حالی کی صد سالہ برسی کے موقع پر خصوصی اشاعت

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

تحقیق، تدوین وشرح:

ڈاکٹر سید تقی عابدی

حالی کی صد سالہ برسی کے موقع پر خصوصی اشاعت

تحقیق، تدوین و تشریح

ڈاکٹر سید تقی عابدی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

حالی کی صد سالہ برسی کے موقع پر خصوصی اشاعت

حالی کا انتقال 31 دسمبر 1914 رات کے 1 بجے ہوا اور اُن کی تدفین یکم جنوری 1915 دن 1 بجے درگاہ بوعلی قلندر میں انجام پائی۔

KULYAT-E-HALI

Compiled by: Dr. Syed Taqi Abedi

Year of Edition 2021 ISBN 978-93-5073-994-5

₹ 1200/-

نام کتاب : کلیاتِ حالی

تحقیق، تدوین وتشریح : ڈاکٹر سید تقی عابدی

سنہ اشاعت : ۲۰۲۱ء قیمت : ۱۲۰۰ روپے

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔ M.08401010786

☆ حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔ Ph.040-66806285

☆ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد۔ Ph.040-24411637

☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی۔ Ph.022-23774857

☆ بک امپوریم، پٹنہ۔ M.09304888739

☆ دانش محل، لکھنؤ۔ Ph.0522-2626724

☆ مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔ M.09325203227

☆ کشمیر بک ڈپو، سری نگر۔ M.09419761773

☆ گلوبل بکس، سری نگر۔ M.09070340905

☆ قاسمی کتب خانہ، جموں۔ M.09797352280

☆ تاج بک ڈپو، رانچی۔ Mob. 9304514659

☆ ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد۔ Ph.040-66822350

☆ انجمن ترقی اردو، حیدرآباد۔ M.09247841254

☆ دکن ٹریڈرس، حیدرآباد۔ Ph.040-24521777

☆ کتاب دار، بک سیلر و پبلشر، ممبئی۔ Ph.09869321477

☆ عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔ M.09433050634

☆ راہی بک ڈپو، الہ آباد۔ M.07905454042

☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

☆ مکتبہ علم وادب، سری نگر۔ M.094419407522

☆ وطن پبلیکیشنز، سری نگر۔ M.09419003490

☆ نعیم بک سیلرز، مئو ناتھ بھنجن۔ M.09450755820

پاکستان میں ملنے کا پتہ : ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph. 0092-42-37247480, 37231388

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.o. 3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678203, 45678204, 45678286, 23216162
E-mail: info@ephbooks.com, ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

رو میں ہے رخشِ عمر

نام	:	سید تقی حسن عابدی
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلص	:	تقی
والد کا نام	:	سید سبط نبی عابدی (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سنجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مارچ 1952ء
مقام پیدائش	:	دہلی (انڈیا)
تعلیم	:	ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا)
		ایم ایس (برطانیہ)
		ایف سی اے پی (امریکہ)
		ایف آر سی پی (کینیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ذوق	:	شاعری، ادبی تحقیق و تنقید

شوق : مطالعہ اور تصنیف

قیام : ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیو یارک، کینیڈا

شریک حیات : گیتی

اولاد : دو بیٹیاں (معصوما اور رویا)

دو بیٹے (رضا و مرتضیٰ)

تصانیف : (53) شہید (1982) جوشِ مودّت، گلشنِ رویا، اقبال کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاء، رموزِ شاعری، اظہارِ حق، مجتہد نظم مرزا دبیر، طالع مہر، سلک سلامِ دبیر، تجزیہ یادگار انیس، ابواب المصائب، ذکر دُرّ باران، عروسِ سخن، مصحف فارسی دبیر، مثنویات دبیر، کائنات نجم، روپ کنور کماری، دُرّ بار رسالت ﷺ، فکر مطمئنہ، خوشۂ انجم، دُرِ دریائے نجف، تاثیر ماتم، تجمی مایا، روشِ انقلاب مصحف تغزل، حوا نجم، تعشق لکھنوی، ادبی معجزہ، غالب دیوان نعت و منقبت، چوں مرگ آید، رباعیات دبیر، سبدِ سخن، دیوان غالب فارسی، فیض فہمی، مطالعہ دبیر کی روایت، دیوانِ سلام و کلام انیس، رباعیات انیس، رباعیات رشید لکھنوی اور احوال پیری، کلیات حالی، مسدس حالی، حالی فہمی، حالی کی نظمیں، حالی کی غزلیں، قطعات حالی، رباعیات حالی، حالی کے شخصی مرثیے، قصاید حالی، بچوں کے حالی، حالی کی نعتیہ شاعری، دیوان حالی فارسی، دو شاہکار نظمیں

زیر تالیف : تجزیہ شکوہ جواب شکوہ، فانی لافانی، تجزیہ رباعیاتِ فراق گورکھپوری، اقبال کے چار مصرعے، رباعیات بیدل، باقیاتِ فیض

 Dr. Syed Taqi Abedi

35

فہرست

باب اوّل ابتدائیہ، شخصیت وفن 35

بابِ دوم — رُباعیات (اُردو) 139

(ماخذ: رباعیات حالی مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

باب سوم غزلیات (اُردو) 189

ماخذ: دیوان حالی (طبع اوّل 1893ء)

ردیف الف

ردیف ب

ردیف ت

ردیف ز

ردیف م

ردیف ن

ردیف و

ردیف ھ

ردیف ی

35

ماخذ: دیوان حالی طبع اوّل

ردیف الف

ردیف ب

ردیف پ

ردیف ت

ردیف ٹ

ردیف ث

ردیف ج

ردیف چ

ردیف ح

ردیف خ

35

ردیف د

ردیف ذ

ردیف ر

ردیف ڑ

ردیف ز

ردیف س

ردیف ش

ردیف ص

ردیف ض

ردیف ط

ردیف ظ

ردیف ع

ردیف غ

ردیف ف

ردیف ق

ردیف ک

ردیف گ

ردیف ل

ردیف م

35

ردیف ن

ردیف و

ردیف ھ

ردیف ی

35

ماخذ: جواہرات حالی (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

35

(1874ء تا 1893ء)

ماخذ: دیوان حالی (طبع اوّل 1893ء)

x تنقیدی

x سیاسی

x معاشرتی و اصلاحی

35

X طنزیہ و مزاحیہ

35

X حکایات و مطائبات

باب پنجم قصاید (اُردو) 379

باب ششم منظومات مدحیہ سپاسیہ اور داعیہ (اُردو) 431

عنوان	سنہ تصنیف	ہیئت	ماخذ

باب ہفتم مراثی (اُردو) 431

35

35

باب دو از دہم بچوں کی نظمیں 995

(زمانہ تصنیف 1904ء تا 1908ء)

باب سیزدہم تراجم 1053

باب چہاردہم قطعاتِ تاریخ اور تاریخی جملے مقتبس از قرآن 1093

ردیف الف

ردیف ت

ردیف ث

ردیف د

ردیف م

ردیف ن

35

ردیف و

ردیف ي

(ب) تخمیس غزل نعتیہ جناب مرزا غالبؔ

(ج) رُباعیاتِ فارسی

(ج) قصاید فارسی

(د) مراثی فارسی

(ھ) قطعات فارسی

35

(و) متفرقات فارسی

(ز) قطعات تاریخ ومختلف مادہ ہای تاریخ فارسی

(ح) قطعات تاریخ

باب بیجدہم کلام عربی 1197

مولانا الطاف حسین حالی
مشہور مصور آفتاب ظفر کی نظر میں

باب اوّل

ابتدائیہ، شخصیت وفن
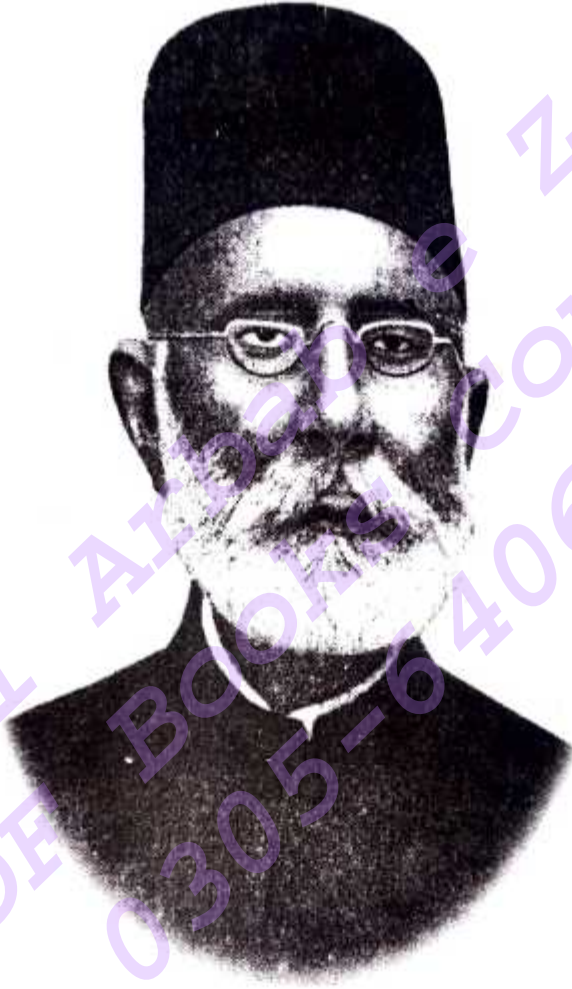
مولانا الطاف حسین حالیؔ
1836ء — 1914ء

راست سے چپ (کرسیوں پر) مولانا حالی-ڈپٹی نذیر احمد-محسن الملک-وقار الملک (استادہ) تھامس آرنلڈ-شبلی نعمانی

غدر کے بعد جب کئی برس خانہ بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسنِ اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس
دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے — جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شعر کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے —
شناسائی ہو گئی اور آٹھ سات برس تک بطور رفیق کے انکے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے
اسکی بہ نسبت انکا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر انکے
مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے انکا پرانا شوقِ سخن — جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا — تازہ
ہو گیا اور انکی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی، جو ابتک بوجہ شغل نہ رہنے کے اچھی طرح ظہور نہ پاتا تھا، چمک اٹھا۔ انکے زمانہ میں اردو اور
فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں کی تحریک سے میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا
مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھ کو چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔
وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا
اسکو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔
نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مطلع
پڑھا: "آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے" اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا۔ یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔
انکے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

عکسِ تحریر مولانا حالی مرحوم

سر سید احمد خان کا خط حالیؔ کے نام

جناب مخدوم و مکرم من!

عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہوئی، ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے، جو مایہ ناز شعرا و شاعری ہے، بالکل مبرا ہے، کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے، جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھتی ہے۔ (دیباچے کی) نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ (نظم میں) پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اُس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس (کتاب) میں پائی جاتی ہے تو صرف اُنھی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس (نظم) کا محرک ہوا اور اُس کو میں اپنے اُن اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب (قیامت میں) خدا (مجھ سے) پوچھے گا کہ تو (اعمال میں سے) کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں، اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔ آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمائیے۔ یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب تک موجود ہیں......

آپ کے اس خیال کا کہ (کتاب کا) حق تصنیف (اشاعت) مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرادی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو، جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا اُن کے ماتم کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں، اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہو گی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف، (دہلی جمع) ہوں اور رنڈیاں نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو "تہذیب الاخلاق" میں چھاپوں گا۔ میرے اُن استفسار کا جواب، جن پر نشان درج کر دیا ہے، بہت جلد مرحمت ہو۔

والسلام

خاکسار، آپ کا احسان مند تابعدار، سید احمد

شملہ پارک ہوٹل، 10 جون 1879ء

شجرہ مولانا حالی

اس شجرے کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے دونوں بیٹوں خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین کی اولاد نے اُردو کو عمدہ ادیب نقاد افسانہ نگار اور ماہرین تعلیم دیے۔ خواجہ اخلاق حسین کے نواسے اور نواسی خواجہ غلام السیدین مصنف آندھی میں چراغ، صالحہ عابد حسین مصنفہ یادگار حالی، خواجہ غلام السیدین کی بیٹی سیدہ سیدین حمید اور خواجہ سجاد حسین کی بیٹی کے بیٹے خواجہ احمد عباس ہماری گفتگو کا ثبوت ہیں۔

پیش لفظ

یہ بھی اُردو شعر و ادب کی نا قدری ہے کہ اس کے مشاہیر شاعروں، ادب کے عظیم ترین محسنوں اور معماروں کی قدر دانی جیسے ہونی تھی ویسے ہو نہ سکی۔ الطاف حسین حالیؔ، غالبؔ اور شیفتہؔ کے شاگرد، سر سید کے فرماں بردار، محمد حسین آزاد، شبلیؔ نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، صدر یار جنگ شیروانی اور چراغ علی کے مصاحب، علی گڑھ کالج اور تحریک کے اکابرین کے وفادار، حیدر آباد، رام پور، پٹیالہ کے حکمرانوں روسا اور انگریز حکومت کے مدح شعار ممتاز شاعر تھے۔ وہ اگرچہ ترقی پسند شاعر، تنقید کے بنیاد گزار اور جدید نظم کے پیشوا تھے جنہوں نے تنقید اُردو شعر و ادب میں مقدمۂ شعر و شاعری، نثری کارناموں میں حیات جاوید، یادگار غالبؔ اور حیات سعدیؔ کے علاوہ اُردو، فارسی اور عربی میں تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار چھوڑے ہیں جو ان کے ہم عصروں کے مقابل سب سے زیادہ وسیع اور تقریباً ہر صنف سخن پر محیط ہیں لیکن ان کا اصلی کارنامہ شعر و ادب میں جدت، مقصدیت اور زندگی کی قدروں کو شامل کرنا ہے۔ چناں چہ انہوں نے اگر مرثیۂ غالب سے یادگار غالب تک شعری، علمی، تہذیبی اور تنقیدی قدروں کو روشناس کروایا تو حیاتِ جاوید، مسدس، حقوقِ نسواں اور اولاد کے ساتھ علی گڑھ تحریک کی نظموں سے برصغیر کی قوم اور خوابیدہ ملت میں تعلیمی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی اور ملی شعور کو بیدار کر کے ایسی فضا بنائی کہ اس میں آگے چل کر علامہ اقبال، سر راس مسعود، ابوالکلام آزاد،

ظفر الحسن، عبدالحق غلام سیدین جیسے معنوی شاگردوں نے ایک پسماندہ اور بے حس ملت کو دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صفوں میں پہنچا دیا۔ اس لیے اگر حالؔی کو اُردو شعر و ادب کا مجدد کہا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔ حالؔی کا کلام قومی ادبی اور ملی سرمایہ ہے چناں چہ جب تک قوم اور ادب باقی ہے اس کی اہمیت بھی باقی رہے گی۔ حالی کا کلام جتنا مقبول اور موثر کل تھا آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ حالی شناسی پر راقم کی درجن بھر کتابیں اسی جذبے کے تحت ان کی سو سالہ برسی کے موقع پر پیش کی جا رہی ہیں جس کا ڈول ہم نے کئی سال قبل اُردو کے اندھے کنویں میں ڈال کر چلو چلو پانی جمع کر کے جامِ سخن میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے ہم کسی تحسین اور صلے کے منتظر اس لیے بھی نہیں ہیں کہ ع

ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

دِلّی اور لاہور میں حالی کی غزلوں، نظموں، قطعوں، رباعیوں اور بعض شخصی مرثیوں سے لوگ واقف تھے جنہیں حالی مشاعروں، محفلوں اور جلسوں میں پڑھتے تھے۔ ان کے کلام کے بعض نمونے اُس دور کے گلدستوں، تذکروں، اخباروں اور رسالوں میں گاہے گاہے چھپتے رہے۔ حالؔی کی بعض نظمیں علاحدہ علاحدہ مختلف مقامات پر شائع ہوتی رہیں جن میں مناجات بیوہ، مثنوی حقوق اولاد، شکوۂ ہند، تحفۃ الاخوان، فلسفۂ ترقی اور چپ کی داد وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن باقاعدہ طور پر حالؔی کی زندگی میں مسدس حالی اور تین مجموعے کلام شائع ہوئے۔

مسدس حالی: 1879ء ضمیمہ مسدس حالی: 1886ء مجموعہ نظم حالی: 1890ء میں اور دیوان حالی معہ مقدمہ شعر و شاعری 1893ء میں۔ حالی نے اپنی زندگی کے آخری سال یعنی 1914ء میں اپنی فارسی اور عربی نظم و نثر کا مجموعہ ''ضمیمۂ اردو کلیات نظم حالی'' مرتب کر کے شائع کیا لیکن افسوس زندگی نے وفا نہ کی چناں چہ ضمیمہ تو چھپ گیا مگر کلیات

کی ترتیب اور طباعت نہ ہو سکی۔

حالی کے انتقال کے بعد اگر چہ حالی کے نواسے نے حالی پبلشنگ ہاؤس سے حالی کی مختلف اہم تصانیف کو عمدہ طریقے پر شائع کیا لیکن کلیاتِ نظم حالی کی طباعت میں مشکلات اس لیے رہیں کہ حالی کی بعض نظموں کے حقوقِ اشاعت بعض قومی اداروں اور تاجروں کو حالیؔ نے دے رکھے تھے اور وہ ان نظموں کی کلیات میں شمولیت پر راضی نہ تھے۔ چناں چہ اسی وجہ سے مختلف مقامات اور مختلف چھاپہ خانوں سے حالیؔ کی تصانیف جن میں علاحدہ علاحدہ رباعیاتِ حالی، قطعاتِ حالی، مسدسِ حالی اور حالی کی دیگر نظمیں شائع ہوتی رہیں۔

1922ء میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالیؔ کا غیر مدون کلام یعنی باقیاتِ حالی کا مجموعہ ''جواہراتِ حالی'' کے نام سے شائع کیا۔ ''جواہراتِ حالی'' کی پذیرائی سے متاثر ہو کر شیخ اسماعیل پانی پتی نے ''کلیاتِ نظم حالی'' کو چار جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے پہلی اور دوسری جلد میں ''دیوانِ حالی'' مطبوعہ 1893ء اور ''جواہراتِ حالی'' 1922ء میں شائع شدہ کلام کو اصناف وار ترتیب دے کر کلیات 1924ء میں پیش کیا۔ افسوس ہے کہ جلد سوم اور چہارم کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ تقریباً چالیس سال بعد افتخار احمد صدیقی نے دو جلدوں میں کلیاتِ نظم حالی کے عنوان سے حالی کا سارا کلام مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا جو حالی کے کلام کے موجودہ نسخوں میں معتبر کلیات ہے۔ حالی کے کلام کی کمیابی اور پرانی کتابت کی غلطیوں سے بھرے ہوئے نسخوں کی طباعت حالی شناسی میں خلل انداز ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ چالیس پچاس سال میں حالی پر کوئی خاص کارآمد تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہو سکا۔ کچھ عمدہ مقالے، تبصرے اور تجزیے مقدمہ شعر و شاعری پر ہر دور میں ہوتے رہے اور یہ صدائیں بھی دو تین دہائیوں سے خاموش ہو گئیں۔ راقم نے حالی شناسی کے فروغ کے لیے حالیؔ کے کلام کو صرف نصاب میں شامل

ضروری نہ جانا بلکہ عوام میں بھی اس کے چرچے کو لازم جان کر اس کی فراہمی کا منصوبہ بنایا جس میں اکیسویں صدی کے اُردو ماحول میں حالی کا کلام جدید علمی تحقیقی اور تنقیدی زاویوں پر استوار کر کے تجزیے اور تشریح کے ساتھ ایسی ترتیب اور تدوین کے ساتھ پیش کیا جائے کہ عالم اور عامی اس سے مستفید ہوسکیں۔ چناں چہ حالی کے کلام کے ہر حصے پر دقیق دیدہ ریزی اور مستند حوالوں کی آبیاری سے گلشن تجزیے اور تشریح کو سنوارا گیا۔ کلیات حالی دو جلدوں میں، حالی فہمی، مسدس حالی، حالی کی نظمیں، قطعات حالی، رباعیات حالی، حالی کی غزلیں، حالی کی نظمیں، حالی کے شخصی مرثیے، قصاید حالی، حالی کی نعتیہ شاعری، بچوں کے حالی اور دیوان حالی فارسی اسی گلشن کے پھول ہیں جن کو جدا جدا گل دانوں میں سجایا گیا ہے۔ حالی کے منظوم کلام کی تشریح اور تدوین کے لیے مطبوعہ نسخوں سے استفادہ کیا گیا کیوں کہ حالی کا قلمی غیر مطبوعہ کلام سب کچھ فسادات میں ضائع ہو گیا۔

حالی کی پوتی مشتاق فاطمہ کی صاحبزادی صالحہ عابد حسین اپنے مکتوب بنام ڈاکٹر رفیق حسین مرتب مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتی ہیں۔ ''فسادات کے بعد حالی مسلم ہائی اسکول جو حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے ان کی یادگار کے طور پر قائم کیا تھا ختم کر کے اُسے جین ہائر سکنڈری اسکول بنا دیا گیا تھا جو اب ڈگری کالج ہو گیا ہے۔ ان کا مکان کسٹوڈین کے قبضے میں گیا۔ کتب خانہ ان کا تو پہلے ہی اسکول کو دے دیا گیا تھا۔ میرے والد اور چچا کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں نادر اور بیش بہا کتابیں تھیں وہ بھی فسادات کی نذر ہوا۔''

حالی کے مطبوعہ کلام کے کئی نمونے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہم نے کلام میں جہاں اختلاف پایا وہاں حالی کی زندگی میں شائع شدہ کلام کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ دیوان حالی، مسدس حالی، مجموعہ نظم حالی، ضمیمۂ کلیات حالی اور مختلف معروف نظمیں جو

شائع ہو چکی تھیں ان سے استفادہ کیا گیا۔ ''جواہرات حالی'' اور دیگر نسخوں کو دوسری کتابوں کے حوالوں سے دیکھا گیا ہے حالی کے قدیم کلیات میں جو مسائل تھے جہاں کئی الفاظ ملا کر لکھے جاتے تھے اور بعض نسخوں میں یاں' واں' ترے' مرے کو یہاں' وہاں' تیرے' میرے لکھا گیا جس سے شعر وزن سے ساقط ہو گیا تھا اس کلیات میں ان نقائص سے اجتناب کرنے کے لیے کلیات نظم حالی کی دونوں جلدوں سے بھرپور استفادہ کیا گیا جن کو ڈاکٹر افتخار صدیقی نے مرتب کیا اور ضروری حاشیے درج کیے۔ ڈاکٹر افتخار صدیقی کا کلیات موجودہ نسخوں میں سب سے عمدہ اور نقائص سے پاک ہے۔ ہم نے ان کے بعض حاشیوں کو شامل کر کے (اص) کی علامت کا نشان رکھا ہے۔ حالی کے تمام حاشیوں کو درج کیا ہے جنہیں بعض ناشرین نے کار اضافی جان کر نکال دیا تھا۔

حالی وہ ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے روایتی اور جدید شاعری کی ہے۔ جہاں تک حالی کی غزلیات کا تعلق ہے انہوں نے قدیم غزلوں کے نمونہ کلام کو اپنے دیوان میں رکھا تاکہ قدیم اور جدید کا فرق ظاہر ہو۔ چناں چہ قدیم روایتی غزلوں پر ''ق'' کا نشان دیوان میں لگا دیا جس کو کئی ترتیب اور تدوین کرنے والوں نے چنداں اہمیت نہ دی۔ اس کلیات میں ڈاکٹر افتخار صدیقی کے نسخے کی روش اختیار کی گئی ہے۔ تاکہ آیندہ قدیم اور جدید غزلیات میں خلط ملط نہ ہو چنان چہ قدیم اور جدید غزلیات علاحدہ علاحدہ ترتیب دی گئی ہیں۔ ناظرین حالی کی قدیم عشقیہ شاعری اور جدید مقصدی شاعری کو ان علامات کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ حالی اس فکری انقلاب کے بارے میں دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''غرض کہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی۔ اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا...... مگر جب آفتاب

عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا......جس شاعری پہ ناز تھا
اس سے شرم آنے لگی۔''

حالی نے اُردو اور فارسی میں رباعیات کہی ہیں۔ اُردو اور فارسی کی عمدہ رباعیات کے سامنے حالی کی رباعیات معمولی اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ حالی کی رباعیات کے مجموعے کئی شائع ہوئے لیکن سب سے اچھا مجموعہ جس میں حالی کی سب سے زیادہ رباعیات ہیں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا ترتیب شدہ ہے جو انہوں نے حالی کی سو سالہ ولادت کی سالگرہ پر شائع کیا تھا۔ اس کلیات اور مجموعہ رباعیات میں ہم نے اسی نسخے سے استفادہ کیا جسے افتخار صدیقی نے نظم کلیات حالی میں شامل کیا ہے۔ حالی کی اُردو رباعیات کی تعداد ((120 اور فارسی رباعیات کی تعداد ((20 ہے۔ شیخ اسماعیل کے مرتبہ رباعیات کے مجموعے میں کتابت کی غلطیاں اور بعض الفاظ کا املا غلط درج ہونے کے باعث مصرعے وزن سے خارج ہو گئے تھے وہ تصحیح کر کے شامل کر لیے گئے اور مزید ایک قطعہ جو غلطی سے رباعیوں میں شامل تھا خارج کر دیا گیا ہے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

موتی ہزار قعر سمندر میں ہوں نہاں

حالی منکسر المزاج تھے انہیں واعظ اور ناصح بننے میں حیا آتی تھی۔ خود لکھتے ہیں:

''بعض رباعیوں اور قطعوں میں اخلاقی مضامین پیش کیے گئے چنان چہ شاعر کو پند و نصیحت کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا۔ مگر یہاں شاعر ناصح سے اس لیے مختلف ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے جب کہ پاک ناصح جگ بیتی کا ذکر کر رہا ہے۔''

ہم نے حالی سے منسوب ''نعتیہ خمسہ'' کو جسے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے جواہرات یعنی مجموعۂ باقیاتِ حالی میں شامل کیا تھا اور ''خستہ'' حالی کا تخلص بتایا تھا اس کلیات میں الحاقی کلام بتا کر شامل نہیں کیا۔ یہ نعتیہ خمسہ فارسی میں ہے اور اس کا سن

طباعت 1856ء ہے جب حالی کی عمر مشکل سے اٹھارہ برس ہے۔ افتخار صدیقی مرتب ''کلیاتِ نظم حالی'' بھی اس کو حالی کا کلام نہیں مانتے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اِسے شامل کیا ہے۔ ہم نے پورا تحقیقی مضمون اس ضمن میں ''حالی فہمی'' میں ناظرین کی سہولت کے لیے شائع کیا ہے۔

حالی کی زندگی میں جو ان کے فارسی اور عربی کلام کے نظم و نثر کا مجموعہ بنام ضمیمۂ اردو کلیات شائع ہوا تھا اُس سے نثر کے حصے کو چھوڑ کر فارسی عربی کا منظوم کلام یہاں شامل کیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ حالؔی نے سرسید کی تحریک پر مسدس لکھا۔ مسدس کا سب سے پہلا ایڈیشن جون 1879ء میں شائع ہوا جس کو پڑھ کر سرسید نے جو مکتوب لکھا تھا ہم نے اس کو اس دستاویز کا جز بنایا ہے۔ سرسید کا یہ کہنا کہ بارگاہ ایز دی میں خالی ہاتھ نہیں آیا بلکہ مسدسِ حالی لکھوا کر لایا ہوں اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ سرسید مسدسِ حالی کے گرویدہ تھے۔ چناں چہ سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' جلد 1880ء میں پورا مسدس چھاپا۔ حالی کے مسدس کا پہلا ایڈیشن سال بھر میں ختم ہوگیا۔ دوسرا ایڈیشن بھی ایک ہی سال میں ختم ہوا تو مسدس کے تیسرے ایڈیشن میں حالؔی نے مسدس پر نظر ثانی کی، کئی مصرعوں کو بدلا، بندوں میں اضافہ کیا اور ضمیمہ کا بھی اضافہ کر کے مسدس کے چھٹے سال بعد 1886ء میں شائع کروایا۔ حالؔی کے مسدس میں (294) بند ہیں اور ضمیمہ میں (164) بند ہیں اس طرح کل بندوں کی تعداد (458) ہے حالی کے سوسالہ ولادت کی سالگرہ پر 1935ء میں ڈاکٹر عابد حسین کے مقدمے کے ساتھ مسدس کا صدی ایڈیشن بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ ہم نے یہاں اسی صدی ایڈیشن کے نسخے سے استفادہ کیا۔

حالی نے اپنے کلام بالخصوص مسدس اور بعض نظموں میں پسماندہ بے حرکت مسلمان قوم کے اسلاف اور اکابرین کے کارناموں کو بیان کر کے یہ تلقین کی ہے کہ تم

اب بھی یہ کام کر سکتے ہو اس طرح ان کا کلام مسلمانوں کی غیرت کی رگ کو پھڑکتا اور سوئی ہوئی قوم کے لیے ایک تازیانہ کا کام کرتا ہے کہ بیدار ہوں اور فلاکت و ہلاکت سے نجات حاصل کرو۔

حالی نے اپنے نظموں کے پہلے مجموعے میں چودہ نظمیں شائع کیں جس میں مدو جزر اسلام، مناجات بیوہ، حقوق اولاد اور شکوہ ہند کو اس لیے شامل نہیں کیا کہ وہ پہلے اور مسلسل شائع ہو رہی تھیں۔ حالی دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اس مجموعے میں 1874ء تک کی نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ 1874ء میں جب محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہال رایڈ کی تائید سے ایک مشاعرے کی بنا ڈالی گئی جس میں مصرعہ طرح کے بجائے موضوع دیا گیا تاکہ اُردو شاعری کو فرسودہ عشقیہ اور مبالغہ آمیز مضامین سے نجات دلوائی جائے تو انہوں نے بھی جو نظمیں پڑھیں یعنی برکھارت، نشاط امید، حب الوطن اور مناظرہ رحم و انصاف کو اس مجموعہ کا حصہ بنایا۔ حالی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ انہیں اگرچہ مغربی شاعری کے اصولوں سے واقفیت نہیں لیکن انہیں مبالغہ اور اغراق سے نفرت ہے جس کا ثبوت خود ان کا کلام ہے۔ حالی نے بتایا ہے کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے اخبار اور 1872ء کے جاری شدہ تہذیب الاخلاق کے علاوہ مغربی لٹریچر کی ترجمہ شدہ کتابوں نے مسلمانوں کے ذہنوں میں لٹریچر کا انقلاب برپا کر دیا تھا جس کی وجہ سے مغربی طرز کی نظموں کی پذیرائی ہونے لگی۔ حالی کہتے ہیں:

> ''میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے، معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعے میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہیں ہو سکا اور اُن صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں، اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اُردو زبان میں نئی طرز کی

ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے۔ اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آیندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے، جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔

پارۂ در خاک معنی تخم سعی افشاندہ ام
بو کہ بعد از ماشود ایں تخم نخل بار دار"

یعنی میں نے دنیائے معانی کی خاک میں کوشش کے بیج بوئے ہیں تاکہ ہمارے بعد اس کے پھل دینے والے درخت سے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

حالی نے دیوان کے دیباچہ میں لکھا: "کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں۔ بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔ پہلا کلام جو عالم جہل و نادانی یا خلاصہ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔ انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو کام اس کی تھوڑی یا بہت کوشش سے انجام ہوتا ہے عام اس سے کہ اچھا ہو یا برا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو اس کو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے۔ ان نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے۔ نہ خیالات ہی اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں اور نہ طرز بیان میں کوئی ایسی جدت ہے جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں۔ پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔"

حالی نے یہ بھی بتایا کہ انسان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی چیز کو عدم سے وجود میں لا سکے۔ نئے خیالات سے مراد وہی عام خیالات ہیں جن کو شاعروں نے ترک کر دیا تھا اور معمولی خیالات سمجھ کر چھوڑ دیا تھا جب کہ انہی خیالات میں زندگی کے راز چھپے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ نظموں میں اسلاف کے اقوال واقعات اور حکایات کو بھی بیان کیا گیا۔ طوالت و تکرار حالی کی نظموں کا سب سے بڑا عیب ہے۔ مثلاً: مناجات بیوہ جو حالی کی بہترین نظم ہے اس میں طوالت اور تکرار نے اسے کم اثر کر دیا ہے۔ اگر اس کے بعض حصوں کو نکال بھی دیا جائے تو نظم پر کوئی منفی اثر نہیں پڑ سکتا۔ حالی کو اگر موقع ملتا تو شاید ان نظموں کی تکرار اور طوالت پر نظر ثانی کرتے۔ ہم مطمئن ہیں کہ نسل آیندہ اس کا انتخاب کرے گی۔

جہاں تک کلیات کی ترتیب اور تدوین کا تعلق ہے جو کم از کم تین طرح سے مرتب کیا جا سکتا ہے یعنی اصنافی ترتیب، موضوعاتی ترتیب یا زمانی ترتیب۔ حالی کے پہلے کلیات کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اُردو کے قدیم اور مروجہ اسلوب یعنی اصناف سخن کے اعتبار سے جمع کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کلیات نظم حالی کو موضوعاتی اعتبار سے تقسیم کر کے ہر صنف میں زمانی دور کو بھی ملحوظ رکھا۔ راقم نے بھی کلیات حالی میں اصنافی ترتیب دے کر جہاں منظومات کے سنین کا تعین ہو سکا انہیں تاریخوں کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ راقم بک کارنر پبلشرز کے رُوحِ رواں جناب امر شاہد کی کاوشوں کا ممنون ہے جنہوں نے حُسنِ یوسف کو بازارِ مصر میں پیش کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر بیدار بخت اور کرنل انور احمد کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے وہ تمام کتابوں کا بندوبست کیا جو میری لائبریری میں نہیں تھیں۔

خیر اندیش

ڈاکٹر سید تقی عابدی

حالی کی کہانی حالی کی زبانی

(جو نواب عماد الملک بہادر مولوی حسین صاحب بلگرامی کی فرمائش سے لکھی گئی)

میری ولادت تقریباً 1253ھ مطابق 1837ء میں بمقام قصبہ پانی پت شاہ جہاں آباد سے جانب شمال 53 میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے؛ میں واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے؛ آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ جن کا سلسلہ نسب 26 واسطوں سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اور 18 واسطوں سے شیخ الاسلام تک اور 10 واسطوں سے ملک محمود شاہ انجو لقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق عجم کا فرمانروا تھا، پہنچتا ہے۔ چونکہ غیاث الدین بلبن اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علما و شعرا و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدر دان تھا اس لیے اکثر اہل علم اور

عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا چناں چہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیص رخ بازار اور تولیت ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان سے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انہیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں؛ کی بیٹی تھیں۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سر پرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انہوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناں شوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہو گیا انہیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے ان سے صرف و نحو پڑھی۔ مگر چند روز بعد بھائی نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر 17 برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر

تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشوونما پائی تھی وہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اوّل تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجہلے کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں کے مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرتا تھا ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دلی میں شرح مسلم، ملاحسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر 1855ء کا ہے۔ دلی سے آ کر برس ڈیڑھ تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ 1856ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن 1857ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور

میں آئے اور سرکاری عملداری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے (پانی پت میں) بے کاری کی حالت میں گذرے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلاء، مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروع اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہوا جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتیؔ اور اردو میں شیفتہؔ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس

تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے۔ اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خان کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہؔ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انہوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا:

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص مذاق پیدا ہو گیا۔

نواب شیفتہؔ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے

ان کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں رہ کر نیل ہالرائیڈ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی 1874ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر۔ تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی وطن پر لکھیں۔

اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آکر اوّل میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی؛ لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزلی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔ چناں چہ میں نے اوّل مسدس مدو جزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں، لکھیں۔

نظم کے سوا نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً 1867ء میں ایک کتاب تریاق مسموم ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا؛ لکھی تھی جس کو اسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا چناں چہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ

میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا مگر اوّل تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جبکہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جس پر کرنیل ہالرایڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپیہ کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلی میں سعدیؔ شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیاتِ سعدی ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں پھر شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھ کر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی لکھا گیا ہے یادگارِ غالب کے نام سے لکھ کر شائع کی اور اب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم حیاتِ جاوید جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے لکھی جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرائمر وغیرہ میں نے لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب اخلاق، علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اُردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے 1898ء میں لکھا تھا اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس

وکٹوریا کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

1305ھ میں جبکہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے لیے سر سید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امدادِ مصنفین ایک وظیفہ تعداد پچھتر روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور 1309ھ میں جب کہ میں سر سید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ حیدر آباد گیا تھا۔ اس وظیفہ میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکہ حال کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

io

دیباچہ دیوانِ حالی

(مولانا حالیؔ)

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا تعشق کو لازم وملزوم سمجھتے تھے اور ایسا سمجھنا کچھ بے وجہ نہ تھا۔ اوّل تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اس جوش اور ولولے سے ہوا ہے جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور شعر کی ذات میں جو ایک آتش گیر مادہ ہے وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعال انگیزی کا محتاج ہے۔ پھر قوم (۱) کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا ہے اسی خیال کی تائید کرتا ہے۔ با ایں ہمہ حداثت سن یہ کب اجازت دیتی تھی کہ شاہد رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیرزال کی صورت میں کیا جائے اور شراب ارغوانی کی جگہ سرکہ بے نمک سے ضیافت طبع کی جائے۔ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔

ا۔ قوم سے یہاں اس کے متعارف معنی مراد نہیں بلکہ قوم سے مراد شعرا ہیں۔

خود بھی یہ سودا اچھلا۔ آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لیے جس پر راہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلے کے ساتھ راہ کی ہمواری اور رہ گزر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا، وہ تمام سیمیائی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دل فریب نظر آتے تھے، رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل وتشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔

یقولون هل قبل الثلثین ملعب(۱)

فقلت وهل بعد الثلثین ملعب

جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں منہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے۔ مگر زمانے کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دل فریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ وبلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں:

یکرہ بحال خویش ہم آخر تواں گریست

تا چند بر فلان و بہ بہاں گریستن

کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں، بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند، مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی، اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔ جو نظمیں کسی قدر طولانی تھیں وہ تقریباً تمام چھپ چکی اور شائع ہو چکی

۲۔ یعنی لوگ کہتے ہیں کیا لہو ولعب کا زمانہ تیس برس سے پہلے ہے؟ سو میں نے ان سے کہا: کیا لہو ولعب کا زمانہ تیس برس کے بعد ہے؟

ہیں۔ اب زیادہ تر کچھ بچے کھچے متفرق اور پراگندہ خیالات باقی ہیں۔ جن میں سے کسی قدر قطعہ و رباعی کے لباس میں اور کچھ غزل کے روپ میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان کے سوا چند ترکیب بند، ایک آدھ مسمط، کچھ قصیدے اور تاریخیں ہیں جن میں سے اکثر خاص خاص طور پر وقتاً بعد وقت شائع ہو چکی ہیں لیکن مصنف کی طرف سے عام طور پر پبلک کی نذر نہیں ہوئیں۔ پہلا کلام جو عالم جہل و نادانی یا خلاصہ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔ انسان کی طبیعت کا مقتضا ہے کہ جو کام اس کی تھوڑی یا بہت کوشش سے سرانجام ہوتا ہے، عام اس سے کہ اچھا ہو یا برا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو، وہ اس کو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے۔ جس فخر کے ساتھ وہ اعرابی (۱) جس نے کبھی آبِ شیریں کا مزہ نہ چکھا تھا، ایک کھاری پانی کے چشمے سے مشک بھر کر ہارون رشید کے دربار میں بطور سوغات کے لیے گیا تھا، وہ اس فخر سے کچھ کم نہ تھا جو کولمبس امریکا دریافت کر کے ازبلا کے دربار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ پس یہ تمام مجموعہ جس میں کچھ نئے اور کچھ پرانے خیالات شامل ہیں، محض ایک امید موہوم پر کہ دیکھیے مردود ہو یا مقبول، ملک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور پہلے اس سے کہ کوئی ہم پر ہنسے، ہم اپنے دعووں پر آپ ہنستے ہیں۔

شاید ناظرین کو پچھلے زمانے کے خیالات میں پہلے زمانے کی بہ نسبت حقائق و

ا۔ یہ ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہے یعنی ہارون رشید کے زمانے میں ایک بدوی جس نے کبھی دجلہ کے شیریں پانی کا مزہ نہ چکھا تھا، اس کو صحرا میں ایک چشمہ ملا جس کا پانی اگرچہ دجلہ کے پانی سے نسبت نہ رکھتا تھا لیکن جیسا شور پانی کہ وہ بدوی ہمیشہ پیا کرتا تھا، اس سے کسی قدر میٹھا تھا۔ وہ خوشی خوشی اس کی ایک مشک بھر کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے دربار میں اس کو بطور ایک علق نفیس کے پیش کیا۔ خلیفہ نے اس کو چکھا تو بالکل کھاری پانی تھا۔ مگر اس کی بدمزگی بدوی پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اس کو انعام دے کر رخصت کیا اور حکم دیا کہ یہ شخص دجلہ کا پانی نہ پینے پائے ورنہ اپنے دل میں شرمندہ ہوگا۔

واقعات کا کچھ زیادہ جلوہ نظر آئے اور جیسے کہ امید کی جاتی ہے، ان خیالات کو سچی شاعری کا ایک نمونہ تصور کیا جائے۔ مگر یہ بات کہ جیسے یہ خیالات کانوں کو سچے معلوم ہوتے ہیں، ایسے سچے دل سے بھی نکلے ہیں یا نہیں خود ہم کو بھی معلوم نہیں، تا بدیگراں چہ رسد۔ جیسا کام محض سچے جوش اور ولولے سے ہوتا ہے ویسا ہی بلکہ بعض اوقات اس سے بہتر محض شہرت اور ناموری کی خواہش، تحسین و آفرین کے لالچ، جلبِ منفعت کی توقع یا کم سے کم اپنا دل خوش کرنے کے خیال سے بھی ہو سکتا ہے، اور خود کرنے والے کو اپنے کام کا منشا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگرچہ ہم اس وقت نہ ہوں گے مگر زمانہ سچ اور جھوٹ کو اور دودھ پانی کو الگ کیے بغیر نہ رہے گا۔ سچ پھولے گا اور پھلے گا اور جھوٹ برسات کے سبزے کی طرح جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔

وکم قد رأینا من فروع کثیرۃ
تموت اذا لم تحیہن اصول(۱)

ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرزِ بیان اور زبان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آ جاتا ہے مگر پہیا اور دھرا باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیے تھے مگر اسلوبِ بیان میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح، ہجا، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے، خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں مگر ان کے طریقہ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں روشناس ہونے اور

۱۔ ہم نے وہ شاخیں اکثر سوکھتی دیکھی ہیں، جن کی جڑیں اس قابل نہ تھیں کہ اپنی شاخوں کو سرسبز رکھ سکیں۔

اہل ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لیے اسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے اور اپنی وضع، صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل دور کر دے، اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرزِ بیان میں قدما کے طرزِ بیان سے بہت دور نہ جانا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھی پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اس کے لیے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

کچھ تعجب نہیں کہ اس مجموعے کو اور نیز ان نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں، دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے؟ نہ خیالات ہی اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں اور نہ طرزِ بیان ہی میں کوئی ایسی جدت، جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں اور وہ یہ سمجھ کر بے اختیار پکار اٹھیں کہ ﴿هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾[1]۔ پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرزِ ادا میں، جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا، وہ بہت کم فرق پائیں گے مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے ہیں، اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں یا کسی کے ذہن کی ان تک رسائی نہ ہو سکے بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و ناشاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے ہیں اور ہر وقت ان کے پیش نظر ہیں مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور مبتذل ہیں کہ ان کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور ان کی طرف

۱۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اہل جنت کو کوئی جنت کا پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے ﴿هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ (یعنی یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا) کیونکہ جنت کے میوے، صورت میں یکساں معلوم ہوں گے مگر ہر ایک کا مزہ اور لذت جدا ہوگی۔

بہت کم التفات کیا گیا اور پایہ شاعری کو ان سے وراء الورا سمجھا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت شاعری کا بھید انہی متبذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو بسبب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا:

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہے، ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لا سکے۔ اس کی بڑی دوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دے کر اس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس جس طرح عمارت تیار کرنے میں معمار اینٹ، مٹی، چونے کا یا بڑھئی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے، اسی طرح ضروری ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترتیب دینے میں کسی ایسے مسالے کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو۔ وہ مسالہ کیا ہے؟ یہی دنیا کے حالات جو روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں، خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں یا زمین، آسمان، چاند، سورج، پہاڑ، اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے یا مچھر، مکڑی اور بھنگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے۔ پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی، اس کی مثال اس معمار کی سی ہوگی جو عمارت بنانے کے لیے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مسالے کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہوسکتی:

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

الغرض جب سے شاعری کی لے کھلی، معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں

بیٹھنا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزول مائدہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانے کے حالات دیکھ کر جو کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی ان کو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقے کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے۔ بعض خیالات بحسب ضرورت وقت، اقوال سلف یا حکایات سلف سے اخذ کیے گئے۔ کہیں ان کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے اس کو ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا گیا۔ بعض قطعات و رباعیات میں اخلاقی مضامین کنایہ میں ادا کیے گئے ہیں جو شاید کہیں کہیں مطایبہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں، مگر انوری و سعدی و شفائی کے مطائبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہوں گے۔ ریا و مکر و سالوس و عجب و خود پسندی اور اسی قسم کے اخلاق واعظ و زاہد و صوفی و شیخ و ملا پر ڈھالے گئے نہ اس لیے کہ نعوذ باللہ اس فرقہ علیا کی مذمت مقصود تھی بلکہ اس لیے کہ ان اخلاق کے بیان کرنے کا اس سے واضح تو کوئی عنوان نہ تھا۔ سیاہی کا دھبا جیسا اجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے ایسا میلے کپڑے پر نہیں ہوتا۔ ظلم اور بے انصافی کے مرتکب اپنی اپنی طاقت کے موافق فقیر اور بادشاہ دونوں ہوتے ہیں، مگر جب ظلم کو زیادہ ہولناک صورت میں دکھانا منظور ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ سلطنت کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ریا و عجب و خود پسندی اگرچہ ہر فرد بشر میں کم و بیش پائی جاتی ہے، مگر جب اس کو علم و زہد و مشیخت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تعجب انگیز اور ڈراؤنی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی شاعر کی علت غائی ہے۔ ایک شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اس کو یہ ضرورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے، اس لیے ہم کو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اصلی ناصح خود برائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو ان سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچ دکھاتا اور گھر کے بھیدی کی طرح

چھپے رستموں کے پترے کھولتا ہے اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے۔ ہر بدی اور گناہ کا نمونہ کم یا زیادہ، پوشیدہ یا علانیہ انسان کے نفس میں موجود ہے۔ پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی پتے کی بات شاعر کی قلم سے مترشح ہو تو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے ہی نفس کی چوریاں ظاہر کر رہا ہے:

ہیں عاشقی کی گھاتیں معلوم اس کو ساری
حالی سے بدگمانی بے جا نہیں ہماری

شاید اس موقع پر شاعر کی طرف سے یہ عذر ہو سکے کہ اس میں فطرت انسانی کے دقائق و غوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے جس کی مدد سے بعض اوقات ایک رند مشرب اور خراباتی شاعر جس پر پرہیزگاری کی کبھی چھینٹ نہ پڑی ہو، وہ پرہیزگاروں کی سوسائٹی کا ایسا صحیح نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ خود اس سوسائٹی کے ممبر بھی اپنی سوسائٹی کا ویسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے۔ اسی طرح ایک دوسرا شاعر جس نے پرہیزگاروں اور پارساؤں کے حلقے سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا، وہ رند و اوباش کی صحبتوں کا ایسا چربہ اتار دیتا ہے کہ گویا انھی میں سے ایک نے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔ ابونواس نے بارہا خلیفہ سے ایک مصرع سن کر، جس میں رات کے تخلیے اور عیش کی صحبت کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوتا تھا، اس مصرعے کی تضمین میں ایسے واقعات بیان کر دیے ہیں کہ خلیفہ متعجب ہو کر بے ساختہ یہ کہہ اٹھتا تھا: "قاتلك الله كانك كنت ثالثاً"[1] شیکسپیئر جس کے ہمراہی ہرن کا شکار کھیلنے والے اور تماشا کرنے والے تھے اور جس نے کبھی آنکھ کھول کر عالی خاندان اور شریف و پاکیزہ عورتوں کی سوسائٹی نہ دیکھی تھی، اس نے میکبتھ، جولیٹ، کیتھرائن، ڈزڈیمونا اور بعض اور لیڈیوں کے ایسے اصلی کیرکٹر دکھائے ہیں جن کا اس

---

[1] خدا تجھ کو شرمائے گویا تیسرا ہم میں تو تھا۔ یعنی تو نے ایسے صحیح واقعات بیان کیے ہیں کہ گویا تو بھی ہماری صحبت میں شریک تھا۔

سوسائٹی پر جس میں اس کی عمر گزری تھی، کبھی پرچھاواں تک نہ پڑا تھا۔ ایران میں فردوسی اور ہندوستان میں انیس، رزم کے بیان میں صدہا باتیں ایسی ٹھکا۔ کی لکھ جاتے ہیں، جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعات گویا خود ان پر گزرے تھے۔

اس عذر سے اگرچہ کسی قدر شاعر کی برأت ہو سکتی ہے، مگر پھر بھی اس کو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے، بخلاف شاعر کے کہ اس کا اصلی مقصد فطرت انسانی کی کرید اور واقعات دہر سے متاثر ہو کر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس۔ وہ کسی کے سمجھانے کے لیے نہیں چلاتا بلکہ خود کچھ سمجھ کر چیخ اٹھتا ہے:

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور مشیر
دردمند ان کے نہ اُن کے درد کے درمیاں ہیں ہم
چھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھ کر
نالۂ بے اختیار بلبل نالاں ہیں ہم

پس اگر شاعر کا کوئی قول اس کے فعل کے برخلاف پایا جائے تو اس کو واعظ یا ناصح قرار دے کر یہ الزام نہیں دینا چاہیے کہ {اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ}[1] بلکہ اس کی طرف سے یہ عذر کرنا چاہیے کہ {اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ}۔[2]

انسان کے کلام میں کہیں کہیں اختلاف یا تناقص پایا جانا ایک ضروری بات ہے بلکہ اس کے کلام کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے کہ کما قال اللّٰہ تعالیٰ: {وَلَوْ كَانَ مِنْ

۱۔ ''کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا حالانکہ تم اپنی جانوں کو بھولے ہوئے ہو۔''
۲۔ ''تحقیق وہ کہتے ہیں مگر کرتے نہیں۔''

عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾ [1] مگر جس طرح ایک فلسفی یا مورخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا اس تصنیف کو عیب لگاتا ہے، اس طرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگتا بلکہ اس کا بے ساختہ پن ظاہر کرتا ہے جس کو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیے۔ فلسفی یا مورخ ہر ایک چیز پر اس کے تمام پہلو دیکھ کر ایک مستقل رائے قائم کرتا ہے اور اس لیے ضروری ہے کہ اس کا بیان جامع و مانع ہو۔ لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اس کے سامنے آئے اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اس کے دل کو بے چین کر دے، اس کو اسی طرح بیان کرے۔ پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو، اس کو اس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے۔ وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا کہ اس کو حقائق و واقعات کے ہر پہلو پر نظر رکھنی پڑے بلکہ جس طرح ایک فوٹو گرافر ایک ہی عمارت کی کبھی روکار کا، کبھی پچھیت کا، کبھی اس ضلع کا، کبھی اُس ضلع کا جدا جدا نقشہ اتارتا ہے، اسی طرح شاعر حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے۔ پس ممکن ہے کہ شاعر ایک ہی چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بری چیز کی تعریف، کیونکہ خیر محض کے سوا ہر خیر میں شر کا پہلو اور شر محض کے سوا ہر شر میں خیر کا پہلو موجود ہے۔ عقل، علم، زہد، دولت، عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں مگر شعرا نے ان کی جا بجا مذمت کی ہے۔ اسی طرح دیوانگی، نادانی، رندی، فقر، ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود کی جاتی ہیں لیکن شعرا ان کے اکثر مداح رہے ہیں۔

شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری

۱۔ ''جس طرح کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ: خدا کے سوا اگر یہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔''

حیثیت سے اس سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کبھی قدما کے مقابلے میں اس لیے کہ وہ استاد اور موجدِ فن تھے، اپنے تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے اور کبھی اس لیے کہ اس نے ان کی دولت میں کسی قدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہے جو ان کے پاس نہ تھی، اپنے تئیں ترجیح دیتا ہے۔ وہ کبھی دنیا کی اس لیے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دار الغرور و دار المحن ہے اور کبھی اس کی بڑائی و عظمت اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعہ آخرت ہے۔ وہ کبھی ایک ہی گورنمنٹ کی، اس کی خوبیوں کے سبب سے ستائش کرتا ہے اور کبھی اس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت۔ مگر وہ کبھی ان حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتا جن پر اس کے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں۔ جب ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو گویا دوسرے پہلو کو بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ ایک نادان بچے کی طرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہنسنے لگتا ہے۔ مگر نہ اس کے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنے کا۔ پس ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں ایسی بے جوڑ باتیں دیکھ کر لوگ متعجب ہوں مگر جب تک شاعر کا سا دل ان کے پہلو میں اور ویسا ہی سودا ان کے دماغ میں نہ ہو، ان کا تعجب رفع ہونا مشکل ہے:

بہ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

یہ چند اصول جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نکتہ چینوں کی زبان بند کرنی مقصود ہے، کیوں کہ جس طرح فوارہ روکنے سے زیادہ زور کے ساتھ اچھلتا ہے، اسی طرح نکتہ چینوں کی زبان بند کرنے سے اور زیادہ اُچھلتی ہے۔ دوسرے، نکتہ چینوں سے کان اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ جس طرح توپ خانے کا گھوڑا توپ کی آواز سے کان نہیں ہلاتا، اسی طرح مصنف نکتہ چینوں کے شور و غل کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ پس ان کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت۔ البتہ ضرورت وقت اس امر کی مقتضی تھی کہ دیباچے میں یہ چند باتیں جتا دی جائیں۔ ظاہر

ہے کہ سویلزیشن، جس کو شعر و شاعری کا قاتل کہا جاتا ہے، اس کا پرچھاواں اس ملک پر بھی پڑنے لگا ہے۔ شعر جس کو مدرسے میں لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ [1] اس کو روز بروز زیادہ تر مدرسے ہی کے ساتھ پالا پڑتا جاتا ہے۔ تعلیم ایسے عقل و دانش کے پتلے جوق در جوق اور فوج در فوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوقِ معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں جیسے شعرا اُن کے نزدیک عقل و دانائی سے۔ ان پر شعر اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا کہ عرب کے اونٹ پر حدی خوان کی آواز اثر کرتی ہے۔ غرضیکہ شاعرانہ مذاق یوماً فیوماً ملک سے مفقود ہوتا جاتا ہے اور ایسی علامتیں موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لیے گل ہونے والا ہے۔ نہ پرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں دیوان شائع کرنا اور شاعری کے متعلق کچھ اصول بیان کرنا ایسی بات تھی جیسے چین میں عبرانی بائبل شائع کرتی۔ اسی لیے مقدمے میں مطلق شاعری پر کسی قدر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے اور چند باتیں جو خاص اس مجموعے سے علاقہ رکھتی تھیں، وہ اب دیباچے میں بیان کی گئیں۔ لیکن اگر غور کیجیے تو ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی۔ مقدمہ اور دیباچہ لکھنا تو درکنار، سرے سے شعر کہنے کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی: ع

آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

مگر مدبر السموات والارض نے اس خرابہ آباد نما کی رونق اور بہار ہماری اسی غفلت و نادانی پر موقوف رکھی ہے کہ دن رات یہاں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھے رہیں، دھوکے کو حقیقت اور خواب کو بیداری سمجھیں، اور جس کوشش و جاں فشانی کے ساتھ کہ مکڑی عمر بھر اپنے بودے اور کمزور جالے کے پورنے میں سرگرم رہتی ہے، اسی

ا۔ یہ اشارہ ہے اس مشہور مقولے کی طرف کہ ''شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد؟''

کوشش و جاں فشانی کے ساتھ ہم بھی اپنی بے بنیاد اور پادر ہوا عمارتیں چنتے رہیں، یہاں تک کہ فنا ہوجائیں۔

در کارخانه که بنایش به غفلت است
هشیار زیستن نه زقانون حکمت است

نروح و نغدوا لحاجاتنا
وحاجة من عاش لا تنقضی
ویسلبه الموت اثوابه
ویمنعه الموت ما یشتهی
تموت مع المرء حاجاته
وتبقی له حاجة ما بقی(۱)

io

ا۔ ترجمہ: ہم اپنے کاموں میں صبح وشام سرگرم ہیں اور جو شخص زندہ ہے اس کا کام ختم نہیں ہوسکتا۔ موت ہی اس کے کپڑے اُتروائے گی اور موت ہی اس کی خواہشوں کا خاتمہ کرے گی۔ انسان کی خواہشیں اُس کے ساتھ ہی مریں گی۔ جب تک وہ زندہ ہے، کوئی نہ کوئی خواہش اُس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

یہ بھی اُردو شعر و ادب کی نا قدری ہے کہ اس کے مشاہیر شاعروں، ادب کے عظیم ترین محسنوں اور معماروں کی قدر دانی جیسے ہونی تھی ویسے ہو نہ سکی۔ الطاف حسین حالیؔ اگر چہ ترقی پسند شاعر، تنقید کے بنیاد گزار اور جدید نظم کے پیشوا تھے جنہوں نے تنقید اُردو شعر و ادب میں مقدمۂ شعر و شاعری، نثری کارناموں میں حیات جاوید، یادگار غالبؔ اور حیات سعدیؔ کے علاوہ اُردو، فارسی اور عربی میں تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار چھوڑے ہیں جو ان کے ہم عصروں کے مقابل سب سے زیادہ وسیع اور تقریباً ہر صنف سخن پر محیط ہیں لیکن ان کا اصلی کارنامہ شعر و ادب میں جدت، مقصدیت اور زندگی کی قدروں کو شامل کرنا ہے۔ اس لیے اگر حالیؔ کو اُردو شعر و ادب کا مجدد کہا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔ حالیؔ کا کلام قومی ادبی اور ملی سرمایہ ہے چناں چہ جب تک قوم اور ادب باقی ہے اس کی اہمیت بھی باقی رہے گی۔ حالی کا کلام جتنا مقبول اور موثر کل تھا آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ حالی شناسی پر راقم کی درجن بھر کتابیں اسی جذبے کے تحت ان کی سو سالہ برسی کے موقع پر پیش کی جا رہی ہیں جس کا ڈول ہم نے کئی سال قبل اُردو کے اندھے کنویں میں ڈال کر چلو چلو پانی جمع کر کے جام سخن میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے لیے ہم کسی تحسین اور صلے کے منتظر اس لیے بھی نہیں ہیں کہ ع

ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

دیباچہ

مسدس مدو جزر اسلام

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بچپن کا زمانہ جو کہ حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے، ایک ایسے دل چسپ اور پُر فضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا۔ نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے، نہ خار دار جھاڑیاں تھیں، نہ آندھیوں کے طوفان تھے، نہ بادِسموم کی لپٹ تھی۔

جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دل فریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہو گئیں۔ مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا اسی قدر وحشت خیز تھا۔ اس کی سر سبز جھاڑیوں میں ہولناک درندے چھپے ہوئے تھے اور اس کے خوش نما پودوں پر سانپ

اور بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ جوں ہی اس کی حد میں قدم رکھا ہر گوشے سے شیر و پلنگ اور مار و کژدم نکل آئے۔ باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی مگر دنیا کی مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی، خودآرائی کا خیال آیا، نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذت اٹھائی، نہ فراق کا مزا چکھا:

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا، آہ و فغاں کے شور سے کرّ وبیاں کے کان بہرے ہو گئے، شکایتوں کی بوچھاڑ سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھر مار سے آسمان چھلنی ہو گیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا، یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہو گئے۔ جب شوق کا دریا اُمڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدان قیامت میں اکثر گزر رہوا، بہشت و دوزخ کی سیر کی، بادہ نوشی پر آئے تو خُم کے خُم لنڈھا دیے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانہ خمار کی چوکھٹ پر جبہ سائی کی، کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے، ایمان سے بے زار رہے۔ پیر مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بت پوجے، زنار باندھا، قشقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کسیں۔ واعظوں کا خاکہ اُڑایا۔ دیر اور بت خانے کی تعظیم کی، کعبہ اور مسجد کی توہین کی۔ خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں، اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا، حسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا۔ غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں،

146

قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیے۔ ہر مشت خاک میں اکسیر اعظم کے خواص بتلائے، ہر چوب خشک میں عصائے موسیٰ کے کرشمے دکھائے، ہر نمرود وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا، ہر فرعون بے سامان کو قادر مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مداح بنے اُسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوں کو اپنی تعریف میں کچھ مزا نہ آیا۔ غرض نامہ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی:

چو پرسش گنہم روز حشر خواہد بود
تمسکات گناہان خلق پارہ کنند

بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں:

شکست رنگ شباب و ہنوز رعنائی
دراں دیار کہ زادی ہنوز آنجائی

نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں حدود رہی ہو، ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔ اس کے سوا بیس برس کی بے کار اور نکمی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقت رفتار جواب دے چکی تھی۔ لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لیے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ چند روز اسی تردید میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے پڑتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے، ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے

تھے، تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ آفتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں۔ مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں، دم چڑھ رہا ہے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ لیکن وہ اُولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے، اسی طرح تازہ دم ہے۔ نہ اُسے رستے کی تکان ہے، نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے، نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے، وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ، اسی دشوار گزار رستے پر پڑ لیے۔ نہ یہ خبر ہے کہاں جاتے ہیں، نہ یہ معلوم ہے کہ کیوں جاتے ہیں۔ نہ طلب صادق ہے، نہ قدم راسخ ہے، نہ عزم ہے، نہ استقلال ہے، نہ صدق ہے، نہ اخلاص ہے۔ مگر ایک زبردست ہاتھ ہے کہ کھینچے لیے جاتا ہے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں

دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکو سلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے اُبھاروں سے دل بڑھتا تھا، نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا، مگر یہ ایک ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے بخارات دورنی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا، دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈتے تھے۔ قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پرزور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے، اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے) آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے:

رو چو انساں لب بجنباں در دہن
ور جمادی لاف انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پرواہ ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے، زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے، قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ اگر چہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا، مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گزرتے رہے ہیں، ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے خیال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے:

در فیض ست منشیں از کشائش نا اُمید ایں جا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا

(وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ۔)

''اور وہ ایسا خدا ہے کہ جب لوگ نا اُمید ہو جاتے ہیں تو مینہ برساتا ہے اور

اپنی رحمت پھیلاتا ہے۔'' ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل سے ہی نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں ایک اُبال آیا۔ افسردہ دل، بوسیدہ دماغ، جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، اُنہی سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ دنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا مگر ہر حال میں یہ دھن لگی رہی۔ بارے الحمد للہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہوگئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔ صرف ایک اُمید کے سہارے پر یہ راہِ دور دراز طے ہوگئی ہے ورنہ منزل کا نشان نہ اب تک ملا ہے اور نہ آیندہ ملنے کی توقع ہے:

خبرم نیست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید

اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اُس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا ہے۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی اُمی e کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا اُمت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اُن کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔ اگرچہ اس جاں کاہ نظم میں جس کی دشواریاں لکھنے والے کا دل اور دماغ ہی خوب جانتا ہے، بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے مگر شکر

ہے کہ جس قدر ہو گیا اتنی بھی اُمید نہ تھی۔ ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہراً اس روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے، کیوں کہ اس میں تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اُس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے، نہ رنگیں بیانی۔ نہ مبالغے کی چاٹ ہے، نہ تکلف کی چاشنی ہے۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اہل وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں اور کوئی کرشمہ ایسا نہیں ہے کہ ''لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر'' (نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی بشر کے دل میں گزرا) گویا اہل دہلی و لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چنا گیا ہے جس میں ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لیے نہیں کی گئی بلکہ عزیزوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لیے کی گئی ہے۔ اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو اُن کا احسان ہے ورنہ کچھ شکایت نہیں۔

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

مولانا الطاف حسین حالی

1296ھ مطابق 1879ء

io

دیباچہ

متعلق بہ ضمیمہ مسدس مدو جزر اسلام

حدیث درد دلاویز داستانے ہست
کہ ذوق بیش دہد چوں دراز تر گردد

''مسدس مدو جزر اسلام'' اول ہی اول 1296ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس نظم کی اشاعت سے شاید کوئی معتد بہ فائدہ سوسائٹی کو نہیں پہنچا مگر چھ برس میں جس قدر قبولیت و شہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی وہ فی الواقعہ تعجب انگیز ہے۔ نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے۔ قوم کی برائیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ و سنان کا کام لیا گیا تھا۔ ناظم کی نسبت قوم کے اکثر ابرار و اخیار مذہبی سوئے ظن رکھتے تھے۔ تعصب عموماً کلمہ حق سننے سے مانع تھا، بایں ہمہ اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اس کے سات آٹھ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں جابجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری

ہیں۔ کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کیے جاتے ہیں۔ بہت سے مسدس اسی کی روش پر اسی بحر میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ اکثر اخباروں میں موافق و مخالف ریویو اس پر لکھے گئے ہیں۔ شمال مغربی اضلاع کے سرکاری مدارس میں عام قبولیت کی وجہ سے اس کو تعلیم میں داخل کر دیا گیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نے اس کی طرف کافی توجہ کی ہے، مگر اس پر مصنف کو کچھ فخر کرنے کا محل نہیں ہے۔ اگر قوم کے دل میں متاثر ہونے کا مادہ نہ ہوتا تو یہ اور ایسی ایسی ہزار نظمیں بے کار تھیں۔ پس مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اس نے زمین شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی نہیں چاہی۔ اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گم راہ نہیں ہے۔ وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں مگر رستے کی تلاش میں چپ و راست نگراں ہیں۔ ان کے ہنر مفقود ہو گئے ہیں مگر قابلیت موجود ہے۔ ان کی صورت بدل گئی ہے مگر ہیولی باقی ہے۔ ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے مگر زائل نہیں ہوئے۔ ان کے جوہر مٹ گئے ہیں مگر جلا سے پھر نمودار ہو سکتے ہیں۔ ان کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں مگر چھپی ہوئی۔ ان کے خاکستر میں چنگاریاں بھی ہیں مگر دبی ہوئی۔

یہ نظم جس میں قوم کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا صحیح صحیح نقشہ کھینچنا مد نظر تھا، اگرچہ مشرق کی عام نظموں کی بہ نسبت مبالغے سے خالی تھی لیکن فروگذاشت سے خالی نہ تھی۔ دوست کی نگاہ نکتہ چینی اور خوردہ گیری میں وہی کام کرتی ہے جو دشمن کی نگاہ کرتی ہے۔ دونوں یکساں عیبوں پر خوردہ گیری اور چشم پوشی کرتے ہیں مگر دشمن اس غرض سے کہ عیب ظاہر ہوں اور خوبیاں مخفی رہیں اور دوست اس خوف سے کہ مبادا خوبیوں کا غرور عیبوں کی اصلاح سے باز رکھے۔ مصنف بھی جو کہ دوستی کا دم بھرتا ہے، شاید محبت اور دل سوزی ہی سے قوم کی عیب جوئی پر مجبور ہوا اور ہنر گستری سے معذور رہا۔ مگر یہ

اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اسی قدر مایوس کرنے والا بھی تھا۔ مصنف کے دل کی آگ بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ میں سرایت کر گئی تھی۔ نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور تمام کوششیں رائگاں نظر آنے لگیں۔ شاید اس خرابی کا تدارک کچھ نہ ہوسکتا اگر قوم کی توجہ مصنف کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا نہ کرتی اور قوم کو ایک نئے خطاب کا مستحق نہ ٹھہراتی۔ گو قوم نہیں بدلی مگر اس کے تیور بدلتے جاتے ہیں۔ پس اگر تحسین کا وقت نہیں آیا تو نفرین ضرور کم ہونی چاہیے۔ بعض احباب کی تحریک نے ان خیالات کی تائید کی اور ایک ضمیمہ مقتضائے حال کے موافق اصل مسدس کے آخر میں لاحق کیا گیا۔ ضمیمے کو طول دینا مصنف کا مقصود نہ تھا لیکن اس مضمون کو چھیڑ کر طول سے بچنا ایسا ہی مشکل تھا جیسے سمندر میں کود کر ہاتھ پاؤں نہ مارنا۔

قدیم مسدس میں جستہ جستہ تصرف کیا گیا ہے۔ شاید بعض تصرفات کو ناظرین اس وجہ سے کہ قدیم اسلوب مانوس ہو گیا تھا، پسند نہ کریں۔ مگر مصنف کا فرض تھا کہ دوستوں کی ضیافت میں کوئی ایسی چیز پیش نہ کرے جو خود اس کے مذاق میں ناگوار معلوم ہو۔ نظم نہ پہلے پسند کے قابل تھی اور نہ اب ہے۔ مگر الحمد للہ کہ درد اور سچ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ امید ہے کہ درد پھیلے گا اور سچ چمکے گا۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم!!

مولانا الطاف حسین حالی

1303ھ مطابق 1886ء

دیباچہ مجموعہ نظم حالی

(مولانا حالی)

1874ء میں جبکہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرایڈ، ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو، وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔ یہ تحریک اگر پندرہ برس پہلے کی جاتی تو شاید اس پر کوئی ثمرہ مترتب نہ ہوتا، کیونکہ جو لوگ ہندوستان میں اردو نظم پر تھوڑی یا بہت قدرت رکھتے تھے وہ عشقیہ مضامین کی ممارست سے شاعری کو عاشقی کا مرادف جانتے تھے اور مبالغے کو شعر کے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ وہ واقعہ نگاری اور تصویر حقائق کو منصب شاعری کے خلاف تصور کرتے تھے۔ انہوں نے مغربی انشا پردازی کا کوئی نمونہ بھی اپنی زبان میں نہیں دیکھا تھا جس پر وہ اپنی شاعری کی بنیاد رکھنے کے قابل ہوتے۔ لیکن یہ تحریک خوش قسمتی سے ایسے وقت ہوئی جبکہ اردو زبان میں مغربی خیالات کی روح پھونکی جا رہی تھی۔ لٹریچر میں بہت سی کتابیں اور مضامین انگریزی سے اردو

میں ترجمہ ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے۔ دیسی اخباروں میں بھی جن میں سے سینٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا اخبار خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل ہے؛ میں انگریزی آرٹکلوں کے ترجمے ہونے لگے تھے۔ ان اسباب سے مغربی طرز تحریر اور مغربی طرز بیان آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ 1872ء میں سرسید احمد خاں نے پرچہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس کے سبب سے اُن مسلمانوں کے خیالات میں جو لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے تھے، بہت جلد ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اُردو فارسی انشا پردازی کا قدیم طریقہ اُن کی نظر میں نہایت سخیف اور سبک معلوم ہونے لگا اور اپنی شاعری کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اگرچہ مغربی شاعری کا کوئی عمدہ نمونہ اس وقت اُردو زبان میں موجود نہ تھا اور نہ اب تک موجود ہے۔ لیکن وہ جو مشہور ہے کہ ''دیوانہ راہوئے بس است'' جدت پسند طبیعتوں پر جس قدر مغربی انشا پردازی کی لے اب تک کھلی تھی، وہی اُن کو لے اڑی۔ بہت سے موزوں طبع اور بعضے کہن مشق بھی جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا تھا، اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔ اگرچہ یہ صحبت مدت تک جمی رہی لیکن راقم صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ بہ سبب ناموافقت آب و ہوا کے لاہور سے تبدیل ہو کر دہلی چلا آیا۔ مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اُس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی ناکمل زبان میں جیسی کہ اردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغے سے اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عاید ہو۔

چار مثنویاں جو اس مجموعے میں سب سے اوّل درج کی گئی ہیں یعنی برکھا رت،

نشاط اُمید، حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف، اسی مشاعرے کی نظمیں ہیں جو مشاعروں کی ترتیب کے موافق اس کتاب میں داخل کی گئی ہیں۔ ان کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو مشاعرہ مذکور سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ محض یہ تقاضائے وقت و مقتضائے طبیعت یا بہ تحریک بعض اکابر قوم وقتاً بعد وقتٍ وحیناً بعد حین ترتیب پا کر ان میں سے چند عام طور پر شائع ہوگئی ہیں، اور چند بالکل شائع نہیں ہوئیں اور کچھ اخباروں وغیرہ کے ذریعے سے بعض احباب پبلک کی نذر کی ہیں۔

میرے اکثر دوست مدت سے متقاضی تھے کہ تمام ہفوات ایک جگہ جمع کر کے نکتہ نواز دوستوں سے داد اور نکتہ گیر یاروں سے اپنے کلام کی اصلاح میں امداد لوں۔ لیکن جو نظمیں عام طور پر شائع ہو رہی ہیں جیسے مدو جزر اسلام، مناجات بیوہ، حقوق اولاد، شکوۂ ہند وغیرہ کو اس مجموعے میں داخل کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی اور دیوان غزلیات و قطعات و رباعیات وغیرہ میں ابھی کچھ اور بڑھانا باقی ہے، اس لیے ان کو چھوڑ کر باقی اکثر نظمیں جو 1874ء سے اب تک لکھی گئی ہیں، سب ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں۔

میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے، معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعے میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہیں وہ سکا اور اُن صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں، اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اُردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے۔ اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آیندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے، جن سے اُمید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔

پارۂ در خاک معنی تخم سعی افشاندہ ام
بو کہ بعد از ماشود ایں تخم نخل بار دار

دیباچہ

ضمیمہ اردو کلیات نظم حالیؔ

(مولانا حالیؔ)

تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک ہندوستان کے مسلمان بالطبع فارسی زبان میں نظم و نثر لکھنے اور خط و کتابت کرنے کے عادی تھے۔ جس شخص کو ادب سے مناسبت ہوتی تھی وہ اکثر فارسی زبان کی شاعری اور انشا پردازی میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ اس کا سبب کچھ تو اسلاف کے طریقے کی پیروی کا خیال ہوتا تھا جو عموماً فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے تھے اور کچھ یہ وجہ تھی کہ اُردو جو اُن کی مادری زبان تھی زیادہ تر بول چال میں اور کسی قدر شعر و سخن میں محدود تھی اور ہر شخص کا یہ کام نہ تھا کہ پہلے ہی پہل شارع عام کے خلاف ہر قسم کی تحریروں میں اُردو زبان کو استعمال کر سکے۔ بڑے بڑے ذی علم اور لائق اصحاب اُردو زبان میں خط و کتابت کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ چنانچہ اُردو زبان کے قواعد تک فارسی ہی میں لکھے گئے اور اُردو کے شاعروں کا تذکرہ بھی فارسی ہی میں قلم بند کیا گیا۔

ایک اور وجہ اُردو زبان کا رواج نہ ہونے کی یہ تھی کہ اہل علم اور لائق اشخاص اُردو میں تصنیف و تالیف یا خط و کتابت کرنے کو اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ مذہبی اور

علمی کتابیں اکثر عربی زبان میں اور کبھی کبھی فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ زمانے کے انقلاب سے وہ میلان کم ہونا شروع ہوا اور آخر کار یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ دونوں زبانوں میں تصنیف و تالیف کرنا یا نظم و نثر لکھنا موقوف ہی نہیں ہوا بلکہ بمقابلہ اُردو زبان کے محض فضول سمجھا جانے لگا۔ عربی علم ادب تو بہت دن پہلے سے ملک سے رخصت ہو چکا تھا مگر غالب مرحوم اور اُن کے معاصرین کے بعد فارسی شاعری اور انشا پردازی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

مذکورۂ بالا انقلاب سے تقریباً سولہ سترہ برس پہلے راقم کو فارسی نظم و نثر لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا لیکن ایک عرصے تک وہ خیال میلان طبع کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ حسن اتفاق سے 1863ء میں میرا تعلق جناب غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم و مغفور، رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی سرکار میں، جو کہ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، ہو گیا اور اس تعلق کی وجہ سے تقریباً آٹھ نو برس ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ جناب ممدوح کا قیام 1857ء کے بعد سے جہانگیر آباد میں رہنے لگا تھا، جہاں مخاطب صحیح کم یاب تھا، اس لیے وہ فکر شعر کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ لیکن جب راقم وہاں رہنے لگا تو رفتہ رفتہ جناب ممدوح کا شوق از سر نو تازہ ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت تک مجھ کو فارسی یا اُردو میں فکر شعر کرنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا، مگر جناب ممدوح کو ادھر متوجہ دیکھ کر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی۔

فارسی یا اُردو کی جس زمین میں وہ غزل لکھتے، مجھے بھی اپنے ساتھ شریک فرماتے۔ انھی دنوں میں تنہائی اور قلت مشاغل کے سبب عربی ادب کی ہوس دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اگرچہ علم ادب کسی اُستاد سے باقاعدہ پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اور نہ کسی ادیب سے صلاح لینے کا موقع ملا تھا، مگر چونکہ لٹریچر سے فی الجملہ مناسبت تھی، کبھی کبھی

146

ڈکشنریوں کی مدد سے ادب کی آسان آسان کتابیں دیکھنے لگا۔ شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ عربی نظم و نثر پر خودرو مبتدیوں کی طرح ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہوئی۔ غرض کہ فارسی اور اُردو کے ساتھ عربی نظم و نثر میں بھی حیناً فَحِیناً خامہ فرسائی کرتا رہا۔ آخر وہ زمانہ آپہنچا کہ فارسی اور عربی کے مخاطب صحیح ملک میں نایاب ہو گئے اور دونوں زبانیں ہندوستان کی مردہ زبانوں میں شامل ہونے کے قابل ہوگئیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جو نظم یا نثر لکھی جاتی ہے، گو کہ وہ کیسی ہی بے عیب ہو، اہلِ زبان کی نظر میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی، الا ماشاء اللہ۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اہلِ وطن کے نزدیک قبولیت کا درجہ حاصل کر لے۔ لیکن جب اہلِ وطن کسی ملکی انقلاب کے سبب اُس غیر زبان سے بے گانہ محض ہو جائیں اور اس کی جگہ ملک میں دوسری زبان قائم ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کی شاعری اور انشا پردازی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جاتا ہے۔

یہی حال آج کل ہندوستان میں فارسی اور عربی لٹریچر کا ہے۔ دونوں زبانوں کی نظم و نثر کے مسودے جو کبھی کبھی کے لکھے ہوئے پڑے تھے، اُن کی نسبت متردد تھا کہ اُن کو کیا کیا جائے۔ قوم میں کوئی ایسی محفوظ لائبریری نظر نہ آتی تھی جہاں افرادِ قوم کے ورکس (Works) اچھے یا برے، احتیاط کے ساتھ رکھے جائیں۔ پھر اہلِ وطن کا ان دونوں زبانوں سے عموماً ناآشنا ہونا اپنے اس قدیم شعر کا مضمون یاد دلاتا ہے:

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

لیکن مذکورہ بالا مسودات، کچھ تو اس وجہ سے کہ بڑی کاوش سے لکھے گئے تھے، اور زیادہ تر اس خیال سے کہ قومی خصوصیات کی یادگار تھے، ان کو رائیگاں کھونا گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ تمام پرچے جس قدر بہم پہنچ سکے ادھر اُدھر سے فراہم کیے گئے اور ذیل کی

ترتیب کے ساتھ اس مجموعے میں جو ''کلیات نظم'' اُردو کے آخر میں بہ طور ضمیمے کے ملحق کیا جائے گا، داخل کر دیے گئے۔ یعنی اوّل نظم فارسی، اس کے بعد نثر فارسی، پھر نظم عربی، اُس کے بعد نثر عربی۔

یہ ضمیمہ اگرچہ کم و بیش فارسی اور عربی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر مشتمل ہے، مگر عربی کلام اس قدر قلیل ہے کہ اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر اس میں ایک قصیدہ حضرت مولانا و مقتدانا شاہ عبدالغنی النقشبندی المجد دی قدس سرہ کی شان میں نہ ہوتا، جو تقریباً 1283 ہجری (1866ء۔ مرتب) میں مدینہ منورہ بھیجا گیا تھا اور جس کی نسبت جناب ممدوح نے بعض ادبائے مدینہ کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا، تو راقم کو ہرگز یہ جرأت نہ ہوتی کہ اپنا عربی کلام اس ضمیمے میں داخل کرنے کی مبادرت کرتا۔

از مقام: پانی پت حالیؔ

io

مولانا حالؔی کی حیات اور شخصیت

نام:

خواجہ الطاف حسین

تخلص:

حالؔی۔ (بعض افراد نے لکھا کہ آغاز شاعری میں حالؔی خستہ تخلص کرتے تھے جو صحیح نہیں)

تاریخ ولادت:

بقول حالؔی ''میری ولادت تقریباً 1253ھ مطابق 1837ء میں ہوئی۔''
(1253 ہجری سال اپریل 1837ء سے شروع ہوتا ہے۔ چناں چہ حالؔی اپریل اور دسمبر 1837ء کے درمیان پیدا ہوئے)۔

نوٹ:...... تذکرۂ حالی میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالؔی کی تاریخ ولادت 1253ھ مطابق 1836ء لکھی ہے جو صحیح نہیں۔

مقام ولادت:

پانی پت ضلع کرنال

والد:

خواجہ ایزد بخش متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ انگریز سرکار کے پرمٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے اس وقت حالؔی صرف نو سال کے تھے۔

والدہ:

حالؔی بچپن ہی سے والدہ کی توجہ تربیت اور محبت سے محروم رہے حالؔی کی ولادت کے فوری بعد ان کی والدہ کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا چناں چہ ان کی تربیت اور پرورش ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے کی۔

دادا:

خواجہ بوعلی بخش

پردادا:

خواجہ محمد بخش

جد:

خواجہ ملک علی جو ہرات کے بادشاہ میرک علی کے بیٹے تھے اور غیاث الدین

بلبن کے دورِ حکومت میں ہندوستان آئے۔ بلبن نے ان کے علم وفضل وکمال سے متاثر ہوکر کرنال کے قصبہ پانی پت میں جاگیر عطا کی اور یہ خاندان 1276 ہجری سے پانی پت میں مقیم ہوگیا۔

خاندان:

حالیؔ کا شجرہ دادھیال سے بیالیسویں پشت میں حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہے اور نانھیال سے چھتیسویں پشت میں حضور اکرمa سے جاملتا ہے اسی بنا پر صالحہ عابد حسین نے لکھا کہ حالی کی ماں سیدانی تھی۔ حالیؔ لکھتے ہیں میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں؛ بیٹی تھیں۔

بھائی بہن:

حالیؔ کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بڑی بہنیں امتہ الحسین اور وجیہ النساء تھیں۔ چونکہ حالی سب سے چھوٹے تھے اور ان کی ماں ذہنی توازن کھو چکی تھیں اس لیے بڑے بھائی اور دونوں بڑی بہنوں نے حالی کی تربیت اور دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی۔ بقول حالیؔ: ''میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا۔ میرے والد نے انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا۔''

تعلیم:

(ا) بقول حالیؔ: ''میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انہوں نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔''

صالحہ عابد حسین ''یادگار حالی'' میں لکھتی ہیں: ''پرانے زمانے کے دستور کے

موافق ساڑھے چار سال کی عمر میں الطاف حسین کی بسم اللہ ہوئی۔ الطاف حسین کو پانی پت کے ایک جید قاری حافظ ممتاز حسین کے پاس قرآن شریف کی تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ اُن کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا چناں چہ انھوں نے جلد ہی قرآن شریف حفظ کر لیا۔ وہ بچپن سے قرآن شریف اس قدر خوش الحانی اور صحت کے ساتھ پڑھتے کہ بڑے بڑے قاری اور عالم تعریف کرتے تھے۔

(ب) سید جعفر علی سے جو مومن دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے حالؔی نے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے دلچسپی ہو گئی۔ یہ انہی کی صحبت کا اثر تھا کہ حالؔی کے مزاج میں جو فطری شاعری کی اپج تھی اُسے ابھرنے کا موقع بھی ملا۔

(ج) حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی صرف ونحو پڑھی جو لکھنو سے تحصیل علم کے بعد پانی پت میں مقیم تھے۔

(د) دلی پہنچ کر جامع مسجد کے قریب حسین بخش کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور مولوی نوازش علی سے کچھ کتابیں صرف ونحو اور منطق کی پڑھیں۔
دلی ہی میں شرح مسلم، ملا حسن اور میبذی پڑھنا شروع کیا۔

(ہ) دلی میں ڈیڑھ سال رہ کر پانی پت واپس ہوئے اور مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی سے بغیر کسی خاص ترتیب اور نظام کے منطق، فلسفہ کبھی حدیث اور تفسیر پڑھتے رہے۔ حالی لکھتے ہیں: ''بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر (17) برس کی تھی۔ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں

نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس وہاں رہ کر عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار نا چار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ 1856ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن 1858ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا تو میں پانی پت واپس چلا آیا اور قریب چار برس کے بے کاری کی حالت میں گزرے۔ یہاں علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم ونثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔

دلی کالج سے بے زاری:

جس وقت حالی دلی گئے اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا لیکن اس ڈیڑھ سال کی مدت میں حالی نے کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ کالج کے طلبا سے ملاقات کی جن میں محمد حسین آزاد، ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال ڈپٹی نظیر احمد اور ذکاء اللہ وغیرہ جیسے طالب علم موجود تھے جس کی وجہ سے حالی کا پانی پت کا ماحول اور ان کی محدود سوسائٹی تھی جہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر ہی منحصر سمجھا جاتا تھا۔

انگریزی تعلیم کو صرف سرکاری نوکری کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اسی لیے یہ افراد انگریزی مدرسوں کو جاہلوں کے مدرسے یا مجہلے کہتے تھے۔

تلاش علم:

صالحہ عابد حسین کہتی ہیں:

''حالی کی شادی تو ہو گئی مگر علم کی پیاس کم نہیں ہوئی۔ بیوی خوش حال گھرانے کی تھیں۔ الطاف حسین نے اُس کو غنیمت جانا کہ ابھی بیوی کا بار ان کے اوپر نہیں۔ اس فرصت سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ دلی جا کر جو اس اجڑی حالت میں علوم وفنون کا مرکز تھی؛ تحصیل علم کریں۔ دلی اگرچہ پانی پت سے صرف پچپن میل ہی ہے۔ ریل اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی۔ اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی پر یا پیدل سفر کرنا ہوتا تھا۔ الطاف حسین جانتے تھے انہیں دلی جانے کی اجازت نہ ملے گی۔ ایک دن جب ان کی بیوی میکے گئی ہوئی تھیں وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے اور بغیر کسی سامان کے پا پیادہ دلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاید راستے میں اونٹ گاڑی اور بیل گاڑی میں کچھ مسافت طے کی ہو۔ علم کا یہ سچا شیدائی جب دلی پہنچا تو بالکل خالی ہاتھ تھا خدا ہی جانے یہ کٹھن زمانہ کس طرح کاٹا۔ کیسے گزر بسر کے قابل پیسہ کمایا۔ اُس زمانے کا مفصل حال کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔''

راقم کی نظر میں سچ بات یہ بھی ہے کہ ہم صرف سکّے کے ایک رخ یعنی علم کی طلب اور اس کے حاصل کرنے کی قربانیوں کو دیکھ رہے ہیں لیکن سکّے کے دوسرے رخ پر ایک تازہ شادی شدہ دلہن کے احساسات جذبات اور دنیا بھر کے تشویش ناک خیالات کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جائے؟ اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ حالی اپنے اس

عمل سے شرمندہ تھے جس کا نتیجہ ان کی تخلیقات میں آگے چل کر عورتوں کی کسمپرسی اور حقوق پر بیوہ کی مناجات اور چپ کی داد جیسی نظمیں اور ساری عمر اپنی بیوی کی تعریف اور توقیر رہی ہو۔

شریکِ حیات:

بقول حالیؔ:

''بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا اس وقت میری عمر سترہ (17) برس کی تھی۔''

خواجہ امداد حسین نے ماموں کی بیٹی اسلام النساء سے شادی کر دی۔ صالحہ عابد حسین نے جو خود حالیؔ کے خاندان کی فرد ہیں خاندان کے بزرگوں کے بیانات اور خواجہ غلام السطین مرحوم کی غیر مطبوعہ ڈائری کے حوالے سے حالی اور ان کی بیوی کے حالات یادگار حالی میں جمع کیے ہیں۔ ہم کچھ مستند واقعات کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے میاں بیوی کے تعلقات کے علاوہ دونوں کے حسن اخلاق پر روشنی پڑتی ہے اور انہی واقعات سے حالیؔ کے معاملات کی صفائی بھی ہو جاتی ہے کیوں کہ حالی حقوق نسواں کے حامی تھے اور یہ حمایت گھر سے شروع ہوتی ہے۔

بی اسلام النساء بڑی باسلیقہ، منظم، ہمدرد، فیاض اور خدمت گزار خاتون تھیں۔ تقریباً نصف صدی کی مشترک زندگی میں حالیؔ کی اور اُن کی کبھی اَن بن نہیں ہوئی۔ انہوں نے کبھی اپنے شوہر کی علمی اور قومی زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ البتہ وہ بڑے تیز مزاج کی تھیں اور جب غصہ آتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتی تھیں لیکن پھر بڑی جلدی پشیمان بھی ہو جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے حالی کا مزاج اتنا ہی نرم واقع ہوا تھا۔ اس لیے کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

واقعہ:

خواجہ غلام السبطین مرحوم نے اپنی (غیر مطبوعہ) ڈائری میں اسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ محرم کی نو تاریخ کو حالی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور اپنے سالے میر فیاض حسین کے ساتھ کہیں تانگے میں بیٹھ کر گئے۔ بیوی کو حالی کی یہ بات سخت ناگوار گزری (واضح رہے کہ حالی سنی تھے اور بیوی شیعہ اور اس خاندان میں انتہائی رواداری تھی اور اس قسم کی شادیاں بلا تامل ہوتی تھیں) اتفاق سے تانگا الٹ گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو سیدانی کا جلال انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے میاں، بیٹے اور بھائی کو دل کھول کر برا بھلا کہا کہ نبیa کے نواسے پر تو قیامت کا وقت پڑ رہا ہے، اُن کے بچے بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم سواریوں میں بیٹھے سیر کر رہے ہو۔ اچھا ہوا تانگا الٹ گیا وغیرہ وغیرہ۔ میر فیاض حسین اور خواجہ سجاد حسین کو یہ بات ناگوار گزری کہ مولانا کو ایسی سخت باتیں کہی جائیں لیکن فرشتہ منش حالی نے صرف اتنا کہا: ''سیدانی غصے میں ہے اور حق پر۔ غلطی ہماری ہی تھی کہ آج کے دن سواری پر بیٹھے، وہ جو کہتی ہیں بجا ہے۔''

خواجہ سجاد حسین کی بیوی، اُن کے ماموں کی بیٹی تھیں اور وہ بھی اپنی پھوپی اور باپ کی طرح تیز مزاج تھیں اور ساس بہو میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ حالی اوپر کے کمرے میں بیٹھے لکھتے ہوتے اور یہ ساری باتیں سنتے مگر ایک لفظ نہ بولتے۔ بیوی کا بہت خیال کرتے تھے اور بہو کو بھی بہت چاہتے تھے، اکثر ان ہی جھگڑوں میں شام ہو جاتی تو وہ اپنا کام ختم کر کے اٹھتے اور کمرے کی کھڑکی کھول کر مسکراتے ہوئے شیریں لہجے میں جھک کر کہتے۔ ''بس بی بس...... اب تو شام بھی ہو گئی۔ اب تو لڑائی تغاری (مٹی کا کونڈا جسے پانی پت میں تغاری کہتے تھے) کے نیچے دبا دو۔ اس وقت تو

بھٹیاریاں بھی نہیں لڑتیں۔"

کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی ازدواجی زندگی کامیاب تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے اور اپنے اپنے فرائض پوری ذمے داری سے ادا کرتے تھے۔ دونوں کی زندگی کے دھارے الگ الگ تھے لیکن کہیں نہ کہیں آ کر مل بھی جاتے تھے۔

بی اسلام النساء کبھی اپنے شوہر کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ وہ جہاں چاہیں رہیں جو چاہیں کریں وہ دخل نہ دیتی تھیں اور گھر کی ساری فکریں اور پریشانیاں، ساری ذمہ داریاں بھی، جس حد تک پرانے زمانے کی کوئی عورت اٹھا سکتی تھی، نہایت خوش اسلوبی سے اٹھاتی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے حقوق سے جو بھر دستبردار نہ ہوتی تھیں اور اگر شوہر کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو اس کے اظہار میں ذرا سا تامل نہ کرتیں۔

شادی بیاہ، نسبت ناتے اور ہر قسم کے اہم کام جو اولاد اور اولاد کی اولاد سے متعلق ہوتے، اُن میں حالی کی رائے سے زیادہ ان کی بیوی کی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ حالی کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ سارے کا سارا بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیتے اور پھر اس کے بارے میں الٹ کر نہیں پوچھتے تھے۔ ان کے ذاتی خرچ کے لیے زیادہ تر خواجہ سجاد حسین اُن کو کچھ روپے بھیج دیتے تھے۔

حالی نجی خطوں میں اکثر اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ان کا کس قدر پاس تھا بیٹوں، بھتیجوں، پوتیوں وغیرہ کو ان کی طرف سے خاص طور پر سلام و پیام، دعا پیار اور اُن کی صحت کا حال لکھتے اور اُن کو باقاعدہ خط لکھتے رہنے کی تاکید کرتے۔ ہر خط میں کسی نہ کسی طرح اُن کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اُن کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے بدلے میں حالی اور خواجہ سجاد حسین ایک دکان لینا چاہتے تھے۔ مگر یہ

تجویز مولانا کی بیوی کو پسند نہ تھی۔ اس بارے میں انہوں نے کئی خطوں میں بیٹے کو لکھا کہ بغیر ان کی مرضی کے دکان نہیں لینی چاہیے۔ ''اگرچہ مناسب تو یہی تھا مگر مستورات کی بغیر مرضی کے تبادلہ نہیں ہوسکتا، خصوصاً تمہاری والدہ اس کے بہت خلاف ہیں۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''تمہاری والدہ اب اچھی ہیں اور کمزوری کے باوجود گھر کا سارا کام کاج کیے جاتی ہیں۔''

تمہاری والدہ نے باوجود کمزوری کے سب روزے رکھے اور باوجود اس کے سارا کام اگلے اور پچھلے کو خود کرتی رہیں۔ 1900ء میں بی اسلام النساء کا ہیضے سے انتقال ہوگیا۔ اُن کے انتقال پر مولانا حالؔی نے خواجہ سجاد حسین کو جو اطلاعی اور تعزیتی خط لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی بیوی کی کتنی قدر تھی۔

''پرسوں تمہاری والدہ کو دس بجے رات کے اس کا (ہیضے کا) اثر ہوا اور کل نو بجے رات انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ اگرچہ اس حادثہ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں اور متعلقوں اور ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے، اُس کا بیان کرنا مشکل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہوگا۔ مگر میری جان! والدین کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ تمہاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اُس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے سعادت مند اولاد چھوڑی ہے اور ان کو بفضلہٖ تعالیٰ اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ ایک زمانے کو اپنا مداح اور ثنا خوان اور شکر گزار چھوڑا ہے۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی نیکیوں کی تمام عشیرہ میں ایک عمدہ مثال تھیں۔ انہوں نے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی خدمت گزاری سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا۔ آخر وقت میں جب تک اُن کو ہوش رہا برابر خدا کی یاد اُن کے وِردِ زبان رہی۔ جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت ہو اُس سے زیادہ کون خوش نصیب ہوسکتا ہے۔''

حالیؔ کا ضبط دیکھیے کہ ذکر محض مرحومہ کی خوبیوں کا ہے۔ اپنے رنج وغم کے بارے میں ایک حرف نہیں۔ پھر بھی اُس کے ایک ایک لفظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حالیؔ کی بی بی کیسی اعلیٰ سیرت کی مالک تھیں اور حالیؔ کے دل میں اُن کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ حالیؔ کو بیٹوں کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں سخت رنجیدہ ہیں تو کس طرح صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ''تم کو چاہیے کہ اپنی والدہ کی محبت اور خوبیوں کو بہت مت یاد کیا کرو اور اس دعا کا وِرد رکھو۔ ''الٰہی مجھے اپنی محبت اپنی جان سے اور اپنے کنبے سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ دے۔'' خدا ہم سب کو اپنی محبت عنایت کرے کہ یہی ہر ایک رنج وغم کا بہترین علاج ہے۔''

اولادیں:

حالیؔ کے یہاں چھے بچے پیدا ہوئے۔ تین بچے جن میں اعتقاد حسین اور رقیہ بیگم شامل تھیں بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی زندہ رہے۔

(ا) خواجہ اخلاق حسین، پیدائش قبل از: 1857ء۔ وفات: 2/فروری 1924ء

(ب) عنایت فاطمہ، پیدائش: 1859ء۔ وفات: 1915ء

(ج) خواجہ سجاد حسین، پیدائش: 1861ء۔ وفات: جولائی 1946ء

خواجہ اخلاق حسین کو حالیؔ کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے گود لے لیا تھا اسی لیے حالیؔ ان کو برادرزادہ کہتے تھے۔ خواجہ اخلاق حسین کی چار اولادیں تھیں۔ بڑی بیٹی مشتاق فاطمہ تھیں جن کی شادی خواجہ غلام الثقلین سے ہوئی۔ اُردو ادب کے مایہ ناز ادیب خواجہ غلام السیدین اور معروف ادیبہ صالحہ عابد حسین ان ہی کی اولاد تھے۔ دو بیٹے خواجہ احتاق حسین، خواجہ اکرام حسین اور چھوٹی بیٹی صدیقہ النساء اخلاق حسین کی آخری اولاد تھی۔

خواجہ اخلاق حسین کی اولاد نے اُردو شعر و ادب کی شمع جلائی رکھی ہے اور اس کی روشنی آج بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ محترمہ سیدہ سیدین اور پروفیسر صغریٰ مہدی کا تعلق اسی خاندان سے ہے حالی کی بیٹی عنایت فاطمہ کی شادی خواجہ عبدالعلی سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹے خواجہ فرزند علی اور خواجہ عبدالولی اور ایک بیٹی سعیدہ بیگم تھیں۔

حالی کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی اپنی گھریلو زندگی سے پریشان رہتے تھے جس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ان کے داماد خواجہ عبدالعلی کچھ محنتی آدمی نہ تھے وہ ہمیشہ مختلف شہروں میں معمولی جگہ پر ملازم تھے اور اپنی بیوی بچوں سے لاپروا اور بیگانہ تھے اور ان کے خاندان کا سارا بوجھ حالی پر تھا۔ دوسری اہم وجہ حالی کے نواسے عبدالولی کو مرگی کی بیماری تھی جس نے حالی کا سکون چھین لیا تھا۔ حالی کی حالت ان کے ایک خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے اپنے شاگرد عبدالرحیم خاں بیدل کو لکھا تھا۔ ''عبدالولی جس کے علاج کو دہلی گیا تھا اس کے صرع کے دورے تو رک گئے مگر جنون بڑھتا جاتا ہے میرا ناک میں دم ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ زندگی وبال ہوگئی ہے۔ یہ یقین ہوگیا ہے کہ زیست کے برس دو برس جو باقی ہیں بہت بری طرح سے گزریں گے۔''

حالی ذہنی اور مالی طور پر بہت پریشان تھے اور آخری عمر میں کسی سکون کے مقام کی تلاش میں تھے تاکہ اپنی نظم اور نثر کی تحریروں کو ترتیب دے سکیں لیکن انہیں اس کی فرصت نہ تھی۔ حالی نے اپنے نواسے کی بیماری پر ہزاروں روپیہ صرف کیا لیکن افاقہ نہ ہوا نواسے کا مزاج جنون کی کیفیت اختیار کرتا گیا اور بعض اوقات وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ چناں چہ ایک مرتبہ خواجہ عبدالولی نے مولانا سے گستاخی کی اور انہیں شدید دھکا دیا جس سے مولانا گر پڑے۔ خواجہ سجاد حسین اُس وقت موجود تھے اُن کا مزاج بڑا حلیم تھا لیکن وہ کسی کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھانجے کو ڈانٹا

اور ایک طمانچا بھی مارا۔ حالی کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور جب تک خواجہ سجاد حسین نے بھانجے کو منا نہیں لیا حالی نے اپنے لائق بیٹے سے بات چیت نہیں کی۔ وہ اس بیماری کے مارے غم زدہ نوجوان کی ذرا سی دل آزاری کبھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

حالی کے دوسرے نواسے خواجہ فرزند علی نے حالی کی تصانیف کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ چناں چہ حالی کی تصنیف مولود شریف کی پشت پر خواجہ فرزند علی کی حسب ذیل تحریر ہے: ''ایک عرصے سے پانی پت میں ایک مطبع جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا حالی کی زندگی میں ان کے دوست جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم نے ایک مطبع اس نام کا جاری کیا تھا جو چند سال نہایت مفید کام کرنے کے بعد بند ہو گیا۔ اب میں نے اپنے نانا صاحب (مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی) مرحوم و مغفور کی یادگار میں ایک نیا مطبع بنام حالی پریس جاری کیا ہے اس کا مقدم مقصد یہ ہے کہ مولانا حالی مرحوم کی تمام تصانیف ایک سلسلے کی صورت میں اور ایک تقطیع پر چھپوائی جائیں اور ان کی تصحیح کا پورا اہتمام کیا جائے۔''

حالی کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کا شمار اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے تعلیم یافتوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ اسکولوں کے انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ خواجہ سجاد حسین کی کاوشوں سے بہت سے اہم مسودے حالی کی تصانیف کے محفوظ ہو گئے اور شائع ہو کر عوام کی دسترس میں آئے۔

حالی اور فیملی:

حالی صحیح معنی میں کنبہ پرور تھے۔ وہ صرف اپنے بیمار نواسے کی بیماری سے متفکر نہ تھے بلکہ اپنے دوسرے نواسوں، نواسیوں، پوتوں اور پوتیوں سے بھی پوری طرح پیار و محبت کرتے تھے اور انہیں تمام لڑکوں اور لڑکیوں کی صحت، تعلیم اور جذبات کا

خیال رہتا ذیل کے چند واقعات ہماری بات کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

☆ حالیؔ ہمیشہ لڑکوں اور بچوں کے خط کا جواب اُسی پابندی سے دیتے جیسے بڑے آدمیوں کے خطوں کا۔ اُن کا طرزِ تحریر یوں بھی سادہ، شستہ اور آسان ہے لیکن عورتوں اور بچوں کو جب خط لکھتے تو خاص طور پر وہ لہجہ اور زبان استعمال کرتے تھے جس کو وہ اچھی طرح سمجھ سکیں اور ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتے تھے کہ بہت خوش خط اور صاف صاف لکھیں تاکہ انہیں پڑھنے میں آسانی ہو۔

خواجہ فرزند علی کو لکھتے ہیں: ''میری جان اب کے لکھنے پڑھنے میں ایسی کوشش کرو کہ امتحان کے موقع پر پورا پورا اطمینان رہے۔''

☆ خواجہ فرزند علی مولانا کے بڑے نواسے کھیل کود کے بڑے شوقین تھے۔ اسکول کی بندشوں سے گھبراتے اور کتابی تعلیم سے بھاگتے تھے۔ مولانا کو اُن کی تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی اور وہ ہر طرح اس کی کوشش کرتے تھے کہ اُن کا دل لکھنے پڑھنے میں لگے۔ خواجہ سجاد حسین اور خواجہ تصدق حسین کے نام سینکڑوں خطوں میں ان کا ذکر ہے۔ مولانا حالیؔ نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اعلیٰ تعلیم پائیں آخر اس کی طرف اُن کی توجہ نہ دیکھ کر انہیں ایف۔ اے کے بعد انجینئرنگ میں بھیج دیا تھا جہاں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ خواجہ فرزند علی مرحوم بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ: ''دیکھو مولانا حالیؔ کو مجھ سے کتنی محبت اور میرا کتنا خیال تھا کہ تقریباً ہر خط میں میرا ذکر موجود ہے۔''

☆ مولانا حالیؔ کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین ایک صوفی منش بزرگ تھے اور وہ بھی خاندانی معاملات اور بچوں کی تعلیم وغیرہ کی کچھ زیادہ فکر نہ کرتے تھے۔ اس لیے اُن کے دونوں بیٹوں خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ اکرم حسین

کی تعلیم وتربیت کی ساری ذمہ داری بھی مولانا حالؔی ہی پر تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''حقن (احقاق حسین) انگریزی میں تو چل نکلا ہے۔ مگر حساب میں ابھی تک صفر ہے۔ ابھی دھیان اور توجہ لکھنے پڑھنے میں پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن خصلتیں عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اطاعت اور حکم برداری مزاج میں بہت ہے، کاہل نہیں ہے اور روز بروز قریب ہوتا جاتا ہے، گھر جانے کا کبھی نام نہیں لیتا۔ جس بات کو منع کرو پھر نہیں کرتا...... اگر اس کے دل میں کچھ شوق اور توجہ پیدا ہو جائے تو اسے علی گڑھ ظہور حسین وارڈ میں داخل کر دیا جائے۔''

☆ رشتے کے ایک پوتے کے فیل ہونے کی خبر سنی تو بہت افسوس ہوا۔ اُن کے والد کو خط لکھا جس میں اظہار افسوس کے ساتھ ہی کس دل سوزی سے لکھتے ہیں: ''طالب علم کتنا ہی بدشوق ہو مگر فیل ہونے کا رنج وملال سب کو یکساں ہوتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس کی دلجوئی کرنا چاہیے اور ملامت ونفرین سے احتراز کرنا چاہیے...... کہہ دینا رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت استقلال سے پھر کوشش کرو۔ ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہو گے۔''

☆ خواجہ غلام السیدین اُن کی پوتی کے بڑے بیٹے ہیں۔ اس لیے خاندان بھر کے لاڈلے تھے۔ جب ماں اپنے دادا کے ہاں جاتیں تو نیچے کے مکان میں دادی کے پاس ٹھہرا کرتی تھیں۔ اوپر دیوان خانے میں مولانا حالؔی رہتے تھے۔ سیدین مولانا سے بہت مانوس تھے۔ جب وہ نیچے سے اوپر چلے جاتے تو یہ نیچے سے پکارتے ''بابا'' اور مولانا آواز سن کر نیچے اترتے، بچے کو پیار کرتے اور پھر اوپر چلے جاتے۔ سیدین پھر پکارتے ''بابا'' اور وہ پھر اسی طرح نیچے آتے پیار کرتے اور چلے جاتے۔ بچوں کو تو کسی بات کی تکرار میں

مزہ آتا ہے۔ والدہ مرحومہ سنایا کرتی تھیں کہ سیدین جتنی مرتبہ انہیں ''بابا'' کہہ کر بلاتا وہ اس ضعیفی کے عالم میں ہر مرتبہ نیچے اُتر کر آتے اور اُسے پیار کرتے تھے۔

☆ سیدین صاحب کی چھوٹی بہن سیدہ خاتون (مرحومہ) بڑی پیاری، بھولی اور ذہین بچی تھی اور مولانا حالیؔ اس بچی کو بے حد چاہتے تھے۔ انہوں نے سیدہ خاتون پر ایک چالیس بیت کی نظم بھی لکھی ہے۔ جو علاوہ ذاتی لحاظ سے دلچسپ ہونے کے اُن کے مشاہدے کی باریکی پر بھی روشنی ڈالتی ہے:

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے — صورت اچھی، سمجھ بھی اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان — پر ہے اچھے بُرے کی سب پہچان

اس نظم کو پڑھ کر جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچی سے مولانا کو کس قدر لگاؤ تھا۔ وہاں یہ اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بچوں کی طبیعت اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے تھے:

جھوٹ موٹ اُس کو گر ڈراتے ہیں — بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں
کچے پن سے یقین نہیں کرتی — دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

اور

اوپری شکل سے ہے گھبراتی — ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی

اوپر تلے کے بھائی بہن میں جو مزیدار لاگ ہوتی ہے۔ اُس کا ذکر دیکھیے:

پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اُس کو — کیوں کہ اُوپر تلے کے ہیں دونوں
پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا — اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹی ہے دوڑ کر ماں سے — بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے

اور کس پیار بھرے انداز میں بچی کی توتلی زبان کی تعریف کرتے ہیں:

یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زبان | جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوغاں
پھر تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار | ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول | بولتی ہے سدا ادھورے بول
لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب | زرگری اپنی بولتی ہے جب

اس پوری نظم کو پڑھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بچوں کی سیدھی سادی پیاری زبان میں اُن سے باتیں کر رہا ہے۔

☆ حالیؔ بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اگر چہ وہ خاندانی رشتہ دار ہو یا ہمسایہ یا بیگانہ یہ فرشتہ صفت انسان کے درجنوں واقعات آج ایک صدی سے زیادہ وقت گزرنے پر بھی دل کو تڑپا دیتے ہیں اور ان کے اخلاق کا کلمہ پڑھوا دیتے ہیں۔
پانی پت میں ایک مرتبہ حالیؔ کسی جگہ سے تانگے میں بیٹھے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا نالی میں گرا پڑا ہے اور کیچڑ اور گندگی میں لت پت پڑا اچلا رہا ہے۔ آس پاس بہت سے آدمی جمع کھڑے دیکھ رہے تھے اور رام رام کر رہے تھے مگر کوئی اُسے اٹھاتا نہیں۔ مولانا نے فوراً اپنا تانگا ٹھہرایا۔ پاس گئے بڑی آہستگی سے اُسے نالی میں سے نکالا۔ اپنے ہاتھ سے اُس کے کپڑے اتارے اور اس کے ماں باپ کا پتا پوچھ کر خود وہاں چھوڑ کر آئے۔ چلتے ہوئے لوگوں سے کہا: ''جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اُسی رام کا جلوہ اس ننھے بچے میں آپ کو نظر آ سکتا تھا۔'' یہ ایک جملہ ایک کتاب پر بھاری ہے۔

اخلاق و کردار:

یہ سچ ہے کہ حالیؔ کے اخلاق اور کردار کا کلمہ دوست دشمن سب نے پڑھا ہے۔ حالیؔ ایک بلند مرتبہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ عملاً میر

انیسؔ کے شعر کے مصداق تھے۔

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

حالیؔ معمولی سے معمولی شخص کی عزت اور شخصیت کا خیال رکھتے تھے۔ کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا دشنام دینا، کوسنا، غصہ کرنا، دھتکارنا وغیرہ تو ایک طرف کبھی کسی سے آواز بلند گفت گو نہ کی۔ حالیؔ بچوں میں بچے، بیماریوں میں مسیحا، دردمندوں کے ہمدرد، غریبوں کے مددگار اور حاجت مندوں کے سہارا تھے۔ اگرچہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن ان کا دل کشادہ تھا کیوں کہ ان کی فطرت میں قناعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کہتے ہیں:

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

انگریزی محاورہ ہے، "It is Difficult to be humble when you are great" مگر حالی نے اپنے کردار اور عجز و انکسار سے یہ ثابت کر دیا کہ عظیم شخص وہی ہے جس کے اخلاق اور کردار بلند ہوں۔ چونکہ اُردو ادب میں یہ گوہر نایاب خاص طور پر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں میں خال خال ہے اس لیے ہم چند معتبر اور مستند واقعات جو حالیؔ کی فرشتہ صفت شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں یہاں پیش کرتے ہیں۔

شاعروں کی چشمک اور معرکہ آرائیوں سے اُردو کے قارئین بے خبر نہیں ہیں۔ تعلّی شاعر کا پیدائشی حق تو ہے لیکن مشاعروں کی سیاسی تجلی اور بازی گری نے ادبی اور شعری آموزش گاہ کو شعرا کا دنگل بنا دیا ہے اس ماحول میں حالی کی سیرت کو دیکھیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں: خواجہ اکرام اللہ مرحوم نے دہلی کے ایک مشاعرے کا حال مجھے سنایا تھا، جس میں خواجہ حالیؔ مرحوم اور داغؔ مرحوم دونوں شریک

ہوئے تھے۔ طرح تھی۔ ''خبر کہاں''، ''نظر کہاں''، داغ مرحوم کی غزل مشہور ہے:

اس مبتدا کی دیکھیے نکلی خبر کہاں

مشاعرے میں سب غزلیں پڑھ چکے تھے۔ خواجہ صاحب اور داغ مرحوم باقی رہ گئے تھے۔ پہلے شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی اور اُنھوں نے اپنی غزل سنائی:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

حالیؔ نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں؟

اکرام اللہ خاں مرحوم کہتے تھے، غزل تمام مشاعرے پر چھا گئی اور مدح و تحسین کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا، اب داغ مرحوم کے لیے کچھ نہیں رہا۔ خود داغ نے کہا۔ ''اس غزل کے سننے کے بعد میری غزل خود میری نگاہ سے گر گئی، جی چاہتا ہے، پرچہ چاک کر دوں۔''

ایک عرصے کے بعد خواجہ صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تو میں نے غدر کے بعد کے مشاعروں کا تذکرہ چھیڑ دیا اور خصوصیت کے ساتھ اس مشاعرے کا حال دریافت کیا۔ خواجہ صاحب حالات بیان کرنے لگے اور تفصیلات کی رو میں دور تک نکل گئے۔ لیکن پھر اچانک انھیں احساس ہوا کہ اب مجھے غزل کی مدح و تحسین کے واقعات بیان کرنے پڑیں گے، اس لیے کہتے کہتے یک قلم رک گئے۔ اَب میں ہر چند اصرار کر کے پوچھتا ہوں، فرمائیے، اس کے بعد کیا ہوا؟ لیکن وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ ''جی ہاں! بس غزل پڑھی گئی اور مشاعرہ ختم ہو گیا۔'' میں نے بار بار پوچھا: آپ کی غزل پر داغ مرحوم نے کیا خیال ظاہر کیا تھا؟ لیکن ''جی ہاں، کیا کہا جائے۔'' کے سوا اور کوئی جواب نہیں ملا ''جی ہاں'' کی ''ہاں'' کو وہ جس طرح تمدید کے ساتھ ادا کرتے تھے، اُسے قیدِ کتابت میں لانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں پاتا کہ ''جی ہاں'' کی ''ہاں'' پر

ایک لمبی مد کھینچ دوں۔

حالؔی کے پڑپوتے خواجہ غلام الحسنین اپنے مضمون ''حالیؔ'' میں لکھتے ہیں:

''خوش قسمتی سے مجھے تینتیس سال تک دہلی اور پانی پت میں مولانا کی خدمت سے فیض یاب ہونے کی عزت حاصل رہی۔ اگرچہ مجھے اس مدت میں بوجہ ملازمت سررشتہ تعلیم ساڑھے چار سال تک پانی پت سے باہر رہنے کا اتفاق ہوا۔ تاہم تعطیلات میں اور رخصت لے کر بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور چونکہ مجھ کو مولانا سے قرابت قریبہ حاصل تھی اس لیے کسی وقت بھی ان کی خدمت میں کوئی رکاوٹ میرے لیے نہیں تھی، خواہ مولانا اندر تشریف رکھتے ہوں، یا باہر مردانہ مکان میں۔ اور بعض اوقات گھنٹوں ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان وجوہ سے مولانا کی نشست و برخاست، اخلاق و آداب، عادات و خصائل، المختصر ان کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کے متعلق اصلی حالات معلوم کرنے کے بے شمار مواقع جو مجھے حاصل ہوئے کسی کو حاصل نہ ہوئے۔ اس کے علاوہ میں نے مولانا کے کلام کا مطالعہ بھی بہت کچھ کیا ہے اور جو کچھ ان کے کلام میں پایا ہے، وہی ان کی عملی زندگی میں دیکھا۔ لہٰذا میرے بیان کا دارومدار سنی سنائی پر نہیں، بلکہ ذاتی مشاہدات اور ان واقعات پر ہے جن کی تصدیق خود مولانا کے قلم یا زبان سے ہو چکی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنے ایک مضمون میں مولانا حالؔی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ایک بڑے شخص کا قول ہے کہ ادیب کا کلام اس کے دماغ کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر اس معیار پر مولانا حالیؔ کے کلام کو جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی سیرت اور ان کی حیات سرتاپا ان کے کلام میں موجود ہے۔ وہ مجسم ہمدردی اور مجسم درد تھے اور یہی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کا ہر ایک مصرع درد بھرا تڑپتا ہوا جگر

پارہ ہے۔ ہماری زبان میں اور بھی ایسے شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں عجیب اثر اور درد ہے۔ لیکن ان کا درد ذاتی اور محدود ہے۔ حالیؔ کا درد ساری قوم کا درد ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پُر درد نغموں نے قوم کے دلوں کو ہلا دیا۔ سوتوں کو جگا دیا اور کاہلوں کو ہوشیار کر دیا۔"

میرے بھائی آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو ہر بات کو نہایت گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے مولانا کی وفات پر جو 31/دسمبر 1914ء کو واقع ہوئی، اپنے اخبار "عصر جدید" میں ان کی سیرت کے متعلق نہایت جچی تلی رائے لکھی تھی جس پر میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں:

"مولانا یونانی خیالات کی رُو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رُو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی برائی ان کی زبان سے نہیں سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ کسی مذہب کے قائل سے سچ اور عمدہ بات سنتے تھے تو اس کی قدر کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ مذہباً نہایت بے تعصب تھے۔ آپ بلند خیال، بے نفس، محب اہل بیت اور صوفی منش سنی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریق نماز کے علاوہ اور کسی طرح اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقہ کے لوگ موجود ہیں اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ ان کے پاس

بیٹھنے اور باتیں سننے سے نہایت بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ عدل اور میانہ روی مولانا کی خاص صفت تھی۔ اس کے ساتھ رحم و مروّت۔ پانی پت بلکہ اس تمام علاقے کو فخر ہو سکتا ہے کہ ایسا انسانِ کامل اس میں پیدا ہوا جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی بھی نہ سمجھا۔ اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروّت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا۔ عزیزوں اور اولاد کی محبت، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی، نیک آدمیوں کی قدر دانی میں ان کی مثال ضرور ملے گی مگر کم۔ آخر زمانے میں جبکہ دماغ بیکار ہو گیا تھا اور لوگ اپنی عادت کے موافق مختلف خیالات سے جنگ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے تو مولانا مرحوم جب بہت سے آدمیوں کے مقتول ہونے کا ذکر سنتے تھے تو اس قدر تاسف سے آہ کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہو۔ خدمت گار اُن کو الگ روتے ہیں کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا۔ یہی حالت رشتہ داروں اور اہلِ شہر کی ہے۔ قوم میں بھی کچھ کم افسوس نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔"

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے حالی کی سیرت میں دو خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ایک سادگی دوسرے دردِ دل یہ دونوں خصوصیتیں ان کے کلام میں بھی ہیں، سیرت میں ہیں۔ دراصل ان کا کلام اور ان کی سیرت ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

نواب عماد الملک کہتے تھے سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے حالی کا مرتبہ بہت بلند تھا اس بات میں سرسید بھی نہیں پہنچتے تھے۔

حالی ہر چھوٹے اور بڑے سے خلوص اور محبت سے ملتے تھے وہ بڑوں اور

چھوٹوں کا ادب کرتے تھے علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں جب عبدالحق اور حمید الدین حالی سے ملنے گئے تو وہ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حمید الدین نے کہا کہ آپ تعظیم کر کے ہمیں شرمندہ کرتے ہیں تو کہنے لگے: ''آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی تعظیم کروں۔ آیندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔''

اپنی کتابوں پر جو اصلی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ ''مرتبہ'' لکھا مولفہ یا مصنفہ کا لفظ نہ لکھا۔ رفتار و گفتار، رہن سہن ملنے ملانے میں اتنی سادگی اور خاکساری تھی کہ ملنے والے کو مشکل سے یقین ہوتا کہ یہ اُردو کا عظیم شاعر و ادیب حالؔی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حالؔی نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر عمدہ ریویو کیے انہیں سراہا لیکن اُنہی ہم عصروں نے سوائے سرسید کے حالی کی تصانیف پر خاموشی اختیار کی جس کا حالی نے کبھی نوٹس نہیں لیا بلکہ ان کی حمایت میں کہتے اور لکھتے رہے۔

مولوی ظفر علی خان نے ''دکن ریویو'' میں شبلی کی کتاب پر بے جا شوخی سے کام لیا تو حالؔی نے محبت بھرے جملوں سے نصیحت کرنی شروع کر دی۔ میں تنقید سے منع نہیں کرتا تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔

1903ء میں جب مولوی فضل الحسن حسرت موہانی نے علی گڑھ سے ''اُردوئے معلی'' جاری کیا تو جدید شاعری کے اِس مجدد اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس اگرچہ 'اردوئے معلی'' باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالؔی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسبِ معمول سید

زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرتؔ موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں، اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرتؔ کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانہ میں گئے اور ''اردوئے معلّٰی'' کے دو تین پرچے اُٹھا لائے۔ حسرتؔ اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے۔ مگر زین العابدین کب جانے دیتے۔ خود پاس بیٹھ گئے، ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کیے اور مولانا حالیؔ کو مخاطب کر کے حسرتؔ اور اُردوئے معلّٰی کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور ''واہ! خوب لکھا'' کہہ کر داد دیتے تھے حالیؔ بھی ''ہوں ہاں'' سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرتؔ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے، ارے مولانا یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے ''سچ تو یہ ہے کہ حالیؔ سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔''

فرشتہ منش حالیؔ ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ ''نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرتؔ سے پوچھا کہ حالیؔ کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔

حالیؔ کے اخلاق اور کردار کے جو دوست اور دشمن مداح تھے وہ ان کی انسانیت تھی۔ افسوس کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو دہرانا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں انسانیت کے جوہر کی کمی دیکھی گئی ہے۔ حیدرآباد دکن کی علمی اور ثقافتی تہذیب کے

نمایاں شخص عماد الملک سید حسین بلگرامی جو سرسید کے قریبی دوست بھی تھے کہتے تھے، سرسید احمد خان کی جماعت میں کوئی شخص انسانیت کے اعتبار سے حالی کے پایہ کا نہ تھا اور اس خاص بات میں خود سرسید احمد خاں بھی انہیں نہیں پہنچتے تھے۔

حالیؔ نے خود انسانیت کی تعریف سرسید احمد خان کے فارسی مرثیے میں کی ہے جو سچ کہیں تو حالیؔ ہی پر صادق آتی ہے:

چیست انسانی! تپیدن از تپ ھمسایگان
از سموم نجد در باغ عدن پژماں شدن

(انسانیت کیا ہے! ہمسایوں کے رنج اور زحمت سے رنجیدہ رہنا۔ جنت میں بھی نجد کی گرم و زہریلی ہوا کے احساس سے افسردہ اور مرجھائے ہوئے رہنا)

خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

(اپنے کو تمام کم تریوں سے کم تر سمجھنا اور قفس کی تکلیف دہ زندگی کے احساس سے محل میں بھی بے چین رہنا)

آتش قحطی کہ در کنعان بسوزد باغ و کشت
برفراز تخت مصر از تاب آں بریاں شدن

(وہ قحط کی آگ جس سے مصر کے باغ اور کھیت جل چکے اس کی گرمی اور جلن سے تخت شاہی مصر پر بھی بھن جانا)

بی مڑیا کی نگہداشت:

حالیؔ ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ غدر میں دلی اجڑی اور کئی شریف خاندانوں کی عورتیں پانی پت کے گرد و نواح میں عزت و جان بچانے کے لیے زندگی بسر

کرنے لگیں۔ ان ستم زدہ بدبخت افراد میں بی مڑیا بھی شامل تھی جنہوں نے حالؔی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر حالؔی کے کنبے کے ساتھ گزار دی۔ صالحہ عابد حسین یادگار حالی میں لکھتی ہیں کہ ایک اسّی (80) سالہ بوڑھی بی مڑیا کو خود انہوں نے دیکھا تھا جو غدر میں دس سال کی تھیں، عقد ہو چکا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ شوہر، ماں باپ عزیز و اقارب سب مارے گئے اور اس اکیلی کم سن لڑکی نے حالؔی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر چھوٹے موٹے کام جیسے سلائی، کشیدے کاری وغیرہ کر کے اپنا خرچ چلاتی رہیں اور عزت و خودداری سے زندگی گزار دی۔ حالؔی کے انتقال کے بعد ان کی پوتی مشتاق فاطمہ نے بی مڑیا کی اس طرح خدمت کی جیسے ایک بیٹی اپنی ماں کی خدمت کرتی ہے۔ ان واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی صرف جذباتی شاعری ہی نہیں کرتے تھے بلکہ عملی طور پر جس قدر بھی ہو سکے عورتوں کے مسائل کو حل کرنے میں پیش پیش رہتے۔

نوکروں سے برتاؤ:

حالؔی کے دو خاص ملازم تھے۔ نانوں خان اور عطاء اللہ۔

حالؔی ان دونوں ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھار نانوں خان جب سجاد حسین کے ساتھ دوسرے شہر جاتا تو اس کی نگہداری کی تاکید کرتے اور نانوں خان کو خط لکھنے کی تاکید بھی کرتے۔ ایک مرتبہ نانوں خاں غلطی سے کروسین تیل گھی سمجھ کر پی گیا۔

حالؔی نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور نواب لوہارو کے ہاں کی دعوت کو جانا ملتوی کر دیا۔ عطاء اللہ مزاج کا سخت اور بہت اونچا سنتا تھا لیکن وہ بھی حالؔی کا چہیتا تھا جس کو حالی اپنی جاکٹ رضائی اور کھانے پینے کی اشیا دیتے رہتے تھے۔ حالؔی کے انتقال کے بعد یہ

دونوں ملازمین دن رات ان کے گن گاتے رہتے تھے۔

مولانا روم نے بہت صحیح انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے:

دل بدست آرد کہ حج اکبر است
از ھزاراں کعبہ یک دل بہتر است

مذہب:

حالی کی پڑپوتی صالحہ عابد حسین یادگار حالی میں لکھتی ہیں۔ حالی عقیدتاً حنفی سنی مسلمان تھے اور حالی کی بیوی شیعہ تھی۔ وہ حنفی المذہب سنی تھے لیکن اہل بیت اطہار سے اور جناب علی مرتضیٰ t سے انہیں بڑے بڑے شیعوں سے زیادہ عقیدت تھی۔ ان کا یہ شعر اس احترام اور عقیدت کا پورا ثبوت دیتا ہے:

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے

پانی پت میں صرف اُن کے خاندان کے شیعہ حضرات ہی نہیں بلکہ شہر بھر کے شیعہ اُن کے مذہبی عقیدے کی بھی اُسی طرح عزت کرتے تھے جس طرح ان کی ذات کی۔ جب حالی کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا ہی کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔

آں حضرت e سے حالی کو وہ گہری عقیدت اور والہانہ عشق تھا جس کا ثبوت ہر اُس شعر سے مل سکتا ہے جو انہوں نے ہادی برحق e کی شان میں کہا ہے۔ انہوں نے جہاں کہیں اس موضوع پر لکھا ہے قلم توڑ دیا ہے۔ ''مسدس حالی'' کے چند نعتیہ بند اردو شاعری کے سارے نعتیہ کلام پر بھاری کہے جا سکتے ہیں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
غریبوں کا ملجا ضعیفوں کا ماوٰی
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

قناعت:

قناعت ایک خداداد انسانی قدر ہے جسے انسان اپنے نفس کی پاکیزگی سے نمو دیتا ہے میر انیسؔ نے کہا تھا

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں پہ نہیں حاجتِ سوال مجھے
کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

انسان کو جینے کے لیے معاش اور روزگار کی ضرورت ہے۔ زندگی کی گاڑی کا ایندھن یہی روپیہ اور مال ہے جس سے پیٹ کی آگ بجھائی اور بدن کی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ حالیؔ کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اوائل زندگی سے آخری عمر تک کبھی حریص وطمع نہیں کیا بلکہ قانع رہے جو کچھ بھی انہیں روزگار نے فراہم کیا۔ انیسؔ کا شعر حالیؔ کی وضع داری اور قناعت پر صادق ہوتا ہے:

کیا قبول قناعت سے بحرِ عالم میں
صدف کی طرح میسر جو آب و دانہ ہوا

واقعہ:

جب حیدر آباد کے نواب سر آسمان جاہ نے حالیؔ کی شعری اور ادبی کاوشوں سے متاثر ہوکر انہیں ماہانہ وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا تو سرسید نے پوچھا آپ کو گذر بسر کرنے کے لیے کتنا وظیفہ چاہیے۔ حالیؔ نے جواب دیا۔ مجھے اینگلو عربک اسکول سے جو ساٹھ روپے ماہوار ملتے ہیں تو حیدر آباد کے سکہ رائج الوقت کے پچھتر روپے ہوتے ہیں یہی میری زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے۔

☆ لاہور کے قیام کے دوران ڈاکٹر لٹز کی ارضیات پر کتاب کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا جو بعد میں گورنمنٹ کالج کے نصاب میں شامل رہی۔ حالیؔ نے اس ترجمہ اور کتاب کو کالج کے لیے بغیر کسی معاوضہ کے انجام دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالی لاہور میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور تھوڑے سے پیسوں کی خاطر اپنے وطن اور اہل و عیال سے دور تھے اور خاندان کی ساری ذمہ داریاں حالیؔ پر تھیں۔

☆ حالیؔ نے اپنی تصنیفات سے مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ سوائے ایک آدھ کتاب کی رجسٹری یا حقوق محفوظ کروائے ہوں گے ان کی تمام تر کتابیں پبلشرز جب چاہتے شائع کر کے فائدہ اٹھا لیتے۔ مسدس حالیؔ کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوئے لیکن حالی کو کوڑی بھی نہیں ملی شاید اُردو ادب میں اس قسم کے استحصال کی دوسری مثال نہ ہو۔

☆ حالیؔ نے اپنی تمام تر زندگی ایک معمولی مکان میں گزار دی۔ آخری عمر میں چھوٹے بیٹے سجاد حسین جو گورنمنٹ کے بڑے عہدے پر فائز تھے ایک قطعہ زمین لے کر نسبتاً آرام دہ گھر بنایا جس کے اوپری حصے میں حالیؔ رہتے

تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالیؔ کے ہمدرد عالی شان بنگلوں اور کوٹھیوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وقار الامرا نے حیدر آباد میں اپنے رہنے کے لیے ایک عظیم الشان محل فلک نما بنوایا تھا جس کا ذکر حالیؔ نے اپنی نظم میں بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے حالیؔ کا یہ مکان دیکھا ہے جس کے مالک اُس وقت ایک سردار صاحب تھے۔ ہمیں پتا نہیں اس عظیم شخص نے جس گھر میں پچیس برس گزارے ہوں وہ اب کس حالت اور کس کی تحویل میں ہے۔ کیا عمدہ ہوتا اگر اس گھر کو حالی میوزیم میں تبدیل کر کے ان کے نادرات کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جاتا۔ پروفیسر عزیز الدین ڈایریکٹر رام پور لائبریری نے راقم کو بتایا کہ انھوں نے گورنر قدوائی کی مدد سے اس مکان کو حالی میوزیم میں محفوظ کروایا ہے۔

☆ حالیؔ کی مالی حالت خستہ اور کمزور ہونے کی وجہ سے بہت سے کام وہ اپنی زندگی میں نہ کر سکے۔

(ا) حالیؔ دلّی میں ایک مطبع کھولنا چاہتے تھے تا کہ فارسی عربی اور اُردو کی عمدہ نایاب اور کم یاب کتابوں کو عمدہ طریقے پر شائع کر سکیں لیکن پیسہ نہ ہونے سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر رہا۔

(ب) حالیؔ ایک عمدہ میگزین نکالنا چاہتے تھے لیکن یہ کام بھی مالی مشکلات نے انجام ہونے نہ دیا۔

(ج) حالیؔ اپنی تصانیف بھی اچھی طرح سے شائع نہ کر پائے۔ حالیؔ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور نواسے خواجہ فرزند علی نے حالی پریس قائم کر کے حالیؔ کی کتابوں کو شائع کیا۔

☆ مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالیؔ کو جو کچھ بھی ملتا تھا وہ اپنے اقربا

رشتہ دار اور غریبوں میں صرف کر دیتے تھے۔ جب کبھی کسی شہر جاتے وہاں سے تحفے سوغات خصوصاً خاندان کی لڑکیوں اور عورتوں کے لیے ضرور لاتے۔ یادگار حالیؔ میں کئی واقعات ملتے ہیں۔

☆ حالیؔ کے ملازم عطاء اللہ کے واقعات میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے تذکرۂ حالی میں لکھا ہے کہ حالیؔ اپنے بنوائے کپڑے عطاء اللہ کو دے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں جب عطاء اللہ نے حالی سے کہا کہ رات کو بڑی سردی لگتی تو حالیؔ نے اپنی نئی بنوائی ہوئی رضائی عطاء اللہ کو دے دی جب اُس نے کہا کہ یہ تو آپ نے کل ہی بنوائی ہے کوئی پرانی رضائی دے دیجئے تب حالیؔ نے کہا یہ تم لے لو ہم اور بنوالیں گے۔

مسافرت:

حالیؔ پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ تقریباً زندگی کا ایک چوتھائی حصہ مختلف شہروں میں گزرا۔ زندگی کا پہلا سفر پانی پت سے دلّی کا پیدل کیا جو حصول علم کا آغاز تھا اور آخری سفر فرید آباد کا تھا جو ان کی تخلیقات کی جمع آوری کا تکملہ تھا۔

حالیؔ سات سال جہانگیر آباد، چار سال لاہور اور کئی سال دہلی میں اور متعدد بار مقیم رہے۔ علی گڑھ حیدر آباد کراچی الہ آباد بھوپال آگرہ بمبئی کے علاوہ ایک درجن سے زیادہ مقامات پر جاتے آتے رہے۔ صحت کی کمزوری، سفر کی تکالیف ان کے مقاصد میں حائل نہ ہوسکیں۔

شمس العلماء کا خطاب:

حالی کو جون 1904ء میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ حالی کو 1875ء میں ان کی تصنیف مجالس النساء پر چار سو روپے کا انعام دیا گیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں تیس سال کا فرق ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ تحریر کہ شمس العلماء کا خطاب اور انعام حالی کو جون 1904ء میں پیش کیا گیا صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ خود ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''کوشش کے باوجود مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حالی کو شمس العلماء کا خطاب اور چار سو روپے کا انعام دونوں ایک ساتھ ملے تھے یا الگ الگ۔''

حالی اگرچہ اس خطاب کے بہت پہلے ہی سے حق دار تھے لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے یہ خطاب انہیں عمر کے آخری حصے میں نصیب ہوا۔ حالی کو جب یہ خطاب ملا تو وہ فکر مند اور نگران بھی رہے چناں چہ اپنے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں:

> ''خطاب کی تحریک جہاں تک معلوم ہوئی ہے برخوردار تصدق حسین نے معرفت ڈائریکٹر صاحب کے دربار تاجپوشی سے بہت پہلے کی تھی۔ کیوں کہ انہوں نے ڈائریکٹر صاحب کو دینے کے لیے میرے پاس سے میری سب کتابیں اس زمانے میں منگوائی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر آرنلڈ نے ڈائریکٹر صاحب کو میرے حالات سے بخوبی مطلع کر دیا تھا اور اس باب میں بھی

تصدق حسین برخوردار نے بہت کچھ تائید کی تھی۔ کیوں کہ خطاب کے شائع ہونے کے بعد انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں نے ڈائریکٹر صاحب کو اور آرنلڈ صاحب کو اسی معاملے کے متعلق ولایت چٹھیاں بھیجی ہیں۔ ...... اس سے پہلے سائم صاحب کے زمانے میں ماسٹر پیارے لال صاحب نے میرے اور مولانا نذیر احمد صاحب کے لیے ضروری تحریک کی تھی۔ مگر اس وقت معلوم نہیں کیوں التوا ہوا۔

اگر چہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ آج چوتھا روز ہے کہ ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کی خدمت میں حسب تحریر برخوردار تصدیق حسین کے گیا تھا وہ چوں کہ نہایت مہذب اور خلیق ہیں بہت اچھی طرح ملے اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں آج ہی پانی پت جاتا ہوں وہاں تفصیلی ملاقات ہو گی۔ چناں چہ وہ تین روز سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور کل اُن کے ملنے کو جاؤں گا۔ انہوں نے میری کتابوں کے دیکھنے کی بھی خواہش کی ہے وہ بھی اِدھر سے اُدھر سے مانگ تانگ کر لے جاؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درگاہ قلندر صاحب اور کابل باغ وغیرہ عمارت قدیمہ کے

دیکھتے وقت مجھے بھی بلایا جاوے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟"

پوشاک:

حالؔی کے بیٹے سجاد حسین کہتے ہیں۔ حالؔی کی پسند نفیس تھی۔ کپڑا خریدتے تو بہت دیکھ بھال کر کے رنگ ڈیزائن اور قسم سب موزوں ہو۔ جوانی میں باریک اور نفیس کپڑا پہننا پسند کرتے تھے چونکہ سودیشی کے حامی تھے اس لیے اگر پانی پت کی بنی ہوئی باریک کھدر مل جاتی تو اس کے کپڑے پہن کر خوش ہوتے۔ عام طور سے کرتا پاجامہ اور اچکن پر سردیوں میں چوغہ یا روئی کا دگلہ پہن لیتے گلے میں مفلر اور سر پر گول سی ٹوپی بھی پہن لیتے۔

خوراک:

حالؔی کی خوراک کم اور سادہ تھی۔ ترکاریاں بہت پسند تھیں۔ پھلوں میں آم اور خربوزوں کے عاشق تھے۔ آم کی شناخت تھی اور اچھے آم خریدتے تھے۔ چائے اور بسکٹ ہمیشہ تیار رکھتے۔ پان تمباکو اور افیون کی گولیاں کھاتے حقے کا استعمال بھی ہر روز کرتے رہتے۔ آخری عمر میں دانتوں کی تکلیف کی وجہ سے پان کھانے میں کمی کر دی تھی۔ خوراک میں انتخاب اور اعتدال تھا جو آخری عمر تک برقرار رہا۔

آغاز شاعری:

ہمیں تحقیق اور تلاش کے باوجود یہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ حالؔی نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور ان کا پہلا شعر یا پہلی غزل کون سی ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالیؔ فطری شاعر تھے چناں چہ دہلی جانے سے پہلے ہی یہ شاعری کا پودا ان کے دل و دماغ میں نشوونما پانے لگا جس کا ایک سبب پانی پت میں موجود حالیؔ کے استاد سید جعفر علی تھے جو مومن دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے جن سے فارسی لٹریچر کی کتابیں پڑھی تھیں اس وقت حالی کی عمر پندرہ سولہ برس سے بھی کم تھی۔ اس کی دوسری وجوہات میں حالی کا حافظہ، گیرائی اور مشاہدے کی گہرائی کے علاوہ بچپن ہی سے رنج و مصائب سے دو چار ہونے کے سبب دل و دماغ کا سوز و گداز بھی تھا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ حالیؔ جب پہلی بار ڈیڑھ سال دلی میں رہے اس وقت ادبی اور شعری محفلوں میں شرکت کرتے تھے غالباً دوسری بار جب 1861ء میں ملازمت کی تلاش میں دلی آئے تو شعر وسخن کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ دہلی میں محمد اکرام خان شیدا کا دیوان خانہ ادبی مرکز بنا ہوا تھا جہاں شعر وسخن کی محفلیں ہوتی تھیں جن میں سید انور، سید ظہیر اور مرزا سالک کے ساتھ حالیؔ بھی شریک بزم رہتے۔ حالیؔ اپنی کہانی میں لکھتے ہیں:

> ”جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے

تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو
غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔''

حالیؔ کی اس تحریر سے یہ پتا چلتا ہے کہ انہوں نے تیئس (23) چوبیس (24) برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کی۔ غالبؔ کی نصیحت نے حالیؔ کو پابند مشق سخن کر دیا تھا لیکن بعد میں وہ ہمیشہ فکر شعر گوئی میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں وہ دلی کے ماحول سے متاثر رہ کر عشقیہ شعر کہتے اور عاشقانہ اشعار پسند کرتے تھے۔

پڑھنے کا انداز:

حالیؔ کے شعر پڑھنے کا انداز فطری اور پر تاثیر تھا۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور آواز میں دلکشی تھی۔ مولوی عبدالحق نے انہیں کئی جگہ پڑھتے سنا تھا چناں چہ اپنی کتاب ''چند ہم عصر'' میں لکھتے ہیں:

''آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں اُن کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں ان میں بعض طرح طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ، گردن اور دوسرے اعضا سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا انہوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحیدالدین سلیم صاحب کو دی، جو بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک

بند ہی پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا نظم ان کے ہاتھ
سے لے لی، اور خود پڑھنی شروع کی، ذرا سی دیر میں ساری مجلس
میں کہرام مچ گیا۔''

شیفتہ کی مصاحبت:

حالیؔ کی زندگی میں نواب مصطفی خان شیفتہ کی صحبت غالبؔ سے زیادہ اہمیت
رکھتی ہے جیسا کہ انہوں نے خود اپنے قلم سے اپنی کہانی میں لکھا ہے:

''غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں
گذر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق
سے نواب مصطفی خاں مرحوم رئیس دہلی وتعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع
بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتیؔ اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے
تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور
آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا
اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے
شاعر تھے۔ اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور
اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام
مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورہ
سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و
سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا اور ان کی
صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی
طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اُردو اور

فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہؔ اور غالبؔ دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہؔ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہورہا تھا۔ انہوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا۔

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہوگیا۔"

حالیؔ کی تحریر سے شیفتہ سے تعلقات کے علاوہ ان کی شخصیت اور ان کے فن پر بھی روشنی پڑتی ہے اسی راستے سے حالیؔ کو غالبؔ کی منزل ملی اور غالب نے حالیؔ کی شعری اور فکری دنیا میں وہ تبدیلیاں لائیں جو ایک خستہ شاعر کو خالی سے حالی بنا دیا۔ غالب کا مشہور قطعہ جو حالیؔ کی نصیحت کے جواب میں لکھا گیا اس کا مخاطب مصطفیٰ خان شیفتہ ہی ہے۔

تو ای شیفتہ و حسرتی لقب داری
ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم

چو حالی از من آشفتہ بی سبب رنجید
تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال
براں سرم کہ دراں عمر این دو کار کنم
یکی ادائے عبادت عمر پیشینہ
دگر بہ پیش گاہی حالی اعتذار کنم

یعنی تو جو شیفتہ اور حسرتی لقب رکھتا ہے میں صرف تیری محبت اور لطف پر بھروسہ رکھتا ہوں حالی مجھ سے خفا اور بغیر کسی وجہ کے رنجیدہ ہے اگر تو سفارش نہ کرے تو کہہ میں کیا کروں۔ اگر دوبارہ مجھے اس دنیا میں پیدا کیا جائے تو میں صرف دو کام کروں گا ایک گذشتہ عمر کی عبادت جو میں نے نہیں کی اور دوسرے حالی سے معذرت خواہی۔

حالی کی ملاقات شیفتہ سے دلی میں ہوئی تھی اور پھر حالی جہانگیر آباد میں جو شیفتہ کی جاگیر تھی سات آٹھ سال مقیم رہے۔ صالحہ عابد حسین اور مالک رام نے لکھا ہے کہ شیفتہ نے اپنے چھوٹے بیٹے نقش بند خان کی اتالیقی کے لیے حالی کا استخدام کیا جس کی شدت سے تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں۔ ''مالک رام صاحب نے حالی کے بارے میں شیفتہ کی جو رائے نقل کی ہے مجھے اس کا علم نہیں کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مالک رام صاحب کے بیان کی بنیاد حالی سے ان کی عقیدت اور حالی کے خاندان کے لوگوں سے ان کے ذاتی تعلقات ہیں...... مالک رام صاحب اور صالحہ عابد حسین کو یہ محسوس ہوا کہ اگر حالی کو شیفتہ کا مصاحب بتایا جائے تو اردو ادب میں حالی کی قدر و قیمت کم ہو جائے گی حالاں کہ حالی یہ نہیں سوچتے تھے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ وہ شیفتہ کے مصاحب تھے۔ اگر وہ شیفتہ کے چھوٹے بیٹے نقش خان یا ان کے بچوں کے اتالیق ہوتے تو اس کا ذکر ضرور کرتے۔ شیفتہ کا مصاحب

ہونا حالؔی کے لیے نہیں مالک رام اور صالحہ عابد حسین کے لیے شرم کی بات تھی۔"

راقم کی نظر میں مصاحب ہونا یا اتالیق ہونا شخصیت کے علم وفضل اور عمر کی نسبت سے ہوتا ہے۔ حالؔی سات آٹھ سال جہانگیر آباد میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ تھے۔ مصاحبت ان دنوں کچھ شام کے گھنٹوں پر مبنی تھی۔ یہ سچ ہے کہ حالؔی اپنی کہانی میں سات آٹھ جملوں میں شیفتہ کی مصاحبت کی سات آٹھ سالہ مصروفیات کو مکمل اور مستند طور پر بیان نہیں کر سکتے تھے ان دنوں کی گزارشات کو گھر کے افراد ہی بہتر بتا سکیں گے۔ صالحہ نے اپنے والدین سے جو سنا ہے ہم کو اُسے صحیح ماننا پڑے گا جب تک کہ کسی مستند حوالے سے اس کی تردید کی جا سکے۔ حالؔی بچپن سے ہی تعلیم کے شیدا تھے وہ ایک عمدہ معلم بھی تھے اور انہوں نے ساری عمر تعلیم اور علم کے فراہم کرنے میں صرف کر دی یہ تو شیفتہ کے لیے مایہ افتخار ہے کہ حالؔی جیسا عمدہ انسان ان کی صحبت میں رہا اور شیفتہ کے بچوں کے لیے باعث فخر کہ حالی ان کے اتالیق رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے حالؔی کی فکری اور شعری جہتوں کو مہمیز کیا۔ ان کی فکر سے مولویت کم کی اور وسعت نظری سے ہم کنار کیا۔ حالؔی مالی لحاظ سے آسودہ خیال رہے چناں چہ ان کے انتقال کے بعد پھر روزگار کی تلاش میں لاہور میں پناہ لی۔ شیفتہ ہی کے ذریعے غالب کے قریب پہنچے اور غالب کی مصاحبت اور استادی کے فیض سے مستفید ہوئے۔ غدر کے زمانے اور اس کے بعد بھی جہانگیر آباد نسبتاً ایک ایسا مقام تھا جہاں حالؔی اپنے فن اور شخصیت کو سنوار رہے تھے۔ کیا خوب ہوتا کہ حالؔی یادگار شیفتہ لکھ دیتے تاکہ ہمیں ان مسئلوں میں الجھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شد

ایک کامیاب شخص آرزوؤں اور جستجوؤں کا پتلا ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے

حالیؔ نے اپنی (۷۷) سالہ زندگی میں بہت سے مثبت کام کیے اور بہت سے کام گردشِ دوراں سے نہ ہو سکے۔ اس تحریر میں ہم ان خوابوں کو جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے بیان کریں گے۔

☆ حالیؔ چاہتے تھے دہلی میں ایک بڑا مطبع جاری کریں جس میں عمدہ مصنفوں کی کتابوں کو شائع کیا جائے، قدما کی عربی اور فارسی تصنیفات جو شائع نہیں ہوئیں نہایت حسن اہتمام کے ساتھ چھپوایا جائے اور ایک ماہانہ رسالہ بھی اجرا کریں جس میں ہندوستانیوں کو یورپ کی ترقیات کی طرف مائل کریں۔ یہ آرزو پوری نہ ہو سکی کیوں کہ کہ اس عمدہ کام کے لیے سرمایے کی ضرورت تھی جو حالیؔ کے پاس نہ تھا۔

☆ اُردو زبان کی تذکیر و تانیث کے اصول مرتب کر کے ایک کتاب لکھنے کا خیال

پورا نہ ہو سکا۔

☆ عمدہ ناول اور شاہکار ڈرامے جو دوسری زبانوں میں ہیں، ان کو اُردو میں ترجمہ کرنا اور کروانا چاہتے تھے جو نہ کر سکے۔

☆ مولانا حالی نے ایک آل نامہ لکھنا شروع کیا تھا جو مزاح کا ایک عجیب و غریب اور دلچسپ نمونہ تھا۔ اس میں ہر مذہب اور فرقے کے تعصب، تنگ نظری، حماقت، جہالت، خودغرضی وغیرہ پر چوٹ کی گئی ہے۔ مکتوباتِ حالی میں ہمیں اس کے چند لفظ ملے ہیں جو یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لفظ	معنی
المذہب	اعلانِ جنگ
الدین	تقلید آباؤ اجداد
العلم	قسمے از جہلِ مرکب
الامتحان	آزمایشِ لیاقتِ ممتحنان
الیونیورسٹی	کارخانہ کلرک سازی
المسلمانانِ ہند	چوں مارگزیدہ از ریسماں ترسندگان
الرئیس	آں کہ از ریاست بے خبر باشد
الامیر	آں کہ تہیدست و قرضدار باشد
المولوی	آں کہ مسلماناں را از دائرہ اسلام خارج می کردہ باشد
الواعظ	آں کہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند
الشکار	بہانہ آدم کشی

افسوس ہے کہ مکمل نہ ہوسکا ورنہ اپنے طرز کی لاجواب طنزیہ چیز ہوتا۔

☆ حالی عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ دیتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے پانی پت میں اپنے خاندان اور ہمسائے کی لڑکیوں کے لیے ایک مکتب کھولا لیکن بہت جلد استادنی کے نہ ہونے کی وجہ یہ مکتب بند ہوگیا۔

☆ حالؔی باقاعدہ طور پر ایک ہائی اسکول کھولنا چاہتے تھے۔ چناں چہ 1901ء میں جب ملکہ وکٹوریا کا انتقال ہوا تو ان کی یادبود میں ایک ادارہ قائم کیا گیا جس میں حالؔی نے ایک اسکول قائم کرنے کی تجویز کو منظور کروا کر چندہ جمع کرنے کا کام شروع کیا لیکن بدقسمتی سے تین ہزار روپے جمع کر سکے۔ چناں چہ یہ رقم ایک ہائی اسکول کے لیے بہت کم تھی اس لیے اس رقم سے حالؔی نے ملکہ وکٹوریا لائبریری قائم کی جو 1947ء کے فسادات میں ختم ہوگئی۔ حالی اسکول کا خواب حالی کے چھوٹے بیٹے سجاد حسین نے پورا کیا اور حالی اسکول قائم ہوا اور اس اسکول نے ترقی بھی کی لیکن افسوس کہ یہ اسکول بھی ۱۹۴۷ء کے بلوے میں ختم ہوگیا۔

☆ حالؔی کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلا درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ خود کوئی ڈرامہ لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے مجبور تھے۔

حالؔی کی نایاب کتب:

حالؔی کی تمام تر تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔ خود حالؔی نے انہیں مرتب اور شائع کیا۔ حالؔی کے بعد حالی کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور حالی کے نواسے خواجہ فرزند علی نے حالی پریس سے سلسلہ وار ایک ہی تقطیع کی صورت میں کتابیں شائع کیں لیکن ان تمام

کاموں کے باوجود حالی کی بعض کتابیں نہیں ملتیں جن کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔

☆ پادری عماد الدین کی کتاب "تاریخ محمدی e" اسلام اور پیغمبر اسلام پر شدید اعتراضات کیے گئے تھے حالی نے اس کے جواب میں ایک اور کتاب 1870ء میں شائع کی تھی جس کا عنوان "تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے" تھا۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔

☆ 1871ء میں اصول فارسی کا ایک حصہ مکمل کیا مگر اس کا بھی سراغ نہیں ملتا۔

☆ 1872ء میں شواہد الالہام رسالہ لکھا اس میں نبوت اور الہام کو موثر انداز میں پیش کیا گیا تھا جو اَب موجود نہیں۔

☆ حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ جو فارسی میں تھا اس کو حالی نے مرتب کیا اور اس ڈیڑھ سو صفحات کے سفر نامہ میں تقریباً چالیس صفحات مفصل فارسی میں زندگی نامہ بھی پیش کیا۔

ناصر خسرو علوی جو گیارہویں صدی عیسوی کے شاعر تھے جنہوں نے سات سال تک ایشیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کر کے سفر نامے میں اپنے مشاہدات، حالات اور تجربات مفصل طور پر فارسی میں لکھے تھے اس کا مخطوط نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں کے کتب خانے میں تھا۔ حالی نے اس میں ناصر خسرو کے حالات فارسی میں جمع کر کے 1882ء میں شائع کیا۔ یہ سفر نامہ بھی اب نایاب ہے۔

بیماریاں:

حالی جوانی سے کئی امراض سے دو چار تھے اس کی وجوہات ان کی صحت کی دیکھ بھال سے غفلت، ورزش وغیرہ سے دوری اور پان تمباکو اور حقے کا استعمال تھا۔

چونکہ طبیعت میں اعتدال تھا اس لیے ان تمام مسائل کے باوجود اپنے زمانے اور مقام کے لحاظ سے اچھی عمر بسر کی۔

☆ جوانی میں اسہال نے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اسی زمانے سے انہیں بواسیر کی بھی شکایت تھی۔

☆ نزلہ، کھانسی، دمہ اور سانس کی تنگی شاید تمباکو اور حقے کے استعمال کے باعث برونکائیٹس کے سبب ہو۔ حالی کے داہنے بازو میں درد و سوزش کی وجہ سے پلاسٹر وغیرہ بھی لگایا گیا تھا۔

☆ سوزش سینہ اور درد معدہ قلب کی وجہ سے ہو سکتا تھا۔

☆ دانتوں کی تکلیف، مسوڑوں میں سوجھن وغیرہ دانتوں کی حفاظت سے غفلت اور پان وغیرہ کے باعث تھی۔

☆ کم خونی بے وجہ فصد کھولنے کے باعث تھی۔

☆ سانس کی تنگی قلب کی نارسائی، کم خونی اور دمے کے باعث تھی۔

☆ نیند کا کم ہونا دماغی Stress یا کم قوتی کا سبب ہو سکتی ہے۔

☆ حالی کی بینائی میں کمی رعشہ بھی اعصاب کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ کم بینائی موتیا اترنے یا Catract کے باعث تھی۔ چناں چہ انہوں نے دو مرحلوں میں پٹیالہ اور لکھنو کے سرجنوں سے عمل جراحی کروا کر عینک کے استعمال سے کسی حد تک اپنی بینائی کو برقرار رکھا جس کے سبب وہ اپنی تصنیف و تالیف کے علاوہ روز مرہ کے کام مکتوب نگاری وغیرہ خود انجام دیتے تھے۔ حالی نے اپنے خطوں میں اپنی صحت سے غفلت اور بیماریوں کا ذکر کیا ہے۔

حالی کی طبیعت میں جو کسی کام کرنے کی سچی لگن تھی وہ انہیں ان تمام مشکلات اور بیماریوں کے باوجود اُس کام کو بدرجہ احسن انجام دینے میں مددگار ثابت ہوئی۔

مرض الموت:

مولانا اسماعیل پانی پتی، خواجہ عبدالحمید اور صالحہ عابد حسین کی تحریروں سے حالی کے آخری زمانے کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ آخری وقت حالیؔ اپنے اطراف اور ماحول سے واقف تھے۔ کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتے تھے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی جو بعد میں بے بسی میں تبدیل ہو جاتی کیوں کہ جواب نہیں دے سکتے تھے۔ بعض اوقات ایک دو لفظ کہہ لیتے۔ یہ تمام علامتیں شدید دماغی Deppression اور Dementia کی ہو سکتی ہیں جو روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں اور آخر کار 31 دسمبر 1914ء رات کے 1 بجے حالی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

تجہیز و تکفین:

انتقال کے بارہ گھنٹے بعد یعنی یکم جنوری 2 بجے دن حالیؔ کو حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کی درگاہ میں مدفون کر دیا گیا۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں: ''جب حالیؔ کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالیؔ کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔ حالیؔ کے لوح مزار پر علامہ اقبال کا فارسی شعر کندہ ہے۔

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجان ہا فگند شوری کہ من دارم

یعنی حالیؔ کی قبر کا طواف اہل فہم کو جچتا ہے کیوں کہ ان کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیتی ہے جس سے میں واقف ہوں۔

راقم نے اس پورے قطعہ کو جو اقبال نے حالی کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر پانی پت میں پڑھا تھا ایک جداگانہ مضمون میں ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے تا کہ حالی سے اقبال کی عقیدت ظاہر ہو جائے۔ اقبال نے حالی کی موت کے مضمون کو بھی بانگِ درا کا جز قرار دیا ان کی نظم حالی وشبلی میں لکھتے ہیں:

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گل ستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

ملک بھر میں حالی کے انتقال پر جلسے، مجالس منعقد کیے گئے۔ کئی نامور اشخاص نے منظوم اور نثری خراج عقیدت پیش کیا۔ بعض عمدہ قطعہ تاریخ وفات بطور نمونہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

حامد حسن قادری نے ہجری اور عیسوی میں وفات کی تاریخیں نکالیں۔

تاریخ از کلام پاک

1333 ہجری

فبشرہ بمغفرۃ

1914 عیسوی

حالی کی فاتحہ خوانی چہلم 21 فروری 1915ء کو پانی پت میں شاندار پیمانے پر منائی گئی جس میں ملک بھر کے مشاہیر شریک ہوئے اور یہ طے پایا کہ حالی کی یاد میں ہائی اسکول قائم کیا جائے۔

io

منظوم کلام:

جدول اشعار حالیؔ

شمارہ	عنوان	تعداد	زبان	ہیئت	تعدادِ شعر
1	قطعات اُردو	67	اُردو	قطعہ	470
2	رباعیات اُردو	161	اُردو	رباعی	322
3	غزلیات اُردو	123	اُردو	غزل	1261
4	قصاید اُردو	8	اُردو	قصیدہ	326
5	منظومات سپاس مدح دعائیہ اُردو	19	اُردو	قطعہ	320
6	شخصی مراثی اُردو	7	اُردو	متفرق ہیت	381
7	نظمیں اُردو	33	اُردو	قطعہ/مثنوی/متفرق	3295
8	بچوں کی نظمیں اُردو	14	اُردو	متفرق ہیت	367
9	مسدس مع ضمیمہ اُردو	1	اُردو	مسدس	1374
10	قطعات تاریخ اُردو	8	اُردو	قطعہ	38
11	تراجم اُردو	4	اُردو	متفرق ہیت	263
12	متفرقات اُردو		اُردو	متفرق ہیت	103
13	اشعار فارسی		فارسی	متفرق ہیت	687
14	اشعار عربی		عربی	متفرق ہیت	115

تعدادِ کل اُردو اشعار: 8518
تعدادِ کل فارسی اشعار: 687
تعدادِ کل عربی اشعار: 115

تعدادِ کل اشعار مطبوعہ: 9320

بابِ دوم

رباعیات

(اُردو)

حالؔی کی رباعیات کا مختصر جائزہ

حالی نے اُردو میں (160) اور فارسی میں (20) رباعیات لکھی ہیں جن کا دورِ تصنیف 1863ء سے 1914ء تک پھیلا ہوا ہے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالی کی اُردو رباعیات کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

الف۔ رباعیات قدیم وہ رباعیات جو 1863ء اور 1874ء کے درمیان تصنیف ہوئیں جن کی تعداد صرف سات (7) عدد ہے۔

ب۔ رباعیات جدیدہ وہ رباعیات جو 1874ء اور 1893ء کے درمیان تخلیق ہوئیں جن کی تعداد ایک سو (100) عدد ہے۔

ج۔ رباعیات دورِ آخر 1893ء سے 1914ء تک کی رباعیات کی تعداد اکیاون (51) عدد ہے۔

حالی نے موضوعات کے لحاظ سے مذہبی، سماجی، اخلاقی، فلسفیانہ اور ذاتی رباعیات کہی ہیں:

مذہبی رباعیات میں حمدیہ، نعتیہ، منقبتی اور رثائی رباعیات شامل ہیں۔ سماجی رباعیات میں افراد اور ان کا ماحول پیشِ نظر رکھ کر رباعیات تخلیق کی گئی ہیں۔

حالی کی رباعیات کا بڑا حصہ اخلاقی رباعیات اور انسانی قدروں پر مشتمل ہے۔ ان کے پاس فلسفیانہ اور ذاتی رباعیات نسبتاً کم ہیں۔ اس مقام پر ہم رباعیات کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ حالی کی رباعیات پر میر انیس کا اثر گہرا ہے۔ فارسی رباعیات کی ترکیب بھی اُردو رباعیات کی طرح ہے ان رباعیات کا ذکر ہم نے حالی کی ضمیمہ فارسی میں کیا ہے۔ حالی رباعی کے ہنر سے واقف تھے۔ چناں چہ انہوں نے رباعی کے مضمون کو پہلے دو مصرعوں میں تیار کر کے تیسرے مصرعہ میں پوری طرح تراش خراش کر کے چوتھے مصرعے میں یوں پیش کیا ہے کہ اس کا اثر آتشہ ہو جاتا ہے یہ ان کی فن پر مہارت اور قادرالکلامی کی سند ہے۔ توحیدی اور حمدیہ رباعیات میں حالی کی ندرت بیانی ہے۔

اے عقل کی فہم کی رسائی سے دور — ادراک سے اوجھل تو نظر سے مستور
یہ حسرت دید دل میں قائم رکھیو — بس یاس کی ظلمت میں یہی ہے اک نور

مختلف مذاہب اور عقاید کے لوگ بھی کسی طرح سے معبود کے قائل ہیں۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا — آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے — انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

اگرچہ حالی عشق محمد و آل محمد e میں سرشار رہتے ہیں جس کی جھلک ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ حالی نے کئی نعتیں لکھی ہیں۔ کئی رباعیات حالی نے نعتیہ کہی ہیں۔ حالی کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ معمولی اور محلی الفاظ سے شعر کو دل سے جوڑ دیتے ہیں۔

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا — اور اُمیوں کو خیر امم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار — بچھڑے ہوئے گلے کو بہم تو نے کیا

حضور نبی کریم e کی نسبت سے شہروں اسلافوں اور اولادوں کو شرف ملا جس کا خوب صورت مضمون اس رباعی میں ہے:

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف   یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر   آبا کو بھی ہے تیری ابوت سے شرف

حالی نے اگرچہ کوئی کربلائی مرثیہ یا سلام نہیں لکھا لیکن اُن کے کلام میں منقبتی اور رثائی اشعار درجنوں بکھرے پڑے ہیں۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں مرثیے کو ادب کی اخلاقی درس گاہ بتایا ہے۔ رباعی کی معروف بحر میں خوب صورت رباعی پڑھیے:

کیا پاس تھا قول حق کا اللہ اللہ   تنہا تھے پر اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعت یزید گمراہ   لاحول و لا قوۃ الا باللہ

کربلا کا جانباز حُر ابن ریاحی کی زبانی کلمات سے بنائی گئی رباعی ہے۔

حُر کہتا تھا اے دل شہ ذی جاہ سے مل   گمرہ نہ ہو رہبر حق آگاہ سے مل
سرگشتگیٔ کوئے ضلالت کب تک   اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

بالکل نیا مضمون ہے۔ یہ رباعی حالی کے دورِ اوّل کی رباعیات میں شامل ہے۔

گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا   اک شام میں بے داد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحر غفلت کی یزید   واں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

حالی نئی شاعری کے بانی تھے۔ انہوں نے پہلے ماحول کے مطابق پرانی ڈھب کی شاعری کی پھر اعلان کیا۔

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

حالی شاعری کو مقصد اور سماجی اخلاقی قدروں کو ابھارنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے پاس دار تھے اور انگریزوں کی پھیلائی ہوئی نفرتوں سے نبرد آزما تھے۔

ہندو سے لڑیں گے نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

کان پور کی مسجد کے افسوس ناک واقعہ پر حالی کی یہ دو رباعیاں دیکھیے:

یارانِ وطن نے قوم کا ساتھ دیا
دی قوم نے دادِ قوم بے رو و ریا
ہر سو بھڑک اٹھی آگ ہمدردی کی
ہنگامۂ کان پور نے کام کیا

....

تائید میں حق کے جو بلا آتی ہے
ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملاتی ہے
روٹھے ہوئے بھائیوں کو مناتی ہے

حالی کا مسدس مسلمانوں کے عروج و زوال کا مرقع ہے۔ اس کا آغاز ہی اس رباعی سے ہوتا ہے جو مضمون کی تمہید باندھتا ہے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اس زوال کے کئی اسباب ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ عیش وطرب وغفلت ہے۔

اے عیش وطرب تو نے جہاں راج کیا سلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

مسلمانوں کے اخلاق کی پستی مذہبی جنون تکفیر کے فتاویٰ سب حالی کی نظر میں زوال کے باعث تھے وہ ان کو اسلام کے دامن پر دھبہ محسوس کرتے تھے۔

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب وگناہ کافر کہا واعظ نے انہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

اسلام کے دو مکتب خیال پر حالیؔ نے مضمون متن سے ہی باندھا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں گروہ انتہا پسند اور حقیقت سے دور ہیں۔

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور جو باہمت تھے ہو گئے وہ مختار

رباعی کٹر صنف سخن ہے یہ بحر ہزج کے چوبیس (24) اوزان میں کہی جاسکتی ہے اسی لیے اس کے لیے کہنہ مشقی اور قادرالکلامی کی ضرورت ہے۔ یہ حالی کی مہارت ہے جوانہوں نے رباعی کے مصرعوں میں محاوروں کو ایسا جڑا ہے جیسے نگینہ انگوٹھی میں۔

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ منہ سے یا نہ بولیں حضرت معلوم ہے ہم کو جتنے پانی میں ہیں آپ

....

کہتا تھا کل اک منکر قرآن و خبر　　کیا لیں گے یہ اہل قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ　　کُتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

حالی نے صنف رباعی قطعوں کی طرح مشاہیر شعر و ادب، احباب اور ہم نشینوں کی قدر و منزلت کو اجاگر کرنے کے لیے بھی استعمال کی۔ بعض رباعیاں اگرچہ سیدھی سادی ہلکی پھلکی اور حقیقت اور جذبات سے لبریز ہیں لیکن معروف ہیں۔ اجڑی دلی پر حالی کی یہ رباعی دلوں پر کندہ ہے۔

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی　　وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو　　یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

محسن الملک مہدی علی کی موت پر حالی کے دل سے نکلی ہوئی آواز کو سنیے:

ہیہات وہ تعلیم کا حامی مہدی　　سیّد کا وصی قوم کا ہادی مہدی
برسوں یہ صدا رہے گی کالج میں بلند　　مہدی مہدی دریغ مہدی مہدی
جو قوم کی دوستی کا دم بھرتے ہیں　　خدمت پہ وطن کی ناز جو کرتے ہیں
مہدی سے وہ سیکھ لیں کہ اس کوچے میں　　یوں رہتے ہیں یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں

حالی میر انیسؔ سے بہت متاثر تھے۔ وہ میر صاحب کی زبان دانی اور تخیل کے عاشق تھے۔ حالی کے کلام میں میر انیس کے کلام کی سادگی، مکالموں کی نشست کا عمل محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ حالی کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی زندگی میں ان کو چار اُردو کے عظیم شاعروں یعنی میر تقی میر، میر انیسؔ مرزا غالب اور محمد اقبال میں سے تین شاعروں کی ملاقات اور معاصرانہ ربط رہا۔ انیسؔ پر تین رباعیات یہاں پیش کی جاتی ہیں چوں کہ عیاں را چہ بیاں اس لیے مزید تشریح یا تبصرہ کے عظمت انیس کو رباعیات میں دیکھ سکتے ہیں۔

رباعی 1

اُردو کو انیسؔ نے گراں قدر کیا
پائیں سے اٹھا کر لایق صدر کیا
قوت جو نہاں تھی اس میں دی سب کو دکھا
دانے کو شجر، ہلال کو بدر کیا

میر انیسؔ نے کہا تھا:

مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کردیا
سبک ہو رہا تھا ترازوے شعر
مگر پلّہ ہم نے گراں کر دیا

رباعی 2

اُردو کو راج چار سو تیرا ہے
شہروں میں رواج کو بہ کو تیرا ہے
منسوب ہے لکھنؤ سے جب تک کہ انیسؔ
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

رباعی 3

دلی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ
اور لکھنؤ کا انجمن آرا تھا انیسؔ
دلی تھی جڑ اس کی لکھنؤ اس کی بہار
دونوں کا ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیسؔ

io

دَورِقدیم

(1863ء تا 1874ء)

(1)

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

(2)

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے
جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
الفت پہ، وفا پہ، جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روتے تھے تو اب روئیں گے

(3)

فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گزرے
اک خستہ جگر کی رات کیوں کر گزرے
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیوں کر گزرے

(4)

یاد اس کی یہاں ورد مدام اپنا ہے
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجیے کہ ہے نام اس کا
کس طرح نہ کیجیے کہ کام اپنا ہے

(5)

کیا پاس تھا قول حق کا اللہ اللہ
تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزیدِ گمراہ؟
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

(6)

حُر کہتا تھا اے دل شہِ ذی جاہ سے مل
گمرہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مل
سرگشتگیِ کوے ضلالت کب تک
اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

(7)

گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا
اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحرِ غفلت کی یزید
واں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

دَورِ جدید

(1874ءتا 1893ء)

8۔توحید

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

9۔توحید

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

10۔توحید

طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اُٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

11۔توحید

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور
منکر بھی پکار اٹھتے ہیں تجھ کو مجبور
خفاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ
خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور

12۔توحید

جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے
دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اطفال
لیکن انہیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

13۔توحید

مٹی سے ہوا سے آتش و آب سے یاں
کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک
گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں

14۔توحید

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے
طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور
سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

15۔توحید

کیا ہو گی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد
دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
پر جو کہ ہیں تجھ سے لو لگائے بیٹھے
رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد

16۔نعت

بطحاے عرب کو محترم تُو نے کیا
اور اُمیوں کو خیرِ اُمم تُو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار
بچھڑے ہوئے گلّے کو بہم تُو نے کیا

17۔نعت

زُہاد کو تُو نے محوِ تمجید کیا
عشاق کو مست لذّت دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی
توحید کو تو نے آ کے توحید کیا

18۔نعت

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا کو بھی ہے تیری اُبوت سے شرف

19۔صلحِ کل

ہندو سے لڑیں، نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

20۔ترکِ شعرِ عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تُو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

21۔پیرانِ زندہ دل

خوش رہتے ہیں دکھ میں کامرانوں کی طرح
ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل ان کے ہیں ظرف ان کے جو کرتے ہیں تیر
ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

22۔نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دُور بہت

23۔امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں
پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے، کہیے اب کیا ہے صلاح؟
فرمایا کہ بھائی جان! جی ہے تو ہے جہاں

24۔عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پر اتنی ہے خبر
اک مشغلہ دلچسپ ہے بے کاروں کا

25۔نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد، اے فرزند!
اک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

26۔دوستوں سے بے جا توقع

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے
جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے
صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

27۔ شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو! مفتوں
گردن پہ نہ لو عقل خدا داد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے، اب تم
کرتے ہو فزوں، جنوں پہ اک اور جنوں

28۔ غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دُور
پر عیب سے بچیے تا بہ مقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

29۔ گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ، زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع، دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حُسنِ گفتار
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

30۔ شرطِ قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں
پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مفت یہ امکاں ہے، مگر
عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

31۔ طالب کو سوچ سمجھ کر پیر بنانا چاہیے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہل عرفان و یقیں
پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہو نادان کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی
اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

32۔ عالم و جاہل میں کیا فرق ہے؟

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہم سر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

33۔ موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجام ترقی بشر
یاروں سے کہا پیر مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انسان میں عیب
ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

34۔ مسرف کو کیوں کر فراغت حاصل ہو سکتی ہے

اک منعم مسرف نے یہ عابد سے کہا
کر میرے لیے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سوئے چرخ
محتاج کر اس کو جلد اے یار خدا!

35۔کام کی جلدی

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج، تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

36۔غرض

ہے نفس میں انساں کے جبلی یہ مرض
ہر سعی پہ ہوتا ہے طلب گارِ عوض
جو خاص خدا کے لیے تھے کام کیے
دیکھا تو نہاں ان میں بھی تھی کوئی غرض

37۔انقلابِ روزگار

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے علَم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اس کی ہے نوبت تو کل اُس کی باری
بن بن کے یوں ہی کھیل بگڑ جاتے ہیں

38۔تقاضائے سن

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا
پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی امید
وہ وقت گئے، اب اور موسم آیا

39۔جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں، وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا

دنیا کو ہمیشہ نقشِ فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

40۔آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان
اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جوان
ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

41۔شانِ اِدبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان
برسات میں سبزے کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان
یاد آئی ہمیں قوم کے اِدبار کی شان

42۔نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا
شیریں سخنی سے شہد فائق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہ ہو دل میں نفاق
آساں نہیں مقبول خلائق ہونا

43۔ مسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہ ہو دشمن اخواں پکا
ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے
سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکا

44۔ مکروریا

حالی رہ راست جو کہ چلتے ہیں سدا
خطرہ انہیں گرگ کا، نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر
بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

45۔ جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں
پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباس تربیت سے، ورنہ
ہیں طوسی و رازی انہیں شکلوں میں نہاں

46۔ علم

اے علم کیا ہے تونے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

47۔علم

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے
سر چشمہ نعما و آبادی تو ہے
آسائش دو جہاں ہے سائے میں ترے
دنیا کا وسیلہ، دین کا ہادی تو ہے

48۔علم

ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں
مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہ نخشب [1] کی طرح
رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

49۔خاندانی عزت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے
عزت نہیں اس کو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے فضلے کا نسب بھی عالی
پر اُس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

50۔عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا، مجھ سے ہے عزت ہے جہاں
فرمایا ہنر نے، میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی، غلط ہے دونوں کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

---

[1] وہ چاند جو حکیم ابن عطا معروف بہ مقنع نے شہر نخشب میں بنایا تھا اور جو با قاعدہ ایک کنویں سے طلوع وغروب ہوتا تھا، اس کی روشنی چند میل تک محدود رہتی تھی۔

51۔توقع بے جا

ہیں یار رفیق، پر مصیبت میں نہیں
ساتھ ہیں عزیز، لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انساں سے توقع ہے عبث
جو نوع بشر کی خود جبلّت میں نہیں

52۔عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی
اتنی ہی مغایرت ہے یاں اور خویشی
وہ دوست نہیں جس نے کیا فکر مآل
ضدین ہیں دوستی و دور اندیشی

53۔عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

54۔عیش و عشرت

اے عیش و طرب! تو نے جہاں راج کیا
سلطاں کو گدا، غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل
بغداد کو، قرطبہ کو تاراج کیا

55۔غیبت

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بد گوئ خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمت میں

56۔عشق

اے عشق! کیا تونے گھرانوں کو تباہ
پیروں کو خرف [1] اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری
قوموں کو ذلیل، خاندانوں کو تباہ

57۔سببِ زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
سمجھو کہ وہاں ہے کوئی ''برکت کا قدم''
یا تو کوئی ''بیگم'' ہے مشیر دولت
یا ہے کوئی ''مولوی'' وزیر اعظم

58۔دین ودنیا کا رشتہ

دنیا کو دیے دین نے اسرار و حِکَم
دنیا نے کرم دین کی تھامی جس دم
گر دین کی ممنون بہت ہے دنیا
دنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

---

[1] سترا بہترا: مخبوط الحواس

59۔ آزادگانِ راست باز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ
کافر کہا واعظ نے انہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت
لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

60۔ بے پروائی و بے غیرتی

اسباب پہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدار
اس قوم کا چھٹنا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جس کو ہرگز پروا
ذلت سے نہیں ہے جس کو ہرگز کچھ عار

61۔ عفو باوجود قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

62۔ سختی کا جواب نرمی سے

فتنے کو فرو کیجیے بہ ضبط و تمکیں
زہر اُگلے کوئی تو کیجیے باتیں شیریں
غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے
اس عارضے کا علاج بالمثل نہیں

63۔ ہمت

تیمور نے اک مورچہ زیر دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار
آخر سرِ بام لے کے پہنچا تو کہا
مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار

64۔ کم ہمتی

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار
دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور
جو با ہمت تھے بن گئے وہ مختار

65۔ پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا
ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذت سے ندامتوں کی جانا ہم نے
دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

66۔ تاسف بروفات نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم نیرؔ

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبک طناز
آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبل زار
سو اس کی بھی کل سے نہیں آتی آواز

67۔ تاسف بر وفات نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم نیّر

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیّر باقی
وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی [1]
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

68۔ محنت

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

69۔ گدائی کی ترغیب

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا
کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا اُن کی گردن پہ وبال
دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

70۔ تکفیر اہل اسلام

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں
سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہو گا مرقد میں سوال
تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں؟

---

[1] یہ اُن شعرائے دہلی کے نام ہیں جن کے ساتھ راقم کو ربط و اختصاص رہا ہے، عام اس سے کہ وہ مشہور و نام ور ہوں یا نہ ہوں۔ (حالی)

71۔ترکِ عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو
کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانہ قیس و کوہ کن یاد نہیں
چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

72۔تنزلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

73۔اوّل کوشش اور بعد دعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے
پھر چاہیے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا
پائی نہ نجات نوح نے طوفاں سے

74۔کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لیے
بنتی نہیں زندگی میں بے کام کیے
جیتے ہو تو کچھ کیجیے زندوں کی طرح
مردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

75۔ جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے بیچ میں سب سمونے والے
بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جن کی جیبوں میں مدام
اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

76۔ چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار
بدظن نہ ہو عیب اس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر
کر حسن و جمال کا نہ اس کے انکار

77۔ سکوتِ درویشِ جاہل

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ
خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ منہ سے یا نہ بولیں حضرت
معلوم ہے ہم کو جتنے پانی میں ہیں آپ

78۔ ملحدوں کا طعن مسلمانوں پر

کہتا تھا کل اک منکر قرآن و خبر
کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ
کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

79۔ دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا
ہو گا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھ سا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر
اس سے بھی گیا جس کے ہزاروں ہوں خدا

80۔ دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق، سماعت نہ ہو جب کانوں میں
دانائی کی باتوں میں اور افسانوں میں
غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح
دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

81۔ ریفارمر کی حد

دھونے کی ہے، اے ریفارمر! جا باقی
کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

82۔ اپنی تعریف سن کر ناک چڑھانا

تعریف سے کھل جاتے ہیں ناداں فی الفور
داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سن کر ناخوش
مقصود یہ ہے کہ ہو ستایش کچھ اور

83۔ حُسنِ ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں
نیکی میں شک اس کی کوئی لایا ہی نہیں
ہو سکہ رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ
پر اس کو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں

84۔ دینداروں کی برائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حالِ اہلِ اسلام
اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
بد پرہیزی سے بگڑے اپنی بیمار
اور مفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

85۔ فکرِ عقبیٰ

منزل ہے بعید باندھ لو زادِ سفر
مواج ہے بحر رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے لے چلو مال کھرا
ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہ گزر

86۔ انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انساں
ممکن ہے بدی کا نہ رہے اس میں نشاں
ممکن تو ہے سب کچھ پہ حقیقت یہ ہے
انسان ہے اب تک وہی قرن الشیطاں

87۔ سلاطین کا عشق

ہر چند بُرا ہے عشق کا سب کے مآل
پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
سلطاں ہے اگر ظلِّ الٰہی تو عشق
ہے ظلِّ الٰہی کے لیے وقتِ زوال

88۔ وقت کی مساعدت

اے قوت بگاڑ کا ہے سب کے چارا
پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تُو ہمارا ساتھی
پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

89۔ بڑھاپے میں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے

کی طاعت نفس میں بہت عمر بسر
انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیت شب اٹھا چکے اب حالی
مجلس کرو برخاست ہوا وقتِ سحر

90۔ دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
زر دار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک
ہے جوہر انساں کی کسوٹی سونا

91۔حد سے زیادہ غصہ قابلِ عفو ہے

غصے پہ کسی کے غصہ آتا ہے وہیں
جب تک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر
پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

92۔سفہا کی مدح وذم

کرتے ہیں سفیہ اگر مذمت تیری
کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر، نصیب اعدا
رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

93۔مرضِ پیری لاعلاج ہے

اب ضعف کے پنجے سے نکلنا معلوم
پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہے محال
آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

94۔اسراف

مسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
نعمت نہ خدا کی رایگاں یوں کھوئیں
گر بخل پہ لوگ ان کے ہنسیں بہتر ہے
اس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی روئیں

95۔ رَدِّ سوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے، نہ صواب
زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
بدتر ہے ہزار بار اے دوں ہمت!
سائل کے سوال سے ترا تلخ جواب

96۔ کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں
جو دیکھ کے چکھ کے دل سے بھائے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک!
جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

97۔ علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال
مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی
اندیشۂ فوت ہو، نہ ہو خوفِ زوال

98۔ اچھوں کو برا سننے میں بھی مزہ آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا
جو کر کے بھلا، خلق سے سنتے ہیں برا
ان گالیوں کا ہے جن کو چسکا حالی
آتا نہیں ان کو کچھ دعاؤں میں مزا

99۔ شکریہ مدحِ کلامِ راقم

جوشِ خُمِ بادہ، جامِ خالی میں ہوا
پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا
تسلیم[1] نے کچھ اس طرح سے دی دادِ سخن
مجھ کو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

100۔ قیامِ جے پور

دل کہتا ہے حالی سے کہ پچھتایئے گا
جے پور میں ٹھہرنے کی جو ٹھہرایئے گا
جس طرح کہ غربت میں وطن کی ہے یاد
غربت کو وطن میں یاد فرمایئے گا[2]

101۔ احسان بے منت

احساں کے ہے گر صلے کی خواہش تم کو
تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو گر احسان تو کر دو اسے عام
اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

---

[1] ''مولوی سلیم الدین مرحوم نارنولی، مقیم جے پور متخلص بہ تسلیم نے چند قطعے اردو اور فارسی کے راقم کے کلام کی ستائش میں اُس وقت بھیجے تھے جب کہ مدت سے فکرِ شعر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان قطعوں کے جواب میں یہ رباعی لکھی گئی تھی۔'' (حالی)

[2] یہ رباعی دیوانِ حالی، رباعیاتِ حالی یا اور کسی مجموعے میں شایع نہیں ہوئی۔ حالی نے یہ رباعی اس وقت کہی تھی جب کہ وہ بہ زمانہ قیام جے پور، مولوی سلیم الدین نارنولی، متخلص بہ تسلیم کے یہاں اُن کی ادبی صحبتوں میں شریک ہوئے تھے اور قاضی فرزند علی فقیر کے مکان پر فروکش تھے۔
(بحوالہ تذکرہ شعرائے جے پور، مصنفہ احترام الدین احمد شاغل، صفحہ:148)۔ (ا ص)

102۔ قانون بداخلاقی سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً بے کار
حاشا کہ ہو ان پہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں ان کو نہیں حاجت ان کی
اور بد نہیں بنتے نیک ان سے زنہار

103۔ مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہلِ شر سے اڑنا نہ کہیں
بھڑکے گی مدافعت سے اور آتشِ کیں
گر چاہتے ہو کہ چُپ رہیں اہلِ خلاف
جز ترکِ جواب کوئی تدبیر نہیں

104۔ ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل
اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اَجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اٹھ کر کہ حضور
ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل

105۔ انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

106۔ بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

آہیں پیری میں شیخ! بھرتے نہیں یوں
دل دیتے ہیں پر جی سے گزرتے نہیں یوں
تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا
جو جیتے ہیں اس طرح وہ مرتے نہیں یوں

107۔ واعظوں کی سخت کلامی

اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام
واعظ نے درشتی سے کیا اس سے کلام
بولا کہ حضور مقتدا ہوں جس کے
ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

108۔ نواب وقار الامرا اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق نے اس کی چھوڑ دی ہمراہی
اقبال پہ جس نے فتح پانی چاہی
حالی لے جائے کون بازی ان سے
ہے جن کی رگوں میں خونِ آصف جاہی [1]

---

[1] یہ رباعی 1309ھ میں جب کہ راقم حیدر آباد میں مقیم تھا اور نواب وقار الملک بمبئی سے پولو میں بازی جیت کر آئے تھے، لکھی تھی۔ مگر ان کی خدمت میں بھیجی نہیں گئی۔ خونِ آصف جاہی میں اس بات کا اشارہ ہے کہ حضور سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں اور اقبال کے لفظ میں ان کے خطاب کی طرف اشارہ ہے۔ (حالی)

دَورِ آخر

(1893ء تا 1914ء)

109۔توحید

ہستی تری گو نہیں ہے محتاجِ دلیل
صبرِ دلِ مضطر کی مگر کیا ہے سبیل
یہ طبعِ خسیس مطمئن ہو کیوں کر
بے دیکھے ہوا نہ مطمئن جب کہ خلیل

110۔توحید

اے عقل کی فہم کی رسائی سے دور
ادراک سے اوجھل تو نظر سے مستور
یہ حسرتِ دید دل میں قائم رکھیو
بس یاس کی ظلمت میں یہی ہے اک نور

111۔توحید

سُقراط منادی میں تری کام آیا
سر تیرے لیے حسین نے کٹوایا
مر کر کوئی پائے یا سر کٹوا کر
پایا تجھے جس نے اُس نے سب کچھ پایا

112۔ توحید

دریا سے اٹھا کے بھاپ مینہ برسایا
پیراہن سبز خاک کو پہنایا
دانے کو کیا نخل تناور تو نے
پانی جڑ سے پھننگ تک دوڑایا

113۔ خدا کی بے نیازی

منوائی ہے ہار سب سے بازی نے تری
طبقے اُلٹے ہیں ترکتازی نے تری
ہے کالوری[1] و کربلا اس پہ گواہ
جو گھر گھالے ہیں بے نیازی نے تری

114۔ طالب صادق کامیاب ہوتا ہے

طالب کا رہے گا پڑ کے پاسا آخر
دے گا اسے صدق دل دلاسا آخر
جھوٹی نہیں گر پیاس تو آگے پیچھے
دریا پہ پہنچ رہے گا پیاسا آخر

115۔ تشنگی طلب

کب تک کوئی سوزشِ نہانی کو چھپائے
کب تک اپنے کو تشنہ سیراب دکھائے
"کج دار و مریز"[2] سے تری اے ساقی
پتھر کا کلیجا ہو تو پانی ہو جائے

---

[1] وہ مقام جہاں عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ مصلوب ہوئے تھے۔
[2] انوکھی بات جس کی تعمیل مشکل ہو۔

116۔ پیری

علم و عمل و کتاب سے نفرت ہے
لکھنے پڑھنے کے نام سے وحشت ہے
تونے ہر دردِ سر سے دی آ کے نجات
پیری! رحمت ہے تجھ کو صد رحمت ہے!

117۔ پیری

پیری نہیں منزلِ فنا ہے گویا
اب کوچ کا وقت آ لگا ہے گویا
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کافور
اک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

118۔ انسان کی عظمت کا راز

دولت کی ہوس اصل گدائی ہے یہ
سامان کی حرص بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے، تو ہے یہ شاہنشاہی
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ

119۔ کینچلی میں سانپ

محنت سے وصول ایک پیسہ ہو اگر
کر اشرفیوں کی نیولی پر نہ نظر
یہ کینچلی میں بھرا ہوا سانپ ہے سانپ!
ہاں سوچ سمجھ کے ڈالنا ہاتھ اس پر

120۔ دولت کی تعریف

دولت خرمن بھی، برقِ خرمن بھی ہے
تلوار کی دھار بھی ہے جوشن بھی ہے
تھوڑا سا ہے اس میں شر تو ہے خیر بہت
گر سانپ ہے یہ تو سانپ کا من بھی ہے

121۔ قناعت مفقود ہے

حاصل ہے اگر خوشی تو ہے غم کی تلاش
گو شہد میسر ہے تو ہے سم کی تلاش
قانع نہیں کوئی حالت نقد پہ یاں
جنت میں بھی شاید ہو جہنم کی تلاش

122۔ خوش رہنے کا نسخہ

اولاد کا ہے ایک کے دل میں ارماں
اور دوسرے پر ہے بار اولاد گراں
گر چاہے عالم تعلق میں خوشی
رکھے نہ یہاں خوشی کی اُمید انساں

123۔ سب صحبتیں برہم ہونے والی ہیں

نقشے ہیں خوشی کے سب بگڑنے والے
پودے نہیں اس کے جڑ پکڑنے والے
مل بیٹھنا ہے یہ ناؤ ندی سنجوگ
ہیں اب کوئی دم میں سب بچھڑنے والے

124۔ اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ

حاکم سے بھلائی کی توقع ہے محال
جب تک کہ رعیت کے بھلے ہوں نہ خصال
تم اپنے سوا کسی کے محکوم نہیں
عُمّال ہیں بس یہی تمہارے اعمال

125۔ موجودہ مصائب کی وجہ

ہیں برف سے، یخ سے ملک پامال کہیں
طاعون ہے نازل کہیں، بھونچال کہیں
ابتر ہے کچھ ان دنوں نظامِ عالم
عُمّال نہ ہوں خلق کے اعمال کہیں

126۔ افسونِ محبت

ہے جن کو کہ صیدِ دلِ انساں کا خیال
لازم ہے کہ پھیلائیں محبت کا جال
اُستاد کو یاد ہو اگر حُبّ کا عمل
تعطیل میں بھی نہ چھوڑیں مکتب اطفال

127۔ زخارفِ دنیوی کی بے ثباتی

گلشن میں نہیں ہے تری اے گل! جوڑی
تونے نہیں آن حسن کوئی چھوڑی
تھا جی میں کہ تجھ سے باندھیے عہدِ وصال
پر کیجیے کیا، عمر ہے تیری تھوڑی

128۔ابدی حیات کس چیز میں ہے

گر چاہو کہ جیتے جی بھلے کہلاؤ
اپنوں کو سلوک نیک سے پرچاؤ
پر مد نظر ہو گر حیاتِ ابدی
بیگانوں کو آشنا بناؤ، جاؤ!

129۔ کُنْ یَدًا وَّلا تَکُنْ لِسانًا

یارو نہیں وقت عیش و آرام کا یہ
موقع ہے اخیر فکر انجام کا یہ
بس حُبِّ وطن کا جپ چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

130۔ذلیل زندگی موت سے بدتر ہے

نکبت میں ہے رنج و غم، خوشی سے اولی
رونا یاروں کا ہے ہنسی سے اولی
ہیں دیس میں بے وقار، پردیس میں خوار
مرنا ہے بس ایسی زندگی سے اولی

131۔قدرِنعمت بعدزوال

دو چار اگر ہیں کام کرنے والے
ہیں اُن کو ہزاروں نام دھرنے والے
تب قوم کی شاید کہ کھلیں گی آنکھیں
مر جائیں گے جب قوم پہ مرنے والے

132۔ قومی خدمت کا صلہ

کہہ دو جنہیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ
طعنے جھیلو، برا سنو، گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سر دست
گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ!

133۔ مصلحت کی بات ماننی لازم ہے

گر پیر مغاں کہے ''مریز و کج دار''
ہے مصلحت اس میں کچھ نہ کچھ اے مے خوار
ہوتا نہ مساکین کا گر خیر اندیش
خضر اُن کا نہ توڑتا سفینہ زنہار [ا]

134۔ انصاف کی پکار

پاؤ گے نہ کوئی قاف سے لے تا قاف
حق تلفیوں کے دل میں نہ ہوں جس کے شگاف
گر غور سے سنیے، غل ہے یہی چار طرف
انصاف! انصاف! آہ انصاف انصاف!!

135۔ خود اعتمادی

اُترو دریا سے اپنے بل تیر کے پار
کب تک تیرو گے ہو کے تونبوں پہ سوار
تم ڈوبنے کے یہ کر رہے ہو ساماں
اوروں کا سہارا تکنے والو ہشیار!

ا۔ قرآنی تلمیح۔ حضرت خضر نے کشتی مسکیں میں سوراخ کر دیا تھا تا کہ ظالم حاکم اُسے اپنے تصرف میں نہ لائے۔

136۔ پیری میں نفس کا اغوا کرنا

پیری میں نہ عقل چین لینے دیتی
کرتا رہتا نہ دل کو گر نفس قوی
کہتا ہے یہ، جب موت کا آتا ہے خیال
بابا 'کے آدمی و کے پیر شدی'

137۔ مردہ اور زندہ اقوام کا فرق

اقوام میں زندگی کی ہے روح جہاں
چونک اُٹھتے ہیں اک "ہاں" پہ وہاں پیر و جواں
کرتی نہیں وحی مردہ قوموں میں وہ کام
جو کام اک کارٹون کرتا ہے وہاں

138۔ نفس کی خواہشیں دولت کی دشمن ہیں

یا نفس کی خواہشوں کو روک اے زردار
یا فاقہ و فقر کے لیے رہ تیار
لاگے ہوئے ہیں چار طرف گھات میں چور
گھر سے ہشیار! مال و زر سے ہشیار!

139۔ دنیا کی بے ثباتی

گھر بار اپنا ہے اور نہ دولت اپنی
کنبا اپنا، نہ ہے قرابت اپنی
اپنی نہیں کوئی چیز، یاں دو کے سوا
اک موت اپنی ہے، ایک تربت اپنی

140۔ تشنگیِ طلب

ساقی! اے سب کے کام آنے والے
خم اپنے پرائے پہ لنڈھانے والے
چھینٹا اک ادھر بھی بادۂ گلگوں کا
او تشنہ لبوں کی دوں بجھانے والے

141۔ حسن کا تسلط

ہے حسن کا یہ کرشمہ، چشم بددور
عشاق کی بے خودی، حسینوں کا غرور
یہ وہ مئے تند ہے نشے میں جس کے
عاشق بھی ہے چور اور معشوق بھی چور

142۔ علم کی ترقی کا نتیجہ

بڑھتا جاتا ہے جس قدر علم بشر
کرتے جاتے ہیں شک خیالات میں گھر
ہوتی جاتی ہے دھندلی اتنی ہی فضا
جتنی کہ وسیع ہوتی جاتی ہے نظر

143۔ دنیا سراسر شر ہے

دنیا ہے وہ شر جس میں نہیں نام کو خیر
رشتہ ہے بدی سے اُس کا نیکی سے ہے بیر
اور سب سے بڑا یہ عیب ہے اس میں کہ آہ
سرتی نہیں یاں کسی طرح اُس کے بغیر

144۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہ

ہے عام بد و نیک پہ حق کی رحمت
پہنچاتا ہے رزق سب کو وہ بے منت
تم بھی یونہی رکھو سب سے یکساں برتاوَ
بندے جس کے ہو اس کی سیکھو عادت

145۔ عقلِ خود بیں

ہے عازمِ راہِ دور عقلِ خود بیں
آگے مگر اپنی حد سے بڑھ سکتی نہیں
ہے شیش محل میں بند گویا کہ مگس
جب اُڑتی ہے وہ جاتی ہے ٹکرا کے وہیں

146۔ درشانِ انیس لکھنوی

دلی کی زبان کا سہارا تھا انیس
اور لکھنو کا انجمن آرا تھا انیس
دلی تھی جز اس کی لکھنو اس کی بہار
دونوں کا ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیس

147۔ درشانِ انیسؔ لکھنوی

اُردو کو راج چار سُو تیرا ہے
شہروں میں رواج کُو بہ کُو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سخن ہے باقی
تو لکھنو کی ہے، لکھنو تیرا ہے

148۔ در شانِ انیسؔ لکھنوی

اُردو کو انیس نے گراں قدر کیا
پائیں سے اٹھا کے لائقِ صدر کیا
قوت جو نہاں تھی اس میں دی سب کو دکھا
دانے کو شجر، ہلال کو بدر کیا

149۔ محسن الملک کی وفات پر

ہیہات وہ تعلیم کا حامی مہدی
سید کا وصی، قوم کا ہادی مہدی
برسوں یہ صدا رہے گی کالج میں بلند
مہدی! مہدی! دریغ، مہدی! مہدی!

150۔ محسن الملک کی وفات پر

مر کر مہدی نے زندگانی پائی
جی کھو کے جزائے جاں فشانی پائی
زندہ تھے تو چند روزہ مہماں تھے یہاں
جب مر گئے، عمر جاودانی پائی

151۔ محسن الملک کی وفات پر

بے عذر ہر ایک کام انجام دیا
تھکنے کا نہ بھول کر کبھی نام لیا
جو کام پہ اس کے نکتہ چیں تھے شب و روز
دی جان انہی کے کام میں، کام کیا

152۔ محسن الملک کی وفات پر

مہدی کے گئی نہ دل سے کالج کی لگن
یاں تک کہ ہوا اس کے کفن زیبِ بدن
پورا کیا جیسے پال نے دینِ مسیح
اُس نے یونہی پورا کیا سید کا مشن

153۔ محسن الملک کی وفات پر

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا
خدمت کے لیے قوم کی، مر مر کے جیا
پیری ہوئی سد راہ اس کی، نہ مرض
صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

154۔ محسن الملک کی وفات پر

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر
غل علم کا برہما میں مچایا جا کر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی
واں آبِ حیات اُن کو پلایا جا کر

155۔ محسن الملک کی وفات پر

پیری میں جوانوں کو کیا مات اُس نے
آرام پہ اپنے مار دی لات اُس نے
تدبیر سے، محنت سے، دکھا دی سب کو
کالج کی ترقی میں کرامات اُس نے

156۔ محسن الملک کی وفات پر

جو قوم کی دوستی کا دم بھرتے ہیں
خدمت پہ وطن کی ناز جو کرتے ہیں
مہدی سے وہ سیکھ لیں کہ اس کوچے میں
یوں رہتے ہیں، یوں جیتے ہیں، یوں مرتے ہیں

157۔ روزنامہ ہمدرد دہلی کا اجرا

تمغوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب
اک ملک کی خدمت کا ہے سودا یا رب
ہمدرد کو اسم مُسَمّٰی کیجو!
اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے اب

158۔ ہنگامہ مسجد کان پور

یاران وطن نے قوم کا ساتھ دیا
دی قوم نے داد قوم بے رو و ریا
ہر سو بھڑک اٹھی آگ ہمدردی کی
ہنگامہ کان پور نے کام کیا

159۔ ہنگامہ مسجد کان پور

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا
گھر اہل وطن کے دل میں الفت نے کیا
تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے
جو کار نمایاں کہ مصیبت نے کیا

160۔ہنگامہ مسجد کان پور

تائید میں حق کے جو بلا آتی ہے
ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملواتی ہے
روٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے

io

باب سوم

غزلیات

(اُردو)

حالؔی کی غزل گوئی

جہاں تک حالی کی غزل گوئی کا تعلق ہے اس کی ابتدا کا تعین مشکل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے اپنے ابتدائی دور کی غزلیں تلف کر دیں چناں چہ ان کی غزلیات کا پہلا دور جو حالی شناسوں نے 1863ء سے 1874ء متعین کیا ہے وہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے مصاحب ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں غالب کے ساتھ ملاقاتیں اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے مضامین کے ذریعے سرسید کے خیالات سے واقفیت بھی ہو رہی تھی۔

حالی کے کلام میں دورِ اوّل یا قدیم دور کی تیس (30) غزلیں شامل ہیں جن کے مجموعی اشعار کی تعداد (308) ہے۔ حالی نے دور دوم یا جدید غزلیات کو 1874ء اور 1893ء کے درمیان لکھا۔ یہ وہ غزلیات ہیں جن کے اشعار نساخ کے تذکرہ سخن مطبوعہ 1874ء میں شامل نہیں بلکہ تمام غزلیات دیوان حالی مطبوعہ 1893ء میں موجود ہیں۔ جنکی مجموعی تعداد چھیاسی غزلیں اور (863) اشعار ہے۔ دور دوم کی طرح حالی کی غزل گوئی کا آخری دور بھی بیس سال پر مشتمل تھا لیکن حالی نے صرف سات غزلیں کہیں۔ اس طرح حالی کی کل غزلیں (123) اور ان کے مجموعی اشعار کی تعداد

(1261) ہوتی ہے۔یعنی حالی کے کلام کا تقریباً پندرہ فیصد حصہ غزلوں کی شکلوں میں ہے۔ حالی کی قدیم اور جدید غزلوں میں عموماً اشعار سات سے بارہ شعر ہوتے ہیں لیکن تیس (30) شعر کی غزل، دلی سے متعلق غزل مسلسل ہے اور سب سے کم پانچ شعروں کی غزل بھی ہے۔ حالی کی غزلوں میں نعتیہ غزلیں بھی شامل ہیں۔عموماً حالی کی غزلیں مردف ہوتی ہیں لیکن غیر مردف بھی موجود ہیں۔ حالی کئی غزلوں میں مقطعے کے شعر کو اپنی ذات سے منسوب کر کے تعلی کم اور بیشتر عجز و انکساری کا پیام دیتے ہیں۔

غزلیاتِ قدیم	(1863ء۔1874ء)	30 عدد...... 308 شعر
غزلیاتِ جدید	(1874ء۔1893ء)	86 عدد...... 863 شعر
غزلیاتِ دورِ آخر	(1893ء۔1914ء)	7 عدد...... 90 شعر
کل غزلیں		123 عدد...... 1261 شعر

یہ سچ ہے کہ حالی کی بلند شاعرانہ حیثیت کی وجہ ان کا مسدس اور ان کی قومی ملی سماجی نظمیں تھیں۔لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حالی کی غزلیں بہ خصوص پہلے دور کی قدیم غزلیں ان کے شعری شعور اور فن کی نقیب تھیں جن میں تخیل کی روایتی چاشنی نے دو آتشہ کر دیا تھا۔ حالی سعدی، میر، غالب، انیس اور شیفتہ سے متاثر تھے جس کی جھلک ان کی غزلوں میں عیاں اور نہاں ہے۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

ڈاکٹر اعجاز حسین نے حالی کی غزلوں کے بارے میں سچ کہا ہے کہ

''ان میں میر کا درد غالب کا انداز بیان اور شیفتہ کی سادگی اور سچائی کو یک جا کر دیا ہے۔''

حالی کی قدیم غزلوں کا مطالعہ بھی یہ بتاتا ہے کہ وہ روایتی موضوعات یعنی معاملہ بندی، خمریات، تصوف اور فلسفہ وغیرہ سے دلچسپی رکھتے نہ تھے کیونکہ ایسے اشعار

ان کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے یہ اور بات ہے کہ اگر حالی نے انہیں نکال دیا ہو کیونکہ اس طرح کے مضامین تمام تر اساتذہ شعرا تک باندھتے تھے جن سے حالی مستفید تھے۔ حالی یقیناً میر کی طرح حساس تھے لیکن میر کی طرح اسیرِ غم نہ تھے بلکہ وہ سحر کے منتظر تھے۔

دل پُر درد سے کچھ کام لوں گا   اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

درحقیقت حالی کی غزل گوئی کا یہ سفرِ غمِ جاناں سے غمِ دوراں بنتا گیا۔ حالی نے انسانی حقوق اور قدروں کو پامال ہوتا دیکھا ان کے قلب و دماغ میں شعور اور احساس کی جدید فضا پیدا ہوئی چناں چہ اپنی خداداد فنی قدرت کو برصغیر کے سماجی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی حالات پر متمرکز کر کے شاعری کے دفتر کو رفارمر کا صحیفہ بنا دیا۔ اس طرح عشقیہ روداد کو درد و گداز کے ہمراہ عزم و استقلال کی کیفیت میں پیش کر کے جدید غزل کا ڈول ڈالا۔

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں   جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

حالی نے نہ صرف قطرے میں دجلہ دیکھا بلکہ دوسروں کو دکھایا چناں چہ مقدمہ شعر و شاعری میں شاعروں کو اس طرف متوجہ بھی کیا۔ حالی نے قدیم و جدید غزلوں کی تشبیہات استعارات اور اشارات کے قدیم ساغروں میں نئی شراب بھری، زبان اور اُسلوب کو نئے دور کے تقاضوں سے آشنا کروایا جو بعض شاعروں اور ادیبوں کی سخت مخالفت کے باوجود بھی موردِ تقلید قرار دی گئی۔

نا جانے کیوں اُردو شاعری پر بچپن سے آج تک غزل کی حکمرانی ہے۔ غزل کی زباں پر ٹکسال کی سند ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ فارسی کا اثر بھی ہو کیوں کہ دودھ کا اثر بہرحال رہتا ہے۔ اُردو نے اگرچہ ماں کا دودھ نہیں پیا مگر فارسی دایہ کا دودھ تو ضرور پیا تھا جس کا اثر آج تک باقی ہے۔

بیسویں صدی میں نظمیں غزل سے عمدہ لکھی گئیں۔ نظم کے شاعروں میں حالی اقبال، جوش، فیض اپنے اپنے دور میں مفید شعر کے تاجدار مانے گئے۔ حالؔی کی بیانیہ شاعری کا مسدس تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن ان کی زیادہ تر نظمیں سوائے مناجات بیوہ، چپ کی داد اور شکوہ ہند کے سوا گمنامی کا شکار رہیں۔

حالی میرؔ کے مقلد ہیں۔ ان کی شریعت شاعری میں عام آدمی کی زندگی کے مسائل اور جذبات کو نغمگی کے ساتھ پیش کرنا شاعری ہے۔ میرؔ کے کلام کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ میر صاحب نے دونوں قدروں سے استفادہ کیا ہے اور ایک کو دوسرے کے لیے قربان نہیں کیا۔ اور حالی نے نظیرا کبرآبادی کی طرح اس مسلک کی پیروی کی ہے مگر یہاں حالی اور نظیرؔ کے درمیان ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ نظیرؔ نے زندگی کے نشاط پرور مسائل پر مستانہ اور رندانہ کیف کے ہمراہ سب کچھ قربان کر دیا جب کہ حالی نے نشاط سے زیادہ غم کو ملحوظ رکھا جس کی بنا پر کہیں ان کے مسدس کو قوم کا مرثیہ کہیں ان کی شاعری کو رونے اور بسورنے کا دفتر کہا گیا۔ حقیقت یہی ہے کہ حالی نے زندگی کے حقیقی مسائل اور مظاہر کو غم و نشاط کے ساغروں میں پیش کیا ہے جو واقعات تجربات اور مشاہدات کی دقیق دیدہ وری سے پیدا ہوئے۔ الفاظ میں نغمگی تو ان میں پوشیدہ ذاتی غنائت یا Organic Rhythem سے ہوسکتی ہے لیکن الفاظ میں درد اور تاثیر اُس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اُسے دل کے الاؤ میں پکایا نہ جائے۔

io

غزلیات

x دورِ قدیم (1863ء تا 1874ء) ماخذ: دیوان حالی (طبع اوّل 1893ء)

x دورِ جدید (1874ء تا 1893ء) ماخذ: دیوان حالی (طبع اوّل 1893ء)

x دورِ آخر (1893ء تا 1914ء) ماخذ: جواہرات حالی (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

دَورِ قدیم

(1863ء تا 1874ء)

1

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا

مضموں ہے دل میں نقش "لدینا مزید[1]" کا
کونین سے بھرے گا نہ دامن امید کا

قفلِ درِ مراد سب اک بار کھل گئے
چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا

دیکھا ہے ہم نے عالمِ رحمت کو غور سے
ہے شش جہت میں قحط دلِ ناامید کا

شرمِ کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں
انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا

ہے نردبانِ جذبۂ توفیق درمیاں
یاں امتیاز کیا ہے قریب و بعید کا

ہے آسماں پہ تیرے جگر خوار کا دماغ
خونِ جگر میں نشہ ہے جامِ نبیذ کا

تسکیں نہیں مشاہدہ گاہ گاہ سے
یا رب یہ روزہ دار ہے مشتاق عید کا

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں
لے گا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

---

[1] سورۂ ق کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: جنت میں وہ جو کچھ چاہیں گے، ملے گا اور (لدینا مزید:) ہمارے پاس اس سے بڑھ کر (بھی کچھ اور) ہے۔ (القرآن 35:50)

2

خلوت میں تری صوفی گر نور صفا ہوتا
تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

تھا آفت جاں اس کا انداز کماں داری
ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی
میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

یہ لطف بناوٹ میں دیکھا نہ سنا قاصد
ان پڑھ ہے تو ہے یہ کچھ پڑھتا تو بلا ہوتا

باتوں میں شکایت کی بو آتی ہے الفت کی
گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلہ ہوتا

ہم روز وداع اس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

گر صاحب دل ہوتے، سن کر مری بے تابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو کر گزرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانیے کیا ہوتا

کل حالی دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا

3

پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزبان کوئی میہماں نہ تھا

ہم کو بہار میں بھی سر گلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائے گا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر بیم جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جانا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

4

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم
شوق تھا بادیہ پیمائی کا

اس سے نادان ہی بن کر ملیے
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ
حوصلہ کیا ہے تماشائی کا

درمیاں پائے نظر ہے جب تک
ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل
مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں!
گل و بلبل کی شناسائی کا

مدد اے جذبۂ توفیق کہ یاں
ہو چکا کام توانائی کا

314

محتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

5

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخل ایمن و ہر سنگ طور تھا

دردا کہ لب پہ راز دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا

جانی نہ قدر رحمت حق پارسا نے کچھ
ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا

'دردی کشان' بزم مغاں کا نہ پوچھ حال
ایک ایک رند نشہ وحدت میں چور تھا

اب باریاب انجمن عام بھی نہیں
وہ دل کہ خاص محرم بزم حضور تھا

روز وداع بھی شب ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شام بلا کا ظہور تھا

بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ خبر
بہر نماز نعش پہ آنا ضرور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اسی کا اتنا صبور تھا [1]

6

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اٹھایا نہ جائے گا

دیکھی ہیں ایسی ان کی بہت مہربانیاں
اب ہم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائے گا

مے تند و ظرف حوصلہ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں، جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

---

[1] شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اس غزل کے دو اور شعر دریافت کیے ہیں جو بحوالہ جواہراتِ حالی (صفحہ 104) درج ذیل ہیں:

کیوں کر کہوں کہ تم مرے مرنے پہ شاد تھے — چہرہ تھا کیوں اُداس جو دل میں سرور تھا
زاہد کو گر عبادت و تقویٰ پہ تھا گھمنڈ — ہم کو بھی انفعال پہ اپنے غرور تھا

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا

مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہل دیں کے نہ حالی پڑیں بس
آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

7

قلق اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخم دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

سبب ہو نہ ہو اب پہ آنا ضرور
مرا شکر اس کا گلہ ہو گیا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

ہوا رکتے رکتے دم آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

سمجھتے تھے جس غم کو ہم جانگزا

314

وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

نہ دے میری امید مجھ کو جواب
رہے وہ خفا، گر خفا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

8

سنگِ گراں ہے راہ میں تمکین یار کا
اب دیکھنا ہے زور دلِ بے قرار کا

اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

آؤ مٹا بھی دو خلش آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل گلہ روزگار کا

سمجھو مجھے اگر ہے تمہیں آدمی کی قدر
میرا اک التفات نہ مرنا ہزار کا

گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال
سن لیں گے وہ مآل شبِ انتظار کا

اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دلِ حزیں
ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

ہر سمت گرد ناقۂ لیلیٰ بلند ہے
پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہ سوار کا

غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا
خانہ خراب خاطر الفت شعار کا

حالی بس اب یقیں ہے کہ دلی کے ہو رہے
ہے ذرہ ذرہ مہر فزا اس دیار کا

9

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

جس دل کو قیدِ ہستیِ دنیا سے ننگ تھا
وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

لغزش نہ ہو، بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب

اک جرعہ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب

ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز
ہاں جذبِ دل مدد کہ دمِ امتحاں ہے اب

ہے دل غمِ جہاں سے سبک دوش ان دنوں
سر پڑتا سوجھتا کوئی بارِ گراں ہے اب

حالی تم اور ملازمت پیرِ مے فروش
وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

0

بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
پہ چھپتی نہیں سرگرانی کی صورت

جسے دیکھ کر دل ہو عاشق کا بے کل
وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت

شب وعدہ ہے بارِ عام ان کے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

غمِ دل نے رسوا کیا ہم کو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت

ہے اس ریش پر وسمہ کیا خوب کھلتا
ذرا دیکھنا شیخِ فانی کی صورت

یقیں ہے کہ ہم جس کو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت

سمجھ کر کرو قتل حالی کو، دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

!

عہدِ وصال دل سے بھلایا نہیں ہنوز
عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز

پیغام دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز

314

جھونکا نسیم مصر کا آیا نہیں ہنوز

لگ جائے دل نہ منزل مقصود میں کہیں
ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز

آیا نہ ہو گا اس کو تغافل میں کچھ مزا
ذوق نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز

ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا
اس نے نقاب رخ سے اُٹھایا نہیں ہنوز

یاں دے چکی جواب امید جواب خط
واں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز

پایا ہے ذوق و شوق میں ہم کو بھرا ہوا
کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز

کیا دل سے بعد مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد
بھولے ہی کہ تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز

سرمایہ خلاف دو عالم ہے راز دل
باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز

کس نشے میں ہے چور خدا جانے اس قدر
حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز

@

آگے بڑھے نہ قصہ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایہ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگی شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

دردِ فراق و رشک عدوّ تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگی جاوداں سے ہم

لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

ہنستے ہیں اس کے گریہ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی راز داں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

دل کش ہر ایک قطعہ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ؟
پوچھیں گے جا کے حالی جادو بیاں سے ہم

#

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اول شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق

314

رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

$

پیا ہم نے نہ جامِ بے کدورت بزمِ دوراں میں
خزاں کو لے گئے ہمراہ گر پہنچے گلستاں میں

نہیں کچھ منحصر دل بستگی زلفِ پریشاں میں
جو دل چاہے تو الجھے اک غبارِ دودِ پیچاں میں

اگر چھوڑا کمندِ جذبۂ عشقِ زلیخا نے
نہ رہنے دے گا حسنِ خودنما یوسفؑ کو کنعاں میں

تصور نے بھلایا تیرے ذوقِ شادی و غم کو
نہ کچھ کلفت ہے زنداں میں نہ کچھ راحت شبستاں میں

خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر
کہاں تک جی نہ گھبرائے الٰہی دردِ ہجراں میں

زباں تقریر سے قاصر، قلم تحریر سے عاجز
نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزمِ رنداں میں

فلک سے جیتے جی معلوم ملنا کام دل اے خضر

سوائے طولِ حسرت کیا دھرا ہے آبِ حیواں میں

نہ چھوڑے گی محبت یار سے ناکام عاشق کو
نسیم مصر کو آنا ہے اک دن بیتِ احزاں[1] میں

[1] بیت احزاں یا بیت الحزن: غم کدہ یا ماتم خانہ، مراد وہ حجرہ جہاں حضرت یعقوب g اپنے محبوب بیٹے حضرت یوسف g کے غم میں رویا کرتے تھے۔

گل و نسریں تو کیا، فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے
ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیرِ گلستاں میں

بہت دن چاہئیں یوسفؑ کو تا پہنچے زلیخا تک
نکل کر چاہِ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں

نہ دی حیرت نے حالی فرصت سیر جہاں اک دم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

%

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں

مجھ کو تم سے پر اعتماد وفا
تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں

یوں ہی گزرے تو سہل ہے لیکن
فرصت غم کو بھی ثبات نہیں

کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں

314

سرسری دل کی واردات نہیں

ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید
جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

قیس ہو، کوہ کن ہو، یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

۸

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال
اک مزہ تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

ہم نے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبلِ زار
بات چبھتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

عشق نے مصر میں سو بار زلیخا سے کہا
فتنہ دہر ہے جو حسن وہ کنعاں میں نہیں

محتسب! صدق و صفا یاں ہے انہی کے دم تک
مصلحت بزمِ صحبت رنداں میں نہیں

یاں بھی ہے کون و مکاں سے دلِ وحشی آزاد
جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

ٹھہرتے ٹھہرتے دل یونہی ٹھہر جائے گا
بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں

کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں

خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے اُلجھاؤ ترے کاکُلِ پیچاں میں نہیں

آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

ا۔ ذیل کا شعر سخن شعرا میں موجود ہے۔ جو دیوان کے کسی نسخے میں موجود نہیں۔
خلوت خاص میں رہ رہ کے عدو سیکھ گئے
وہ اشارے کہ تری جنبش مژگاں میں نہیں (اس)

بے قراری تھی سب اُمید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں

&

غم فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں
شادیٔ وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں ا۔

خوب روئی کے لیے زشتی خو بھی ہے ضرور
سچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھ سا طرح دار نہیں

قول دینے میں تامل نہ قسم سے انکار
ہم کو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

کل خرابات میں اک گوشے سے آتی تھی صدا
دل میں سب کچھ ہے مگر رخصت گفتار نہیں

حق ہوا کس سے ادا اس کی وفاداری کا

جس کے نزدیک جفا باعث آزار نہیں

دیکھتے ہیں کہ پہنچتی ہے وہاں کون سی راہ
کعبہ و دیر سے کچھ ہم کو سروکار نہیں

ہوں گے قائل وہ ابھی مطلعِ ثانی سن کر
جو تجلی میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں

ا۔ ذیل کا شعر سخن شعرا میں موجود ہے۔ جو دیوان میں موجود نہیں:
حالی انصاف کو آخر بنے انساں کب تک
طعنِ اغیار ہیں کچھ آپ کے اشعار نہیں

*

میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

چشمِ بد دور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ
غیرتِ عشق سے اب تک وہ خبردار نہیں

ہو چکا ناز اٹھانے ہی میں گو کام تمام
للہ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں

مدتوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا
دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں

اصل مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا
ورنہ ہم اور کسی شے کے طلب گار نہیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

(

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشارات نہاں میں

کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

)

مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو
مجھے بھی ڈھونڈ لینا تم جہاں ہو

نہ چھیڑوں تذکرہ وصلِ عدو کا
اگر سمعِ مبارک پر گراں ہو

تقاضائے محبت ہے، وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

314

بہت بے قدر ہوں محفل میں تیری
کہیں ناخواندہ تو بھی میہماں ہو

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں
بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو

کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے
جسے سُنی ہماری داستاں ہو

موثر ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

حقیقت محرمِ اسرار سے پوچھ
مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سن
مری الفت در و دیوار سے پوچھ

ہماری آہِ بے تاثیر کا حال
کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ

دلوں میں ڈالنا ذوق اسیری
کمند گیسوئے خم دار سے پوچھ

دلِ مہجور سے سن لذتِ وصل
نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ

نہیں جز گریہ غم حاصل عشق
ہماری چشم دریا بار سے پوچھ

نہیں آبِ بقا جز جلوہ دوست

کسی لب تشنہ دیدار سے پوچھ

فریب وعدہ دلدار کیجیے کی قدر
شہید خنجرِ انکار سے پوچھ

فغاں شوق کو مانع نہیں وصل
یہ نکتہ عندلیب زار سے پوچھ

تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم
وہ تصویر خیال یار سے پوچھ

متاع بے بہا ہے شعر حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

~

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

تھا یہاں دل میں طعن وصل عدو
عذر ان کی زباں پہ آنے لگے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی
غیر اُلفت بہت جتانے لگے

تم کو کرنا پڑے گا عذر جفا
ہم اگر درد دل سنانے لگے

314

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

جی میں ہے لوں رضائے پیر مغاں
قافلے پھر حرم کو جانے لگے

سرِ باطن کو فاش کر یا رب
اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

-

حشر تک یاں دلِ شکیبا چاہیے
کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیے

ہے تجلی بھی نقابِ روئے یار
اس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیے

غیر ممکن ہے نہ ہو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اس کو لکھا چاہیے

ہے دل افگاروں کی دل داری ضرور
گر نہیں الفت مدارا چاہیے

ہے کچھ اک باقی خلش اُمید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے

دوستوں کی بھی نہ ہو پروا جسے
بے نیازی اس کی دیکھا چاہیے

بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز

کیجیے اغماض جتنا چاہیے

شیخ ! ہے ان کی نگہ جادو بھری
صحبت رنداں سے بچنا چاہیے

لگ گئی چپ حالی رنجور کو
حال اس کا کس سے پوچھا چاہیے

—

جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے
قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے

دم گریہ کس کا تصور ہے دل میں
کہ اشک اشک دریا ہوا چاہتا ہے

خط آنے لگے شکوہ آمیز اُن کے
ملاپ ان سے گویا ہوا چاہتا ہے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو
وہ صرف تمنا ہوا چاہتا ہے

ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں
اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے

مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت
کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے

فزوں تر ہے کچھ ان دنوں ذوق عصیاں
در رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

قلق گر یہی ہے تو راز نہانی

کوئی دن میں رسوا ہوا چاہتا ہے

وفا شرط اُلفت ہے لیکن کہاں تک
دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے

بہت حظ اُٹھاتا ہے دل تجھ سے مل کر
قلق دیکھیے کیا ہوا چاہتا ہے

غم رشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم
سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے

بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

=

جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا اگر کل نہ لیا، یاد رہے

شوق بڑھتا گیا جوں جوں رکے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر
نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت، لطف سمجھ کر کیجے
اس بھلائی کا ہے انجام برا، یاد رہے

شیخ یاں شرم گنہ شوق بھلا دیتا ہے
توبہ اُن کی ہے جنہیں اپنی خطا یاد ہے

314

وادیِ عشق میں موسیٰ کو ہو گر رخصتِ دید
ہاتھ کٹوائیں جو پھر کفش و عصا یاد رہے

خضر نے پاؤں اگر دشتِ فنا میں رکھا
بھول جائیں گے رہ آبِ بقا، یاد رہے

دل بری طرح لگا عشقِ بتاں میں اے شیخ
دیں پڑا پائیں اگر اب کے خدا یاد رہے

چارہ گر کار بہ اندازہ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا، یاد رہے

+

کر دیا خوگرِ جفا تو نے
خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

دور پہنچی تھی اپنی آزادی
پر خدا جانے کیا کیا تو نے

کیوں نہ آئیں گے یاں وہ اے ہمدم
بس سنا میں نے اور کہا تو نے

گوش و لب ساتھ لائے تھے ہم آج
نہ کہا اور نہ کچھ سنا تو نے

صبر کا ہے بہت برا انجام
ہم کو سمجھا ہے دل میں کیا تو نے

ابتدائے وفا ہے سر دینا

314 میری دیکھی نہ انتہا تو نے

دل سے قاصد بنا کے وعدۂ وصل
اور کھویا رہا سہا تو نے

ایک عالم کو خوش کیا اے رشک
ہم کو کس سے خفا کیا تو نے

جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج
حالی اپنا کہا سنا تو نے

q

کر کے بیمار دی دوا تو نے
جان سے پہلے دل لیا تو نے

رہ روِ تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمہ بقا تو نے

شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا
آ کے مسجد سے کیا لیا تو نے

دور ہو اے دل مآل اندیش
کھو دیا عمر کا مزا تو نے

ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ
کیا کیا چشم آشنا تو نے

دل و دیں کھو کے آئے تھے سوئے دیر
یاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے اُمید خلد پر حالی
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

w

314

دل کو درد آشنا کیا تو نے
دردِ دل کو دوا کیا تو نے

طبع انساں کو دی سرشتِ وفا
خاک کو کیمیا کیا تو نے

وصلِ جاناں محال ٹھہرایا
قتلِ عاشق روا کیا تو نے

تھا نہ جز غم بساط عاشق میں
غم کو راحت فزا کیا تو نے

جان تھی اک وبال فرقت میں
شوق کو جاں گزا کیا تو نے

تھی محبت میں ننگ منت غیر
جذبِ دل کو رسا کیا تو نے

راہ زاہد کو جب کہیں نہ ملی
درِ مے خانہ وا کیا تو نے

قطع ہوتے ہی جب لگا پیوند
غیر کو آشنا کیا تو نے

تھی جہاں کارواں کو دینی راہ
عشق کو رہ نما کیا تو نے

ناؤ بھر کر جہاں ڈبوئی تھی
عقل کو ناخدا کیا تو نے

بڑھ گئی جب پدر کو مہر پسر
اس کو اس سے جدا کیا تو نے

جب ہوا ملک و مال رہزن ہوش
بادشہ کو گدا کیا تو نے

جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد
درد کو بے دوا کیا تو نے

جب دیا راہ رو کو ذوقِ طلب
سعی کو نارسا کیا تو نے

پردہ چشم تھے حجاب بہت
حسن کو خود نما کیا تو نے

عشق کو تابِ انتظار نہ تھی
غرفہ اک دل میں وا کیا تو نے

حرم آباد اور دیر خراب
جو کیا سب بجا کیا تو نے

سخت افسردہ طبع تھے احباب
ہم کو جادو نوا کیا تو نے

ا؎ اس شعر میں پدر و پسر کا اشارہ حضرت یعقوب و یوسف m کی طرف ہے اور اگلے شعر میں بادشاہ سے مراد ابراہیم ادھم k ہیں۔

پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یا رب
کون پوچھے کہ کیا کیا تُو نے

حالی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے ا؎

e

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے ۲؎

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات

مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی
جو سچ پوچھو تو جائے سوء ظن ہے

بہت دل ہیں تیرے عاشق کو درکار
تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد
نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

ا۔ حالی اپنے قصیدہ نعتیہ (ع ..... ''میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور'') کی نثریہ تمہید سے متعلق طویل حاشیے میں لکھتے ہیں: ''انہی دنوں (یعنی 87-1286ھ مطابق 71-1870ء) میں سیتارام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھیں۔'' غالباً حالی کا اشارہ انہی تین ہم طرح غزلوں (نمبر 26 تا 28) کی طرف ہے۔ (ا۔ص)

۲۔ ''یہ غزل تقریباً 1289ھ (1872ء) میں اس وقت لکھی تھی جب کہ اول ہی اول بہ تقریب ملازمت دلی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا۔ اس وقت اول تو دلی سے جدا ہونا سخت شاق گزرا تھا، دوسرے لاہور میں کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ وہاں پہنچتے ہی نہایت سخت وبا آئی اور وبائے ہیضہ کے بعد مدت تک چیچک اور بخار کا زور رہا۔ آخر کار راقم بھی سخت بیمار ہو گیا۔ اس تنہائی اور سراسیمگی و غم و اندوہ کی حالت میں یہ اشعار لکھے گئے تھے۔'' (حالی)

کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت
مگر جوشِ سخن مہرِ دہن ہے

رہے لاہور میں آ کر سو جانے
یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے

نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف
مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے

یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام
کہ بلبل نا شناسائے چمن ہے

نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ
نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہکن ہے

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور
تصور میں مرے اک انجمن ہے

مری خلوت میں ہے ہنگامہ بزم
خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول
جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بو
جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے

عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی
مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے

نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام
یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے

گریں نظروں سے سب باتیں پرانی
مگر اُلفت کہ اک رسمِ کہن ہے

بھلا حالی اور اُلفت سے ہو خالی
یہ سب تم صاحبوں کا حُسنِ ظن ہے

کیا ہے اس نے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے

۲

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خود نمائی کی

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

ملتے غیروں سے ہو، ملو لیکن
ہم سے باتیں کرو صفائی کی

دل رہا پائے بند اُلفت دام
تھی عبث آرزو رہائی کی

دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے
رکھیے اُمید دل ربائی کی

شہر و دریا سے باغ و صحرا سے
بو نہیں آتی آشنائی کی

نہ ملا کوئی غارت ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

بخت ہم داستانی شیدا اے
تو نے آخر کو نا رسائی کی

صحبت گاہ گاہی رشکی ہے
تو نے بھی ہم سے بے وفائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے
ساعت آ پہنچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالی

314

انتہا ہے یہ بے حیائی کی

io

۱۔ شیدا سے مراد منشی اکرام اللہ خاں صاحب دہلوی ہیں کہ اُس زمانے میں کبھی کبھی فکرِ شعر کرتے تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے۔ (حالی)

۲۔ رشکی، آنریبل نواب محمد علی خان بہادر رئیس جہانگیر آباد کا تخلص ہے۔ (حالی)

دَورِ جدید

(1874ء تا 1893ء)

1

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندہ نا فرماں ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہو گا حق کیونکہ ادا تیرا

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نا محرم
کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا

چچتا نہیں نظروں میں یاں خلعتِ سُلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

عظمت تری مانے بن کچھ بن نہیں آتی یاں
ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا

تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو
جس جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا

نشے میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بے خود
جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا

سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

طاعت میں ادب تیرا عصیاں سے ہے گو بڑھ کر
عصیاں میں ہے طاعت سے اقرار سوا تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگِ بیاں حالی ہے سب سے جُدا تیرا

2

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا رُعب جمال تیرا

کاوش میں ہے الٰہی، دِگدا میں ہے طبیعی ا؎
جو حل ہوا، نہ ہو گا وہ ہے سوال تیرا

چھوٹے ہوئے گو جی، پر دل بندھے ہوئے ہیں
ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیوں کر جائے نکل کے کوئی
پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا

اُن کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

دل ہو کہ جان، تجھ سے کیوں کر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا

ا؎ الٰہی: الٰہیات کا عالم۔ طبیعی: علوم طبیعی کا عالم

ہے پورِ زال ا؎ سے دل اس کا قوی زیادہ
رکھتی ہے آسرا یاں جو پیر زال تیرا

ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی
یا رب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

بیگانگی میں حالیؔ یہ رنگ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قالِ اہلِ حال تیرا

3

ربڑ میں دشت جنوں کی تیری عجب مزا خوش گوار دیکھا
نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اس نشے میں خمار دیکھا

314

نہ جی رکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نا مراد جو یاں انہیں بھی امید وار دیکھا
رخِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں
نہ بلبل و گل میں واں تعلق نہ سرو و قمری میں پیار دیکھا
سوار محمل کی جستجو میں ہزاروں دشت طلب میں دوڑے
نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اٹھتا غبار دیکھا
جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا بھی قسمت سے بھید تیرا
ملا نہ کھوج اس کا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا
لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پُر خطر سے
گئے وہ کود آنکھ بند کر کے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا
بچے ہوئے کاہشوں سے یاں کی وہی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں
وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا
چمن میں بھولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغ دار تیرے
گل ان کی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا

ا۔ پورِ زال: زال کا بیٹا، مراد رستم پہلوان

خبر نہیں یہ کہ کیا ہے، کیسا ہے، کون ہے اور تو کہاں ہے
پہ اپنے میں اور تجھ میں ہم نے علاقہ اک استوار دیکھا
سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہوں یا مسلماں
نہ اُن سے کچھ تیرا بیر پایا، نہ ان سے کچھ تیرا پیار دیکھا
سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیے ہاتھ باندھ سب کے
جنہیں تھا یاں اختیار سب کچھ انہیں بھی بے اختیار دیکھا
بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بے کار تجھ کو پایا، کبھی نہ سرگرم کار دیکھا

نعت 4

یا ملکی الصفات و یا بشری القوی
فیک دلیل علیٰ انک خیر الوری [1]

تجھ سے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ باراں سے خاک
خلقک خصب الزماں بعثک محیا الوری [2]

دعویٰ روشن ترا ثابت بے بینہ
صورت و سیرت تری صدق پہ تیرے گوا

قال ترا اور حال نشۂ وحدت میں چور
اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

غیب سے بھیجا تجھے، ناپتا پھرتا تھا جب
دشت میں بھٹکا ہوا قافلہ بے رہنما

اٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کے وقت
جیسے کہ ہنگام قحط قبلے سے اٹھے گھٹا

---

[1] اے ملکوتی صفات اور انسانی قابلیتیں رکھنے والے! آپ کی ذات اس بات پر دلیل ہے کہ آپ تمام مخلوقات کے سردار ہیں۔

[2] آپ کی پیدائش کائنات کے لیے طراوت بخش اور آپ کی بعثت مخلوق کے لیے حیات بخش ہے۔

شان رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں
گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جدا

گلہ بنی سعد کا جب کہ چراتا تھا تو
گلہ آدم تجھے سونپ چکی تھی قضا

دوڑ پڑے سوئے حق کاٹ کے سب بیڑیاں
اُمیوں کے جب پڑی کان میں تیری صدا

راہب و قسیس و حبر [1] رہ گئے دل تھام کے

دیکھ کے تیرا قدم ہم قدم انبیاء

خاک تھی جس ملک کی مزرعِ شر و فساد
تو نے اسی کو دیا ارضِ مقدس بنا

تو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب
جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحُّم کیا

چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت
تو نے کیا دام دام قرض سب اُن کا ادا

تو نے کیا سرِ حق عارف و عامی پہ فاش
ایک کو سمجھا دیا، ایک کو دکھلا دیا

چوٹ سے حق کی رہا دل نہ اچھوتا کوئی
ایک کے چرکا لگا، ایک کو گھائل کیا

حجتِ حق کر چکا دین ترا جب تمام
پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما

دیر ہوئے بے چراغ اور صلوٰہ یہود [2]
شرک ہوا مضمحل اور کہانت ہبا

---

[1] قسیس: عیسائی عالم جو مبلغ بھی ہو (مشنری)۔ راہب: تارکِ دنیا عابد و زاہد (جو بزمانہ بعثت، نصاریٰ میں بہت تھے۔) حبر: جید عالم (عرفاً یہودی عالم جمع احبار) [2] صلوٰۃ یہود: مجازاً یہود کی عبادت گاہ۔

بجھ گئے آتش کدے بیٹھ گئے بت کدے
ہو گئی تثلیث مات اور ثنویت فنا

اٹھے بہت مدعی جیسے کہ ساون میں گھاس
مزبلہ پر چند روز پاتی ہے نشوونما

غیرتِ حق نے مگر جلد لیا انتقام

مل گئے اٹھ اٹھ کے سب خاک میں اہل ہوا
رہ گیا نام سجاح [1] کذب میں ضرب المثل
اسود و ابن کثیر [2] خوار ہوئے برملا
سلسلہ انبیا ختم نہ ہوتا، اگر
حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اٹھا
آتے ہی چشمہ دیا تو نے کنویں سے نکال
جس کو چلے آتے تھے کھودتے سب انبیاء
بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ
بھیج چکا تیرے ہاتھ ملت بیضا خدا
تجھ پہ صلوٰۃ و سلام رب سموات سے
روز و شب و صبح و شام قدر رمال و حصی [3]

---

[1] سجاح: ایک عورت، مدعیہ نبوت، کذب میں ضرب المثل۔ ھوا کذب من سجاح (وہ سجاح سے زیادہ کاذب ہے)۔

[2] اسود عنسی اور مسیلمہ ابن کثیر دونوں مدعی نبوت تھے۔

[3] ریت کے ذروں اور سنگ ریزوں کے برابر۔

5

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا
راجوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے

گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ
جو گنج تو نے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا

جس رہ گزر میں بیٹھا تو غول راہ بن کر
صنعاں[1] سے راست رو کو رستہ بھلا کے چھوڑا

فرہاد کوہ کن کی لی تو نے جان شیریں
اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوب g سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسف g سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دل گداز تیرے
پتھر کے دل تھے جن کے ان کو رلا کے چھوڑا

عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی
عقل و خرد کا تو نے خاکہ اڑا کے چھوڑا

علم و ادب رہے ہیں دلبے[2] ترے ہمیشہ
ہر معرکے میں تو نے ان کو دلا[3] کے چھوڑا

۱۔ ایک بزرگ تھے جن کے بارے میں روایت ہے کہ ایک عیسائی لڑکی کو دل دے بیٹھے اور مدت تک اس کے سور چراتے رہے۔

۲۔ وہ پرند جس پر دوسرے لڑنے والے پرندوں کو لڑائی کا طریقہ سکھاتے ہیں۔

۳۔ کشتی دلانا یعنی پچھاڑنا۔ کشتی کا لفظ حذف کر کے صرف ''دلانا'' بھی بولتے ہیں۔

افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دل کش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اک دست رس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

314

دیکھ اے امید کیجو ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا

مے خانے کی خرابی جی دیکھ کر بھر آیا
مدت کے بعد کل واں جا نکلے تھے قضارا

اک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے
اے زاہدو! تمہارا ہے اس میں کیا اجارا

دنیا کے خرخشوں سے چیخ اُٹھے تھے ہم اوّل
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

توفیق نے ہمیشہ لی تنت پر خبر یاں
جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا

انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے
جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا

افسوس! اہلِ دیں بھی مانندِ اہلِ دنیا
خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمہارا

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حالی سے کام ہے یاں فعلوں سے اس کے کیا کام
اچھا ہے یا برا ہے، پھر یار ہے ہمارا

رونا نہ ہو گا حالی شاید یہ کم تمہارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا

الفت میں دم بہ دم کچھ لذت ہے بڑھتی جاتی
چھوڑے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمہارا

عاقل ہیں شہر میں کم ناداں بہت ہیں واعظ
ہے مصلحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تمہارا

دل جو نہیں کوئی یاں، حیف اے صنم پرستو!
دل کش بہت تھا ورنہ بیت الصنم تمہارا

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہو گا گر وزن کم تمہارا

دشت طلب کے رہتو! طے ہو گے کس طرح تم
آتا نہیں سمجھ میں کچھ پیچ و خم تمہارا

دو بے نواؤں کو بھی کچھ جم کے جانشینو!
بس جام جم ہمارا اور ملک جم تمہارا

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا
دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو! ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا

ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رو دیے سوارو
ہے لاکھ لاکھ من کا ایک اک قدم تمہارا

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے
گزرا ابھی ہے یاں سے خیل و حشم تمہارا

پھرتے ادھر اُدھر ہو کس کی تلاش میں تم

314

گم ہے تمہی میں یارو باغ ارم تمہارا

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالی
کچھ کر کے بھی دکھائے زور قلم تمہارا

8

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
پہنچا ہی بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا

خود مہر وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

یا رب طلب وصل ہو یا ہو طرب وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و ارماں
چھل بل میں تم اس زال فسوں گر کی نہ آنا

افسوس کہ غفلت میں کٹا عہد جوانی
تھا آب بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی
اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سنانا

دنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن
وہ دن ہے کہ جس دن ہے اسے چھوڑ کے جانا

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت
فرمایا خبردار! کہ نازک ہے زمانا

ڈھارس سی کچھ اے ہم قدمو! تم سے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

9

جہاں میں حالیؔ کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی، نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجیے گا

سنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعویٰ
یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

اسی میں ہے خیر حضرتِ دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد، اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجیے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانے کی خو ہے نکتہ چینی، کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

کمال ہے ضد بے کمالی، نہیں ملاپ ان میں حرف گیرو
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد، نہ دردِ الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجیے گا

تمہارا تھا دوست دار حالیؔ اور اپنے بیگانے کا رضا جو
سلوک اس سے کیے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجیے گا

0

ہو عزمِ دیر شاید کعبے سے پھر کر اپنا
آتا ہے دور ہی سے ہم کو نظر گھر اپنا

قید خرد میں رہتے آتے نہیں نظر ہم

314

وحشت رہے گی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

پیرِ مغاں سے ہو کر تب سرخ رو ملیں گے
فضل و ہنر کا ہو گا جب چاک محضر اپنا

بیگانہ وش ہے گر وہ تو ہے ہمارے ڈھب کا
ایسوں ہی سے نبھا ہے یارانہ اکثر اپنا

عصمت پہ اپنی تھی خود فطرت گواہ اپنی
کر بیٹھے اپنے ہاتھوں ہم چاک محضر اپنا

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

غیروں کو لیں گے آخر اپنا بنا کے کیا ہم
اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مکدر اپنا

!

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

اے بانگِ طبلِ شاہی دن ہو گیا جب آخر
خوابِ گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

تھا ہوش یادِ گل کا دورِ خزاں میں کس کو
ہے عندلیب نالاں! یہ تو نے گل کھلایا

ویراں ہے باغ تس پر پھولی نہیں سماتی
مژدہ صبا نے یا رب بلبل کو کیا سنایا

اے عشق! دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا

ڈرتے رہیں گے اب ہم بے جرم بھی سزا سے
احسان اُس کا جس نے ناحق ہمیں ستایا

واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم
کوئی جواب شافی پر اس سے بن نہ آیا

آیا نہ تھا کبھی یاں گویا قدم خزاں کا
دو دن میں یوں پلٹ دی کس نے چمن کی کایا

تقلیدِ قوم ہی پر گر ہے مدارِ تحسیں
تو ہم نے دوستوں کی تحسیں سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں حالی جچا نہ اپنی
جو جو گماں تھے ہم کو ان کا نشاں نہ پایا

@

نفس دعوی بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ اُترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا

حق نے احساں میں نہ کی اور میں نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا

چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی
چپکے چپکے نفس خائن کا کہا کرتا رہا

طاعنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہ خطا
وار اُن کا اس لیے اکثر خطا کرتا رہا

نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی
اس کو حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا

منہ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں
اُن سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

تھا نہ استحقاق تحسیں، پر سنی تحسیں سدا
حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا

شہرت اپنی جس قدر بڑھتی گئی آفاق میں
کبرِ نفس اتنا ہی یاں نشوونما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

#

کہیں الہام منوانا پڑے گا
کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

نہ ہو صوفی صفا گو تجھ میں لیکن
کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد
یہ گر ناصح کو بتلانا پڑے گا

جنہیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا
انہیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا

عوام الناس کا ہو گا جنہیں منہ
انہیں خاصوں پہ منہ آنا پڑے گا

رہے وصفِ جناں کی مشق واعظ
تمہیں بچوں کو پھسلانا پڑے گا

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
تجی باتوں کو دہرانا پڑے گا

تعلق کا ہے پھندا پیچ در پیچ

314

یہ عقدہ ہم کو سلجھانا پڑے گا

بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے
بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا

نہیں بو اُنس کی اس غم کدے میں
کہیں دل جا کے بہلانا پڑے گا

دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے
ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا

زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند
وفا سے ہم کو پچھتانا پڑے گا

جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید
ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا

$

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی
تمہیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا

رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی
بس اب دل سے شکووں کو دھونا پڑے گا

بن آئے گی ہرگز نہ یاں کچھ کیے بن

314

جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان! ہونا پڑے گا

%

کب تک اے ابرِ کرم ترسائے گا
مینہ بھی رحمت کا کبھی برسائے گا

پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں
جو لگائے گا تجھے پچھتائے گا

دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام
آج اگر آیا نہیں کل آئے گا

ذوق سب جاتے رہے جز ذوقِ درد
اک یہ لپکا دیکھیے کب جائے گا

واعظ آتا ہے تو آنے دو اُسے
پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا

آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت
اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم
ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا

دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف
رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا

باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل
جی قفس میں اس کا کیا گھبرائے گا

رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا
شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا

ابر و برق آئے ہیں دونوں ساتھ ساتھ

314

دیکھیے برسے گا یا برسائے گا
مشکلوں کی جس کو حالی ہے خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

۸

واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا
منہ اُسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا
دل میں باقی ہے وہی حرص گناہ
پھر کیے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا
آؤ اس کو لیں ہمی جا کر منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا
دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے اُنس
ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا
جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا
عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھیے پیش آئیں کیا
دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا
مان لیجے شیخ جو دعویٰ کرے
اک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا
ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

&

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا

اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اُس نے تو اللہ سے غافل، ناصح
اُس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا

چپ چپاتے اُسے دے آئے دل اک بات پہ
ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

شب کو زاہد سے نہ مڈ بھیڑ ہوئی خوب ہوا
نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو!
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

عشق اس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دنیا
ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

کرتے کیا پیتے اگر مے نہ عشا سے تا صبح
وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

314

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لے کے ہٹایا جاتا!

★

راحت کا جہاں میں یونہی اک نام ہے گویا
راحت کی تلاش اک طمعِ خام ہے گویا

کچھ کرتے ہیں جو یاں وہی انگشت نما ہیں
بدنام ہی دنیا میں نکو نام ہے گویا

نا چیز ہیں وہ کام، نہیں جن پہ کچھ الزام
جو کام ہیں ان کا یہی انعام ہے گویا

ہے وقتِ رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں
آخر ہوئی رات اور ابھی یاں شام ہے گویا

اُٹھا تھا کچھ اوّل ہی سے یہ درد بری طرح
آغاز ہی الفت کا بس انجام ہے گویا

ادبار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اسلام
اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا

جب دیکھیے حالی کو پڑا پایئے بے کار
کرنا اُسے باقی یہی اک کام ہے گویا

314

(

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب
کیمیا کو طلا سے کیا مطلب

چشمہ زندگی ہے ذکر جمیل
خضر و آب بقا سے کیا مطلب

بادشاہی ہے نفس کی تسخیر
ظلِ بالِ ہما سے کیا مطلب

جو کریں گے بھریں گے خود واعظ!
تم کو میری خطا سے کیا مطلب

جن کے معبود حور و غلماں ہیں
ان کو زاہد خدا سے کیا مطلب

کام ہے مردمی سے انساں کی
زہد یا اتقا سے کیا مطلب

ہے اگر رند دامن آلودہ
ہم کو چون و چرا سے کیا مطلب

صوفیِ شہر با صفا ہے اگر
ہو، ہماری بلا سے، کیا مطلب

نکہت مے پہ غش ہیں جو حالی
اُن کو درد و صفا سے کیا مطلب

314

)

یہ ہیں واعظ، سب پہ منہ آتے ہیں آپ
ناصحِ قوم اس پہ کہلاتے ہیں آپ

بس بہت طعن و ملامت کر چکے
کیوں زباں رندوں کی کھلواتے ہیں آپ

ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو
چڑھ کے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ

واعظو ہے ان کو شرمانا گناہ
جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں اک اک کی تکفیر آپ کیوں؟
اس پہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور
خلد کو ویران کرواتے ہیں آپ

چھیڑ کر واعظ کو حالی خلد سے
بسترا کیوں اپنا پھنکواتے ہیں آپ

،

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

زیرِ برقع تو نے کیا دکھلا دیا
جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

ہٹ پہ اس کی اور پس جاتے ہیں دل
راس ہے کچھ اس کو خود رائی بہت

سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں
دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت

چور تھا زخموں میں اور کہتا تھا حُر
راحت اس تکلیف میں پائی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

جاں نثاری پر وہ بول اٹھے مری
ہیں فدائی کم، تماشائی بہت

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چُپ واقعات دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

~

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھیے شیخ! مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو! آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

کیا خبر زاہد قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسہ زر کی صورت

میں بچا تیر حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کے لذت
ناصحو! اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعد ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر ہے صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈرانی [1] ہے بہت آج بھنور کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

---

[1] ''ڈراونی'' کی جگہ حالی نے اکثر ''ڈرانی'' باندھا ہے۔ (ا ص)

-

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ
دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ

رچ رہی ہے کان میں یاں لے وہی
اور مغنی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت
اور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

اک کہانی پیر زن کی رہ گئی
راج کسریٰ کا رہا باقی نہ پاٹ

دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں
ہے مگر یاں جی کچھ اے زاہد اُچاٹ

جو کہے تجھ کو بنا دیں اے امیر
ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ

ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

تیغ میں برش یہ اے حالی نہیں
جس قدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

314

—

باپ کا ہے جبھی پسر وارث
ہو ہنر کا بھی اس کے گر وارث

گھر ہنرور کا نا خلف نے لیا
تیرا ہے کون اے ہنر وارث

فاتحہ ہو کہاں سے میت کی
لے گئے ڈھو کے سیم و زر وارث

ہوں اگر ذوقِ کسب سے آگاہ
کریں میراث سے حذر وارث

خاک و کرمان گور و خویش و تبار
ایک میت اور اس قدر وارث

واعظو! دین کا خدا حافظ
انبیاء کے ہو تم اگر وارث

قوم بے پر ہے، دین بے کس ہے
گئے اسلام کے کدھر وارث

ہم پہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف
جیسے مردے کے مال پر وارث

ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی
کیوں ہیں میت پہ نوحہ گر وارث

=

بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث
دل جلوں کو تو نے گرمایا عبث

جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی
رات بھر یاروں کو چھنوایا عبث

شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاک باز
سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث

کوئی پنچھی آ کے اب پھنستا نہیں
آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث

نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم
تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

کھیتیاں جل کر ہوئیں یاروں کی خاک
ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث

قوم کا حالی پنپنا ہے محال
تم نے رو رو سب کو رلوایا عبث

+

بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج
بول کر ہم نے منہ کی کھائی آج

چپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ
بات بگڑی بنی بنائی آج

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

بزمِ ساقی نے دی الٹ ساری
خوب بھر بھر کے خُم لنڈھائی آج

معصیت پر ہے دیر سے یا رب
نفس اور شرع میں لڑائی آج

غالب آتا ہے نفس دوں یا شرع
دیکھنی ہے تری خدائی آج

چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو
نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

کل یہاں کاروبار ہیں سب بند
کرلو کرنی ہے جو کمائی آج

زد سے الفت کی بچ کے چلنا تھا
مفت حالی نے چوٹ کھائی آج

q

تلخیِ دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج
یہ بھی ہے یارو کوئی رنجوں میں رنج

رنج و شادی یاں کے ہیں سب بے ثبات
اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

تھا قناعت میں نہاں گنجِ فراغ
پر ہمیں بے وقت ہاتھ آیا یہ گنج

فکر و سن بڑھتے تھے شاید ساتھ ساتھ
ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے پنج

ہم کو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا
جب کبھی جیتے تھے ہم، اے بذلہ سنج!

آگئی مرگ طبیعی ہم کو یاد
شاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج

راہ اب سیدھی ہے حالی سوے دوست
ہو چکے طے سب خم و پیچ و شکنج

314

W

بزم مے اچھی ہے، گو دنیا ہے اسے مے خوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ

نفس سے سر بر ہوئی دانش نہ صبر و عقل و ہوش
ایک دشمن برسرِ کیں ہو تو ہیں سب یار ہیچ

شیخ ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز
ہے یہ سب اونچی دکاں اور رونق بازار ہیچ

شاہدِ معنی کو آرائش کی کچھ حاجت نہیں
سبحہ و سجادہ ہیچ اور جبہ و دستار ہیچ

ہو گرجتے جس قدر اتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو! ہے یہ سب گفتار بے کردار ہیچ

روئی تو آٹھ آٹھ آنسو اور پسیجا دل نہ ایک
نکلے موتی تیرے سب، اے چشمِ گوہر بار، ہیچ

خوانِ نعمت نے ترے اے عالمِ مردار خوار
کر دیے آفاق کے سب خوان و خواں سالار ہیچ

ہے ادب مسند پہ، جو کچھ ہے رئیس شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

e

کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

منزلِ دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو
ہیں اسے پانی دیے جاتے کسانوں کی طرح

ان کے غصے میں ہے دل سوزی، ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نا مہربانوں کی طرح

کام سے کام اپنے ان کو، گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

طعن سن سن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

کیجیے کیا حالی نہ کیجیے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

۲

مئے مغاں کا ہے چسکا اگر برا اے شیخ
تو ایسی ہی کوئی چاٹ اور دے لگا اے شیخ

ریا کو صدق سے ہے جامِ مے بدل دیتا
تمہیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ

وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر
تماشے دیکھے ہیں یہ ہم نے بارہا اے شیخ

غرورِ فقر و غرورِ غنا میں فرق ہے کیا
تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ

زباں پہ ہوتی ہے مہر ان کی جو ہیں محرمِ راز
پھر ایسا کیجیو ہرگز نہ ادعا اے شیخ

خبر بھی ہے تمہیں کیا بن رہی ہے بیڑے پر
ہیں آپ جون سے اُس بیڑے کے ناخدا اے
شیخ

وہ ڈوبتوں سے الگ رہتے ہیں جو ہیں تیراک
شناوری کا یہی گر ہے، مرحبا اے شیخ!

گوزن و گور ہیں بچپن سے تارکِ دنیا
نہایت آپ کی ہے ان کی ابتدا اے شیخ

کمالِ حسنِ عقیدت سے آیا تھا حالی
پہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

ا۔ ''جس'' کے معنی میں، ''جون سے'' (بروزن کون سے) گفتگو میں مستعمل ہے لیکن تحریر میں نہیں۔ (ا۔ص)

t

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا، رجا کے بعد

ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور
ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

گر دردِ دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اس کی یاد
آگے خدا کا نام ہے ناصح ! خدا کے بعد

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم
ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

آخر کو ماننا پڑا اے نفسِ خیرہ سر
تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر
بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دل کش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

y

کبھیں خوف اور کبھیں غالب ہے رجا اے زاہد
تیرا قبلہ ہے جدا، میرا جدا اے زاہد

درگزر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے

314

تو ترا اور کوئی ہو گا خدا اے زاہد

ہم دکھا دیں گے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور
کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد

قُربِ حق کے لیے کچھ سوزِ نہاں بھی ہے ضرور
خشک نفلوں میں دھرا کیا ہے بھلا اے زاہد

میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تم سے
تو ہی کہہ اس میں ہے کیا میری خطا اے زاہد

جال جب تک ہے یہ پھیلا ہوا دیں داری کا
فکر دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہد

عیب حالی کے بہت آج کیے تو نے بیاں
ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاہد

u

پیاس تیری بوئے ساغر سے لذیذ
بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ

جس کا تو قاتل ہو پھر اس کے لیے
کون سی نعمت ہے خنجر سے لذیذ

لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب
ہم کو ہے سب شہد و شکر سے لذیذ

قند سے شیریں نری پہلی نگاہ
دوسری، قندِ مکرر سے لذیذ

جھانجھ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو
بھوک ہے وہ شیرِ مادر سے لذیذ

ہے یہ تجھ میں کس کی بو باس اے صبا
بوئے بید و مشک و عنبر سے لذیذ

جو قناعت کے ہیں حالی میہماں

اُن کو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ

i

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر
وہی اصرار ہے خطاؤں پر
رہیں نا آشنا زمانے سے
حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر
رہرو با خبر رہو کہ گماں
رہزنی کا ہے رہنماؤں پر
ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا
مرتے ہیں ہم انہی اداؤں پر
اس کے کوچے میں ہیں وہ بے پر و بال
اڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر
شہسواروں پہ بند ہے جو راہ
وقف ہے یاں برہنہ پاؤں پر
نہیں منعم کو اس کی بوند نصیب
مینہ برستا ہے جو گداؤں پر
نہیں محدود بخششیں تیری
زاہدوں پر نہ پارساؤں پر
حق سے درخواست عفو کی حالی
کیجے کس منہ سے ان خطاؤں پر

O

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر
جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار

314

عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست اس کے ہیں نہ اُس کے آشنا
گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر
خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر
اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں
کرتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر
کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رسوا اسے دل کھول کر
کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اس سے خواہاں عمر بھر
ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر
عیب کچھ گنتے نہیں اس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سوا سب بے خبر
خیر کا ہوتا ہے ظنِ غالب جہاں
کھینچ کر لاتے ہیں اس کو سوئے شر
بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو
عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر
دوست اک عالم کے پر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر، یارو حذر
عیب حالی اپنے یوں کہتا ہے کون

خواہشِ تحسین ہے حضرت کو مگر

p

ہو گی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر
دام اٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کیے بغیر

گو ہو شفا سے یاس پہ جب تک ہے دم میں دم
بن آئے گی نہ درد کا درماں کیے بغیر

بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کیے بغیر

آمادہ دہر پردہ دری پر ہے قوم کی
مبروص کو رہے گا نہ عریاں کیے بغیر

عزت سے اپنی یاروں کو کچھ آ پڑی ہے ضد
چھوڑیں گے نیم جاں کو نہ بے جاں کیے بغیر

مشکل بہت ہے گو کہ مٹانا سلف کا نام
مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کیے بغیر

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دل رُبا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیے بغیر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑے گا وقت انہیں نہ مسلماں کیے بغیر

حالی کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بستیوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیے بغیر

[

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ
ہو گئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

آج تک قصرِ امل ہے نا تمام

بندھ چکی ہے بارہا کھل کھل کے پاڑ

ہے پہنچنا اپنا چوٹی تک محال
اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ

کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار
پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ

دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے
سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ

عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ
دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اُجاڑ

کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار
کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ

بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی
ان دنوں کم تر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

]

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو! دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک طاعت مکروہ ہے برقع میں نہاں

کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رمنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی، مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہو گا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے

ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دور زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و
نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

Q

رنجش و التفات و ناز و نیاز
ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

عشق کی آنچ اس میں پاتا ہوں
دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز

شیخ! اللہ رے تیری عیاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

اک پتے کی جو ہم نے کہہ دی آج
رنگ واعظ کا کر گیا پرواز

ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری
تو گئی بھول ہم کو خاکِ حجاز

آج منکر بھی ناچ اُٹھیں گے
گر مغنّی کی ہے یہی آواز

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف
چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا
ہیں دگرگوں زمانے کے انداز

ہوتے جاتے ہیں زور مند ضعیف
بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز

چھپتے پھرتے ہیں کبک و تیہو سے
گھونسلوں میں عقاب اور شہباز

ہے نہتوں کو رہ گزر میں خطر
رہزنوں نے کیے ہیں ہاتھ دراز

ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم
بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لبِ آز

ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے
گھائلوں پر ہیں ہیز تیر انداز

تشنہ خوں ہیں بھوکے شیروں کے
حیلہ گر روبہوں کے عشوہ و ناز

دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس
اور یاروں کے یار ہیں غمّاز

ہو گا انجام دیکھیے کیا کچھ
ہے پر آشوب جب کہ یہ آغاز

لَے ابھی تک کھلی نہیں، لیکن

غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر

موج حائل ہے اور ہوا ناساز

یا تھپیڑے ہوا کے لے اُبھرے

یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

کام اسے اپنے سونپ دو حالی

نہیں جس کا شریک اور انباز

ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترائے

چارہ یاں کیا ہے غیر عجز و نیاز

W

جاذبِ رحمت ہے مقناطیسِ عصیاں اپنے پاس

رکھتے ہیں عاصی کمندِ صیدِ غفراں اپنے پاس

عاجزوں سے مقتدر کرتے ہیں اکثر درگزر

عجز اپنا ہے کلید بابِ رضواں اپنے پاس

ہو گئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرمان کے

عذر خواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطاں اپنے پاس

بام بتلایا بلند اور نارسا بخشی کمند

رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ برہاں اپنے پاس

خاک میں ہم نے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ

ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس

دست برد اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں

314

ہے بحمد اللہ وہ مہر سلیماں اپنے پاس
دیکھنا حالی نہ دینا وضع فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویز استخلاف رحماں اپنے پاس

E

چھیڑ اب نہ اے تصور مژگان یار بس
کافی ہے خار خار غمِ روزگار بس
یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے
غم خواری اپنی رہنے دے اے غمگسار بس
ہر داغ فصلِ گل کی نشانی ہے اے صبا
گلگشت کو بہت ہے دلِ داغ دار بس
ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں
اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس
دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ
یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس
آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر
کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس
تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

R

اک ہم کو مہم برسر ایام ہے در پیش

بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے در پیش

غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے
اور معرکہ گردشِ ایام ہے در پیش

وہ دن گئے جب تھا مرض صعب کا آغاز
اب اس مرض صعب کا انجام ہے در پیش

گو صبح بھی تھی روز مصیبت کی قیامت
پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہے در پیش

وہ وقت گیا نشہ تھا جب زوروں پہ اپنا
اب وقتِ خمار مئے گل فام ہے در پیش

اُمیدِ شفا کا تو جواب آ ہی چکا ہے
اب موت کا سننا ہمیں پیغام ہے در پیش

جی اس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے در پیش

T

ہر بشر سے اس کی مختص ہیں عطائیں خاص خاص
ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص

دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دنیا سے مگر
رہزنِ دل ہیں ابھی اس کی ادائیں خاص خاص

گو زمانے نے بھلا دی دل سے اپنے فصل گل
یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص

زہد و تقویٰ سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
وقت ہیں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص

یوں تو ہے اُمید سب کچھ پر نہ ہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہم نے اے حالی خطائیں خاص خاص

Y

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

حور و غلماں کے لیے لائیں دل آخر کس کا
ہونے دیتا نہیں یاں عہدہ برآ ایک ہی شخص

قافلے گزریں وہاں کیوں کہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص

گھر میں برکت ہے مگر فیض ہے جاری شب و روز
کچھ سہی شیخ، مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی پہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

U

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض

چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض

دل میں ہے اے خضر گر صدق طلب
راہ رو کو رہنموں سے کیا غرض

حاجیو ! ہے ہم کو گھر والے سے کام
گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض

گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو
اُن کو چنگ و ارغنوں سے کیا غرض

نیک کہنا، نیک جس کو دیکھنا
ہم کو تفتیشِ دروں سے کیا غرض

دوست ہیں جب زخمِ دل سے بے خبر
ان کو اپنے اشکِ خوں سے کیا غرض

عشق سے ہے مجتنب زاہد عبث
شیر کو صیدِ زبوں سے کیا غرض

کر چکا جب شیخ تسخیرِ قلوب
اب اسے دنیائے دوں سے کیا غرض

آئے ہو حالیؔ پے تسلیم یاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض

ا

دوست کا ناروا نہیں اعراض
دوستوں ہی کا کام ہے اغماض

چاہیے ایک سب کا ہو مقصود
گو ہوں سب کی جدا جدا اغراض

314

یاد میں تیری سب کو بھول گئے
کھو دیے ایک دکھ نے سب امراض

دیکھیے تو بھی خوش ہے یا ناخوش
اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض

لَا أُبَالِیَ بِاَنْ یَّعَا تَبَنِی
کُلُّ نَاسٍ وَّاَنْتَ عَنِّی رَاضٍ

منعمو ! بذلِ خیر میں یہ دیر
اپنا مطلب اور اس پہ سو اغماض

حق میں اپنوں کے سخت ممسک ہیں
جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض

رائے ہے کچھ علیل سی تیری
نبض اپنی بھی دیکھ اے نباض

وعظ میں گل کترتے ہیں واعظ
منہ میں ان کے زباں ہے یا مِقراض

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع
ہَلْ لَّنَا فِی نِزَاعِنَا مِنْ قَاضٍ

ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد
خارکش تجھ سے ہے سوا مرتاض

شیخ کی تھی یہ آخری تلقین
چاہیے زر تو اس سے کر اعراض

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

O

رات گزری ہو چکا دورِ نشاط
طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط

دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر
نام تھا شاید جوانی کا نشاط

دن اب اے دل منقبض رہنے کے ہیں
ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط

غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں
فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

زینہ منبر ہے لغزش کی جگہ
جانیو واعظ اسے راہِ صراط

تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ
ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط

کوچ کی حالی کرو تیاریاں
ہے قویٰ میں دم بدم اب انحطاط

P

چھپے ہیں حریفوں میں احرار واعظ
برا کہہ نہ رندوں کو زنہار واعظ

سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر
نہ ستّار ہے تو نہ غفّار واعظ

نکل آئے گی مے کشی کی بھی حلت
کوئی مل گیا گر ہمیں یار واعظ

کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن
سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ

ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن
یہ جبہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ

نہ چھوڑے گا زیور گھروں میں نہ زر تو
یہی ہے اگر حُسنِ گفتار، واعظ

مسلماں نہ ہم کاش حالی کو کہتے
ہوئے بات کہہ کر گنہگار واعظ

{

اے بہارِ زندگانی الوداع
اے شباب اے شادمانی الوداع

اے بیاضِ صبحِ پیری السلام
اے شبِ قدرِ جوانی الوداع

السلام اے قاصدِ ملکِ بقا
الوداع اے عمرِ فانی الوداع

روزگارِ ضعف و سستی الصلا
وقتِ سعی و جاں فشانی الوداع

فرصتِ عشق و جوانی الفراق
دورِ عیش وکامرانی الوداع

تجھ کو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں
اے نعیمِ جاودانی الوداع

تیرے جاتے ہی گئیں سب خوبیاں
اے خدا کی مہربانی الوداع

آ لگا حالی کنارے پر جہاز

الوداع اے زندگانی الوداع

}

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ
دیکھ اس خرامِ ناز پہ اتنا نہ کر دماغ

ہے تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں
حملے سے یاں اجل کے نہیں ایک دم فراغ

یا رب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو
بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ

دو چار گام نقش قدم مل کے رہ گئے
آگے چلا نہ آہوے مشکیں کا کچھ سراغ

آئیں پئیں وہ شوق سے جو اہلِ ظرف ہوں
ساقی بھرے کھڑا ہے مئے لعل سے ایاغ

جنگل میں تختہ گل خود رو کر دیکھ کر
تازہ ہوا زمانے کی نا قدریوں کا داغ

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزمِ شعر میں
باری تب ان کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

\

حق نہ مُلّا نے کچھ بتایا صاف
اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف

آنکھ اپنی ہی جب تک نہ کھلی
مہر روشن نظر نہ آیا صاف

کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم
صاف تھے آپ، سب کو پایا صاف

زاہدو! ہم تو تھے ہی آلودہ
تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف

کیوں فقیہوں سے رک گئے حالی
بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

ا

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لائق
نہ اپنا کلبہ احزاں ہے یار کے لائق

کرے گا کیا ترا کحل الجواہر اے کحال
نہیں یہ آنکھ ہی دیدارِ یار کے لائق

مکانِ عاریتی اور لباسِ بوسیدہ
بہت ہے زندگی مستعار کے لائق

غرور و حرص ہیں زیور عروس دنیا کے
بناؤ تھے یہی اس نابکار کے لائق

کرے گی بادِ بہار آ کے اب کسے سرسبز
رہا نہ باغ قدومِ بہار کے لائق

بس اب ہے فضلہ روباہ و گرگ پر گزراں
رہا نہ شیر ژیاں خود شکار کے لائق

گناہ کا عذر کریں محتسب ہم آنکھوں سے
ہمارے جرم ہوں گر اعتذار کے لائق

گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی
تمہی تو شہر میں ہو اعتبار کے لائق

یہ ہم نے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ
مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لائق

a

دلوں کا کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک
تو آشنا سے ہو بے گانہ آشنا ایک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں
جہاں ہے راہ زنِ خلق رہنما ایک ایک

زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر
بنا ہے غوثِ زماں آج کل گدا ایک ایک

رہا ہوں رند بھی، اے شیخ! پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک

وفا کی ایک تجھی سے اُمید ہے اُس وقت
کہ یار یار سے ہو جائے گا جدا ایک ایک

چھپا کے اُس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے
جب آپ منہ سے لگی بولنے خطا ایک ایک

ہوا نہ ایک بھی حق اس کی بندگی کا ادا
کیا ہے جس نے حقِ خواجگی ادا ایک ایک

امیر حاج کی ہمت میں گر نہ آئے قصور
تو موجِ بحر ہے کشتی کی ناخدا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اس کا اُڑا لے گئی ہوا ایک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ
جگر کے پار ہے اب بھی تری نوا ایک ایک

وہ عشق ہے نہ جوانی، وہ تُو ہے اب، نہ وہ ہم
پہ دل پہ نقش ہے اب تک تری ادا ایک ایک

نہ ہم رہیں گے نہ حالی، پہ دل خراش جہاں
رہے گی حالی دلگیر کی صدا ایک ایک

S

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں اُن کی اور اُن کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلایشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں، سب سے الگ

دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بے گانہ ہو
ہے عشیرہ اور اُن کا دودماں سب سے الگ

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور اُن کا راز داں سب سے الگ

جانچتے اوروں کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں
رکھتے ہیں اپنا طریق امتحاں سب سے الگ

اک چمن بہر تفرج رکھتے ہیں زیر بغل
روضہ و بستان و فردوس و جناں سب سے الگ

کلبہ احزاں ہے روشن اُن کا جس مہتاب سے

ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ

سیکڑوں پھندوں میں یاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر ٹٹولے کوئی دل ان کا تو واں سب سے الگ

شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

d

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

عہد گیتی پر نہ پھولیں کامراں
آخر اس کی آشتی لائے گی رنگ

علم کیا، اخلاق کیا، ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

روکیے بدخو کو بد خوئی سے کیوں
آپ اپنی خو سے آ جائے گا تنگ

زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ
یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ

پاک بازوں کو نہیں کچھ قیدِ وضع
جو ہیں اچھے ان پہ سب کھلتے ہیں رنگ

کام کا شاید زمانہ ہو چکا
دل میں اب اٹھتی نہیں کوئی اُمنگ

وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل

314

دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ

کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح
اب لگا کھایا پیا سب آ کے انگ

عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ
ہے ابھی کم حاصل افیون و بنگ

بڑھ گیا ہے رحم انسانی بہت
ہو گی ایجاد اب نئی توپ اور تفنگ

قوم کو حالیؔ نہیں راس اتفاق
پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

f

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل
یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل

رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثار سلف
اور ابھی ہونا ہے شاید مبتذل

اک سنبھلتے ہم نظر آتے نہیں
ورنہ گر گر کر گئے لاکھوں سنبھل

کب تک آخر ٹھہر سکتا ہے وہ گھر
آ گیا بنیاد میں جس کی خلل

ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار
تیری حد بھی ہے کچھ اے طولِ اَمل

اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی
لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل

دیکھیے نبھتا ہے کب تک پاسِ وضع
ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل

314

کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں
وقت کوشش کا گیا شاید نکل

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامہ مدح و غزل

g

مدرسے میں دہر کے رو بر قفا بیٹھے تھے ہم
اٹھے بس ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم

پھر وہی ہم ہیں کہ ہر عشوہ پہ ہیں کافر کے لوٹ
زال دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم

صحبتیں اہلِ وَرَع کی سب گئیں نظروں سے گر
بزمِ رنداں میں یونہی اک روز جا بیٹھے تھے ہم

شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی
ورنہ دھوکا دور سے دیکھ اس کو کھا بیٹھے تھے ہم

ہم نہ تھے آگاہ زاہد زشت خوئی سے تری
آدمی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم

سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر
ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اٹھا بیٹھے تھے ہم

ہم سے خود دنیا ہی پچتائی نہ حالی ورنہ یاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

h

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں

314

گو کہ دل میں متصل خوف خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں
پر گنہہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں
ہم

دیدہ و دل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز
گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم

دل میں دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر
پر اسے آلودہ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم

ہو کے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں وہی
جرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم

ہیں فدا ان دوستوں پر جن میں ہو صدق و صفا
پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم

گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
اک جہاں سے آپ کو لیکن خفا پاتے ہیں ہم

جانتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا
اپنے میں گر شمۂ مہر و وفا پاتے ہیں ہم

بخل سے منسوب کرتے ہیں زمانے کو سدا
گر کبھی توفیق ایثار و عطا پاتے ہیں ہم

ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر
دردِ خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم

ٹھہرتے جاتے ہیں جتنے چشمِ عالم میں بھلے
حالِ نفسِ دوں کا اتنا ہی برا پاتے ہیں ہم

جس قدر جھک جھک کے ملتے ہیں بزرگ و خرد سے
کبر و ناز اتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم

گو بھلائی کر کے ہم جنسوں سے خوش ہوتا ہے جی
تہ نشیں اس میں مگر دُرد ریا پاتے ہیں ہم

ہے ردائے نیک نامی دوش پر اپنے، مگر
داغ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہیں ہم

راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم
دیکھیے کیا ڈھونڈتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

نور کے ہم نے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپوں کا نیا پاتے ہیں ہم

j

یاروں کو تجھ سے حالی اب سر گرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

یاد اس کی دل سے دھو دے اے چشمِ تر تو مانوں
اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

غیبت ہو یا حضوری دونوں بری ہیں تیری
جب بد گمانیاں تھیں اب بد زبانیاں ہیں

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

رحمت تری غذا ہے، غصہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں جتنی تیری جانِ جہانیاں ہیں

314

ہو گا تو پہلے ہو گا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نا مہربانیاں ہیں
اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں
روتے ہیں چار ہم پر، ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں
ہر حکم پر ہوں راضی، ہر حال میں رہیں خوش
حصے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

k

جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوئے کان ہمیں
کچھ روزوں غفلت میں پھرے یاں ڈھونڈتے ہم آسائش کو
کھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں
چل کے نئی اک چال فلک نے کھو دیے ہوش حریفوں کے
زد سے بچیں یا مات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس انہیں گر اپنا ذرا ہو جاں اپنی بھی ان پہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نا منصفیاں اور کہتے ہیں نا فرمان ہمیں
داد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں
صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں
یاں تو بدولت زہد و ورع کے نبھ گئی خاصی عزت سے
بن نہ پڑا پر کل کے لیے جو کرنا تھا سامان ہمیں
پُر سر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں
غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالی یاں سمجھو تم مہمان ہمیں

ا

کی تو ہیں ہم نے بھی حالی کوچ کی تیاریاں
سوجھتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں

خواب راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری
نہیں
جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

ہیں اگر بے دردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار
ناگوار ان سے سوا غیروں کی ہیں غم خواریاں

ہے کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی
سب کو کرنی ہوں گی پوری اپنی اپنی باریاں

زیست بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی محال
اتنی بھی اے عاقلو! اچھی نہیں ہشیاریاں

314

بے مزہ ہے اہلِ دیں کی ترش روئی بھی مگر
اُس سے پھیکی اہلِ دنیا کی ہیں ظاہر داریاں

گو طبیعت سے گئے سب مادے فاسد نکل
کم ہوئیں حالی نہ لیکن نفس کی بیماریاں

;

رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں
آج ہم شہر میں خوں اپنا ہدر کرتے ہیں

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

جرم خالق سے سوا پاتے ہیں جرم فقہا
جب کہ ہم اپنے جرائم پہ نظر کرتے ہیں

کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ
بول قوال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں

زہد و طاعت کا سہارا نہیں جب سے زاہد
یاد اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں

عیب یہ ہے کہ کرو عیب، ہنر دکھلاؤ
ورنہ یاں عیب تو سب فرد بشر کرتے ہیں

غم زدو ! رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دکھاتے ہیں وہی جس میں کہ گھر کرتے ہیں

جی رکاوٹ سے جو ان کی کبھی رک جاتا
اک لگاوٹ میں ادھر سے وہ اُدھر کرتے ہیں

اک یہاں جینے سے بے زار ہمی ہیں یا رب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

314

تلخیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی
یہ مہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں

قیصر و زار کا یاں پیٹ تو بھرنا معلوم
بس ہماری ہی طرح وہ بھی گزر کرتے ہیں

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

٭

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سیکڑوں اس میں

کی نصیحت بری طرح ناصح
اور اک بس ملا دیا بس میں

ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے
چشمِ انسان و چشمِ نرگس میں

بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اِس میں

نہ ہو قبضے میں جب عنانِ فرس
ہیچ ہیں جو ہنر ہیں فارس میں

جس سے نفرت ہے اہلِ نعمت کو
وہی نعمت ہے چشمِ مفلس میں

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

آج کل چرخِ صلح جو ہے بہت
دیکھیے ہو بگاڑ کِس کِس میں

کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

A

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں
ہیں مے ناب کے دلال قدح خوار نہیں

شہر میں ان کے نہیں جنسِ وفا کی بکری
بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں

کون سے وہ گُل رعنا پہ نوا سنج نہیں
کون سی نرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں

کبھی لیلیٰ پہ ہیں مفتوں کبھی شیریں پہ فدا
اور جو پھر دیکھو تو دونوں سے سروکار نہیں

اُٹھ نہیں سکتی سزا جرمِ وفا کی ان سے
دل پھنسا کر کہیں بنتے وہ گنہگار نہیں

عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ
اور جو ہو کیل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں

نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا ان کو
در بدر جھانکتے پھرنے سے انہیں عار نہیں

بوالہوس، کام طلب، بندہ نفس، اہلِ ہوا
ایک عالم ہے اسی رنگ میں، دو چار نہیں

دعویٰ عشق و محبت پہ نہ جانا ان کے
ان میں گفتار ہی گفتار ہے، کردار نہیں
کہے حالی بھی اگر عاشقِ صادق ہوں میں
کہہ دو واللہ کہ صادق نہیں زنہار نہیں

S

پھونکا ہے فصلِ گل نے صور آ کے پھر چمن میں
اک حشر سا بپا ہے مُرغانِ نغمہ زن میں
بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے
بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں
بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا
پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں
چپ ہے زبانِ سوسن حیراں ہے چشمِ نرگس
قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں
ہیں اور تو ادائیں ساری سہی قدوں کی
پڑنی ہے جان باقی بس سرو نارون میں
ہے عیدِ اہلِ اسلام یا موسمِ بہاراں
جنگل بسا ہوا ہے سب عطرِ یاسمن میں
منہ سے دھواں سا اُٹھا لیتے ہی نام اسلام
بارود بجھ رہی تھی گویا لب و دہن میں
پھر زخم پھوٹ نکلا حالی نہ چھیڑنا تھا
فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں
گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم

پر تازگی وہی ہے اس قصہ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سنا بھی اس پر کیا گزری انجمن میں؟

پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اسے جا
روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

روبہ کی جون میں ہے مرعوب اب وہ ملت
تھی سہم ناک کل تک جو شیر کے برن میں

وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستند یمن [1] کی
ہے اب بجائے حکمت خاک اڑ رہی یمن میں

وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے
ہے کال موتیوں کا اب سر بسر عدن میں

قبر اویس پر ہے بس فخر اب قرن کو
زندہ اویس کوئی باقی نہیں قرن میں

اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اڑا دی
فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں

ڈالی نہ ہو گی آگے اے دورِ چرخ شاید
جو اب کے تو نے ہلچل ڈالی ہے انجمن میں

فوج اور بہیر [2] دونوں پھرتی ہیں بے سری سی
گویا امیرِ لشکر مارا گیا ہے رن میں

خرد و بزرگ سارے ہیں بدحواس گویا
لٹنے کی قافلے کے پہنچی خبر وطن میں

---

[1] یمن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ "الایمان یمان والحکمة یمانیة" یعنی ایمان ہے تو یمن کا ہے اور حکمت ہے تو یمن کی ہے۔

[2] بہیر: خدمت گاروں اور مزدوروں کا لشکر

314

بھولی ہوئی ہیں ڈاریں ہرنوں کی چوکڑی سب
جائیں کدھر کہ ہر سو ڈوں لگ رہی ہے بن میں

حالی بس اب نہیں یاں سننے کی تاب باقی
مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہے یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں

D

وحشت میں تھا خیال گل و یاسمن کہاں
لائی ہے بوئے اُنس نسیمِ چمن کہاں

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوق دید بھی
جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں

اہل طریق جس کو سمجھتے ہیں زادِ راہ
واں دخل دست برد کو اے راہ زن کہاں

فصل خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں
مُرغ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں

لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرف آشنا
لے جائے ہم کو دیکھیے ذوقِ سخن کہاں

جی ڈھونڈھتا ہے بزمِ طرب میں انہیں، مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

دل ہو گیا ہے لذتِ غربت سے آشنا
اب ہم کہاں ہوائے نشاطِ وطن کہاں

کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں

روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں مگر

جاتا ہے محوِ شوق کا دیوانہ پن کہاں

F

حکم ہے پیرِ مُغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ
خیر کفارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاؤ

دل کو کس طرح سمجھئے کہ وہی ہے یہ دل
وہ اُمیدیں ہیں نہ ارماں، وہ اُمنگیں ہیں نہ چاؤ

یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر
تُو تو اچھا ہے مگر تیرے بُرے ہیں برتاؤ

دوست ہوں جس کے ہزاروں وہ کسی کا نہیں دوست
سچ بتا تجھ کو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ

تو وہی برق جہاں سوز ہے بن خواہ نہ بن
ہے برابر ترا بے ساختہ پن اور بناؤ

ایک ہی دوست اور اس سے ہمیں چھٹواتے ہو
ناصحو! اب تمہیں دشمن کہیں یا دوست، بتاؤ

ہو گیا ذکرِ قیامت تو اجیرن واعظ!
باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ

تجھ کو اے ابر بلا دیکھ کے جی چھوٹ گیا
ایک ہی بار تم اے بادلو! اس طرح نہ چھاؤ

پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا
ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ

دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کشتِ اُمید
آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مل کے بہاؤ

اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک

آج کل کیجیے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ

قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ
وقت اب ہاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

G

درِ فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ

ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد
بہت جانچ لیتے ہیں، دیتے ہیں تب کچھ

کچھ اور آؤ بن کر تم اے میر و مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

یہ طبل تہی ہیں جو ہنکارتے ہیں
جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

دیا تو نے یاں جس بہانے سے چاہا
ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ

ہے افسردہ مجلس کی خست سے واعظ
وہ گرمائے گا، یہ پسیجیں گے جب کچھ

تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب
نہیں ناصحو! تم پہ الزام اب کچھ

یہ ہے میر مجلس کہ چینی کی مورت
ٹٹولو تو ہیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

کوئی لقمہ چرب تاکا ہے شاید

یہ حالی کی عزلت نہیں بے سبب کچھ

H

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بے گانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو! پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتساب شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا
مبادا کہ ثابت ہو خست زیادہ

پھر اوروں کی تکتے پھرو گے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن
جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا
نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ

وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا
جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ

نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے
خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ

ہے اُلفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم
پہ اُلفت زیادہ نہ وحشت زیادہ

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں
پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر
نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ

J

ہے اُن کی دوست پر ہم کو تو بد گمانی
وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ ان کی مہربانی

بے جرم کوئی آخر کب تک سنے ملامت
ناصح سے ہم کو اپنی کہنی پڑی کہانی

عاشق کے دل کو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے
دیتا نہیں وہ لذت پیاسے کو سرد پانی

امید وصل سے ہے کچھ جی چھڑائے دیتا
جو کچھ سنا ہے ہم نے مشاطہ کی زبانی

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی

صبر و سکوں سے ہم کو یہ بھی نبیڑنے دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اے کاہش نہانی

پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویراں
ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی

دیکھا جمالِ جاناں آنکھوں نے اور نہ دل نے
کیا جانے کس ادا سے کی اُس نے دل ستانی

اک نکتے کے بیاں سے سر بر نہ ہو گے حالی
چلتا نہیں کسی کا یاں لاف نکتہ رانی

K

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے
گر مے نہیں، دے زہر ہی کا جام بلا سے

جو کچھ ہے سو ہے اُس کے تغافل کی شکایت
قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے

دلالہ نے اُمید دلائی تو ہے لیکن
دیتے نہیں کچھ دل کو تسلی یہ دلاسے

ہے وصل تو تقدیر کے ہاتھ اے شہہ خوباں

314

یاں ہیں تو فقط تیری محبت کے ہیں پیاسے

پیاسے ترے سرگشتہ ہیں جو راہ طلب میں
ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آب بقا سے

درگزرے دوا سے تو بھروسے پہ دعا کے
درگزریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو
تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے

حالی دلِ انساں میں ہے گم دولتِ کونین
شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان و عطا سے

جب وقت پڑے دیجیے دستک درِ دل پر
جھکیے فقرا سے نہ جھکیے امرا سے

L

کبک وقمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مرو کس کا ہے، بدخشان وختن کس کا ہے

دم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیتِ حُزن کس کا ہے

مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانیے یہ چرخِ کہن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذات خدا
ورنہ بے عیب زمانے میں چلن کس کا ہے

آج کچھ اور دنوں سے ہے سوا استغراق

عزمِ تسخیر پھر اے شیخ زمن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہل نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل ونسرین وسمن کس کا ہے

عشق ادھر عقل ادھر دھن میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھیے دونوں میں کٹھن کس کا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اس کی
ولولہ تجھ میں یہ اے مُرغ چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

:

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

سپاہ و میر سپہ باغ باغ ہیں لیکن
بہیر روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے

کہا جو میں نے وفا کرتے آئے ہیں احباب
کہا زمانے کی عادت بدلتی جاتی ہے

قلق انہیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے

بہت سے کھو دیے خلجان بے نوائی نے
ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے

ہوئے ہیں بارِ امانت سے تیرے سب عاجز

زمیں بھی اپنے خزانے اگلتی جاتی ہے
اُڑے گی خاک تقدس کی اب سر بازار
فقیہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے
نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

"

بری اور بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی
ملے گا نہ گل چیں کو گل کا پتا
ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا
کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
ادھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر
یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ
یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں
یونہی عمر ساری گزر جائے گی
سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

Z

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی
کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی، لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن
میں
یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گلچیں! یا ہے قزاقی

کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

رہی دانائی آخر غالب آکر پہلوانی پر
گئے چیں مان سب چینی و فرغانی و قبچاقی

ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ
لنڈھائے خم پہ خم غیروں پہ کیوں ممسک ہو گر ساقی

مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالی
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی

X

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز
اس میں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مندی
اس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

جو چھپاتے ہیں حق اندیشہ رسوائی سے
گھات میں ان کی لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی

دوست گر بھائی نہ ہو دوست ہے تو بھی، لیکن
بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی نہیں

اے غمِ دوست تجھی پر نہیں اپنی گزران
کچھ فتوح اس کے سوا اور ہے بالائی بھی

دل غنی رکھتے ہیں اے دولت دنیا جو لوگ
تیور ان کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی

عقل ہے اپنی حماقت کے چھپانے کی انہیں
جن میں کچھ ساتھ حماقت کے ہے خود رائی بھی

عقل اور حسن پہ جن کے بھری مجلس ہو گواہ
ان کو خود رائی بھی پھبتی ہے خود آرائی بھی

ملنے دے گی نہ اجل تم سے ہمیں جی بھر کر
فرصت اے دوستو! دنیا سے اگر پائی بھی

جی گئے ہم، پہ رہے مردوں سے بدتر [1] حالی
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی

---

[1] اپنے دائم المرض ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ (حالی)

C

رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی
بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

برائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن

کہاں یہ برائی کہاں وہ برائی

گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب
عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی

رکا ہاتھ جب بن گئے پارسا تم
نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی

بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے
سوا اس کے منعم میں ہے کیا بڑائی

جو کہیے تو جھوٹی جو سنیے تو سچی
خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی

ہوئی آ کے پیری میں قدر جوانی
سمجھ ہم کو آئی پہ ناوقت آئی

وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت
وہی پربت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی

جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح
جو واں دل پہ لی تھی تو یاں منہ کی کھائی

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

V

وصل کا اس کے دل زار تمنائی ہے
نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے
قطعِ امید نے دل کر دیے یک سُو، صد شکر

شکل مدت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے

قوتِ دست خدائی ہے شکیبائی میں
وقت جب آ کے پڑا ہے یہی کام آئی ہے

ڈر نہیں غیر کا جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے
ہم نے جب کھائی ہے اپنے ہی سے زک کھائی ہے

نشے میں چور نہ ہوں، جھانجھ[1] میں مخمور نہ ہوں
پند یہ پیر خرابات نے فرمائی ہے

نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی
بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی
سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

b

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

سامنا ہے موت کا ہونا محبت سے دو چار
آئے اس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

عقل پچھلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی
لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے

---

[1] جھانجھ: غصہ، تندی و تیزی، جھنجھلاہٹ

چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن، خدا کی شان ہے

تجھ میں جوت اے شمع ہے کس برق عالم سوز کی

314

جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے

دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

n

تم میں وہ سوز نہ تم میں ہے وہ ایماں باقی
رہ گیا کیا ہے اب اے گبر و مسلماں باقی

بزمِ دعوت میں رسائی ہوئی اپنی اس وقت
میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہماں باقی

حق ادا اک نگہ لطف کا ہو گا کیوں کر
دل و دیں لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی

ظاہرا درد ہی الفت کا نہیں چارہ پذیر
ورنہ چھوڑا نہیں ہم نے کوئی درماں باقی

توشہ موجود ہے حالی نہ سواری نہ رفیق
ابھی کرنے ہیں بہت کوچ کے ساماں باقی

m

جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تف کیجیے
نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجیے

واں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار
اس سے آخر کس طرح پیدا تعارف کیجیے

ضبط کیجیے دردِ دل تو ضبط کی طاقت نہیں
اور کھلا جاتا ہے رازِ دل اگر اُف کیجیے

دوست کے تیور ہیں ہم ہر رنگ میں پہچانتے

بے تکلف ملیے ہم سے یا تکلف کیجیے

جب کہ عقبیٰ مل گئی دنیا ہے پھر سہل الوصول
شیخ لگتے ہاتھ اس پر بھی تصرف کیجیے

وقت تھا جو کام کا حالی گنوا بیٹھے اسے
جایئے اب عمر بھر بیٹھے تاسف کیجیے

توبہ حضرت کی یونہی اک دودھ کا سا ہے اُبال
ہم دکھا دیں گے ذرا دم بھر توقف کیجیے

فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی
جان کو ہم نے لگا لی ہے یہ علت کیسی

جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا بیم خزاں
جن کی قسمت میں ہو کلفت انہیں راحت کیسی

جی کا الفت کو سمجھتے تھے ہم اک بہلاوا
وہ تو آفت تھی ہمارے لیے الفت کیسی

جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع نادار
قیدِ ہستی میں مری جان فراغت کیسی

عیب جوئی سے نہیں خلق کی دم بھر فارغ
جن کو کچھ کام نہیں یاں، انہیں فرصت کیسی

جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا
وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی

جانتا ہے وہی دل پر ہے گزرتی جس کے
ہم کہیں کس سے کہ در پیش ہے حالت کیسی

ہم نے اوّل سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک

ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی

جب کہ رہتا نہیں قابو میں دل اپنے ناصح
وحی بھی کام نہیں کرتی نصیحت کیسی

نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالی انجام
یار کی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی

•

سعی سے بہتر تن آسانی مری
کفر سے بدتر مسلمانی مری

تھا نہ محتاج سبب عفو کریم
کچھ نہ کام آئی پشیمانی مری

خلد میں بھی گر رہی یاد اس کی زلف
کم نہ ہو شاید پریشانی مری

ہے لباس جسم تک مجھ پر گراں
دور جا پہنچی ہے عریانی مری

مانع گلگشت ہے بیم خزاں
موت کرتی ہے نگہبانی مری

قدر نعمت ہے بقدر انتظار
حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری

خندہ زن ہے اس مسلمانی پر کفر
جیسی ہے حالی مسلمانی مری

/

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے
شکوے وہ سب سنا کیے اور مہرباں رہے

کیا کیا ہیں دل میں دیکھیے ارماں بھرے ہوئے
ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے

حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتہ امید
اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے

پوچھی گئی نہ بات کہیں پاس وضع کی
اتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے
نرخِ متاعِ عشق، الٰہی گراں رہے

حالی سے مل کے ہو گئے تم افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اس میں کہاں رہے

Z

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہل وعظ
یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے

وصل مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس
ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جاں رہے

کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رو سیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام

314

کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی کے بعد کوئی نہ ہم درد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

X

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
آخر کو ہم حوالہ تقدیر کر چکے

افسوں شب وصال کے واں کارگر نہیں
نالے شب فراق کے تاثیر کر چکے

اے دل اب آزمائش تقدیر کا ہے وقت
وہ امتحان برش شمشیر کر چکے

کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

بھولے رہے تصورِ مژگاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم ہدف تیر کر چکے

جاں لب تک انتظار میں آتی ہے بار بار
مشاطہ جلد تر کہیں تقریر کر چکے

دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

io

دَورِ آخر

(1893ء تا 1914ء)

1

کہاں فکر میں اب وہ جولانیاں
وہ دریائے معنی کی طغیانیاں
کہاں وہ طبیعت کی رنگینیاں
وہ بزمِ سخن میں گل افشانیاں
کہاں اب وہ جلسوں میں احباب کے
سخن سنجیاں اور سخن رانیاں
دکھائی جونہی دورِ گردوں نے آنکھ
گئے بھول ساری غزل خوانیاں
جھکے بن زمانے سے بنتی نہیں
رگڑنی ہیں یاں سب کو پیشانیاں
لگے بڑھنے جیسے کہ ہوش و خرد
لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی
بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں
اگر راست گوئی کی جرأت نہیں
تو جھوٹی ہیں واعظ کی لسانیاں
منادی نہیں حق کی کچھ دل لگی
بہت یاں ہیں درکار قربانیاں
گئے جھیل چپ چاپ گر مشکلیں

یہی مشکلیں پھر ہیں آسانیاں

ہو ناپید جو ملک میں اتفاق
ہیں آبادیاں واں کی ویرانیاں

بھریں خرقہ پوش اب کوئی اور روپ
یہ شکلیں تو ہیں جانی پہچانیاں

وہی لے گئے یاں سے زادِ سفر
گئے جھاڑ جو اپنی ہمیانیاں

لگاؤ نہ اس دارِ فانی سے دل
عیاں اس کی ہیں ست پیانیاں

جو یاں آج ہے جوشِ عیش و نشاط
تو کل حسرتوں کی ہیں طغیانیاں

پھر آرام برسوں نہیں یاں نصیب
اگر چار دن ہیں تن آسانیاں

چمن ہے کہ ہے سیمیائی نمود
یہ کہتی ہیں نرگس کی حیرانیاں

گل آوازِ بلبل پہ ہیں ہنس رہے
کہ کے دن کی ہیں یہ خوش الحانیاں

متاعِ وفا کا ہے دنیا میں کال
مگر گاہکوں کی ہیں ارزانیاں

لگا دیتے ہیں اس کی قیمت میں جو
شہنشاہیاں اور سلطانیاں

کھلونوں پہ مرتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ
یہ داناؤں کی یاں ہیں نادانیاں

جھپٹتے ہیں مُردار کی پا کے بو

یہ ہیں شیر مردوں کی جولانیاں

بنی نوع کے دوست کرتے ہیں آہ
بنی نوع پر آتش افشانیاں

کلیجے کے ٹکڑوں سے ہوتی ہیں یاں
سدا چیل کوؤں کی مہمانیاں

جہاں سوزیوں کا ہے گویا کہ نام
جہاں داریاں اور جہاں بانیاں

ڈبوتی ہیں آخر کو منجدھار میں
یہ فرعونیاں اور ہامانیاں

محبت کا دنیا کے حالی مال
پشیمانیاں ہیں پشیمانیاں [1]

2

نفس کی فرماں روائی ہو چکی
خود پسندی خود نمائی ہو چکی

اب ہیں پیری کی عبودیت کے دن
بس جوانی کی خدائی ہو چکی

گرم جوشی، لطفِ صحبت ہو چکا
ناخوشی، خفگی، لڑائی ہو چکی

موت کی راحت فزائی کا ہے وقت
زندگی کی جاں گزائی ہو چکی

---

[1] یہ غزل 1900ء تک لکھی جا چکی تھی کیونکہ مولانا حالی نے اپریل 1900ء میں دیوان انور کے تبصرے میں اس غزل کا چھٹا اور ساتواں شعر نقل کیا ہے۔ (بحوالہ حالی کا ذہنی ارتقا صفحہ 272)

قطرہ اب دریا میں مل جانے کو ہے
تیری میعاد اے جدائی ہو چکی

جلتے ہیں جبریل کے شہپر جہاں

بے پروں کی واں رسائی ہو چکی

دیکھنا ہے تجھ کو اب اے جذبِ عشق
عقل کی زور آزمائی ہو چکی

قید خانے میں گیا دل جن کا لگ
اُن اسیروں کی رہائی ہو چکی

دیر میں بھی لیجیے قسمت آزما
مسجدوں میں جبہہ سائی ہو چکی

خود بڑا بن کر دکھاؤ آپ کو
باپ دادا کی بڑائی ہو چکی

وقت ہے اے زاہد اب تشہیر کا
شہرتِ زہدِ ریائی ہو چکی

ہے چڑھائی علم کی مذہب پہ اب
شرک و بدعت کی چڑھائی ہو چکی

فلسفے سے اس کی اب مٹ بھیڑ ہے
سفسطے [1] سے ہاتھا پائی ہو چکی

رہ گئی ہے مذہب و ملت کی جنگ
ملک و دولت کی لڑائی ہو چکی

ہو نہ مذہب کی صفائی جب تلک
اہلِ مذہب کی صفائی ہو چکی

اب نہیں سننے کا اے حالی دماغ
بس بہت ہذیاں سرائی ہو چکی

---

[1] استدلال اور قیاس جس کی بنیاد مغالطے پر ہو۔

3

مستی جہل میں غفلت کا نشا اور سہی

شب تاریک میں گھنگھور گھٹا اور سہی

دوستو! روگ یہ ظاہر نہیں جانے والا
ہو چکیں ختم دوائیں تو دعا اور سہی

کم نہ تھے روگ جوانی میں بھی کچھ اے پیری
رعشہ اب اور سہی لغزش پا اور سہی

گر گنہ عفو کی اُمید پہ کرنا ہے خطا
ہیں جہاں لاکھ گنہ ایک خطا اور سہی

شہ کو ہے خوف عدو، خوف اجل، خوف زوال
کہہ دو اے بے خبر! کہ خوف خدا اور سہی

بے وفا کون سی خوبی ہے، نہیں جو تجھ میں
وصف اتنے ہیں جہاں ایک وفا اور سہی

ترک دنیا کے علائق تو کیے سب زاہد
گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور سہی

تیرے انفاس نے مُردوں کو کیا ہے زندہ
ایک جھونکا ادھر اے باد صبا! اور سہی

مدرسے میں نہ ملا کچھ تو نہ توڑ آس اے دل
اک در دولت ساقی پہ صدا اور سہی

تم تو حالی یہی طرز اپنی نبا ہے جاؤ
طرز شعر فصحا و بلغا اور سہی

4

نہ عیش کیخسروی رہے گا نہ صولت بہمنی رہے گی

رہے گی اے منعمو! تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی
رہے گی گردش دکھا کے نیچا جو ہو گے تارے تم آسماں کے
کسی کی آگے بنی رہی ہے، نہ اب تمہاری بنی رہے گی
گرایا تورانیوں کو تو نے، پچھاڑا مازندرانیوں کو
کہاں تلک اے شراب غفلت یہ تیری مردانگی رہے گی
رہے گی کس طرح راہ ایمن، کہ رہ نما بن گئے ہیں رہ زن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہ زنی رہے گی
صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی، دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی
کرے گی کچھ عقل رہ نمائی، نہ علم سے ہو گی کچھ صفائی
گناہ کی گندگی میں دنیا یونہی ہمیشہ سنی رہے گی
بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے، نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی
قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبول عام ہونا
رہو گے گر حسن ظن کے طالب تو تم سے یاں بدظنی رہے گی
جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالی تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیت اُن کی غنی رہے گی [1]

---

[1] یہ غزل 1904ء تک لکھی جا چکی تھی۔ حالی نے 31 مئی 1904ء کے خط میں (مکتوبات حالی، صفحہ 22) مولوی عبدالرحیم خاں بیدل کو اس غزل کی ایک نقل بھیجی تھی۔ مذکورہ خط میں لکھتے ہیں: ''فصیح الملک (داغ) کی ایک غزل کبھی دیکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے:

کب تک کھنچے رہو گے کب تک تنی رہے گی
کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی

مگر جب فکر کرنے لگا تو اس کی بحر یاد نہ رہی۔ آپ کے مشغلے کے لیے غزل مذکورہ ارسال خدمت کرتا ہوں۔''...... (بحوالہ حالی کا ''ذہنی ارتقا'' صفحہ 206)

کہنے کی بات ہو تو اُسے کہہ سنایئے
جو دل پہ بن رہی ہے وہ کیوں کر دکھایئے

دنیا کی ہو ہوس تو دل و دیں گنوایئے
یاں کھویئے بہت ساتو کچھ جا کے پایئے

یہ کیا کہ دل ہے دیر میں اور کعبے میں مقام
ہو رہیے بس وہیں کے جہاں دل لگایئے

گر جان کا ضرر ہے محبت میں ناصحو
ہم جان ہی سے بیٹھے ہیں بے زار، جایئے

اور اعتبار کھوتے ہو اپنا رہا سہا
بس آ گیا یقیں ہمیں قسمیں نہ کھایئے

بھر پائے بس زمانے سے جو مانگتے تھے حق
فارغ خطی ہم اپنی ابھی لکھ دیں، لایئے

مشکل ہے پاک ہونا اگر دل نہیں ہے پاک
زمزم میں غسل کیجیے کہ گنگا نہایئے

پھرتا ہو جو کہ کودتا غیروں کی آگ میں
خیر اُس اجل گرفتہ کی کب تک منایئے

ہوتی ہجومِ غم میں ہے کیوں زہر کی تلاش
حالی بتائیں آپ کو گر کچھ کھلایئے

6

وصف چمن قفس میں سنو عندلیب سے

پوچھو وطن کی قدر مسافر غریب سے
نالوں سے ایک دم نہیں مسکیں کو قرار
کیا کہہ گئی چمن میں صبا عندلیب سے
لاگ اور لگاؤ ساتھ گئے سب شباب کے
نفرت رقیب سے نہ اب الفت حبیب سے
اب دل سے دور رکھو خیالِ نشاطِ عمر
آواز دے رہا ہے یہ کوئی قریب سے
شادی ہے ایک کی وہی جو دوسرے کا غم
دنیا کے بھی ہیں شادی و غم کچھ عجیب سے
دوں بڑھنے درد دل کو مروں اس میں یا جیوں
پانڈے سے لوں صلاح نہ پوچھوں طبیب سے
کہتا ہوں، دیکھتا ہوں جسے خوار و بے وقار
ہے کوئی خاندان شریف و نجیب سے
طالب میں صدق ہے نہ عقیدت مرید میں
ہیں آج کل کے پیر بھی کچھ بد نصیب سے
پڑھیے وہ خطبہ جس میں کہ صدق و صفا نہ ہو
کہہ دو یہ جا کے برسرِ منبر خطیب سے
فاقے میں تم کو دیکھ کے جاتی ہے بھوک بھاگ
پہنچا ہے نسخہ آپ کو یہ کس طبیب سے
اب جس کے جی میں آئے بھرے شاعری کا دم
میدان آج کل ہے یہ خالی نصیب سے
نعم البدل ہے داغ کا، حالی، کلامِ داغ [1]
ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

---

[1] یہ غزل داغ کی وفات 17 فروری 1907ء کے بعد کہی گئی۔

تیر پیہم لگائے جاتا ہے
نظروں نظروں میں کھائے جاتا ہے

دیکھئے اور کیا دکھائے فلک
ابھی آنکھیں دکھائے جاتا ہے

دوستوں کو رلا چکا لیکن
دشمنوں کو ہنسائے جاتا ہے

ہو چکی قوم مردہ، پر جلاد
ابھی درے لگائے جاتا ہے

گو کہ حالی میں دم نہیں باقی
ڈور اپنی ہلائے جاتا ہے

گو نہیں آس خیر کی لیکن
خیر سب کی منائے جاتا ہے

اب سنے اس میں کوئی یا نہ سنے
وہی راگ اپنا گائے جاتا ہے

io

باب چہارم

قطعات

حالؔی کے قطعات کا اجمالی تجزیہ

حالؔی نے مختلف موضوعات پر((67 قطعات لکھے ہیں۔ یہ سارے قطعات مختلف عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں۔قطعات کے مجموعی اشعار کی تعداد((470 ہے۔سب سے طولانی قطعہ میں((21 شعر اور سب سے چھوٹے قطع میں((2 شعر ہیں۔

قطعات کی تقسیم بندی اور ترتیب وتدوین میں ہم نے بھی افتخار صدیقی کی طرح بعض نظموں کو صرف اس وجہ سے قطعات میں شامل نہیں کیا کہ ان کی ہیت یا ظاہری شکل قطعہ نما ہے اس کے علاوہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے مرتب کردہ دیوان میں چونکہ قطعات کی کوئی ترتیب نہ تھی اس لیے افتخار صدیقی کے دیوان کی پیروی کرتے ہوئے موضوعات کے تحت قطعات کو تنقیدی قطعات، سیاسی قطعات، معاشرتی اور اصلاحی قطعات،طنزیہ ومزاحیہ قطعات اور حکایات ومطائبات کے زیرعنوان پیش کیا ہے۔

حالؔی کا ایک عمدہ پندرہ شعر کا قطعہ ''شعر کی طرف خطاب'' کے زیرعنوان نظر آتا ہے۔اس قطعہ میں حالؔی نے جدید شعر کا منشور نظم کیا ہے جو مقدمہ شعروشاعری میں نثر کی صورت میں نظر آتا ہے۔چونکہ جدید شعر سے عوام اور خواص واقف نہ تھے اور ہر محفل میں اس کی پذیرائی ممکن نہ تھی اس لیے حالؔی نے اس قطعہ میں شعر کو ڈھارس دی ہے اور دلاسا دیا ہے کہ تو بہت صحیح اور سچ ہے تجھے ظاہری اور جھوٹے نقش ورنگ سے پرہیز کرنا چاہیے۔حالؔی نے شعر کو مخاطب کر کے ایک عمدہ شعر کی خصوصیات کو بیان کیا ہے جو اجمالی طور پر یہ ہیں:

(ا) شعر میں دل فریبی یا رنگینی نہ ہو تو افسوس نہیں مگر شعر بےکار بلکہ افسوس کا حامل ہوگا اگر اس میں دل میں اثر کرنے کی قوت اور خوبی نہ ہو۔

(ب)اگرچہ شاعری کی دنیا صنائع لفظی،صنائع معنوی اور دوسرے صنعتوں کے گورکھ دھندوں کو

پسند کرتی ہے مگر شعر کی اصلی خوبی اس کی سادگی ہے اس لیے کبھی سادگی کو ان بے قیمت قدروں پر قربان نہ کر۔

(ج) شعر کا ذاتی جوہر اس کا سچا خیال اور بیان ہے چناں چہ اس کو دوسروں کی جھوٹی تعریف کی ضرورت نہیں رہتی۔

(د) اس دور میں اگر سچائی اور سادگی کے حسن پرستار نہ ملیں تو کوئی بات نہیں تو خود کو دیکھ کر فخر کر کیوں کہ تو نے سچائی کے سمندر میں طوفان پیدا کیا ہے جو جھوٹے جہازوں کو ڈوبا دے گا۔

(ہ) شعر کو جھوٹ اور مبالغہ سے پاک ہونا چاہیے۔ وہ قدیم روایات تھیں جب کہ مبالغہ شعر کی جان اور شاعری کا ایمان تھا اب اگر اساتذہ بھی مبالغہ سے کام لیں تو ان کی پیروی اور تقلید نہ ہو۔

(و) اچھا شعر جس میں یہ سب خصوصیات ہوں خاموشی کے ساتھ دل پر اثر انداز ہوتا ہے اس کو تبلیغات اور ظاہری تعریف کی ضرورت نہیں رہتی۔ اچھا شعر داد و تحسین کے نشیب و فراز سے گزر کر جاوداں ہو جاتا ہے۔

(ز) شاعری جو وطن اور عوام کے لیے کی جائے اس میں عزت اور سلطانی ہے۔

(ح) جدید شعر کی قدر ابھی پوری طرح سے نہیں کی جاتی مگر یقیناً وہ وقت دور نہیں کہ اس کو سب اپنا اُسلوب بنائیں گے۔

(ط) جدید اشعار سے محفل آراستہ ہونی چاہیے۔ حالیؔ نے جدید شعر کو اعتبار بخشا اور اسی سے اعتبار پایا۔

اوپر بیان کیے گئے شعری محاسن اور مطالب حالیؔ نے کچھ مغربی شعریات سے لیے اور کچھ اپنی فکر و دانست سے مہیا کیے جس کی تربیت اور نشو و نما شیفتہؔ کی صحبتوں سے حاصل ہوئی تھی۔

حالیؔ اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ ہو چکی

حالیؔ سخن میں شیفتہؔ سے مستفید ہے
غالبؔ کا معتقد ہے مقلد ہے میرؔ کا

خود حالیؔ نے کہا تھا:

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

حالیؔ اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ انہیں نسبتاً طوالانی عمر (77 سال ملی اور آخری ایام تک ذہنی فتوحات جاری رہیں۔ انہیں سرسید جیسا مرشد، آزاد، شبلی، نذیر احمد جیسے مصاحب، غالب جیسا استاد شیفتہ اور آسمان جاہ جیسے سرپرست، اقبال، عبدالحق، زین العابدین، اسماعیل پانی پتی جیسے پرستار، سجاد حسین، غلام سیدین، غلام ثقلین، عابد حسین، صالحہ عابد اور سیدہ سیدین جیسے خاندانی سپوت ملے جنہوں نے حسن یوسف کو بازارِ مصر میں پیش کیا۔

حالیؔ نے قطعات میں تنقیدی اور شعر کی تعمیری گفتگو بھی کی ہے جو حالیؔ سے پہلے خال خال تھی۔ حالیؔ نے نثر اور نظم میں جدید اور زندہ شعر کے علائم اور اثرات ظاہر کیے ہیں۔

مثنوی کی طرح نظم اور قطعہ میں ایک مضمون یا مطلب کو تسلسل کے ساتھ پوری طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ حالیؔ نے اپنے استاد غالب کی طرح قطعوں میں وہ مطالب نظم کیے ہیں جو مختصر اور مسلسل موضوعات رکھتے ہیں۔

جابر علی سید نے اپنے ایک دلچسپ مضمون گولڈ سمتھ حالی اور گریرسن میں حالیؔ کے اس قطعہ ''شعر کی طرف خطاب'' سے اٹھاریوں صدی کے انگلش شاعر گولڈ اسمتھ کی نظم ''اے میری پیاری نظم'' کا تقابل کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حالیؔ کے قطعہ کے کئی شعر گولڈ سمتھ کی نظم سے ماخوذ ہیں۔ ہم یہاں گولڈ سمتھ کے اشعار کا ترجمہ اور حالیؔ کے قطعہ کے اشعار جابر علی سید کے مضمون سے بطور اقتباس بغیر کسی تشریح اور تبصرے کے درج کرتے ہیں۔

1۔ گولڈ سمتھ: اے میری پیاری نظم تو اُن موقعوں سے پہلی بھاگنے والی نظم ہے جہاں نفسانی خواہشات کی طغیانی ہوتی ہے۔ حالیؔ:

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو

2۔ گولڈ سمتھ: تو اس بےقدری کے زمانے میں بجائے اس کے کہ دلوں کو اپنی طرف مائل

اور پاک شہرت حاصل کرے ہر جگہ ملامت کی جاتی ہے۔ حالیؔ:

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

3۔ گولڈسمتھ: تو کمال کے طالبوں کی رہنما ہے اور نیکی کی دایہ۔ پس خدا ہی تیرا نگہبان ہو گا۔ حالیؔ:

چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جا دلوں میں گھر
گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو

4 گولڈسمتھ: تیری بدولت عام جلسوں میں مجھے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جب تنہا ہوتا ہوں تو تجھ پر فخر کرتا ہوں۔ حالیؔ:

جو قدر داں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ
حالیؔ کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو

اگرچہ گولڈسمتھ کی نظم کے باقی شعروں کے متن کا حالیؔ کے قطعہ سے کوئی موضوعی تعلق نہیں رہا لیکن ان چند شعروں سے یہ پتا چلتا ہے کہ حالیؔ مغربی شاعروں کا مطالعہ ترجموں کی صورت میں کر رہے تھے اور اس سے استفادہ بھی حسب ضرورت ہو رہا تھا اور اسی کو چراغ سے چراغ روشن کرنا کہتے ہیں۔

حالیؔ نے اچھے شعر کی بابت یہ بھی لکھا ہے کہ شعر میں شاعر انہی موضوعات پر قلم اٹھائے جو اُس نے خود کیے ہیں اور اس کا ذاتی تجربہ رکھتا ہو یعنی شراب رندی میخانے کا مست و رنگین ذکر وہی کرے جو اس کا اہل ہے۔ عشق و عاشقی ہجر و وصال کے مضامین وہی باندھے جو عاشق رہا ہو اور عاشقی کا مزا اور درد چکھا ہوا ہو۔ حالیؔ کا خیال ہے ایک تو فرضی عاشق یا شرابی بننا نرے نقالی اور نقلی عمل ہے دوسرے اس میں سچائی اور صداقت کا فقدان ہے جس سے شعریت مجروح ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں ریاض خیر آبادی نے تمام شاعری شراب اور میخانے کی نذر کر دی مگر شراب کے ساغر کو بھی ہاتھ نہ لگایا اسی طرح درجنوں شاعروں نے فرضی معشوقاؤں کی محبت اور ہجر و وصل میں دفتر سیاہ کر دیے۔

حالی نے ایک قطعہ میں جس کا عنوان ہے ''مشاعرے کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر'' یہ دکھایا ہے کہ انہوں نے عشقیہ شاعری کی جب تک ان کا دل اور اس کی امنگیں جوان تھیں وہ زمانہ تھا جب کہ: ع

طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی رو داد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

لیکن اب وہ جوانی نہ رہی چناں چہ اب یا دوسروں کی نقالی کریں اور مضمون فرضی باندھیں:

آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
لایئے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر

مگر ایسا کرنے سے ہم اُس بوڑھی بدکار عورت کے مانند ہو جائیں گے جس کا کام صرف دلالی ہو جاتا ہے:

پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
قحبہ چون پیر شود پیشہ کند دلالی

حالی نے خود نظم اور نثر پر نکتہ چینی کی اور ان کی اصلاح کے لیے اپنا نظریہ بھی پیش کیا۔ حالی کا ایک طنزیہ قطعہ نکتہ چینی ہے جس میں باپ بیٹے کو نصیحت کر رہا ہے کہ اپنا خون و پسینہ ایک کر کے نظم و نثر میں معنی آفرینی کی تصانیف کر کے نام کمایئے اگر وہ شاعر یا نثار بننے کی لیاقت نہ رکھتے تو: ع

شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

اس مطلب کو کئی شاعروں نے پیش کیا ہے کہ بہت سے ناکام شاعر کامیاب ناقد بننے کی کوشیش کرتے ہیں۔

حالی نے قطعہ ''چھوٹوں کا بڑا بن جانا'' میں عربی مصرعہ پر قطعہ کی عمارت کھڑی کی۔ ''كَبّرنَا مَوتُ الكُبَرَ'' یعنی بڑے لوگوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا۔ اس قطعہ کی تمہید کو

حالی نے ایک دانشور کی حکایت سے جوڑ کر جو کئی چھوٹے بڑے خطوط سے ایک ایک خط کو مٹا کر سب سے چھوٹے خط کو محفوظ کیا جو دراصل سب سے بڑا خط نظر آنے لگا۔ حالی نے اس حکایت کو برصغیر کے قحط الرجال سے جوڑ کر اپنی عجز و کسر نفسی سے تکمیل کیا:

قوم میں جیسا حال ہے اب آدمیوں کا کال نہ تھا
شعر میں تھے استاد اکثر سحر بیاں اور نکتہ سرا
اہل ہنر کا نام و نشاں قوم میں جب باقی نہ رہا
حالی و زید و عمرو بنے صاحب دیواں نام خدا
ہم ہیں وہی نا چیز مگر کَبُرنَا مَوتُ الکُبَر

حالی کے مسدس میں شعرا کی جوگت بنائی گئی تھی اس کے بعد حالی کی مختلف نظموں اور مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے جو تنقید اُردو شاعری اور شعرا پر کی تھی اُس کی وجہ سے حالی کے خلاف کئی اخبار اور رسالے مسلسل نثر اور نظم میں مطالب لکھ رہے تھے جن میں حسرت موہانی کا اُردوے معلی اور سجاد حسین کا اودھ پنچ پیش پیش تھا۔ کوئی کہتا تھا:

دلی دلی کیسی دلی
پانی پت کی بھیگی بلی

کوئی حالی کو خالی، ڈفالی لکھتا تھا۔ اودھ پنچ کے صفحہ اول پر کئی سال تک یہ شعر شائع ہوتا رہا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائے مال ہے

اُردوئے معلی کے شاعر و ادیب حالی کو دلی کا نہیں بلکہ پانی پت کا باشندہ مانتے تھے جب کہ حالی کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دلی میں گزرا اور پانی پت دلی سے پچاس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بہر حال ''دلی کی شاعری کا تنزل'' کے تحت حالی نے ان سوالوں کا جواب بھی دیا اور کسی حد تک اپنے دل کا بخار بھی کم کیا۔ اُردوے معلی کے شعرا صرف دلی اور لکھنو کو ہی ٹکسال قرار دیتے تھے۔ ہم یہاں اس تیرہ((13 اشعار کے قطعہ کے کچھ مصرعوں اور شعروں کو درج کر کے بغیر مزید تشریح

کے حالی کا جواب پیش کرتے ہیں:

اک دوست نے حالی کے کہا از رہ انصاف
شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہل زباں سے
معلوم ہے حالی کا جو ہے مولد و منشا
اردو سے بھلا واسطہ حضرت کے وطن کو
اردو کے دھنی وہ ہیں جو دلی کے ہیں روڑے
پنجاب کو مس اس سے نہ یورپ نہ دکن کو
حالی کی زباں گر یہ مثل نہر لبن ہو
خالص نہ ہو تو کیجیے کیا لے کے لبن کو

پھر اس دوست نے چند شعر سنائے جو اُردو شاعری کے لیے ننگ تھے۔ حالیؔ نے اس قطعہ کو یوں تمام کیا:

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

قطعات میں حالیؔ کے فن کا یہ کمال ہے کہ وہ مصرعوں میں پورا مطلب ظاہر کر دیتے ہیں۔ ''پولیٹیکل اسپیچیں'' جو سیاسی لیڈروں کی ہوتی ہیں کیا اس کے سوا ان میں کچھ ہوتا ہے:

یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن
دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات
کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں میں
اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

حالیؔ کے سیاسی قطعات آزادی، ہندوستان کی غلامی اور کالے اور گورے کے نسلی فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان میں کہتے ہیں:

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
راہ میں دونوں کے باہم ہوگئی کچھ ہشت مشت

کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
ڈاکٹر نے آ کے دونوں کی سنی جب سرگزشت
دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیق مرض
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیوں کر اعتبار

یہ سچ ہے کہ حالی کے اکثر قطعات معمولی مضامین اور سطحی شاعری سے بنے ہیں۔ بعض قطعات حالی کے ایک مصرعہ یا ایک لفظ کے ارد گرد تخلیق ہوئے معلوم ہوتے ہیں جیسے اس قطعہ ''قانون'' کے پانچ شعر لفظ ''لا'' کے اطراف ہیں جس کے معنی عربی میں نہیں اور انگریزی میں (Law) قانون کے ہیں۔ حالی اس قطعہ میں یہ بتاتے ہیں کہ اگرچہ قانون سب کے لیے ہے لیکن اس کی پابندی اور عمل داری صرف کمزوروں کے لیے ہے۔ امیروں، حکمرانوں اور زورمندوں کے لیے وہ مکڑی کے جالے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا:

حق میں کمزوروں کے ہے قانوں وہ
اور نظر میں زور مندوں کی ہے ''لا''

یہاں حالی نے انگریز حکمرانوں کے لیے زورمندوں اور ''لا'' بمعنی نہیں استعمال کیے ہیں۔ حالی نے بعض انگریزی ضرب المثال کو بھی قطعات میں عمدہ اور سلیس طریقے پر پیش کیا ہے۔ Divide and rule فاتح قوموں کا شعار اور طریقہ حکومت رہا ہے۔ حالی کے قطعے ''تدبیر قیام سلطنت'' کا شعر سنیے۔

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو

ایک اور انگریزی ضرب المثل کا ترجمہ اس قطعہ میں دیکھیے۔

کھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام
اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا

حافظ کہتا ہے کہ میرا دشمن صحیح معنی میں میرا دوست ہے جس کی وجہ سے میں راہ راست پر ہوں۔ کئی فلسفیوں اور دانشوروں نے بھی ایسی باتیں کی ہیں۔

حالیؔ کے قطعے سے دو شعر دیکھیے:

قول اک حکیم کا ہے کہ گر غور کیجیے
ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر
دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست
منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر

حالیؔ کے بعض دو شعری قطعات عمدہ نکات کی ترجمانی انوکھے انداز میں کرتے ہیں جو ان کی فن پر قدرت اور معنی آفرینی کا ثبوت ہے۔ مغرور کی پہچان کے ذیل کہتے ہیں:

غرورِ زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو — تو سمجھو کرتا ہے اپنے غرور کا اظہار
جنھوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا — بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

ایک اور قطعہ ''کام اچھا کرنا چاہیے نہ جلد'' میں کہتے ہیں:

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اُس نے کی تاخیر اس میں جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیوں کر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

''سچ کہاں ہے'' عمدہ قطعہ ہے۔ تاریخ اور دیگر تحریریں جھوٹی ہیں:

دیکھنے ہوں تمھیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں
سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

حالیؔ ایک نسبتاً طویل قطعہ ''خودستائی'' میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خودستائی کا مادہ ہر شخص میں ہے لیکن ہر ایک کا طریقہ اظہار جداگانہ ہے:

جو زیورِ خرد سے مُعَرّا ہے سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو ان سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ
پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا
چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خُوبیاں
یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا
کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حسن ظن ہے یہ
اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا
اور چاہتا ہے کہ ہو تعریف کچھ سوا
القصہ جس کو دیکھیے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بے چارہ مبتلا

حالؔی نے عورتوں اور لڑکیوں کے مسائل پر صرف مناجات بیوہ اور چپ کی داد ہی نہیں لکھی بلکہ کئی دوسری نظموں اور نثری تحریروں میں ان کی تعلیم اور حقوق کی پاسداری بھی کی ہے حالؔی نے عملی طور پر بھی پانی پت میں لڑکیوں کے لیے مکتب جاری کیا تھا۔ جہاں تک قطعات کا تعلق ہے حالی کا ایک چودہ شعر کا قطعہ ''بیٹیوں کی نسبت'' ایک پراثر نظم ہے۔ حالؔی اس قطعہ میں یہ بتاتے ہیں کہ ہم بڑی آب وتاب سے بیان کرتے ہیں کہ قدیم دور میں عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ زندہ دفن کر دیتے تھے لیکن یہ نہیں سوچتے کہ یہی عمل بیٹیوں کے لیے ہمارے معاشرے میں دوسری شکل سے جاری ہے یعنی جب لڑکی کی شادی کرتے ہیں تو اس کے شوہر کے صفات اخلاق دیکھنے کے بجائے خاندان کے نام ونشان ثروت اور جاگیر پر توجہ کرتے ہیں:

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر
بد مزاجی ہو جہالت ہو کہ ہو بد چلنی
کچھ برائی نہیں ذی تو نہ ہو داماد اگر

جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں
گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
زندہ درگور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر

علامہ اقبالؔ کا ایک شاہکار شعر ہے جس کے معنی ہیں کہ ایک کافر دل کی بیداری (یقین دل) کے ساتھ اپنے بت کے سامنے اُس مسلمان سے بہتر ہے جو کعبے میں غیر یقینی کے عالم میں ہے:

کافری بیدار دل پیشِ صنم
بہ بہ دین داری کہ خفت اندر حرم

شاید اقبالؔ نے یہ مطلب حالیؔ سے اخذ کیا ہو۔ حالی قطعہ ''یقین'' میں کہتے ہیں:

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست
دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا
تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بت پرست
جس کا یقیں ہے تیرے یقیں سے کہیں سوا
وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر
آتا نہیں یقین میں اس کے کبھی قصور
تو بندہ غرض ہے وہ راضی رضا پہ ہے
وہ ہے کہ یہ ہے بندگی اے بندہ خدا

حالیؔ نے سرسید احمد خان پر نثر میں شاہکار سوانح حیات جاوید لکھی جو تقریباً ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ نظم میں بھی حالیؔ نے سرسید پر سب سے زیادہ اشعار لکھے وہ کہیں مرثیے کی صورت، کہیں علی گڑھ تحریک کے جلسوں اور قصیدوں میں اور کہیں قطعات اور نظموں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ دیباچوں، مقالات اور خطوں میں بھی سرسید کا ذکر اور ان کی فکر کی مدح سرائی نظر آتی ہے۔ ہم یہاں تحریر کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف تین طنزیہ قطعات پر روشنی ڈالیں گے۔ ان قطعات میں حالیؔ نے سرسید کی مخالفت اور ان کی تکفیر میں طنز کیا ہے۔ اُردو شاعری میں ہماری نظر

میں حالی کے سوا کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا جس نے کھل کر بڑی تعداد میں تکفیر کے خلاف شعر کہے ہوں۔ ''سید احمد خان کی تکفیر'' کے قطعہ سے چند شعر بغیر تشریح اور تبصرے کے یہاں درج کیے جا رہے ہیں:

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں
بعض کے نزدیک توحید اس کی حد تام ہے
بعض کہتے ہیں کہ شر سے تیرے سب ایمن رہیں
پس مسلمانی و دیں داری اسی کا نام ہے
بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہے لباس
جو لباس غیر پہنے خارج از اسلام ہے
اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر
سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

حالی نے اپنے ایک قطعہ میں ''سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ'' بتائی ہے جو صرف سرسید کے سماجی، سیاسی اور مذہبی خیالات یا ان کی تصانیف اور عملیات کے باعث نہیں بلکہ یہ زیادہ تر حسادت اور سرسید کی فتوحات کی بنا پر تھی:

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ
کس لیے سید سے صاف اے حضرت والا نہیں
کافر و ملحد ہمیشہ اس کو ٹھہراتے ہیں آپ
آپ بھی نام خدا ہیں تارک صوم و صلوٰۃ
پھر یہ سید پر تبرا آپ کو زیبا نہیں
سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے
رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

حالی کا ایک طنزیہ قطعہ ''سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید میں'' ہے۔ یہ قطعہ درحقیقت ایک

واقعہ کا منظوم نقشہ ہے جو خود سرسید نے بھی لکھا تھا۔ اُس دور میں سرسید کی ہر تصنیف اور تالیف ہی نہیں بلکہ ہر تحریر اور تقریر کو بھی مذہبی لوگ اور چند حاسد مولوی اپنے اپنے رسالوں اور کتابوں میں موردِ اعتراض اور طعن ولعن کرتے تھے۔ اس قطعہ کا لب لباب یہ ہے کہ ایک مولوی جو معاش سے پریشان تھا اور روزی کمانے کے چکر میں سرگرداں تھا اُس کو ایک شخص نے مشورہ دیا کہ سرسید کی تازہ تصنیف بازار میں آئی ہے اُس پر تنقید کر کے تو ثروت مند ہو سکتا ہے۔ حالی کی زبانی کچھ مصرعوں کو سنیے:

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہِ معاش کی
راہ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اک خضرِ بے خجستہ نے کی آ کے رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اس کے کہ آج کل
سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی
جا اور لفظ لفظ کو اس کے چھیڑ کر
تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بری بھلی
پھر دیکھنا کہ راس و چپ و گرد و پیش سے
لگتی ہے کیسے آ کے زر و سیم کی جھڑی

ہم اس تحریر کو حالی کے دو چھوٹے قطعات پر تمام کرتے ہیں۔

سخن سازی:

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو

موجود سخن گو ہوں جہاں واں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو

دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونوں

ناصحِ مخلص اور اہلِ غرض میں تمیز:

منصور نے یہ جعفر صادق سے عرض کی
محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا بشر

کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور

فرمایا ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ صرف نصیحت زبان پر

315

اور جن سے ہے امید نصیحت وہ بالیقیں   صحبت میں بیٹھنے سے کریں گے تری حذر

قطعات

(1874ء تا 1893ء)

ماخذ: دیوان حالی (طبع اوّل 1893ء)

x تنقیدی

1 شعر کی طرف خطاب

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو
آپے کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری
قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجیو نماز تو
اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ ساز باز تو
ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
معذور جان ان کو جو ہے چارہ ساز تو

چپ چاپ اپنے بچ سے کیے جا دلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تو

جو نابلد ہیں ان کو بتا چور بن کے راہ
گر چاہتا ہے خضر کی عمر دراز تو

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا، تو لے نکل
بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے، اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر، پہ بے قدریوں کے بعد
اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

جو قدر داں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو

2 مشاعرے کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر حیف
طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ
سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی

گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی

آپ بیتی نہ ہو جو، ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجیے درد جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی [1]

3 نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم وفضل میں
جس طرح بن آئے بیٹا! نام پیدا کیجیے
کیجیے تصنیف اور تالیف میں سعی بلیغ
اس میں ایک اپنا پسینہ اور لہو کر دیجیے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا
اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے
اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں
شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

---

[1] بازاری عورت جب بوڑھی ہوجاتی ہے تو دلالی کا پیشہ اختیار کرتی ہے۔

4 بے تمیزیِ ابنائے زماں

از رہِ فخر آبگینے سے یہ ہیرے نے کہا
ہے وجود اے مبتذل! تیرا برابر اور عدم
جنس تیری کس مپرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ
تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونے کا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا
امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم
مسکرا کر آبگینے نے یہ ہیرے سے کہا
گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم!
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز
ہیں مبصر ایسے اس بازار نا پرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑ رہتے ہیں ہم

5 چھوٹوں کا بڑا بن جانا

چند خطوط اک دانا نے
کھینچ کے یاروں سے یہ کہا
دیکھ لو ان میں جتنے ہیں خط
کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہے کوئی جو بے ہاتھ لگائے
دے یونہی چھوٹے خط کو بڑھا
ایک نے جتنے خط تھے بڑے
اٹھ کے دیا ایک اک کو مٹا

جب نہ رہا واں پیش نظر
خط کوئی چھوٹے خط کے سوا

دیکھا اُٹھا کر آنکھ جدھر
تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا

کل کی ہے یارو بات کہ تھی
قوم میں باقی جان ذرا

قوم میں جیسا حال ہے اب
آدمیوں کا کال نہ تھا

تھے موجود ادیبوں میں
اخطل و اعشیٰ [1] کے ہمتا

منشیوں میں ایسے تھے بہت
جن پہ کہ نازاں تھی انشا

شعر میں تھے اُستاد اکثر
سحر بیاں اور نکتہ سرا

لے گئی ان کو آخر کار
بحرِ فنا کی موج بہا

اہلِ ہنر کا نام و نشاں
قوم میں جب باقی نہ رہا

حالی و زید و عمرو بنے
صاحبِ دیواں نام خدا

اب چاہو اُستاد گنو
یا ہمیں سمجھو ہم یکتا

ہم ہیں وہی نا چیز مگر
کبّرَنَا مَوْتُ الْکُبَرَا [2]

---

[1] دو مشہور عرب شاعروں کے نام [2] بڑے لوگوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا

6دلی کی شاعری کا تنزل

اک دوست نے حالی کے کہا ازرہ انصاف
کرتے ہیں پسند اہل زباں اس کے سخن کو

چند اہل زباں جن کو کہ دعویٰ تھا سخن کا
بولے کہ نہیں جانتے تم شعر کے فن کو

شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہل زباں سے
ہو چھو نہ گئی غیر زباں اس کے دہن کو

معلوم ہے حالی کا جو ہے مولد و منشا
اردو سے بھلا واسطہ حضرت کے وطن کو

اردو کے دھنی وہ ہیں جو دلی کے ہیں روڑے
پنجاب کو مس اس سے نہ پورب نہ دکن کو

بلبل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے
کیا عالمِ گلشن کی خبر زاغ و زغن کو

حالی کی زباں گر بہ مثل نہر لبن ہو
خالص نہ ہو تو کیجیے کیا لے کے لبن کو

ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ
پہنچے گا نہ وہ نافہ آہوے ختن کو

مانا کہ ہے بے ساختہ پن اس کے بیاں میں
کیا پھونکیے اس ساختہ بے ساختہ پن کو

یہ دوست نے حالی کے سنی جب کہ تعلّی
حق کہنے سے وہ رکھ نہ سکا باز دہن کو

کچھ شعر تھے یاد ان کے، پڑھے اور یہ پوچھا
کیوں صاحبو! عزت اسی اردو سے ہے فن کو؟

سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے
کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو [۱]

ہو بولی ٹھٹھولی کا جہاں نام فصاحت
واں کون لگا ماننے حالی کے سخن کو

7 شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

سنتے ہیں یہ اک مدبر کی ہے رائے
چاہیے گر رونق علم زباں

شاعروں کو سلطنت کا کیجے رکن
جن پہ اس کی سب رکانیں [۲] ہیں عیاں

رائے صائب ہے بظاہر اور متیں
گو کیا اس کا نہیں کچھ امتحاں

شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ
ہے بہت کم برخلاف اس کے گماں

سلطنت کا پر خدا حافظ ہے جب
شاعروں کے ہاتھ ہو اس کی عناں

---

[۱] شیخ محمد اسماعیل صاحب کا بیان ہے کہ مولانا حالی نے کلیات نظم اُردو مرتب کرنے کے خیال سے دیوان پر بھی نظر ثانی کی اور یہ شعر کاٹ کر اس کی جگہ حسب ذیل شعر لکھا۔

[۲] ''رُکان'' ہندی لفظ ہے بہ معنی قاعدہ، قانون، طور، طریقہ

315

اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے
شعر و انشا کو بھی ہے خوف زیاں
ایک پر ان میں سے چل سکتا نہیں
دوسرے کا جادوے حُسنِ بیاں
ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی
پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں

سیاسی x

پولیٹیکل اسپیچیں 8

اے بزمِ سفیرانِ دول کے سخن آرا
ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن
کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہے
ظاہر ہے نہ غصے میں بیاں سے تری رنجش
نے لطف میں کچھ طرزِ بیاں اس سے جدا ہے
ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار
اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے
جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں
اور جنگ میں کچھ لطفِ سخن اس سے سوا ہے
گر سوچیے تو سیکڑوں پہلو ہیں سفر کے
اور سنیے تو زنجیر سے ہر قول بندھا ہے
دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات
گونگا نہیں، گویا نہیں، کیا جانیے کیا ہے

کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں میں
اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

تھے لب پئے اظہار پہ اب آ کے کھلا یہ
انسان کو اخفا کے لیے نطق ملا ہے

9 آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنہیں
قدرداں اُن سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم

ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم

عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
بے نوا کو ہے زیادہ قدر دینار و درم

"تعرف الاشیاء بالاضداد" ہے
قول حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم

سن کے اک آزاد نے یہ لاف، چپکے سے کہا
ہے سقر موری کے کیڑے کے لیے باغ ارم

10 انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آ کر، کرامت ہے یہ انگلستان کی

اس کی سرحد میں غلاموں نے جونہی رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی

ا۔ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔

قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی

آن کر آزاد یاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام اس کی ہوا جن کو لگی

نیشن کی تعریف!

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے
اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب

کہ نیشن وہ جماعت ہے، کم از کم
زباں جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب

مگر وسعت اسے بعضوں نے دی ہے
نہیں جو رائے میں اپنی مذبذب

وہ نیشن کہتے ہیں اُس بھیڑ کو بھی
کہ جس میں وحدتیں مفقود ہوں سب

زباں اس کی نہ ہو مفہوم اس کو
ہوں آدم تک جدا سب کے جد و اب

جو واحد لا شریک اس کا خدا ہو
تو لاکھوں اس کے ہوں معبود اور رب

@ کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان

دو ملازم، ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل، مگر پہلا سوار راہوار

تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار

راہ میں دونوں کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار

صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار

ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمے سے غش کالے کو آیا چند بار

آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونوں پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار

ڈاکٹر نے آ کے دونوں کی سنی جب سرگزشت
تہہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار

دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار

یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار

اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جان دار

ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

قانون

کہتے ہیں ہر فرد انساں پر ہے فرض
مانا قانون کا بعد از خدا

پر جو سچ پوچھو نہیں قانون میں
جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا

اس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں
اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا!

پر اسے دیتے ہیں توڑ ایک آن میں
جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا

حق میں کمزوروں کے ہے قانون وہ
اور نظر میں زور مندوں کی ہے ''لا'' اے

$ تدبیر قیام سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو

اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو

پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
مانو اُسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو

کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اُسے منہ سے نہ نکالو

% قوم کی پاسداری

اک مسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر

چاہتے ہیں نفع پہنچے اپنے اہل ملک کو
گو کہ ان کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر

ا۔ ''لا'' عربی حرفِ نفی، بمعنی ہیچ ہے۔ اور انگریزی میں (Law) بمعنی قانون ہے۔ مراد یہ ہے کہ بڑے لوگ قانون کو ''لا'' اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی نظروں میں وہ ہیچ ہے۔

کارخانے کا یہ راجس ا کے کبھی چاقو نہ لیں
اس کا ہو بے چارہ ہندی بیچنے والا اگر

خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انہیں
ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر

الغرض اہل وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا، قصہ مختصر

سن کے حالی نے کہا ہے حصر انگریزوں پہ کیا
ایک سے ہے ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر

ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبول اس پہ ہے طبع بشر

کھیاں جیتی نگل جاتے ہیں پاس قوم میں
اچھے اچھے راست باز اور حق پرست اور دادگر

ہاں بری اس عیب سے لے دے کے اس دنیا میں
چشمِ بددور اُمت مرحوم، اے جانِ پدر

اور قوموں سے انہی لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ، کرتے ہیں اپنی فوج پر

ہو گا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو بھی
جس قدر ہے ان سے اپنوں اور یگانوں کو خطر

Rogers۔ انگریز کارخانہ دار جس کے چاقو مشہور تھے۔

X معاشرتی و اصلاحی

۸ بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانے میں یہ تھی رسمِ عرب
کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر

سنگ دل باپ اسے گود سے لے کر ماں کی
گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر

رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن
جو کہ اندھے ہیں ہیں ہیئے اسے کے نہیں کچھ ان کو خبر

لوگ بیٹی کے لیے ڈھونڈھتے ہیں جب پیوند
سب سے اوّل انہیں ہوتا ہے یہ منظور نظر

ایسے گھر بیاہیے بیٹی کو جو ہو آسودہ
اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر

جانے پہچانے ہوں سمدھیانے کے سارے زن و مرد
ان کو معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر

ایک ہی شہر میں ہوں دونوں گھرانے آباد
دونوں نزدیک قرابت میں ہوں باہم دیگر

315

جیتے جی مر گئی بس ان کی طرف سے گویا
جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر

ا۔ ہئی یا ہیا (سنسکرت، ہندی) بمعنی دل، روح، باطن، ہستی

بد مزاجی ہو، جہالت ہو کہ ہو بد چلنی
کچھ برائی نہیں ذتوننا [1] ہو داماد اگر

وہ یہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن
بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر

جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں
گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر

ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
زندہ در گور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر

اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

&یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست
دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا

جی میں ترے ہزاروں گزرتے ہیں وسوسے
ہوتی نہیں قبول تری ایک اگر دعا

تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بت پرست
جس کا یقیں ہے تیرے یقیں سے کہیں سوا

وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر

گو حاجت اس کی ان سے ہوئی ہے نہ ہو روا

آتا نہیں یقین میں اس کے کبھی قصور
امید اس کی روز فزوں ہے اور التجا

تو بندہ غرض ہے، وہ راضی رضا پہ ہے
وہ ہے کہ یہ ہے بندگی؟ اے بندہ خدا

۱۔ اونچی ذات والا

*استفادہ

لیجیے بھیک دوڑ کر گر ہے گداگری کا یہ
جس سے ملے جہاں ملے، جو ملے، اور جب ملے

ہے یہی اصل اکتساب ہو جیے سب سے مستفید
زک ملے یا سزا ملے، درس ملے، ادب ملے

)لائق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

قول ایک حکیم کا ہے کہ گر غور کیجیے
ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر

اوّل تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو
اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر

پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب
سو سو طرح سے وہ اسے کرتا ہے جلوہ گر

دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست
منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر

اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بد سگال
رکھتا ہے جو کہ دوست کے عیب اس سے مستتر

گو قول ہے متین پہ جو تھی سخن کی تہہ
افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ واں نظر

دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید
عیب ان کے دوست کیوں نہ جتائیں گے بے خطر

اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے اپنے عیب
وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہوں گے بہرہ ور

جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یاں
موقوف عبرت ان کی نہ دشمن نہ دوست پر

(عقل اور نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں
اپنے دعوؤں پہ بیاں کر کے دلیل و برہاں

کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی
درد ہیں تیرے اسی واسطے سب بے درماں

ہے غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی
جس کا آتا ہے نظر پیشتر از صبح زیاں

سود سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں سے پرہیز
تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں

نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر
یہ بھی ہے نیند کوئی موت کا ہے جس پہ گماں

315

نہ جوانی میں تجھے صبر نہ پیری میں شکیب
کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں

کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو
دیکھ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہے کہاں

ہاتھ دھو لذتِ فانی سے نہیں گر منظور
عیش باقی و حیات ابدی سے حرماں

نفس نے عقل سے کی عرض کہ اے خضرِ طریق
وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجیے جاں

پر نہیں حکم ترا کوئی عمل کے قابل
گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہے بیاں

نقد کو چھوڑنا اور نسیہ کی رکھنی اُمید
کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جز ناداں

ہے یہ ایک ایک مری لذت فانی وہ بلا
سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جس پر قرباں

ایک اب بھوکے سے کہتا ہے کہ لے قاب طعام
ایک مدعو اسے کرتا ہے پس از سال رواں

کیوں کہ اُمید پہ اک مائدہ نعمت کی
سال بھر صبر کرے گرسنگی میں انساں

عقل نے سن کے کہا خوف ہے تجھ سے اے نفس
جزیرہ تیرا تجھے دیکھیے پہنچائے کہاں

حق کے پیرائے میں ہوتا نہیں باطل سرسبز
کیجیے لاکھ بیاں اس پہ دلیل و برہاں
جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالفرض اگر
زہر دانستہ کرے نوش، نہیں یہ امکاں
نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھیو یہ لقمہ نقد
اس کے کھانے میں نہیں جان کی خیر اے ناداں!

`عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا
گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے
جاے
ہنس کے عادت نے کہا کیا عقل ہے مجھ سے الگ
میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و
راے

~حملہ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہمارے بس میں ہے
گر کبھی حملے پہ اس کے غالب آ جاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی
جن کو نادانی سے حملے اس کے ٹھہراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیے سب عقل نے ہتھیار ڈال
زور بازو پر ہمیشہ جس کے اتراتے تھے ہم

315

۔جس قوم میں افلاس ہو اس میں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بہ خلاف آپ کے سب اگلے سخن ور
جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کم تر
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا
یاروں کے لیے ہے یہ بیاں موجبِ رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اُس وقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تونگر
پھر اس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

۔برکت اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اک آزاد کہ ہے جن میں ملاپ
دولت و بخت ہے ہر حال میں ان کے ہمراہ

نہ انہیں حاجتِ اعواں، نہ تلاشِ انصار
نہ انہیں خوفِ بد اندیش نہ بیمِ بدخواہ
پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یکجہتی
اس کی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت وجاہ
نہ ملاذ ان کے لیے قلعہ نہ خندق نہ فصیل
نہ مفید ان کے لیے فوج نہ لشکر نہ سپاہ
ایک مُلّا نے سنا جب یہ سخن فرمایا
تکیہ اور اس قدر اسباب پہ کرنا ہے گناہ
اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں
دستِ قدرت کے ہے سب ہاتھ سفید اور سیاہ
واں نہ ملت کی ضرورت ہے نہ کچھ پھوٹ کا ڈر
پڑ گئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر
کر دیں افراد پراگندہ جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہے اللہ کی عادت معلوم
اس کو جب دیکھا ہے دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

=بُعدِ صوری مانعِ قُربِ معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لیے شہر میں اک گھر
جا اپنے محلے سے کہیں دور بنایا
جب اہل محلہ سے چلا ہو کے وہ رخصت
دل دردِ جدائی سے عزیزوں کا بھر آیا

ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس
اک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا

بلی کہ جو بے عقل ہے دم دیتی ہے گھر پر
اتنی بھی محبت تمہیں گھر سے نہیں آیا؟

حالی نے کہا اُنس ہے چیز اور، وفا اور
بلی نے مزا پھل کا وفا کے نہیں پایا

اس مہر و وفا کی نہیں بلی پہ پڑی چھینٹ
کتے نے ہے جس کا کہ سبق ہم کو پڑھایا

ہم غش ہیں مکینوں پہ وہ عاشق ہے مکاں کی
گھر بھول گئے ہم، تو نہیں تم کو بھلایا

گھر دل میں ہو یاروں کا تو پھر گھر ہے برابر
مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا

+ اُمرا اور عقلا

جاتے ہیں اگر پاس امیروں کے خرد مند
وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت

پر اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں
ملتے عقلا سے نہیں جو صاحب ثروت

بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ اطبا
بیمار کو کچھ اس سے سوا ان کی ہے حاجت

q خوشامد کے معنے

خوشامد کرتے ہیں آ آ کے جو لوگ

تمہاری ہر دم، اے اربابِ دولت
خوشامد پر نہ ان کی بھولنا تم
وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت
کہ جو ہم نے بیاں کیں خصلتیں نیک
نہیں ان میں سے تم میں ایک خصلت

۷مغرور کی پہچان

غرور زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو
تو سمجھو کرتا ہے اپنے غرور کا اظہار
جنہوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا
بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

۵ کام اچھا کرنا چاہیے نہ جلد

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اُس نے کی تاخیر اس میں جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیوں کر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

۱۲اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی
پر بھول چوک ہے بشریت کا مقتضا
ہوتا ہے اس سے کارِ نمایاں کوئی اگر
کرتا ہے بار بار بیاں اس کو برملا

یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہیے
ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ اک جدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اس کو یاد
یاروں سے میں بیان ابھی کر چکا ہوں کیا
بھولے نہ اپنی یاد پہ انساں کو چاہیے
آخر بشر کا خاصہ ہے سہو اور خطا

tفضول خرچی کا انجام

سرے پہ راہ کے بیٹھا تھا اک گدائے ظریف
جہاں سے ہو کے گزرتے تھے سب صغیر و کبیر
ہر اک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم و بیش
سخی ہو اس میں کہ ممسک، غریب ہو کہ امیر
فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولت مند
کہ جس کا تھا کوئی اسراف میں نہ شبہ و نظیر
ہوا جو ایک دن اس راہ سے گزر اس کا
درم اک اس نے بھی چاہا کہ کیجیے نذر فقیر
کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت
کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر
پہ لوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار
کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی اللے تللے رہے تو آپ کو بھی
ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر
سو وقت ہے یہی لینے کا خود بدولت سے

315

دکھائے دیکھیے پھر اس کے بعد کیا تقدیر

yاختلاف مذاہب رفع نہیں ہوسکتا

غیر ممکن ہے کہ اٹھ جائے دلیل و بحث سے
جو چلا آتا ہے باہم اہل مذہب میں خلاف
ہو نہیں سکتا مطابق جب کہ دو گھڑیوں کا وقت
رفع ہو سکتے ہیں پھر کیوں کر ہزاروں اختلاف

uانسان جواشرف المخلوقات ہے، سب سے زیادہ مورد آفات ہے

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار
دو ہیں ان میں سے نہایت جاں گزا
ایک فکر اُس آنے والے وقت کی
شک نہیں ہے جس کے آنے میں ذرا
دوسرے چوٹیں زبان خلق کی
زخم جن کا زخم ہے تلوار کا
اور بھی حیوان ناطق کے لیے
ہیں بہت سی زحمتیں ان کے سوا
پر گدھے اور اَور حیوانات سب
رہتے ہیں دور ان گزندوں سے سدا
کیسا ان آلام سے رہتا نچنت
اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

iچنڈو بازی کا انجام

ایک متوالے سے چنڈو کے، وہ تھا ہوش میں جب
پوچھا ناصح نے کہ اس کام کا آخر انجام!

بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم
زندگانی کو وداع اور جوانی کو سلام

آنکھ میں اپنے پرائے کی ٹھہرنا بے قدر
شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام

جس سے عقبیٰ ہو درست ایسا نہ بونا کوئی بیج
جس سے دنیا میں ہو نام ایسا نہ کرنا کوئی کام

ہم پہ آئینہ ہے جو حال ہے ہونا اپنا
نفسِ سرکش کے مگر ہاتھ میں ہے اپنی زمام

کہا ناصح نے کہ انجام ہو معلوم اگر
لے نہ اس زہر ہلاہل کا کوئی بھول کے نام

یہ تو کہتے ہو کہ انجام برا ہے، لیکن
یہ بتاؤ کہ برا ہوتا ہے کیسا انجام

بُرے انجام کی تب ہو گی حقیقت روشن
بُرے انجام سے جب آ کے پڑے گا خود کام

مرنے والے ہی کو ہے موت کی لذت معلوم
گو کہ رکھتے ہیں یقیں موت کا سب پختہ و خام

x طنزیہ و مزاحیہ

o تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا زینت واسباب پہ جو لوگ
اتراتے ہیں، اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے

حالی نے کہا جن کو ہے اترانے سے نفرت
اترا کے وہ اس طرح نہیں ناک چڑھاتے

p سیداحمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں
بعض کے نزدیک توحید اس کی حد تام ہے

ہے مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول
جو ہیں قائل اس کے ان پر کفر کا الزام ہے

کیونکہ اس سے ماننا پڑتا ہے اس رحمت کو عام
جس سے غیر از اہل قبلہ جو ہے وہ نا کام ہے

بعض کہتے ہیں کہ شر سے تیرے سب ایمن رہیں
بس مسلمانی و دیں داری اسی کا نام ہے

پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عند الفحول
کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اسے وہ خام ہے

ایمنی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ
اور 'سب' کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے

بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہے لباس
جو لباس غیر پہنے خارج از اسلام ہے

بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ

315

حصر کرنا ان تمام آرا کو مشکل کام ہے

مذہب منصور [1] ہے لیکن بیاں کرنا ضرور
جو مسلم آج کل نزدیک خاص و عام ہے

اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر
سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

]قرض لے کر حج کو جانے کی ضرورت

قریب موسم حج قرض لے کے اک دیں دار
چلا بہ نیت حج گھر سے سوئے بیت اللہ

کہا یہ اس سے اک آزاد نے کہ اے حضرت!
کیا ہے آپ پہ شارع نے جبر یا اکراہ

[1] مختلف اقوال میں سے قول راجح کو ''مذہب منصور'' کہتے ہیں۔

کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز
وطن میں چھوڑ کے اطفال کو بہ حال تباہ

نہ نان و نفقہ فرزند و زن سے خاطر جمع
نہ زاد و راحلہ کا ساز و برگ خاطر خواہ

سنا یہ اور بہت ترش ہو کے فرمایا
کہ روکتا ہے مسلماں کو حج سے اے گمراہ!

وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے
نگین و خاتم و طبل و نشان و تخت و کلاہ

خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے میہمانوں کی

پہنچتے جو کہ ہیں طے کر کے بر و بحر کی راہ
جنہیں فراغت و تنگی میں ہے اسی سے امید
جنہیں سلامت و آفت میں ہے اسی کی پناہ

وہ سن کے بولا کہ ناخواندہ میہمانوں کو
اُمید لطف کی رکھنی ہے میزباں سے گناہ
ذلیل ہوتے ہیں جو بن بلائے جاتے ہیں
طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں عزت وجاہ

یہ سن کے شیخ نے دیکھا ادھر اُدھر کہ کہیں
ہو مدعی نہ تجسس میں یاں کوئی ہمراہ
بلا کے پاس پھر آہستہ اس سے فرمایا
ابھی زمانے کی چالوں سے تو نہیں آگاہ

قدم پہنچتے جہاں تک ہیں پختہ کاروں کے
جوانِ خام کی واں تک نہیں پہنچتی نگاہ
خدا کے حکم ہیں مبنی تمام حکمت پر
فتوح جن میں ہے دنیا و دیں کی خاطر خواہ

نماز و روزہ ہو یا ہو طواف و عمرہ و حج
حصول جیسے کہ ہوتا ہے ان سے قرب الٰہ
اسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام
نہ جن میں چاہیے محنت نہ کوشش جاں کاہ

مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے، ورنہ
ہزاروں پھرتے ہیں حجاج سادہ لوح تباہ
یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں برخور دار

315

وگرنہ علم معیشت وسیع ہے واللہ

[سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ
کس لیے سید سے صاف اے حضرت والا نہیں

کافر و ملحد ہمیشہ اس کو ٹھہراتے ہیں آپ
ثابت اسلام اس کا نزدیک آپ کے گویا نہیں

آپ بھی نامِ خدا، ہیں تارکِ صوم و صلوٰۃ
اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں

خود نبوت پر سنے ہیں ہم نے ایراد آپ کے
اور اُلوہیت سے بھی دل جمع حضرت کا نہیں

چشم بد دور آپ کا بھی جب کہ ہے مشرب وسیع
پھر یہ سید پر تبرا آپ کو زیبا نہیں

سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے
بات یہ ہے، سن لو صاحب، تم سے کچھ پردا نہیں

رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

Q قحطِ اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری
جو تھا سو چشم ُپر نمٗ اپنا تھا یا پرایا

دنیا سے اٹھ گئے سب جو تھے مُرید صادق
یہ کہہ کے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا

ہم نے کہا مریدی باقی رہی نہ پیری
یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور اس کو بھی رلایا

۷۷ سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہِ معاش کی

وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
لیکن نہ اس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی

اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
تدبیر یہ بھی اس کی نہ تقدیر سے چلی

روزی کی خاطر اس نے کیے سینکڑوں جتن
پر کی نصیب نے کہیں اس کے نہ یاوری

راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اک خضر پے خجستہ نے کی آ کے رہبری

جھک کر کہا یہ کان میں اس کے کہ آج کل
سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی

جا اور لفظ لفظ کو اس کے چتھیڑ کر
تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بُری بھلی

پھر دیکھنا کہ راس و چپ وگرد و پیش سے
لگتی ہے کیسی آ کے زر و سیم کی جھڑی

دنیا طلب کو چاہیے ابلہ فریب ہو
دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہے ابلہی

315

Eلوگ کسی کی خوبیاں سن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اس کے عیب سن کر

اپنے عیبوں کے ہیں ہم جتنے کہ ممنوں حالی
اس قدر خوبیوں کے اپنی نہیں شکر گزار

لوگ جب عیب ہمارا کوئی سن پاتے ہیں
گو کہ کرتے ہیں تاسف کا بظاہر اظہار

پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو رنج ان کو کمال
گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار

اور جو ہو گوش زد ان کے کوئی خوبی اپنی
خوش تو پڑتی ہے بتانی انہیں صورت ناچار

دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم ان کے
کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زنہار

للہ الحمد کہ مخلوق کے خوش کرنے کا
نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ تیار

Rاسراف

ایک مسرف نے یہ ممسک سے کہا
کب تک اے ناداں یہ حب مال و زر

تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ
ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر؟

ہنس کے ممسک نے کہا اے سادہ لوح
زر لٹانا رایگاں اور اس قدر؟

آج ہی گویا، نصیب دشمناں
آپ کا دنیا سے ہے عزمِ سفر

T پاس نیک نامی

اے نیک نام! شکر کر اللہ کا ادا
جس نے بنایا نیک تجھے کر کے نیک نام
ہوتا اگر نہ پاس تجھے نام نیک کا
پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھ کو خوف خدا کا ہو اس قدر
جتنا کہ خوف طعنہ و تشنیع خاص و عام

Y غرورِ نیک نامی

گئی ہے حد سے گزر شیخ کی نکونامی
گمانِ بد کبھی اس کی طرف نہیں جاتا
جو اس کے عیب قسم سے بیاں کرے کوئی
خود اس کو عیب کا اپنے یقین نہیں آتا

U خودستائی

اے دل! بشر وہ کون ہے جو خود ستا نہیں
پر خود ستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا
جو زیور خرد سے معرا ہیں سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو ان سے تیز ہوش ہیں، سو سو طرح سے وہ

پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا

کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج
کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دے دیا

کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل کی دب میں میں نے دیا مال جب دکھا

پردے میں زیرکی کے چھپاتا ہے بخل یہ
اور بن کے بے وقوف جتاتا ہے وہ سخا

کچھ اس لیے کہ ہم بھی انہی میں سے ہوں شمار
اہلِ وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا

کچھ اس لیے کہ اپنا ہو انصاف آشکار
کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا

کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے برا کوئی
ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا

کہتا ہے ایک گر ہے خوشامد کا اور ہی
پرجاتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم برا

دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ
اور منہ سے درد کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا

چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا

کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حُسنِ ظن ہے یہ
اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا

قانع ہے وہ اُنہی پہ، ہوئے وصف جو بیاں

اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا

کہتا ہے زید، عمرو ہے شدت سے سادہ لوح
گنتا ہے سب کو نیک وہ اچھا ہو یا برا

کہتا ہے عمرو زید بھی کتنا ہے عیب بیں
بد ہو کہ نیک اس کی زباں سے نہیں بچا

یہ اُس کا اور وہ اس کا بیاں کر کے کوئی عیب
ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا

غیبت، امید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں
ہوتا اگر یہ خاک کا پتلا نہ خود ستا

حالی جو پترے کھول رہے ہیں جہان کے
شاید کہ اس سے آپ کا ہو گا یہ مدعا

یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا

القصہ جس کو دیکھیے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بے چارہ مبتلا

اروسائے عہد کی فیاضی

کی رئیس شہر کی تعریف یاروں نے بہت
بر سبیل تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا

بولے آج اس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر
عاملان شہر مدعو اس کے رہتے ہیں سدا

ضلع کے حُکّام کا ادنیٰ اشارہ چاہیے
پھر کوئی دیکھے سخاوت اس کی اور بذل و عطا

315

یادگاریں جتنی ہیں اعیان دولت کی بنیں
ان میں صرف اس کی رقم ہے سب کے چندے سے سوا

پالکی یا ویگنٹ [۱] ہے جو سواری اس کے پاس
اہل کاروں کے لیے ہے وقف، بے چون و چرا

کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس [۲]
اس کی ہمت کے ہیں سب مداح بے رو و ریا

جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام
جوڑ کر ہاتھ ان سے حالی نے بصد منت کہا

عیب بھی اس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں
سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

O ایمان کی تعریف

فقیہ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف
تو دی چراغ سے اس کو بہ آب و تاب مثال

کہا فتیلہ اقرار باللساں ہے ضرور
جہاں ہو آتشِ تصدیق و روغنِ اعمال [۳]

---

[۱] چار پہیوں کی کھلی ہوئی گھوڑا گاڑی جس میں دو طرفہ نشستیں ہوتی ہیں (Wagonette) [۲] کوتوال
[۳] یعنی ایمان کے لیے دل سے تصدیق، زبان سے اقرار، اور عمل سے اثبات ضروری ہے۔

کہا کسی نے کہ نکلا ہے ان دنوں اک تیل
نہیں ضرور فتیلے کا جس میں استعمال [۱]

P شادی قبل از بلوغ

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو

تختِ پدر پہ اس کو ممنوع ہے بٹھانا

قانون ہے بنایا یہ اُن مقننوں نے

عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا

لیکن کریں نہ اُس کی قبل از بلوغ شادی

کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا

نزدیک اُن کے گویا بر رغم عقل و دانش

ہے کنگڈم سے آساں میڈم کو بس میں لانا

{حرص

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلام واعظ

قدرِ قلیل ہے سب مال و منال دنیا

گویا کہ حرص اس کی اس سے بجھی نہیں ہے

ہے جس قدر فراہم پاس اس کے مال دنیا

ا۔ یعنی مٹی کا تیل جو بغیر بتی کے بھی جل سکتا ہے۔ گویا مجیب کے نزدیک اقرار باللسان ایمان کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔

{عصمت بی بی از بے چادری

اے بے نواؤ! ہنستے ہو کیا منعموں پہ تم

اخلاق میں کچھ ان کے اگر آ گیا بگاڑ

تم زد سے نفس کی ہو جبھی تک بچے ہوئے

315

ہو جب تلک کہ پکڑے ہوئے ہوئے مفلسی کی آڑ

اسباب جو کہ جمع ہیں منعم کے گرد و پیش
گر تم کو ہو نصیب تو دنیا کو دو اجاڑ

\سچ کہاں ہے

دیکھنے ہوں تمھیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں
سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

|اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

ٹھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام
اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقتِ باز پرس
اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

aبے اعتدالی

تم اے خود پرستو! طبیعت کے بندو!
ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز
جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے

جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت
تو چیخ اٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے

جو مجرے میں بیٹھو تو اٹھو نہ جب تک
کہ اٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے

اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر
تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے

پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو
کہ بس ٹھن گئے عزم جنگ تتر [1] کے

چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر
تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے

جو ہے تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو
کہ چھوڑیں گے اب آپ دوزخ کو بھر کے

جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی
رہیں پاؤں کے ہوش جس میں نہ سر کے

جو کھانا تو بے حد جو پینا تو ات گت
غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے [2]

---

[1] تاتاریوں سے لڑنے کا ارادہ

[2] یعنی پیٹ بھر کے احمق۔ احمق کا لفظ اکثر اس مقام پر حذف کر دیتے ہیں۔ گویا مخاطب کے سوا کسی پر اس کی حماقت ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔

S طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدمے سے ہوتا ہے ہر بشر کو ملال
کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صغار و کبار

یہ صدمہ گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے
تو اور بھی اسے دیتا ہے انفعال فشار

یہی سبب ہے کہ ہوتے نہیں طبیب ملول
جو چل بسے کوئی ان کے علاج میں بیمار

وہ جانتے ہیں کہ تھپ جائے گی خطا ہم پر
کیا ملال کا اپنے گر اس جگہ اظہار

x حکایات و مطائبات

d ایک خود پسند امیر زادے کی تضحیک

کہتے ہیں اک امیر زادے کو
تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں

خصلتیں جو امیر زادوں میں
لازمی ہیں سو اس میں بھی سب تھیں

گو کہ رکھتا نہ تھا ہنر کوئی
اس پہ تھا خود پسند اور خود بیں

کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ
علم تیر و کماں میں اپنے تئیں

واہ وا سنتے سنتے یاروں کی
ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقیں

الغرض ایک روز صحرا میں
جب کہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں

مشق تیر افگنی میں تھا مصروف
کر رہے تھے خوشامدی تحسیں

آ کے دیکھا جو اک ظریف نے حال
وجہ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں

تیر جتنے کمان سے چھوٹے

پائے سب بے اصول و بے آئیں
جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا
تیر آماج گہ کے کوئی قریں
ایک جاتا تھا چھپٹ کے سوئے شمال
ایک جاتا تھا پھٹ کے سوئے یمیں
کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی
رکھ کے بالائے طاق سب تمکیں
خاک کے تو دے پہ جا کے ہو بیٹھا
لوگ کرتے رہے چناں و چنیں
ناوک انداز بولا چلا کر
کوئی تجھ کو جنوں ہے اے مسکیں
یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے
یا کہ دو بھر ہے تجھ کو جان حزیں
عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا
جب کہ جائے گریز ہو نہ کہیں
زد سے ان بے پناہ تیروں کی
کہیں جاں دار کو امان نہیں
مجھ کو ہر پھر کے شش جہت میں حضور
امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

fبدی کر کے نیک نامی کی توقع رکھنی

نا منصف و بے رحم تھا اک ضلع کا حاکم
برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کے رعیت
جب دورے کو اٹھتا تھا تو دیہات میں جا کر

تھا پوچھتا ہر ایک سے از راہِ شرارت
ہیں پرگنے کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا
کرتے ہیں ہماری وہ ستایش کہ مذمت
تھی اس کی مثال ایسی کہ اک شخص بد آواز
جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت
گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے
ہر بار لپکتا تھا بصد تیزی و سرعت
ہو تا کہ یہ معلوم کہ ہے دور سے میری
آواز خوش آیند و یا قابلِ نفرت

g نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر
درگزر تھی اور نہ ساتھ ان کے رعایت تھی کہیں
بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی معاف
کام سے مہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تئیں
حسن خدمت پر اضافہ یا صلہ تو درکنار
ذکر کیا، نکلے جو چھوٹے منہ سے اس کے آفریں
پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھے جب اس سے دو
چار
نتھنے پھولے، منہ چڑھا، ماتھے پہ بل، ابرو پہ
چیں
تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لیے کوئی فتوح
آ کے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں

رہتا تھا اک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس
فرض جس میں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں

گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار
زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں

حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں
تا کہ یہ درخواست دیکھیں واجبی ہے یا نہیں

واں سوا تنخواہ کے، تھا جس کا آقا ذمے دار
تھیں کریں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمے تھیں

دیکھ کر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لا جواب
تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مار آستیں

ایک دن آقا تھا اک منہ زور گھوڑے پر سوار
تھک گئے جب زور کرتے کرتے دست نازنیں

دفعتًہ قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہ وار
اور گرا اسوار صدر زیں سے بالائے زمیں

کی بہت کوشش نہ چھوٹی پاؤں سے لیکن رکاب
کی نظر سائیس کی جانب کہ ہو آ کر مُعیں

تھا مگر سائیس ایسا سنگ دل اور بے وفا
دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں

دور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا
دیکھ لو سرکار اس میں شرط یہ لکھی نہیں

hصفائی نہ رکھنے کا عذر

راہ سے گزرا کہیں میلا کچیلا اک غلام
اس کے میلے پن پہ لوگوں نے ملامت اس کو کی

عرض کی ایک اک رواں ہو جس بدن کا ملک غیر
اختیار اس کی صفائی کا نہیں رکھتے رہی

جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال
عذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی

کیونکہ جسم آدمی میں پیش اہل معرفت
کوئی چیز اس کی نہیں، ہے سب امانت گور کی

j سخن سازی

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو

موجود سخن گو ہوں جہاں واں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو

دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونوں

k شائستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال
انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا

مدت تک اس کی جب یہی دیکھی گئی روش
پوچھا کسی نے اس سے کہ اس کا سبب ہے کیا

بولا کہ عادت اس لیے کی ہے یہ اختیار

چھٹ جائے مجھ سے تاکہ یہ لپکا سوال کا

پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک
آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا

پر جب سے ہے سوال کے اس قوم پر مدار
منت سے، عجز سے، کبھی ملتا نہیں ٹکا

امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت
گر چند روز اور رہا ان سے سابقا

آیا جواب سن کے یہ اس کا بہت پسند
کی آفریں اور اس سے مخاطب نے یوں کہا

نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ
حق میں ترے مفید ہیں یہ ان سے بھی سوال

انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل
اہل وطن پہ ان کی مگر جان ہے فدا

پر جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ
دل بھائیوں پہ بھی نہیں ان کا پسیجتا

انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور
جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا

اہل غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ
شائستگی کا زہر ہے جب سے انہیں چڑھا

ناصح مخلص اور اہل غرض میں تمیز

منصور [1] نے یہ جعفر صادق سے عرض کی
محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا ہر بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور
فرمایا ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ حرف نصیحت زبان پر
اور جن سے ہے امید نصیحت وہ بالیقیں
صحبت میں بیٹھنے سے کریں گے تری حذر

خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خدام ماموں کے بہت گستاخ تھے
ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا
کوئی آقا جب کہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت
پیش خدمت اس کے بد اخلاق ہوتے ہیں سدا
پر جو سچ پوچھو تو ہونا خادموں کا شوخ چشم
ہے دلیل اس کی کہ ہے خود خلق آقا کا برا
کھو دیا ہیبت کو اپنی جس نے اور تمکین کو
اس نے گویا ڈھا دیا رکن رکیں اخلاق کا

---

[1] ابوجعفر منصور: عباسیہ خاندان کا دوسرا خلیفہ (عہد خلافت: 753ء تا 774ء)

'خوشامد کرنے کی ضرورت

متوکل کا تیر چڑیا پر
ہو گیا اتفاق سے جو خطا

ابن حمدوں ندیم تھا حاضر
کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا

جن کو خلقِ خدا پہ شفقت ہے
خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا

جا نہ سکتی تھی بچ کے تیر سے وہ
تو نے دی قصداً اس کی جان بچا

ابن حمدوں نے کی یہ دانائی
کہ خوشامد سے یوں اسے تھپکا

دور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے
ہو کے اپنی خطا سے کھسیانا

جائے کنجشک ابن حمدوں پر
تیر کا اپنے امتحاں کرتا

ابن حمدوں کی جان گو جاتی
دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

Aرعیت پر نااہل کو مسلط کرنا

ہاروں نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اس کے
فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا

وہ خطہ ملعوں تھا یہی جس کی بدولت
تھا دل میں خدائی کا خیال اس کے سمایا

میں بھی اسے اس باغی طاغی کے علی الرغم
اک بندہ بے قدر کو بخشوں گا خدایا

کہتے ہیں خصیب ایک غلامِ حبشی تھا
جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا

کی سلطنت مصر کی باگ اس کے حوالے
نا اہل کے پنجے میں اہالی کو پھنسایا

باڑی گئی بہہ ایک برس نیل کی رو میں
یہ حادثہ آ اس کو کسانوں نے سنایا

فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اُون
ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا

ہارون نہ سمجھا کہ ودیعت ہے خدا کی
محکوم ہے جو میری رعایا و برایا

فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا
اپنے کو خدا، جس نے ہے عالم کو بنایا

جوکھوں میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی
اک سفلہ ناکس کی بنا اس کو رعایا

S رشک

ظاہرا مردوں کی طینت میں نہیں رشک اس قدر
ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں

ایک شہزادی کہ اکلوتی تھی جو ماں باپ کی
تخت شاہی پر ہوئی بعد از پدر مسند نشیں

سلطنت میں اس کی تھا مردوں کو کلی اختیار
عورتیں اصلاً دخیل اس کی حکومت میں نہ تھیں

مرد ہی تھے اس کے محرم، مرد ہی اس کے مشیر
تھا نہ عورت کا پتا دربار میں اس کے کہیں

تخلیے میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم
ہنس کے فرمایا کہ اے دولت کے ارکانِ رکیں

مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں مانوس میں
بلکہ ہے اُنس اس لیے تم سے کہ تم عورت نہیں

بات کی حُسنِ بیاں سے اس نے دی صورت بدل
تاکہ کوئی سوءِ ظن اس پر نہ کر بیٹھے کہیں

ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے
اس لیے نفرت کہ ہے مردوں کی صورت دل نشیں

D مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے، سب کیا ہے کہ اکثر
مردوں کی حکومت میں ہے ملکوں کی بری گت

لیکن بخلاف اس کے ہے عورت کا جہاں راج
واں ملک ہے سرسبز اور آباد رعیت

فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاں دار
قبضے میں ہے واں عورتوں کے دولت و مکنت

اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی
سمجھو کہ ہے اس ملک میں مردوں کی حکومت

F گدائے میرم

اک برہمن مورتی کے سامنے با صد نیاز
مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دعا بیٹھا کہیں

آن نکلا بانوا اک مانگتا کھاتا ادھر
دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جم وہیں

جی میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے
تا کہ پوجے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شرمگیں

مورتی کے سامنے جب کر چکا وہ التجا
بانوا بولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ بیں

مورتی کچھ تجھ کو دے گی اور نہ دے سکتی ہے وہ
ناحق اتنی التجا اس کے آگے تو نے کیں

ہنس کے برہمن نے کہا، ہے مانگنا بندے کا کام
دے نہ دے وہ اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں

ہم نہیں دیتے ڈھئی تم جیسی ڈھیٹوں کی طرح
ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پاؤں پھیلاتے نہیں

باب پنجم

قصاید

(اُردو)

قصایدِ حالؔی پر مختصر ریویو

حالؔی کے کلام میں 8 قصیدے نظر آتے ہیں۔ جن کے مجموعی اشعار کی تعداد 328 ہے۔ ان 8 قصیدوں میں 5 قصیدے مکمل اور 2 قصیدے نامکمل ہیں۔ حالؔی کے 5 مکمل قصیدوں میں 2 نعتیہ قصیدے، 1 قصیدہ نواب سر آسمان جاہ حیدر آباد، ملکہ وکٹوریہ اور 2 قصیدے نظام دکن کی شان میں ہیں۔ نا تمام قصیدوں میں 1 قصیدہ سر سید اور نواب کلب علی رام پور کی مدح میں ہے۔ 1 نا تمام قصیدے میں صرف تشبیب کے کچھ اشعار ہیں۔ ان قصیدوں کے علاوہ حالی شناسوں نے کئی نظمیں جو موضوع اور ہیت کے اعتبار سے قصاید لگتی ہیں اگر چہ ان کا عنوان قصیدہ نہیں ہے، کو قصیدوں ہی میں شامل کیا ہے۔ جن کی فہرست ذیل کے جدول میں دی گئی ہے۔ جن کی تعداد 18 اور اشعار کی تعداد 321 ہے۔ اس طرح حالؔی کے کل قصاید اور منظومات مدحیہ کی کل اشعار کی تعداد 649 ہے۔

جدول قصاید

عنوان	سنہ تصنیف	ہیئت	ماخذ	تعداد
1- قصیدۂ نعتیہ	1281ھ (65-1864ء)	قصیدہ	دیوان حالی	33اشعار
2- قصیدۂ نعتیہ (رائیہ)	88-1287ھ (71-1870ء)	قصیدہ	دیوان حالی	75اشعار
3- قصیدۂ ناتمام (درمدح نواب کلب علی خاں)	1291ھ (1874ء)	قصیدہ	دیوان حالی	29اشعار
4- قصیدۂ ناتمام (درمدح سید احمد خاں)	1294ھ (1877ء)	قصیدہ	دیوان حالی	14اشعار
5- قصیدۂ جشن جوبلی	(1887ء)	قصیدہ	مجموعۂ نظم حالی	19اشعار
6- قصیدۂ تہنیت عیدالفطر بہ حضور نواب سرآسمان جاہ	1306ھ (1889ء)	قصیدہ	دیوان حالی	46اشعار
7- قصیدہ در شکر و سپاس نظام دکن و اعیان سلطنت	1309ھ (1891ء)	قصیدہ	دیوان حالی	65اشعار
8- قصیدۂ تہنیت بہ حضور نظام دکن	1323ھ (1905ء)	قصیدہ	دیوان حالی	47اشعار

کل تعداد قصاید: 8

کل تعداد شعر: 328

جدول منظومات مدحیہ

عنوان	سنہ تصنیف	ہیئت	ماخذ	تعداد
1- مبارک باد (مرتبہ اسماعیل جلد اوّل)	1875ء	قطعہ	کلیاتِ حالی	10اشعار
2- مژدہ قدوم	76-1875ء	قطعہ	دیوان حالی	5اشعار
3- شکریہ تشریف آوری سر چارلس ایچی سن	1882ء	ترجیع بند	جواہراتِ حالی	12 اشعار
4- قطعہ بہ جناب نواب سرآسمان جاہ	1305ھ (1888ء)	قطعہ	دیوان حالی	27اشعار
5- شکریہ حضور لیفٹیننٹ گورنر بہادر	1889ء	ترجیع بند	جواہراتِ حالی	21

315

اشعار

6- قطعہ در تہنیت ولادت فرزندارجمند 1308ھ (91-1890ء) قطعہ دیوانِ حالی 13اشعار

7- قطعہ در شکر و معذرت 1309ھ (1891ء) قطعہ دیوانِ حالی 7اشعار

8- قطعہ در شکر اضافہ وظیفہ 1309ھ (1891ء) قطعہ دیوانِ حالی 7اشعار

9- شکریہ عطائے مدرسہ نواب غازی الدین مرحوم 92-1891ء ترجیع بند دیوانِ حالی 36اشعار

10- اشعار مدحیہ بحضور سرڈینس فٹزپیٹرک قبل 1893ء قطعہ دیوانِ حالی 11اشعار

11- شکریہ مسٹر برور قبل 1900ء قطعہ دیوانِ حالی 11اشعار

12- مسٹر آرنلڈ کی روانگی ولایت 1904ء ترکیب بند دیوانِ حالی 58اشعار

13- مسٹر ماریسن کی روانگی ولایت 1905ء قطعہ دیوانِ حالی 22اشعار

14- خطاب بہ حاذق الملک 1908ء قطعہ دیوانِ حالی 5اشعار

15- افتتاح ندوۃ العلماء 1908ء مخمس دیوانِ حالی 18اشعار

16- تہنیت مسند نشینی حضور نظام 1911ء قطعہ دیوان حالی 29

اشعار

17- شہر حیدرآباد 1912ء قطعہ دیوانِ حالی 6اشعار

18- شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خاں 1913ء قطعہ دیوان حالی 23

اشعار

کل تعداد منظومات مدحیہ: 18

کل تعداد شعر: 321

حالیؔ قصیدے کی صنف کو ضروری جانتے ہیں۔ وہ مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں۔

''قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق مدح وذم کے لیے جائیں اور اس کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے جس کے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا اور اپنے بہت سے اہم اور ضروری فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں اکثر اوقات کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی واقعے کو سن کر بے اختیار ہمارے دل میں مدح وستایش یا نفریں وملامت کا جوش اٹھتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر کا فرض ہے کہ جو ملکہ خدا نے اُس کی طبیعت میں ودیعت کیا ہے اُس کو معطل اور بے کار نہ چھوڑے اور اس سے جیسا کہ اس کی فطرت کا مقتضا ہے کچھ کام لے۔ اسی لیے مدح ایسے اسلوب میں کرنی چاہیے کہ وہ منجر بہ خوشامد نہ ہو جائے اور مذمت ایسے عنوان سے ہونی چاہیے کہ دل سوزی کا پہلو طعن وتشنیع کی بہ نسبت غالب تر ہو۔

حالیؔ کے بیان سے ہمیں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس صنف میں کیوں خامہ فرسائی کی جس کا حسن مبالغہ، جس کا رنگ خوشامد، جس کا ڈھنگ بناوٹی اور جس کا آہنگ حسن طلب کی تکرار ہو۔ غالب کے شاگرد حالی شاید خود کو بقول استاد پورا شاعر کہلوانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے یادگار غالب میں لکھا۔ ''خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اس کو شعرا میں شمار نہیں کرنا چاہیے اور اس بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوقؔ کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا شاعر جانتے تھے۔''

حالیؔ کے قصاید اور مدحیہ منظومات پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم اُردو قصیدہ نگاری اور ممتاز اُردو قصیدہ نگاروں پر روشنی ڈالیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس گلستان رنگ وبو میں حالی نے کیا کیا گل کھلائے اور گلشن کو خس وخاشاک سے صاف کرنے میں کیا کیا کام کیے۔

دکنی قصیدوں کے بعد شمالی ہند میں ولی دکنی کے قصیدوں کا پتا چلتا ہے جو صرف حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی موضوعات پر سیدھی سادی زبان پر مشتمل ہیں۔ فارسی قصیدوں کو سامنے رکھ کر اُسی ہیت اور حدود میں قصیدہ نگاری کی ہے۔ ولیؔ کے قصیدے ان کی دوسری اصناف کے سامنے معمولی اور قصیدے کے شکوہ بیان، رنگینی اور زورِ تخیل سے خالی ہیں اگرچہ ولیؔ نے تعلّی کر کے فارسی کے عظیم قصیدہ گو شعرا سے داد حاصل کی ہے: ؎

یقیں ہے مجھ کو اگر یہ قصیدۂ رنگیں

سنیں تو وجد کریں انوریؔ و خاقانیؔ

اُردو شاعری کا عظیم قصیدہ گو سوداؔ ہے سوداؔ کے تقریباً پینتیس ((35 قصیدے اُردو اور ایک قصیدہ فارسی میں ہے۔ جن میں چار نعتیہ قصیدے، 11 منقبتی اور بیس ((20 قصیدے حکمرانوں امرا اور بادشاہوں کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں: ''سوداؔ نقاش اوّل نظم قصیدہ در زبان ریختہ است'' سوداؔ نے خاقانی اور انوری و سعدی کے قصیدوں کو سامنے رکھ کر عالی قصیدے لکھے۔ ایک قصیدے میں خود کو ان تین شاعروں کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں: ع

یار و مہتاب گل شمع بہم چاروں ایک

شبلیؔ نے قصیدے کے حسن میں مطلع، مقطع اور تخلص کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ سوداؔ نے نہ صرف ان پر بلکہ تشبیب، گریز، مدح، حسن طلب، اور دعائیہ اشعار پر بھی استادانہ عمل دکھایا ہے۔

سوداؔ کا مطلع صاف اور زوردار تشبیب میں جدتِ خیال اور بوقلمونی، گریز سبک اور پرلطف حسن طلب، خاتمہ اور دعائیہ مضامین میں سحر کاری کا استادانہ عمل ہے جو انہیں قصیدوں میں میرؔ کی سادگی اور حقیقت نگاری سے زیادہ محبوب بنا دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مبالغہ اور خیالی مضامین جس کی نسبت شیخ چاند لکھتے ہیں: ''سوداؔ نے مبالغہ آرائی میں کوئی تامل نہیں کیا۔ ان کا پورا سرمایہ مدح مبالغہ سے بھرا پڑا ہے۔''

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ حالی مقلد ہیں میرؔ کے جہاں مبالغہ نہیں بلکہ سادگی، اصلیت اور جوش ہے وہ شیفتہ سے مستفید ہیں اس لیے ان کے پاس مبالغہ آرائی نہیں۔

استاد ذوقؔ نے جنہیں اکبر ثانی نے خاقانی ہند کا ادبی خطاب دیا۔ پچیس سے زیادہ قصاید لکھے لیکن ذوق کا کوئی قصیدہ حمد، نعت یا منقبت میں نہیں ملتا۔ یہی نہیں بلکہ سوائے لال قلعہ کے بادشاہ اور ولی عہد کے کسی بیرونی حکمران یا شخصیت پر بھی قصیدہ نہیں۔ غیر مطبوعہ قصیدہ مغل بیگ کا دستیاب ہوا ہے۔ آزاد نے لکھا کہ کئی ابتدائی دور کے قصیدے تلف ہو گئے۔ موجودہ قصیدوں میں اگرچہ ابتدائی دور کے قصاید بھی موجود ہیں۔ ذوق کے ممدوح محدود تھے اس لیے موضوعات کو قوت فکر مہارت زبان و بیان سے رنگین کر کے ہر سال عید وغیرہ پر نئے نئے قصیدے پیش کر کے انعام اور خلعت حاصل کرتے تھے۔ استاد غالب نے فارسی میں ((71 قصیدے لکھے جن کے مجموعی اشعار

کی تعداد(3917 ہے۔ حالؔی کا خیال ہے کہ غالبؔ کے قصاید کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے اُن کے اضافِ نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے۔ اگرچہ اغلب ناقدین غالب کی غزلیات کو ان کی سب سے ممتاز صنف مانتے ہیں۔ بعض غالبیات کے اسکالرز غالب کی مثنویات کو ممتاز صنف میں جگہ دیتے ہیں۔ یہاں مسئلہ ذوق و مذاق کا ہے غالبؔ کا کرشمۂ سخن ہر صنف میں ممتاز ہے۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاہ اینجاست

حالؔی یادگارِ غالبؔ میں لکھتے ہیں: ''قصیدے کی شان جیسی ہونی چاہیے اوّل سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔ قصاید میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے کہیں سلمان ظہیر کا اور کہیں عرفی و نظیری کا اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ اپنے قصاید پر نازاں تھے۔ غالبؔ اپنے شاگرد ہرگوپال تفتہ کو خط میں لکھتے ہیں...... ''وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھے نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔'' جب نبی بخش حقیر نے غزل کے اشعار کی تعریف لکھی تو کہتے ہیں۔ ''بھائی تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں میرے فارسی کے قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف ہی نہیں اُٹھاتا۔''

مثال کے طور پر اگر ہم غالبؔ کے اس قصیدے کو جو ایک انگریز چیف سکرٹری مسٹر تھوپی پر نسب کی تعریف میں ہے؛ کہہ کر طاق نسیان پر رکھ دیں تو تشبیب کے ان جان فزا اشعار جن میں شراب پر عمدہ اور نادر مضامین ہیں محروم رہیں گے۔

بی می نکند در کف من خامہ روائی
سرد است ہوا آتش بی دود کجائی
باید کہ صراحی بود آبستن صہبا
تا ناطقہ را روی دہد نادرہ زائی
نگزاشتہ ہر چند نشان لاغری از من

از ناله کنم سری خودش راه نمائی

(بغیر شراب کے قلم میرے ہاتھ میں نہیں چلتا، موسم ٹھنڈا ہے اے بغیر دھویں کی آگ تو کہاں ہے۔ صراحی کو چاہیے کہ وہ شراب سے حمل دار رہے تاکہ پینے والے کے منہ سے نادر (مضامین) نکلیں۔ لاغری نے میرا نشان مٹا دیا اب میں لوگوں کو فغان و آہ کر کے اپنی طرف راہنمائی کرتا ہوں)

غالبؔ مضمون نگاری کے شہنشاہ ہیں۔ ملکہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے اُس میں خود کو مغلیہ دور کے درباری شعرا اور خراسانی درباری شعرا سے مُقایسہ کر کے کہتے ہیں کہ ان کی طرح میں بھی تمہارے دربار کا درباری شاعر ہوں۔ یہ غالبؔ کا طرز بیان ہے جس میں تعلّی کر کے اپنی تعریف کو ممدوح کی تعریف سے بڑھا دیتے ہیں۔ یہی انداز غالبؔ کا نعت و منقبت میں بھی ہے جس میں ان برگزیدہ ہستیوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے عرفیؔ شیرازی کی طرح اپنے آپ پر فخر کرتے ہیں۔

سخن ز نکتہ سرایان اکبری چہ کنی
چو من بخوبی عہد توام ز خویش گواہ
نزول من بہ جہان بعد یک ہزار و دویست
ظہور سعدی و خسرو بہ شش صد و پنجاہ
بہ فن شعر چہ نسبت بہ من نظیری را
نظیر خود بہ سخن ہم منم سخن کوتاہ
کنون تو شاہی و من مدح گو تعال تعال
گزشت دور نظیری و عہد اکبر شاہ

اکبرِ اعظم کے درباری شاعروں کا ذکر کیوں کر رہے ہو مجھ جیسا عظیم شاعر تیرے دربار میں موجود ہے میری پیدائش ((1200 ہجری ہے اور سعدی اور خسرو کی پیدائش (650 ہجری) ہے۔ شاعری میں نظیری نیشاپوری کو مجھ سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ میرا خود سخن نظیر ہے قصہ مختصر۔ اس وقت تو پادشاہ ہے اور میں تیرا مدح گو؛ وہ دور نظیری اور اکبر شاہ چلا گیا۔

حالیؔ کے قصیدوں پر ان کی شاعری کی دوسری اصناف کی طرح یہ الزام ہے کہ وہ انگریزوں

کے مدح خواں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ حالیؔ نے درجنوں اشعار انگریز حکمرانوں، امرا اور عہدے داروں کے لیے لکھے۔ یہی کام نہ صرف ان کے استاد غالب بلکہ اُس زمانے کے کئی شاعروں نے کیا جس نے نہیں کیا اُس کو یا تو پھانسی کے پھندے پر سید محمد باقر کی طرح لٹکا دیا گیا یا منیر شکوہ آبادی کی طرح کالا پانی بھیج دیا گیا۔ حالیؔ نے اگر ان اشعار کا دقیق مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مثبت قدروں یعنی روٹی، روزگار، تعلیم، تربیت، رفاہی کام، ملک کا نظم ونسق، غریب پروری وغیرہ کی تعریف کی ہے تاکہ انگریز قوم کو ترغیب ہو اور اس سے محروم قوم کو فائدہ پہنچے۔

جب لاہور کے گورنر لائل اینگلو عربک اسکول دہلی آتے ہیں تو حالی نے ایک طویل مدحیہ نظم لکھی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

کہاں یہ اس مدرسے کی قسمت　　کہ لائیں تشریف خود بدولت
کریں غریبوں پہ جو عنایت　　ہمیشہ ان پر خدا کی رحمت
ہے جب سے لائل نے سایہ ڈالا　　ہوا ہے پنجاب میں اُجالا
ہمیشہ جب تک کہ علم و حکمت　　جہاں میں کرتے رہیں حکومت
حضور قیصر کا ظلِ رافت　　ہمارے سر پر رہے سلامت

حالیؔ 1875ء کو ملکہ وکٹوریا کی سالگرہ پر کہتے ہیں جو علی گڑھ کی بھی افتتاح کی تقریب تھی:

دولت جاوید کی پڑتی ہے بنیاد یاں　　قوم کی بے طالعی ہند سے رخصت ہے آج
مدرسہ علم و دیں کرتے ہیں قائم ثقات　　مزرعِ قوم پر بارش رحمت ہے آج
دولت برطانیہ روز فزوں ہو جیو　　قوم کو یہ دن نصیب جس کی بدولت ہے آج
قوم کے بدخواہ سب مل کے پڑھیں فاتحہ　　نکبت و ادبار کی ملک سے رخصت ہے آج

حالیؔ نے کورس کی شکل میں ایک مدحیہ نظم لکھی جو بچوں نے گورنر پنجاب کی جانب سے مدرسہ کی عمارت اور وظیفے ملنے پر اظہار تشکر کے لیے گائی۔ چند شعر یہ ہیں:

تھے تعلیم میں کم سب سے ہم　　تم نے مدد کی اپنی پیہم
مدرسہ تھا بے ٹھور ہمارا　　تھا نہ کہیں ٹکنے کا سہارا
آپ کو ہم پر رحم جو آیا　　گھر یہ عطا ہم کو فرمایا

آر کلاک احسان کا پتلا آدمی کی صورت میں فرشتہ
آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر کیسے کیسے رعیت پرور
جن سے ہے ہندوستان منور فخر ہے انگلستان کو جن پر

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

حالی کا قصیدہ ''جشن جوبلی'' جو 1887ء میں ایک سپاس نامے کے ساتھ انجمن اسلامیہ لاہور کی طرف سے ملکہ وکٹوریا کے حضور میں پیش کیا گیا مورد اعتراض اور انگریزوں کی چاپلوسی اور جھوٹی تعریف سمجھا گیا۔ انگریز حکمران بہر حال کولونیل ماسٹر تھے اور انہوں نے پوری برصغیر کی آبادی کو غلام بنا رکھا تھا چناں چہ اس حکومت کی تائید اور تحسین حالی جیسے رہنما کے لیے ننگ تھی۔ اس قصیدے کے چند شعار یہ ہیں:

یہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس اب — ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر
وہ دور تعصب تھا یہ ہے دورۂ انصاف — وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر
سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گزرا — محمود نہ تیمور نہ دارا نہ سکندر
گر برکتیں اس عہد کی سب کیجیے تحریر — کافی ہے نہ وقت اس کے لیے اور نہ دفتر
گو منت قیصر سے ہے ہر قوم گراں بار — احساں مگر اسلام پہ اس کے ہیں گراں تر
بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا — سنکا اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر

شاید ایسی ہی فکر کے لیے علامہ اقبال نے کہا تھا:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اس جشن جوبلی میں انگریزوں کے حقیقی مثبت کارنامے جن میں دُختر کُشی اور ستی کی رسم کی ممنوعیت کا بھی ذکر ہے:

اس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کیے قطع
جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر

دی اُس نے مٹا ہند سے یوں رسم ستی کی
گویا وہ ستی ہو گئی خود عہد کہن پر

حالیؔ نے انگریزوں کے دور میں جانوروں کے حقوق کی بات کی ہے اور دعا پر قصیدہ تمام کیا ہے۔

اس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم سے محفوظ — مظلوم نہ اب بیل نہ گھوڑا ہے نہ خچر
قیصر کے گھرانے پہ رہے سایہ یزداں — اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایہ قیصر

سرسید کی شان میں جو قصیدہ لکھا اُس میں تعلیم وتربیت اور علی گڑھ کا ذکر یوں کرتے ہیں:

تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی — ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے
بعد از قرون اولیٰ کس نے کیا بتاؤ — سید نے کام آ کر جو قوم میں کیا ہے

نواب رام پور کے قصیدے میں کہتے ہیں:

ہو رہے تھے دودمان علم و دولت جاں بہ لب — تو نے اک اک کے چوایا حلق میں آب بقا
کول میں پودا لگا ہے جو پے تہذیب یہ — آبیاری سے ہے تیری ہی اسے نشوونما

میر محبوب علی پاشا کے قصیدے میں طرز بیان دیکھیے:

جب سے کالج کی علی گڑھ میں بنا ڈالی گئی — دولت عالی مدد کرتی رہی اس کی سدا
جو لگایا تھا درخت اس کی ہمیشہ لی خبر — دم بہ دم پانی دیا یاں تک کہ بار آور ہوا
خود علی گڑھ کالج اور اس کے در و دیوار سب — راگ گائیں گے سدا احسان آصف جاہ کا
تھا پڑا سید کا سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز — دولت عالی نے اس خشکی میں دی گنگا بہا

ایک اور قصیدے میں علی گڑھ کے محسن کا ذکر دیکھیے:

علی گڑھ میں رہے گا بن کے دارالعلم یہ کالج — یہی عالم ہے گر بذل و عطائے خسروانی کا
وہ کالج مردہ قوم میں پھر جان ڈالی ہے — اسی منبع سے جاری ہے وہ چشمہ زندگانی کا

مسٹر تھیوڈور ماریسن جو علی گڑھ کالج کے انگریزی زبان کے استاد تھے ان کی انگلستان کی روانگی کی وقت یہ چند اشعار اُس مدحیہ نظم میں سے ہیں جو 1905ء میں لکھی گئی۔

گو کہ یاں تعلیم کا بویا تھا سرسید نے بیج — پر پھلا پھولا تمہاری سعی سے اس کا چمن
تم نے کی کالج کی خدمت جس خلوص وصدق سے — بس یہی خدمت تمہارا ہے صلہ اے مارسن

315

تم نے سرسید کی جو اصلاح میں حصہ لیا قوم کی سنت ادا کی ہے یہ تم نے بے سخن

حالی نے صرف علی گڑھ ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی قوم وملت کی جہالت کو دور کرنے کے لیے علم کدہ، مدرسہ، کالج کھولا گیا اُس کی ضرورت اور اس کے بانیوں اور محسنوں کی قصیدوں اور مدحیہ نظموں میں قدردانی کی ہے۔

حالی نے گورنر سرجان سکاٹ ہیوٹ کی شان میں شبلی کے کہنے پر یہ مدحیہ اشعار ندوۃ العلماء کے افتتاح پر لکھے: ؎

ہیوٹ نے ڈالی تیری نیو اے ندوہ کر شکر خدا
بے گھر تھا تو اے ندوہ تجھ کو گھر دیا سرجان نے
ویرانہ تھا آباد تجھ کو کر دیا سر جان نے
اب تو قدم آگے بڑھا خواہش ہے گر اس سے سوا
ہم سے تمہارا شکر اے برطانیہ کیا ہو ادا
اڈورڈ ہفتم اور شہنشاہی رہے اس کی سدا

نعتیہ قصیدوں کے سوا حالی کے دوسرے قصاید روایتی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اُن میں کلاسیک قصیدوں کی شان وشوکت، مبالغہ آرائی، پرزور مذمت، اور خیال بندی نہیں۔ بہت سے قصیدوں میں پورے اجزائے قصیدہ بھی موجود نہیں اس لیے حالی نے صرف مختصری تمہید جو موقع اور مقام کی نسبت سے ہے کی ہے پھر مدحیہ مضامین لکھ کر دعا پر خاتمہ کیا ہے۔ حالی کے قصیدوں میں خوشامد نام کو بھی نہیں۔ شکریہ اور سپاس گذاری نظر آتی ہے لیکن حسن طلب کی بھیک نہیں۔ غالب نے تشبیب پر زور دیا تھا اور اسی پر تفتہ کے خط میں ناز بھی کیا تھا۔ حالی کے قصیدے اس سے خالی ہیں۔ حالی کو مبالغہ اور دورغ خیال بندی سے نفرت تھی چناں چہ قصیدے پھیکے اور بیانیہ ہو کر رہ گئے۔ وہ حکمران جن کے ذائقے مبالغہ آرائی کے چٹخارے سے تندو تیز ہو گئے ان کے لیے حالی کے قصیدوں کا اثر شاید ایک شکریہ کا خط ہو۔ بعض قصاید میں حالی مدح کا پہلو عمدگی سے پیش کرتے ہیں اگر ممدوح کی خدمات قومی فائدہ اور ملک کی تعمیری صلاحیتوں کے ہمراہ ہو۔ حالی کے وہ قصاید اور مدحیہ منظومات جو علی گڑھ کے محسنوں اور قومی خدمت گزاروں کے لیے لکھے گئے

اس میں مداحی دل کی گہرائیوں سے ابل رہی ہے وہ اپنے قصیدوں میں اُن نکات کی جلوہ نمائی کرتے ہیں اور ان خصوصیات کو نمایاں کرتے ہیں جن میں تعلیم و تربیت، فلاح و بہبودی، علم و ہنر کی تشہیر و تنظیم کے پہلو ہوتے ہیں۔ سرسید جیسے مصلح پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ حالیؔ نے قوم کو خطاب کر کے کہا:

اس دور آخری میں جب یوں بگڑ چلے ہو
اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے
وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے
تعلیم کی ہماری بنیاد اس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

حالیؔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: مدحیہ قصیدے کا جس میں جھوٹ اور مبالغہ ہو لکھنا میرے لیے سخت مصیبت ہے۔ حالیؔ کو قصیدہ نگاری سے دلچسپی نہ تھی اسی لیے انہوں نے قصیدے حکمرانوں نوابوں کے کم لکھے اور بعض کو ادھورا چھوڑ دیا۔ ع

دل چاہتا نہیں تو زباں میں اثر کہاں

جن قصیدوں میں ممدوح کی عالی ظرفی، سخاوت، شجاعت، قومی ہمدردی تھی اُسے بیان کیا ہے اور بعض قصیدوں میں ان افراد کو اپنی قومی اخلاقی اور انسانی ذمہ داریوں سے باخبر بھی کیا ہے جو عام طور سے قصیدوں میں نہیں ہوتا۔ قصیدوں میں یہ رنگ حالیؔ نے سعدی کے قصیدوں اور انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں سے حاصل کیا۔

رام بابو سکسینہ نے حالیؔ کے قصیدوں پر ریویو کرتے ہوئے صحیح کہا ہے۔ ''پرانے روایتی قصیدوں کی طرح حالیؔ کی ساری قابلیت ممدوح کی صرف مداحی اور محض لفظی شان و شوکت میں صرف نہیں ہوتی بلکہ وہ ممدوح کو اس کی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں اور موقع موقع پر اُسے نصیحت اور عبرت کی باتیں بھی بتاتے ہیں۔'' ؎

شکر کرنا تھا ہمیں سرکار عالی کا ضرور

چند نظمیں انجمن میں اس لیے ہم نے پڑھیں
اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں مگر
جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ اُن میں نہیں

حالی نظام دکن کا قصیدہ لکھنے سے قبل مولوی عبدالحق سے نظام کے ذاتی اوصاف اور رفاہ عامہ کے کاموں کی تفصیل دریافت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مجھے بے سروپا مدح سرائی اور بھٹی کرنی نہیں آتی اس لیے میں چاہتا ہوں قصیدے میں سرتاپا فیکٹس اور واقعات کا بیان ہو۔

چناں چہ نواب میر عثمان علی خان نظام دکن ہفتم کی مسند نشینی کے موقع پر 1911ء میں کہتے ہیں۔

فلک مرتبت میر عثمان علی خاں ــ مبارک تمہیں مسند شہر یاری
مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل ــ جہاں چپے چپے پہ ہے ذمے داری
مبارک بزرگوں کی میراث تم کو ــ جنہوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری
مبارک یہ بارِ گراں تم کو شاہا ــ اٹھانے سے ہیں جن کے افلاک عاری
سمجھنا ہر اک قوم و ملت کو یکساں ــ کہ خصلت ہے یہ زیور شہر یاری
جو زر دار ہیں ان کی ہے پاسبانی ــ جو نادار ہیں ان کی حاجت بر آری
دعا گوئے دیرینہ نا چیز حالی ــ کہ مدحت گری کہ ہنر سے ہے عاری

حالیؔ کے قصیدوں اور مدحیہ منظومات میں دو موضوعات جگہ جگہ پر ابھرتے ہیں۔ ایک تو وہ ملک میں قوموں کے درمیان اتحاد و محبت کا ذکر چھیڑتے ہیں اور دوسرے تعلیم کی اہمیت اور تعلیمی درس گاہ علی گڑھ کی دامے درمے سخنے پشتبانی کرتے ہیں۔

نظام دکن پر محبوب علی پاشا کے قصیدے میں لکھتے ہیں:

جتنی یاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول ــ بے تعصب بے تکلف بے تصنع بے ریا
دولت عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیے ــ ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یاں دوسرا
پارسی ہندو مسلماں یا مسیحی کوئی ہو ــ ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

ایک اور نظام دکن کے قصیدے میں کہتے ہیں۔

تعصب اجنبیت اختلاف مذہب و ملت نہیں کوئی مزاحم اس کے دریا کی روانی کا

شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ فارسی اور اُردو قصیدوں میں سعدؔی کے بعد حالؔی ہی وہ تنہا شاعر ہے جس کے پاس مبالغہ، خوشامد گوئی کی جگہ صداقت، سادگی اور خلوص قصیدوں میں موجود ہے۔

حالؔی نے جن اُمرا سے وظیفے امداد انعامات پائے ان کی شکرگذاری کی ہے۔ ان قصیدوں میں خوشامد نہیں لیکن عجز، انکساری، حقیری، فقیری، غریبی وغیرہ وغیرہ کا رنگ ہے وہ زیادہ تر حالؔی کی افتاد طبع کا نتیجہ تھا۔ غالب نے بھی نواب رام پور کے سو روپیے کے ماہانہ وظیفہ کے لیے ڈیڑھ سو بار:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار کہا

صرف دعا ہی نہیں دی بلکہ مدح بھی ضرورت سے زیادہ کی۔ انیسؔ نے بڑی بڑی رقم ٹھکرا دی۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر مجرائی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

نواب آسمان جاہ نے 1888ء میں سرکار حیدر آباد کی طرف سے حالی کا ماہانہ وظیفہ مقرر کیا ایک مدحیہ قطعہ حالی نے بھیجا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

آسمان جاہ کی خدمت میں یہ حالی کی ہے عرض کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں
شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے اس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرماں

حالؔی احسان فراموش شخص نہ تھے اگر کوئی کسی بھی قسم کی خدمت کرتا حالؔی اس کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ منظوم طریقے سے یا مکتوب کے ذریعے سے۔

حالؔی کی قصیدہ نگاری درحقیقت نعتیہ قصیدوں میں کھلتی ہے۔ نعتیہ قصاید نہ صرف کلاسیک قصیدے ہیں بلکہ اس میں دلی تاثیرات اور داخلی سوز و گداز کو محسوس بھی کیا جاسکتا ہے ہم یہاں حالؔی کے دو نعتیہ قصیدے اور ایک نعتیہ نظم عرض حال کے اقتباسات پیش کریں گے ہم نے نعتیہ خمسہ جو 1856ء کی تصنیف ہے اور جو 'خستہ' تخلص نامی شاعر کی نعت ہے حالؔی کے کلام میں شامل نہیں کی۔ حالؔی نے جو ضمیمہ مسدس میں عرض حال لکھی ہے وہ حالی کی مشہور ترین نعت ہے۔

حالؔی کی تینوں نعتیہ نظموں کا رنگ الگ الگ ہے۔ پہلا قصیدہ نعتیہ جو 1281ء مطابق

1864ء کی تخلیق ہے جس میں (33) اشعار ہیں۔ یہاں مدحت سرکار دو عالم تشبیہات، استعارات تلمیحات اصطلاحات سے مزین ہے۔ یہ اُس دور کی نعت ہے جب حالی بھی روایتی اور کلاسیک شاعری سے متاثر تھے۔

ہم یہاں نسبتاً تفصیل سے کام لے رہے ہیں کیوں کہ اس قسم کا نمونہ کلام حالیؔ کے پاس خال خال ہے۔ مطلع ہی میں حالیؔ نے اپنے وجود کو اور اپنی تخلیق کو مدحت نبی e کے لیے مختص بتایا ہے۔

بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں کے لیے
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

استعاروں میں جدت اور خوبصورتی دیکھیے:

وہ چاند جس سے ہوئی ظلمت جہاں معدوم — رہا نہ تفرقہ روز و شب زماں کے لیے
وہ پھول جس سے ہوئی سعی باغباں مشکور — رہی نہ آمد و رفت چمن خزاں کے لیے
ہلالِ مکہ کا ماہ دو ہفتہ یثرب کا — فروغ قوم کے اور شمع دودماں کے لیے

حالیؔ کی پہلی نعت میں جوش بیان اور شعری آمد میں غضب کا حسن ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ کے ہوتے ہوئے بھی ابلاغ میں دشواری نہیں۔ دو شعروں میں قرآن، جبریل، کعبہ، انس وجاں طواف وسجود اور آستاں کی نقش بندی دیکھیے۔

گھر اس کا موردِ قرآن و مہبط جبریل
در اس کا کعبہ مقصود انس وجاں کے لیے
سپہر گرم طواف اس کی بارگاہ کے گرد
زمین سر بسجود اس کے آستاں کے لیے

اس نعت میں اخلاق نبی، شفاعت نبوی، معراج اور ولایت نبی e کے خوبصورت مصرعے پڑھیے: جو نعت کے اصلی نکات ہیں:

گہ افتخار مقابل میں اہل نخوت کے — گہ انکسار مدارات میہماں کے لیے
صفائے قلب حسودانِ کینہ خواہ کے ساتھ — دعائے خیر بد اندیش و بدگماں کے لیے

شفیع خلق سراسر خدا کی رحمت ہے بشارت امت عاصی و ناتواں کے لیے
شفاعت نبوی ہے وہ برق عصیاں سوز کہ حکم خس ہے جہاں کفر دو جہاں کے لیے
نہ حرف وصوت میں وسعت نہ کام ولب میں سکت حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لیے
خدا کی ذاتِ کریم اور نبی کا خلق عظیم محک ہے حب نبی e دل کے امتحان کے لیے

عربی ادق الفاظ اور تراکیب کو مصرعوں میں ایسا کھپا دیتے ہیں کہ وہ بھی رواں دواں ہو جاتے ہیں:

کہیں مقدمۃ الجیش انبیا و رسل کہیں وہ خاتمۃ الباب داستاں کے لیے
مدینہ مرجع و مادائے اہل مکہ ہوا مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لیے
عبور لجہ عصیان سے کس طرح ہو اگر وہ ناخدا نہ ہو اس بحرِ بے کراں کے لیے

حالیؔ کی نعت میں مدحت سرائی کا عجز ہے جس طرح عرفی غالب اور دیگر شعرا نے کیا ہے اور آخر میں حالی کی تمنا بھی درج ہے۔

حریف نعت پیمبر نہیں سخن حالیؔ کہاں سے لائیے اعجاز اس بیاں کے لیے

غالبؔ نے نجف میں دفن ہونے کی آرزو ظاہر کی تھی شاگرد غالب حالیؔ نے جنت البقیع مدینہ کو جنت فردوس پر ترجیح دی ہے۔

اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربتِ مرگ
پیوں نہ آبِ بقا عمرِ جاوداں کے لیے
اگر بقیع میں گز بھر زمین میسر آئے
کروں نہ طولِ امل روضہ جناں کے لیے

حالیؔ نے دوسرا نعتیہ قصیدہ 1871ء میں لکھا جو کئی لحاظ سے ممتاز ہے۔ یہ حالیؔ کا طویل ترین نعتیہ قصیدہ ہے جس میں ((75 پچہتر شعر ہیں۔ اس میں ایک لمبی ((34 اشعار کی تشبیب ہے جس میں حالیؔ نے اپنے فن پر ناز کیا ہے اور حالیؔ کے تمام تر کلام میں کہیں ایسی تعلی نہیں ملے گی۔ حالیؔ نے اس قصیدہ پر ایک نوٹ لکھا ہے جو حالی کے روایتی دور کا ذہنی رجحان دکھا رہا ہے۔ حالیؔ لکھتے ہیں:

''اس قصیدے کی تمہید 1287ھ یا 1288ھ (مطابق 71-1870ء) کے ہذیانات میں

سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن، ذوق، آزردہ، غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انھی دنوں میں سیتارام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھی گئیں۔ جن لوگوں کی جا و بے جا تحسین و آفریں سے دماغ میں خلل آ گیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرے میں نہ آئے۔ بیسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی کھسیانی نہیں ہوتی جیسا کہ شاعر ان لوگوں کی بے التفاتی سے جن کو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدر داں سمجھتا ہے۔ اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدے کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر یہ لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کیوں کہ اس زمانے کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جس طرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعے سے ہوتی ہے اسی طرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے۔ لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعۃً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا لہٰذا قصیدے کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تاکہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔"

اس نعت میں حالیؔ اپنی شاعری پر فخر کرتے ہیں اور انہیں شکایت ہے کہ زمانہ ان کے مقام سے ناواقف ہے کیوں کہ شعر شناسوں سے محفل خالی ہو چکی ہے۔ نعت کی تمہید کے کچھ مصرعوں اور شعروں کو جوڑ کر بغیر کسی تشریح کے ہم بات کو آگے بڑھاتے ہیں:

میں بھی ہوں حُسنِ طبع پر مغرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ
خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے
میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت
مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور

315

لذتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ
اس کو کیا قدرِ خوشہ انگور
کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز
انوری ہے نہ عرفی و شاپور
کون دیکھے مرے چمن کی بہار
مر گیا عندلیب نیشا پور

ایک طویل تمہید کے بعد فوراً گریز کرتے ہیں:

لوں ملائک سے دادِ حُسنِ کلام
گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور

پھر حضور e کی مدحت سرائی کی ہے جس میں آپ کا خلق عظیم آپ کا کرم، رحم، حشم اور فہم پر عمدہ مصرعے لکھے ہیں۔ حالیؔ نے پھر اپنی ذات کو حضور کی بارگاہ میں حقیر و ذلیل گناہ کار اور خود غرض بتا کر حضور سے شفاعت اور رحمت کی درخواست کی ہے۔ اس نعت میں تمہید اور حسن طلب نے خوبصورت رنگ پیدا کر دیا ہے۔

نفس قاہر ہے اور میں مقہور — طمع غالب ہے اور میں مغلوب
طمعِ جاہ و فکرِ عیش و سرور — مہر فرزند و خواہشِ زر و سیم
یہ ہے افعی تو وہ ہے کلب عقور — نفسِ امارہ اور دیو مرید
جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور — مجھ سے جو کام چاہیے لیجے
جیسے زنگی کا نام ہو کافور — فی المثل ہے مری مسلمانی

اور دعائیہ اشعار پر نعت کو ختم کرتے ہیں:

جب کروں بحرِ زندگی سے عبور — جا لگے تیرے در پہ کشتی عمر
ہے بہت تنگ حالیؔ مہجور — دوری آستان والا سے

اس مقام پر خارج از محل نہیں اگر ہم حالیؔ کی عرض حال کے بارے میں مختصر کچھ تحریر کریں۔ حالی نے 1888ء میں اس ترسٹھ اشعار کا قصیدہ لکھا جو شاید اشعار کی تعداد کے لحاظ سے

حضور کائنات e کی طبعی عمر کے عدد سے مساوی ہو۔ اس قصیدہ کی زبان عام فہم اور یہ سب کے لیے لکھی گئی ہے جو نعت کے ساتھ مناجات اور دعا بھی ہے۔ حالیؔ نے جو مسائل مسدس کے بندوں میں لکھے اُس کی تلخیص اس نعت میں کی ہے۔ نعت کی تمہید یا تشبیب میں مسلمانوں کا عروج اور پھر عصر حاضر میں ان کا زوال دکھایا گیا ہے جس کا ذمہ دار خود موجودہ نسل کو بتایا گیا ہے کہ وہ سب کچھ کھو کر خواب غفلت میں سو رہے ہیں۔ یہ نعتیہ قصیدہ مطلع کے اس مصرعہ ع

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے

سے شروع ہو کر فاری مصرعہ: ع

یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا ہے

پر ختم ہوتا ہے۔

اس نعت کے اشعار کی خوبصورتی یہ ہے کہ مصرعہ اولی میں مسلمانوں کا عروج، بلندی اقبال اور چڑھاؤ بتا کر مصرعہ ثانی میں ان کا زوال، پستی، بدبختی اور اُتار دکھایا گیا ہے۔

مثال کے طور پر چند اشعار یہ ہیں:

جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ　　خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں　　اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے　　اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

جو دین کہ ہمدرد بنی نوع بشر تھا　　اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

تمہید کے اٹھارہ انیس اشعار کے بعد گریز کرتے ہیں۔

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی　　پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

لیکن پھر حالی قوم کا مرثیہ جاری رکھتے ہیں۔ امتوں نے حضور e کے ساتھ ظلم وستم کیے لیکن حضور e نے ان کا جواب رحم و کرم سے دیا جنھوں نے برائی کی ان کی بھلائی کی، ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حضور سے فریاد کرتے ہیں۔

ذولسانی شعر دیکھیے: ؎

اے چشمہ رحمت بابی انت و اُمی　　دنیا پہ تیرا لطف سدا عام رہا ہے

جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا　　جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے
صدمہ دُرِ دنداں کو ترے جن سے کہ پہنچا　　کی اُن کے لیے تو نے بھلائی کی دعا ہے
کی تو نے خطا عفو ہے اُن کینہ کشوں کی　　کھانے میں جنھوں نے کہ تجھے زہر دیا ہے
جو بے ادبی کرتے تھے اشعار میں تیری　　منقول انھی سے تری پھر مدح و ثنا ہے

ان تمام شعروں میں حالیؔ نے تاریخ حضور رسالت مآب eاور سیرت کے واقعات نظم کیے ہیں۔ پھر حضرت سے التماس کرتے ہیں کہ انہیں ہدایت اور توفیق دے اور اس امت کو غرق ہونے سے بچایئے۔

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے　　نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے
کر حق سے دعا امت مرحوم کے حق میں　　خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

(۱)......قصاید

1 قصیدہ نعتیہ [۱]

(1281ھ مطابق 65-1864ء)

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دو جہاں کے لیے
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں
عداوت اس کی عذابِ الیم جاں کے لیے

وہ شاہ جس کا محب امن و عافیت میں مدام
محبت اس کی حصار حصیں اماں کے لیے

وہ چاند جس سے ہوئی ظلمتِ جہاں معدوم
رہا نہ تفرقہ روز و شب زماں کے لیے

وہ پھول جس سے ہوئی سعی باغباں مشکور
رہی نہ آمد و رفت چمن خزاں کے لیے

ہلال مکے کا، ماہ دو ہفتہ یثرب کا
فروغ قوم کے اور شمع دودماں کے لیے

گھر اس کا موردِ قرآن و مہبطِ جبریل
در اس کا کعبہ مقصود انس و جاں کے لیے

سپہر گرم طواف اس کی بارگاہ کے گرد
زمین سر بسجود اس کے آستاں کے لیے

ا۔ یہ قصیدہ 1281ھ یا 1282ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس کو اپنی قدیم شاعری کا نمونہ سمجھ کر بدستور سابق رہنے دیا ہے، کہیں کچھ تصرف نہیں کیا گیا۔ (حالی)

وہ لحظہ لحظہ تفقد وہ دم بدم الطاف
رضائے خاطرِ یارانِ جاں فشاں کے لیے

وہ گونہ گونہ مدارا وہ بات بات میں مہر
کشائشِ گرہِ کینِ دشمناں کے لیے

گہ افتخار مقابل میں اہل نخوت کے
گہ انکسار مدارات میہماں کے لیے

کہیں ہلاک میں تاخیر قومِ سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لیے

صفائے قلب حسودانِ کینہ خواہ کے ساتھ
دعائے خیر بد اندیش و بدگماں کے لیے

کہیں مقدمۃ الجیش [1] انبیا و رسل
کہیں وہ خاتمۃ الباب [2] داستاں کے لیے

مدینہ مرجع و ماوائے اہل مکہ ہوا

مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لیے

اسی شرف کے طلب گار تھے کلیم و مسیح
نوید امت پیغمبر زماں کے لیے

بس اب نہ غول کا کھٹکا نہ راہ زن کا خطر
ہوا وہ قافلہ سالار کارواں کے لیے

شفیع خلق سراسر خدا کی رحمت
بشارت امت عاصی و ناتواں کے لیے

شفاعت نبوی ہے وہ برقِ عصیاں سوز
کہ حکم خس ہے جہاں کفر دو جہاں کے لیے

ا۔ لشکر کا اگلا حصہ

۲۔ خاتمہ، آخری حصہ، آنحضرت ﷺ سب سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور سب سے آخر میں مبعوث ہوئے۔

خدا کی ذات کریم اور نبی کا خلق عظیم
گنہ کریں تو کریں رخصت انس و جاں کے لیے

اسی کا دیں ہے کہ ہے گلشن ہمیشہ بہار
وگرنہ ہر گل و گلزار ہے خزاں کے لیے

عبور لجِ عصیاں سے کس طرح ہو اگر
وہ نا خدا نہ ہو اس بحر بے کراں کے لیے

مریض حرص و ہوا پائے کب شفا جب تک
وہ چارہ گر نہ ہو اس دردِ جاں ستاں کے لیے

نہ حرف و صوت میں وسعت نہ کام و لب میں سکت
حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لیے

ارادہ عرش پہ اک آن میں پہنچنے کا
کیا تھا عزم اولوالعزم نے کہاں کے لیے

کرم کا دیکھیے دامن کہاں تلک ہو فراخ

ہو میزبان خدا جب کہ میہماں کے لیے
زمیں پہ ٹھہرا ہے ماوائے شاہ عرش نشیں
رہی نہ اب کوئی فوقیت آسماں کے لیے
اسی سے ہوتا ہے ظاہر عیار استعداد
محک ہے حُبِّ نبی دل کے امتحان کے لیے
اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربتِ مرگ
پیوں نہ آبِ بقا عمرِ جاوداں کے لیے
اگر بقیع [1] میں گز بھر زمیں میسر آئے
کروں نہ طولِ امل روضہ جناں کے لیے

[1] جنت البقیع: مدینہ منورہ کا مبارک قبرستان جس میں رسولe کی بیٹی سیدہ فاطمہc امام حسن، امام سجاد، امام باقر، امام جعفر صادق اور کئی صحابہ کرامf مدفون ہیں۔

سمایا اس کا جو نقش قدم تصور میں
ہجوم شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے
حریف نعتِ پیمبر نہیں سخن حالی
کہاں سے لائیے اعجاز اس بیاں کے لیے
نبی کا نام ہو ورد زباں، رہے جب تک
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

2 قصیدہ نعتیہ (رائیہ) [1]

(1287-88ھ مطابق 1870-71ء)

میں بھی ہوں حُسنِ طبع پر مغرور
مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ
مجھ سے برتر ہے میری طبعِ غیور

خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے
میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور

ا۔ اس قصیدے کی تمہید 1287ھ یا 1288ھ مطابق (71-1870ء) کے ہذیانات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن، ذوق، آزردہ، غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انہی دنوں میں سیتارام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھی گئیں۔ جن لوگوں کی جا و بے جا تحسین و آفریں سے دماغ میں خلل آ گیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرے میں نہ آئے۔ بیسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی کھسیانی نہیں ہوتی جیسا کہ شاعران لوگوں کی بے التفاتی سے جن کو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدرداں سمجھتا ہے۔ اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدے کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر یہ لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کیوں کہ اس زمانے کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جس طرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعے سے ہوتی ہے اسی طرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے۔ لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعتاً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا لہٰذا قصیدے کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تا کہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہوئے۔ (حالی)

نہ گنو اہلِ عصر میں مجھ کو
میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور

چشمہ آبِ خضر کی مانند
چشمِ اہلِ جہاں سے ہوں مستور

دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت
مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور

مثلِ یوسف دکھائے جوہرِ ذات
جس کو بکنا ہو مفت یاں منظور

جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر
ہوں زمانے کے ہاتھ سے مجبور

کبک و قمری کو رخصتِ پرواز
بال و پر مفت صعوہ و عصفور

315

جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور

لذتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ
اس کو کیا قدر خوشہ انگور

جس کے آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے
روزِ روشن ہے یا شبِ دیجور

پہلے ہو گی کسی کو قدرِ ہنر
اٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور

دردِ دل کا بیاں کروں کس سے
بات کھوئی نہیں مجھے منظور

سخن حق کی داد لوں کس سے
سن چکا ہوں فسانہ منصور

دل آباد مفت بے ہنراں
ہو چکا خانہ ہنر معمور

مژدہ خسرو کو وصل شیریں کا
ہو چکی سعی کوہکن مشکور

ہم نے دیکھی تمیزِ اہلِ نظر
ہم نے دیکھا مذاق اہلِ شعور

ہے غرض ان کو صوتِ موزوں سے
نالہ دل ہو یا نوائے طیور

ہو کسی شے سے ان کی گرمی بزم
داستاں ہو وہ یا کہ درسِ زبور

ہے فقط روشنی سے ان کو کام

موم ہو اصل شمع یا کافور
ہے یہاں قائلِ اَنا مردود
ہو وہ فرعون وقت یا منصور
آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ
دل اصحاب گو نہ ہو مسرور
یاں اگر کام ہے تو شیریں سے
قصر خسرو کے اور ہیں مزدور
دلِ احباب پر نہیں چلتا
سحر میرا کہ رہیو غیر سے دور
ہوں تماشائے شہر نابینا
ہے برابر مرا خفا و ظہور
دُرِّ یکتا ہوں اور ہوں بے آب
ماہِ کامل ہوں اور ہوں بے نور
چشمہ پیدا و کارواں تشنہ
بادہ پرزور و انجمن مخمور
اس زمانے میں وہ غریب ہوں میں
جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور
صاحب قدر و جاہ ہے جب تک
کار فرما ہے چین میں فغفور
کاش اس عہد میں مجھے پاتے
تھا سخن جب کہ قبلہ جمہور
کاش واں دیکھتے مجھے کہ جہاں

315

متنبی [1] تھا مادحِ کافور

کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز
انوری ہے نہ عرفی و شاپور

کون دیکھے مرے چمن کی بہار
مر گیا عندلیب نیشاپور [2]

جس سے ہوتا ہے خستہ سینہ ہوش
ہے زباں میری وہ دمِ ساطور

جس سے ہوتا ہے کور پروانہ
ہے مری شمع میں وہ لمعہ نور

---

[1] متنبی عربی کا مشہور شاعر ہے۔ کافور حبشی والی مصر کی ایک مدت تک مدح کرتا رہا۔ آخر اس سے ناراض ہو کر چلا گیا اور وہ وہ ہجویں لکھیں کہ حیا اُن کے تصور سے بھی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

[2] عندلیب نیشاپور سے مراد نظیری ہے لیکن اگر وہ ہوتا تو اس سے زیادہ اور کیا قدر کرتا جیسا کہ شیخ علی حزین نے سودا کی نسبت کہا تھا کہ در پوچ گویان ہند غنیمت است۔ (حالی)

شرح نقطے کی گر کروں تحریر
تنگ ہو عرصہ نقوش و سطور

ترکِ عشق بتاں کریں عشاق
مجھ سے سن پائیں گر ستایشِ حور

گر کروں ذکرِ لذت طاعات
تلخ کر دوں مذاقِ فسق و فجور

چھیڑ دوں گر فسانہ فرہاد
دل خسرو میں ڈال دوں ناسور

کرنے جاؤں جو حق سے عذر گناہ
لے کے آؤں نوید عفو قصور

لوں ملائک سے دادِ حُسن کلام

گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور

وہ شہنشاہ، اُمتی جس کا
یاں گنہگار اور واں مغفور

وہ خداوند، خدمتی جس کا
یاں سبک سار اور واں ماجور

مژدہ اے امت ضعیف کہ یاں
سعی ہوتی ہے بے کیے مشکور

لب شیریں کلام سے اس کے
دوست بھی شاد غیر بھی مسرور

اثر فیض عام سے اس کے
کعبہ آباد مے کدہ معمور

چرخ کو دے اگر وہ حکم سکوں
ہو غلط نسخہ سنین و شہور

صر صرِ قہر گر چلے اس کی
بند ہو مسلکِ صبا و دبور

جس طرف ہو وہ گرم نظارہ
جلوہ گر ہو ادھر سے لمعہ طور

ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن
موج زن ہو وہاں سے چشمہ نور

بات پوچھو تو سوے چرخ نگاہ
سینہ دیکھو تو علم کا گنجور

ہو سکے اس کی خوبیوں کا شمار
نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور

اے ترا پایہ فہم سے برتر

315

اے ترا نام عرش پر مسطور

میں ترے در پہ سن کے آیا ہوں
نام تیرا شفیعِ روزِ نشور

کچھ نہیں زادِ راہ پاس اپنے
مگر امیدِ عفوِ ربِ غفور

طبع غالب ہے اور میں مغلوب
نفس قاہر ہے اور میں مقہور

بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق
نشۂ کبر میں ہوں بالکل چُور

چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن
ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور

مہرِ فرزند و خواہشِ زر وسیم
طمعِ جاہ و فکرِ عیش و سرور

ایک بیمار اور سو آزار
ایک رنجور اور سو ناسور

نفسِ اَمارہ اور دیو مرید
یہ ہے افعی تو وہ ہے کلبِ عقور

مجھ سے جو کام چاہیے لیجے
جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زُور

حسد و بغض و غیبت و بہتان
بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور

ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی
ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہو مامور

دل لگے بندگی میں کیا امکاں

لب ہلے ذکرِ حق میں کیا مذکور

مایہ عقل ہے نہ شورِ جنوں
دلِ بے تاب ہے نہ جانِ صبور

نہ معاصی میں تلخی خجلت
نہ عبادت میں چاشنی حضور

فی المثل ہے مری مسلمانی
جیسے زنگی کا نام ہو کافور

ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے
تیرے زمرے میں گر ہوا محشور

جب ترے کارواں میں جا پہنچا
پھر رہا بابِ خُلد کتنی دور

دوری آستانِ والا سے
ہے بہت تنگ حالی مہجور

اب دعا یہ ہے اے شفیعِ امم
بس کہ بے تاب ہے دلِ رنجور

جا لگے تیرے در پہ کشتی عمر
جب کروں بحرِ زندگی سے عبور

جیتے جی دل میں یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

3 قصیدہ مدحیہ ناتمام [1]

درمدح نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور

(1291ھ مطابق 1874ء)

ظلِ حق کلبِ علی خاں جس کے بذل و جود پر
ہند سے لے تا عرب ہیں خاصی و عامی گوا

صاحبِ علم و عمل اور تابعِ احکامِ دیں
زائرِ قبرِ نبی اور حاجی بیت الہدیٰ

شاعری میں فرد، موسیقی میں فارابی عصر[2]
صوت، روح افزا و صورت، آیہ صنعِ خدا

دولتِ برطانیہ پر اس کی فرزندی کا حق
دولتِ عثمانیہ کو اس سے پیوند ولا

ا۔ یہ قصیدہ 1291ھ میں اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ نواب ممدوح، علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے اور بارہ سو روپے سال کی جاگیر ہمیشہ کے لیے مدرسے کے اخراجات کے واسطے اور کئی ہزار روپے نقد بطور چندہ کے دے چکے تھے۔ مگر مصلحتاً ان کی خدمت میں بھیجا نہیں گیا اور اسی لیے ناتمام رہا۔ اس کے اول و آخر کے کچھ اشعار ضائع بھی ہو گئے ہیں (حالی)

۲۔ حکیم ابونصر فارابی (متوفی 873ء)، مشہور عالم اور فلسفی، "معلم ثانی"، مختلف علوم پر ایک سو سے زاید کتابوں کا مصنف۔

اس کی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب اور جلیس
اور مروت پر ہیں نازاں مجرم و اہلِ خطا

مرجعِ اربابِ علم و فن ہے اس کا بابِ فیض
یہ وہ دعویٰ ہے کہ خود دربار ہے اس کا گوا

کل زمینِ ہند میں تھے جو درخت بارور
ان کو چن چن کر یہاں لایا چمن بند سخا

گر مناظر ہیں تو ہیں سر دفترِ اہلِ کلام
اور محدث ہیں تو ہیں سر چشمۂ علم و ہدیٰ

زمرہ اہلِ یقیں یا مجمعِ اہلِ سلوک

نکتہ چینانِ مجسطی [1] خردہ گیرانِ شفا [2]

شاعر شیریں نفس یا شاطر سنجیدہ رائے
فیلسوفِ مستدل یا عارفِ علت ربا

بے بدل ہے الغرض جو روپ ہے اس باغ میں
بلبل جادو نوا ہو یا گل رنگیں ادا

بہرہ ور ہیں فیض سے تیرے بلادِ دور دست
اے خوشا وہ سرزمیں جس پر ہو تو فرماں روا

بار محصولات سے یاں تک ہوئی ہلکی کہ اب
بار منت سے ترے پشت رعیت ہے دوتا

خیر تیری ہے حصار عافیت تیرے لیے
سیر ہو کر تجھ کو دیتے ہیں بہت بھوکے دعا

---

[1] حکیم بطلیوس کی مشہور کتاب جس کا ترجمہ محقق طوسی نے کیا تھا۔
[2] ابن سینا کی تصنیف 'الشفا' جو طبیعیات، مابعد الطبیعیات اور ریاضیات کی قاموس ہے اور اٹھارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔

نعمتیں حق کی نہ سمٹیں گی سمیٹی زینہار
ہر بھلائی کی ملی دہ چند گر تجھ کو جزا

خوان نعمت پر ہے تیرے میہمانوں کا ہجوم
نام پھر زندہ ہوا خوان خلیل اللہ [1] کا

ہے یقیں تجھ پر پڑے اصحاب محشر کی نگاہ
جب کہیں کس نے کیا حق میزبانی کا ادا

دولت و اقبال روز افزوں سے ہے تیری عیاں
جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا

پرورش پاتی تھی جن کے سایہ دولت میں قوم

315

لے گئی ان کو بہا کر موجِ سیلابِ فنا
کچھ گھرانے رہ گئے ہیں جو کہ آتے ہیں نظر

ہند میں اب تکیہ گاہ امت خیر الوریٰ
یہ اگر بنتے نہ کشتی بان اس طوفان میں

کشتی اسلام تھی منجدھار میں بے ناخدا
رہ گئی تیری خریداری سے شرمِ اہلِ فضل

ورنہ ان کی جنس کا گاہک یہاں کوئی نہ تھا
مل گئے تھے گوہرِ درجِ شرافت خاک میں

خاک سے تو نے اٹھایا ان کو اور بخشی جلا
ہو رہے تھے دودمانِ علم و دولت جاں بہ لب

تو نے اک اک کے چوایا حلق میں آبِ بقا
کول [۲] میں پودا لگا ہے جو پے تہذیب یہ

آبیاری سے ہے تیری ہی اسے نشوونما
ہے یہ وہ احسان جس کے بارِ منت سے کبھی

قوم کی گردن نہ ہلکی ہو گی بے رو و ریا

[۱] حضرت ابراہیمg کا دسترخوان۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے مہمان کے بغیر کبھی کھانا نہیں کھایا۔
[۲] علی گڑھ کا پرانا نام

تیرے ظلِ تربیت میں گر رہا یہ نونہال
ہے یقیں پھیلیں گی شاخیں اس کی طوبیٰ سے سوا

فرض اگر کیجے اسے دیوارِ کاخِ آرزو
تو وہ پشتی باں ہے جس سے اس کی قائم ہے بنا

اور اگر کہیے کہ ہے یہ قوم کی کشتِ مراد
تو ہے اس پر ابرِ رحمت کی طرح چھایا ہوا

4 قصیدہ ناتمام [۱]

در مدح سید احمد خاں

(1294ھ مطابق 1874ء)

پنہاں نہیں ہے یارو سب پر کھلا ہوا ہے
جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے

ہے اک لکیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم
خود سانپ ورنہ یاں سے کب کا نکل گیا ہے

اس پر بھی اے عزیزو! ہے جائے فخر تم کو
دینوں میں دین بیضا حق نے تمہیں دیا ہے

قبلہ ہے وہ تمہارا جو گھر ہے سب سے پہلا
ہادی ہے وہ تمہارا جو ختمِ انبیا ہے

دی ہے وہ مصلح کل حق نے کتاب تم کو
جس نے شریعتوں کو شیر و شکر کیا ہے

بخشی تمہیں حکومت حکمت تمہیں عطا کی
دوراں سدا موافق تم سے نہیں رہا ہے

ا۔ یہ قصیدہ اس وقت لکھنا شروع کیا تھا جب کہ مدرسۃ العلوم کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے اور سرسید کے کام تعجب کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ مگر بسبب مکروہات دنیوی کے پورا نہ ہو سکا۔ (حالی)

اس دور آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے

سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتوؤں سے قوم کی گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے

وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے
قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے

درہم سے اور قلم سے، دم سے قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اُس نے وہ کس سے ہو سکا ہے

ہمدرد قوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا
یہ درد اس کو جد کی میراث میں ملا ہے

تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

بعد از قرونِ اولیٰ کس نے کیا بتاؤ
سیّد نے کام آ کر جو قوم میں کیا ہے

5 جشن جوبلی [1]

(1887ء)

ہے عید یہ کس جشن کی یا رب کہ سراسر
ہے جوبلی ہی جوبلی ایک اک کی زباں پر

یہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس اب
ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر

[1] جشن جوبلی کے موقع پر مولانا حالی ایچی سن کالج لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبہ کے اتالیق تھے۔ یہ قصیدہ انجمن اسلامیہ لاہور کی طرف سے ایک سپاس نامے کے ساتھ ملکہ وکٹوریا کے حضور میں پیش کیا گیا تھا۔ (ا ص)

وہ دورِ تعصّب تھا یہ ہے دورۂ انصاف
وہ جنگ کا مُوجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر

جمشید پہ جب آگ ہوئی سنگ سے ظاہر
ایراں میں کیا جشن سدہ اس نے مقرر

اس عہد ہمایوں میں ہزار ایسے کرشمے
ظاہر ہوئے اس طرح کہ عقلیں ہوئی ششدر

یہ جشن مبارک ہے بہت جشن سدہ سے

وہ آگ نکلنے کا یہ بجھنے کا ہے مظہر

اس دورِ خجستہ میں وہ سب بجھ گئے شعلے
تھی جن کی جہاں سوز لپٹ آگ سے بڑھ کر

اس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کیے قطع
جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر

بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں بیٹیوں کو اب
جو لوگ روا رکھتے تھے خوں ریزی دختر

جب بیٹیوں نے زندگی اس طرح سے پائی
دی زندگی اک اور انہیں علم پڑھا کر

اس عہد نے کی آ کے غلاموں کی حمایت
انساں کو نہ سمجھا کسی انسان نے کم تر

دی اس نے مٹا ہند سے یوں رسمِ ستی کی
گویا وہ ستی ہو گئی خود عہد کہن پر

نابود کیا اس نے زمانے سے ٹھگی کو
اک قہر تھا اللہ کا جو نوع بشر پر

اس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم سے محفوظ
مظلوم نہ اب بیل نہ گھوڑا ہے نہ خچر

اے نازشِ برطانیہ اے فخرِ برزنک
اے ہند کے گلے کی شباں، ہند کی قیصر

سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گزرا
محمود نہ تیمور نہ دارا نہ سکندر

تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا
اور تو نے کیا ہے دلِ عالم کو مسخر

بند اپنے فرائض میں مسلماں ہیں نہ ہندو
معمور مساجد ہیں تو آباد ہیں مندر

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا
سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر

io

گو منت قیصر سے ہے ہر قوم گراں بار
احساں مگر اسلام پہ اس کے ہیں گراں تر

معلوم ہے جو موروں پہ اسپین میں گزری
جس وقت ازابیلا ہوئی واں صاحب افسر

حالت وہی اس ملک میں پہنچی تھی ہماری
گڑتا نہ اگر اس کا نشاں ہند میں آ کر

اب ہند میں کشمیر سے تا راس کماری
ہر قوم کے ہیں پیر وجواں متفق اس پر

اُمید نہیں ہند کے راحت طلبوں کو
راحت کی کسی سایے میں جز سایہ قیصر

io

گر برکتیں اس عہد کی سب کیجیے تحریر
کافی ہے نہ وقت اس کے لیے اور نہ دفتر

ہے اب یہ دعا حق سے کہ آفاق میں جب تک
آزادی و انصاف حکومت کے ہیں جوہر

قیصر کے گھرانے پہ رہے سایہ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایہ قیصر

6 قصیدہ

تہنیت عید الفطر

بہ حضور نواب سر آسمان جاہ مدار المہام سرکار عالی

(1306ھ مطابق 1889ء)

مہ صیام گیا اور روزِ عید آیا
خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا

کیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے
کہ اپنے صبر کا انعام ہم نے بھر پایا

رہین منت ساقی ہیں بادہ خوار تمام
کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا

گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش
کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا

شگفتہ آتے ہیں اس طرح عید گاہ سے لوگ
کہ گنج انہوں نے ہے گویا خرابے میں پایا

حسین چاؤ میں پھولے نہیں سماتے آج
کہ دن خدا نے نمائش کا ان کو دکھلایا

عزیز و دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم
خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا

حکیم ہیں متفکر نہ زاہد افسردہ
خوشی نے دی ہے زمانے کی کچھ پلٹ کایا

غنی ہیں شال میں مست اور گدا ہیں کھال میں مست

ہے ایک خوان سے منعم نے سب کو چکھوایا

ادھر ہے فصلِ بہار اور ادھر ہے عید الفطر
سماں نشاط کا ہے شہر و دشت پر چھایا

کھلے ہیں اس کے عوض دشت میں کروڑوں پھول
جو غم سے شہر میں آج ایک دل ہے کمہلایا

ہزاروں سرو خراماں ہیں شہر میں ہر سو
جو دشت میں کوئی پودا ہے آج مرجھایا

اگر خوشی کا زمانے کی ہے یہی عالم
تو سمجھو غم کا عوض غم زدوں نے بھر پایا

مگر یہ عاریتی انبساط ہے سب ہیچ
اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اترایا

فریفتہ ہوئے جو ایسی ایسی خوشیوں پر
انہوں نے آب کا دھوکا سراب پر کھایا

خوشی ہے جس سے عبارت وہ ہے خوشی اُن کی
جنہوں نے خلق میں ذکرِ جمیل پھیلایا

جنہوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما
جنہوں نے علم کا بجھتا چراغ اکسایا

جنہوں نے ملک کے امراض کو کیا تشخیص
جنہوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرمایا

جنہوں نے خلق سے اپنا بنایا غیروں کو
جنہوں نے لطف سے وحشی دلوں کو پرچایا

خبر مریضوں کی لی، جاہلوں کو دی تعلیم

کھلایا بھوکوں کو، بے پوششوں کو پہنایا

ہوا زمین پہ جس سال آسماں ممسک
مینہ اپنی داد و دہش کا انہوں نے برسایا

ہوائے دہر اگر ہو گئی کبھی فاسد
فضائے دہر کو خُلقِ حَسن سے مہکایا

سدا غریبوں کی امداد پر ہیں جو تیار
لیا سنبھال اسے جس نے ہاتھ پکڑایا

ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا
نہ مانگ سکتے تھے جو اُن کے گھر پہ پہنچایا

نہ سمجھا آپ کو اک پاسبان سے بڑھ کر
انہوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا

نہ پائی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے
ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

وغا میں شیر مگر وقت رحم مورِ ضعیف
کسی کی آہ سنی اور دل بھر آیا

وہ سمجھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج
جو شاہراہ میں پتا کسی نے کھڑکایا

وہ چونک اٹھے کہ گویا قیامت آ پہنچی
جو در پہ آ کے کوئی داد خواہ چلّایا

نشاط و عشرت جاوید کی ہے ان کو نوید
دل ایسا جن کو عنایت خدا نے فرمایا

سنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سلف
سو آنکھ سے وہ وزیرِ دکن نے دکھلایا

بشیر دولت و دیں، صدر اعظم امرا
نہیں ہے جس کا کوئی قرب شہ میں ہم پایا

جو ظل حق ہے رعیت کے سر پہ شاہ دکن
تو اعظم الامرا ظل حق کا ہے سایا

ہمیشہ جس کو ہے بہبود ملک مدِ نظر
رفاہ و امن ممالک میں جس نے پھیلایا

اٹھایا فتنے نے جب سر فرو کیا اس کو
پڑا عمل میں جہاں عقدہ اس کو سلجھایا

بنائے نظم و نسق جس نے رکھی شوریٰ پر
مشیر کار خرد پروروں کو ٹھہرایا

دکن کو جس نے کیا مرجع خواص و عوام
دکن کا جس نے کہ ڈنکا جہاں میں بجوایا

نہ کوئی ملک میں سرکش رہا نہ نافرماں
جفا و ظلم کو توڑا غرور کو ڈھایا

بل انتظام کے رشتے میں پڑ رہے تھے بہت
سو تکلے کی طرح اک ایک بل نکلوایا

لگا گئے تھے وزیران رفتہ جو پودا
وہ صاحبی میں وزیر زماں کی پھل لایا

ترقی اب یہ تمدن میں کی ہے بلدے اس نے
کہ اپنی حالت پیشیں سے خود ہے شرمایا

زمان حال سے ماضی کو دیجے کیا نسبت
اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا

خدا دراز کرے عمر اعظم الامراء
دکن کو جس کی حکومت نے دن یہ دکھلایا

زمیں پہ سایہ فگن جب تک آسمان رہے
رہے دکن پہ حضور نظام کا سایا

تھی کوئی چیز نہ حالی کے پاس لائق نذر
سو یہ چگامہ ناچیز پیش کش لایا

یہی بس اس کے لیے ہو گا مایہ نازش
جو اعظم الامراء نے قبول فرمایا

7 قصیدہ [۲]

در شکر و سپاس نظام دکن و اعیان سلطنت

(1309ھ مطابق 1891ء)

اے صفر کی دوسری روز دوشنبہ مرحبا
ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ تیری صبح جاں فزا

ہم نے رکھا آ کے جب بلدے[۱] کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا

عزت قومی ترستی تھیں سدا آنکھیں جسے
اس کے کچھ آثار دیکھے ہم نے یاں شکر خدا

کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھے اک مدت سے ہم

---

[۱] بلدہ: شہر، مراد حیدر آباد دکن

[۲] یہ قصیدہ ماہ ستمبر 1891ء مطابق صفر 1309ھ میں بمقام حیدر آباد دکن جب کہ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر مع اکثر رفقا کے جن میں سے ایک راقم بھی تھا، بطور ڈیپوٹیشن کے محمڈن کالج علی گڑھ کی طرف سے حضور سرکار نظام میں حاضر ہوئے تھے، ایک جلسہ عام میں پڑھا گیا تھا جس کے صدر انجمن جناب نواب وقار الامرا بہادر تھے۔ (حالی)

315

آ کے بلدے کے سوانے اے میں لگا اس کا پتا

بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے
جھولیاں ڈالے گلے میں در بہ در دیتے صدا

پہنچے لینے ان کو وہ اعیان دارالملک سے
دولت عالی کو جن کی ذات پر ہے اتِکا

قوم کو ہے جن پہ فخر اور ملک کو ہے جن پہ ناز
سلطنت کے جو ہیں اعضا اور وزارت کے قویٰ

صدر اعظم نے ہمیں بخشا اقامت کے لیے
وہ سرابستاں خجل ہو جس سے جنت کی فضا

ہم غریبوں کو سمجھ کر اک سفارت قوم کی
دی وہ عزت شکر جس کا ہو نہیں سکتا ادا

پیشتر مہماں نوازی کا فقط سنتے تھے نام
آ کے یاں سمجھے کہ ہے مہماں نوازی چیز کیا

کی ہے نواب اقتدار الملک نے جو مرحمت
اس نے کلفت کو سفر کی دل سے بالکل دھو دیا

یہ مقولہ ہند میں مدت سے ہے ضرب المثل
جو کہ جا پہنچا دکن میں بس وہیں کا ہو رہا

ہے دکن کی وہ یہی شاید مسافر پروری
جو دکن میں آ کے دیتی ہے وطن دل سے بھلا

اے حد، کنارہ، منڈیر

وارث ملک دکن ہے آج وہ محبوب خلق
نام پر دیتا ہے جس کے جان ہر چھوٹا بڑا

ہم کہ ہیں وکٹوریا کے عہد رافت میں پلے
امن و آزادی کی ہم نے کھائی ہے برسوں ہوا

جانتے ہیں ہم کہ پلتی ہے رعیت کس طرح
کس طرح ہوتے ہیں مقبول جہاں فرماں روا

کرتے ہیں کس منتر اور افسوں سے تسخیر قلوب
کس طرح بوتے ہیں دل میں خلق کے تخمِ وفا

کر لیا محکوم کے دل میں اگر حاکم نے گھر
تو یہ سمجھو حق حکومت کا کیا اس نے ادا

ہے یہی شاہ دکن کی گلہ بانی کی دلیل
گلہ اپنے گلہ باں پر جان و دل سے ہے فدا

پوچھنے گچھنے کی اہل ملک سے حاجت نہیں
ان کی خوش حالی پہ ان کی تازہ روئی ہے گوا

دیکھتے آئے تھے جیسے راہ میں ہم سبزہ زار
خَلق کو سرسبز دیکھا آ کے یاں ان سے سوا

راہ میں دیکھے تھے ہم نے کوہ اگر گردوں شکوہ
آ کے دار الملک میں دیکھے محل گردوں نما [1]

عاملوں کی سخت گیری سے ہیں سب آزاد یاں
بے نوا سے منعم اور منعم سے بڑھ کر بے نوا

---

[1] یہ اشارہ ہے اس محل کی طرف جو کہ نواب وقار الامرا نے بلدۂ حیدر آباد کے باہر جانب جنوب پہاڑ پر زرِ خطیر صرف کر کے اپنے رہنے کے لیے بنوایا ہے اور اس کا نام فلک نما رکھا ہے۔ (حالی)

اغنیا میں ہم وہ استغنا نہیں پاتے کہیں
جیسا بے پروا نظر آتا ہے یاں اک اک گدا

جتنی یاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول
بے تعصب، بے تکلف، بے تصنع، بے ریا

ایک کے تہوار میں بے عذر ہیں سارے شریک
ایک کی تقریب میں ہمدم ہیں سب اور ہم نوا

دولت عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیے
ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یاں دوسرا

پارسی، ہندو، مسلماں یا مسیحی کوئی ہو
ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

ہم کو یاں کہنا تھا کچھ اور کہہ گئے بھولے سے کچھ
رہ گزر کی سیر نے منزل سے غافل کر دیا

قصہ کوتہ بار جب ہم کو ملا دربار میں
کہہ نہیں سکتے کہ بیداری تھی وہ یا خواب تھا

دیکھ کر اپنی رسائی تخت آصف جاہ تک
واقعہ مور اور سلیماں کا ہمیں یاد آ گیا

حضرت والا نے جس شفقت سے کیں نذریں قبول
اس پہ گر جاں اپنی ہم قرباں کریں تو ہے بجا

جس توجہ سے سنی روداد قومی درس گاہ
شکر سے اس کے نہیں ہو سکتے ہم عہدہ برآ

جب سے کالج کی علی گڑھ میں بنا ڈالی گئی
دولتِ عالی مدد کرتی رہی اس کی سدا

جو لگایا تھا درخت اس کی ہمیشہ لی خبر
دم بہ دم پانی دیا یاں تک کہ بار آور ہوا

اب کہ وقت آ کر پڑا تھا بانی کالج پہ سخت
دولت عالی نے شرط دست گیری کی ادا

مشکلیں جس طرح کی تھیں قوم کی اول بجل
کی اسی دریا دلی سے ان کی پھر حاجت روا

خود علی گڑھ کالج اور اس کے در و دیوار سب
راگ گائیں گے سدا احسان آصف جاہ کا

ہند میں باقی ہیں نسلیں جب تلک اسلام کی
جیتے جی ہوں گی نہ اس کے طوقِ منت سے رہا

کی ہے سرسید نے جو کوشش فلاحِ قوم میں
اس کو ہے اے اہلِ مجلس اک زمانہ جانتا

پر یہ سرسید سے بیڑا پار ہونا تھا محال
دولتِ عالی اگر بنتی نہ اس کی ناخدا

تھا پڑا سیّد کا سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز
دولتِ عالی نے اس خشکی میں دی گنگا بہا

ہے روایت جب کہ ہجرت کر کے ختم المرسلیں
پہنچے یثرب میں تو یہ ارشاد یاروں سے کیا

''جس طرح ہوتی ہے بانبی سانپ کی جائے پناہ
ہو گا ملجا اب مدینہ بھی یونہی اسلام کا''

ہے بلا تشبیہ دارالملک آصف جاہ بھی
ہند میں اب مرکزِ اسلام بے رو و ریا

ذی لیاقت جتنے تھے ہندوستاں میں انتخاب
دولتِ عالی نے چن چن کر لیا سب کو بلا

تربتیں اور خانقاہیں، مدرسے اور مسجدیں
سب کی ہوتی ہے مدد اس گھر سے بے چون و چرا

حج بیت اللہ سے جو ہر مسلماں پر ہے فرض
ہے دکن آنا مقدم شک نہیں اس میں ذرا

اول آنا چاہیے یاں استطاعت کے لیے
کیوں کہ ہے بے استطاعت حج کو جانا ناروا

خرچ سے ہاتھ اک مسلماں کا ہو گر اتر میں تنگ
ہے دکن کی سمت وہ گردن اٹھا کر دیکھتا

خواب آتے ہیں دکن کے اس کو سوتے میں نظر
قوم کا بچہ مڈل سے جب ذرا آگے بڑھا

ہند میں کرتے ہیں کوشش جو رفاہِ خلق میں
اور مدد کو جن کی واں حاضر ہے ہر چھوٹا بڑا

چلتے چلتے ان کی گاڑی بھی اٹک جاتی ہے جب
کھینچنے کو اس کے جاتا ہے یہیں سے بینڈیا[1]

ہے دکن کی اور مسلمانوں کی یارو وہ مثال
اک سمندر ہے کہ ہر سو جس میں ہے طوفاں بپا

تھا جہاز اک اس میں معمور اہلِ فضل و جاہ سے
لطمہ امواج نے پرزے دیے اس کے اُڑا

ڈوبنے والے تھے جو وہ ڈوب کر اُچھلے نہ پھر
بچ رہے ہیں جو وہ ہر سو مارتے ہیں دست و پا

کوئی کشتی یا جہاز آتا نہیں ان کو نظر
اس محیطِ بے کراں میں ایک زورق کے سوا

ہے وہ زورق فی المثل سرکار آصف جاہ کی
ہے مسلمانوں کو اب لے دے کے جس کا آسرا

[1] جب گاڑی یا چھکڑا دو بیلوں سے نہیں کھنچ سکتا تو بیلوں کی جوڑی کے آگے تیسرا بیل لگا دیتے ہیں، اس کو بینڈیا کہتے ہیں۔ (حالی)

ہے دعا جس وقت تک پانی سمندر میں رہے
یا رب اس زورق کو تو موجِ حوادث سے بچا

ختم کر حالی سپاس صدر اعظم پر سخن
بال بال اپنا ہے جس کے شکر میں جکڑا ہوا

تقویت سے جس کی ہر مشکل ہماری حل ہوئی
انجمن کے منعقد ہونے کی دی جس نے رضا

پھر ادا کر جان و دل سے شکر صدر انجمن
جس کے قدموں میں یہ زیبا ہے کہ دیں آنکھیں بچھا

جس نے قومی انجمن میں بن کے صدر انجمن
قوم کو دی عزت اور ان کی امیدیں دیں بڑھا

لے کے اذن صدر مجلس کیجے پھر قصدِ وطن
ورنہ ہے حالی دکن کی دل فریب آب و ہوا

باندھ لیجے جلد اب رخت سفر، ڈر ہے کہ ساتھ
قافلے سے چھوٹ نہ جائے قافلہ سالار کا

8 قصیدہ

درتہنیت حضور نظام دکن [1] (دسمبر 1905ء)

زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے شادمانی کا
فلک پیری میں دم بھرتا ہے ان روزوں جوانی کا

نظر آتی ہے بے جام و سبو سب خلق متوالی
ہوا میں نشہ ہے گویا شراب ارغوانی کا

نشاط انگیز ہیں ایام دے، خورداد سے بڑھ کر
نہیں چلتا جہاں میں زور کچھ بادِ خزانی کا

[1] یہ قصیدہ 1323ھ (مطابق دسمبر 1905ء) میں آصف جاہ سادس، نواب میر محبوب علی خاں بہادر، والی حیدر آباد کے جشن سال گرہ چہل سالہ کے موقع پر لکھا گیا۔ (بحوالہ جواہرات حالی، صفحہ 98)

نہ لے یاں رنج و غم کا بھول کر نام ان دنوں کوئی

315

کہ قبضہ ہے دکن پر آج عیش و کامرانی کا

بہارِ جشن آصف جاہ سے گلزار ہے عالم
کرے کون انتظار اب فصل گل کی گل فشانی کا

خراماں ہیں ہزاروں سرو قامت شہر و صحرا میں
جچے گا رنگ کیوں کر آج سروِ بوستانی کا

معطر ہے جہاں مشک و عبیر بزم شاہی سے
بھرے بادِ بہاری دم نہ اب عنبر فشانی کا

الاپیں مطربوں کی جب سنیں چپ لگ گئی سب کو
بہت دعویٰ تھا مرغانِ چمن کو خوش بیانی کا

نئی دنیا ہے یا یہ کینچلی بدلی ہے دنیا نے
کوئی یاں آن کر دیکھے سنگار اس زال فانی کا

یہ ہے اس تاجور کی جوبلی کا جشن چہل سالہ
کہ جو ہے ملک میں ملجیٰ اقاصی و ادانی کا

دعائے طولِ عمر شہ پہ ہاتھ اٹھیں نہ کیوں لاکھوں
کہ ذات اس کی نمونہ ہے خدا کی مہربانی کا

رعیت شاد، ملک آباد اور آزاد ہر ملت
ادا حق کر دیا شاہِ دکن نے حکمرانی کا

وہ رہتے ہیں سدا زندہ جو محبوبِ خلائق ہیں
نظام الملک کو مژدہ حیاتِ جاودانی کا

کھلا اس کی رعیت پروری اور ملک داری سے
جہاں بانی حقیقت میں ہے نام اک گلہ بانی کا

گدا صبر و شکیبائی پہ اپنی پھر نہ ہو نازاں

کرے اندازہ گر شاہوں کے افکار نہانی کا

اُسے ہے فکر بس اپنے لیے نانِ شبینہ کی
مگر یاں سوچ اک عالم کی ہے راحت رسانی کا

کہاں آگاہ ہو گر حکمرانی کے فرائض سے
نہ بدلے حکمرانی سے تردد قلبہ رانی کا

ہر اک مذہب، ہر اک ملت سے ہے یکساں سلوک اس کا
کوئی گر سیکھ لے اس سے جہاں کی پاس بانی کا

تعصب، اجنبیت، اختلاف مذہب وملت
نہیں کوئی مزاحم اس کے دریا کی روانی کا

جہاں ہے مستحق کوئی وہ ہے روزینہ خوار اس کا
دکن سے ہند تک چرچا ہے اس کی حق رسانی کا

توکل اور قناعت کے بھی دروازے کھلیں شاید
بہت پھیلا ہوا ہے خوان اس کی میزبانی کا

رہے گا ملک میں باقی نہ ہرگز بے ہنر کوئی
یہی انداز ہے یاں گر ہنر کی قدر دانی کا

بنا ہے بلدہ خود دارالشفاء اس عہد فرخ میں
یہ اک شمہ ہے آصف جاہ کی راحت رسانی کا

نہیں آصف کو جاں اور مال سے ہرگز دریغ اس میں
خلاصہ ہے یہ خود حضرت کے ارشاد زبانی کا

گئے وہ دن کہ تھے حملے وبا کے شہر پر پیہم
پڑا تھا خلق کا جوکھوں میں بیڑا زندگانی کا

نہ بنتا تھا غذا سے خون صالح جسم انساں میں

جوانوں میں نشاں پایا نہ جاتا تھا جوانی کا

ہوا ہے معتدل اب یاں، تو صحت بخش ہے پانی
مٹا نام و نشاں امراض وضعف و ناتوانی کا

پیے شہر و سواد شہر کا وہ آن کر پانی
جسے چکھنا ہو دنیا میں مزا کوثر کے پانی کا

تمنا دیکھنے کی ہو جسے فردوس اوّل کے
سماں دیکھے دکن میں آ کے اس فردوس ثانی کا

ہوئے ہیں جس قدر ابواب خیر اس عہد میں جاری
کریں اُن کو بیاں کیا منہ ہے الفاظ و معانی کا

خزانے کا دیا منہ کھول شہ نے اہلِ حاجت پر
رعیت کو ہوا جب سامنا قحط و گرانی کا

یتیموں کے لیے دارالیتامیٰ کی بنا ڈالی
رہے گا تا قیامت نام زندہ جس سے بانی کا

شفا خانے ہوئے اور درس گاہیں ملک میں قائم
ہوا بے باق جو حق تھا ہر اک قاصی و دانی کا

وہ کالج جس نے مردہ قوم میں پھر جان ڈالی ہے
اسی منبع سے جاری ہے وہ چشمہ زندگانی کا

وگرنہ قوم میں تعلیم کا ایسا ہی تھا توڑا
کہ ہو گرمی کی شدت میں تراقا جیسے پانی کا

علی گڑھ میں رہے گا بن کے دارالعلم یہ کالج[1]
یہی عالم ہے گر بذل و عطائے خسروانی کا

---

[1] جواہرات حالی (صفحہ 100) میں یہ مصرع یوں درج ہے: ''علی گڑھ میں رہے بن کے دارالعلوم یہ کالج۔''

یہ اک دریافت سمجھی جائے گی دنیا میں لاثانی

پتا گر مل گیا داد و دہش میں اس کے ثانی کا
نہیں ہے کوئی کام اس کا رفاہ خلق سے خالی
اب آگے کام جاں بخشی کا ہو یا جاں ستانی کا
غرض اس سے بنی آدم کی جانوں کی حفاظت ہے
اگر شوقِ شکار اس کو ہے شیر نیستانی کا
جو ہوتی اس کو فرصت صید دل ہائے خلائق سے
تو ڈر رہتا درندوں کی نہ پھر ایذا رسانی کا
ہے اُس کی قادر اندازی کا شہرہ ایک عالم میں
جسے تاکا کبھی مانگا نہ قطرہ اس نے پانی کا
دعا پر مدحت شہ ختم کرتا ہے بس اب حالی
نہیں ممکن کہ ہو اس سے ادا حق مدح خوانی کا
خدا کی مہربانی کا رہے طالب جہاں جب تک
ہو سایہ شاہ و شہزادہ پہ اس کی مہربانی کا
رہے آباد یہ گھر یا الٰہی رہتی دنیا تک
کہ مرجع ہے یہ اک عالم کے آمال و امانی کا
ہر اک منزل میں شہہ کا ساتھ دے تائید ربانی
رہے مفتوح در ہر دم فتوح آسمانی کا
ہزاروں جشن سالانہ ہوں بعد اس جشن کے یارب
کبھی ٹوٹے نہ ہرگز سلسلہ اس شادمانی کا
نظام الملک، آصف جاہ سادس، آصف ثانی
رہے مالک سدا دیہیم و تخت خسروانی کا

io

بابِ ششم

منظومات مدحیہ سپاسیہ اور داعیہ

(اُردو)

(ب)......منظومات مدحیہ سپاسیہ اور داعیہ اُردو

1 مبارک باد [1]

(1875ء)

مژدہ کہ وقف جہاں گنج سعادت ہے آج
فتنہ ایام سے سب کو فراغت ہے آج

آج کی ایک اک گھڑی سارے برس کا ہے مول
ملک کی مخدومہ کا روز ولادت ہے آج

پودا لگاؤ گے جو ہووے گا وہ بارور
مینہ کی طرح ہر طرف بارش برکت ہے آج

ہوویں گے جو کام آج پھولیں پھلیں گے سدا
سینوں میں کچھ خود بہ خود جوش مسرت ہے آج

قوم کے ہمدرد سب آئے ہیں کس جوش سے
کیسی تمنا بھری گرمیِ صحبت ہے آج

دولت جاوید کی پڑتی ہے بنیاد یاں [2]
قوم کی بے طالعی ہند سے رخصت ہے آج

مدرسہ علم و دیں کرتے ہیں قائم ثقات
مزرعہ قوم پر بارش رحمت ہے آج

---

[1] 24 مئی 1875ء کو ملکہ وکٹوریا کی سال گرہ کا دن تھا۔ اُسی دن مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے افتتاح کی تقریب بھی منعقد ہوئی۔ مولانا حالی نے یہ نظم اسی موقع پر سرسید کی خدمت میں بھیجی تھی۔ بہ قول ڈاکٹر غلام مصطفی خاں ''حالی کی قومی شاعری کی بنیاد اسی نظم سے پڑتی ہے۔'' (حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ 46)

[2] کلیات حالی جلد اوّل (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی) میں ''یاں'' کی جگہ ''یہاں'' درج ہے۔

رہیو مبارک سدا ساعت مسعودیہ

315

برسوں میں ہوتی [1] وصول یاروں کی محنت ہے
آج

دولت برطانیہ روز فزوں ہو جیو
قوم کو یہ دن نصیب جس کی بدولت ہے آج

قوم کے بدخواہ سب مل کے پڑھیں فاتحہ
نکبت و ادبار کی ملک سے رخصت ہے آج

2 مژدہ قدوم حضور شاہزادہ ویلز در ہند [2]

(1875-76ء)

مژدہ ہو اہلِ مشرق اب دن پھرے تمہارے
مغرب سے سوے مشرق آیا ہے مہرِ تاباں

گلّے کی اپنے لینے آیا خبر کہاں سے
ہے ایسے گلہ باں پر گلّے کی جان قرباں

ہندوستاں بھی تجھ سے کچھ آج کل نہیں کم
اے معدنِ بزرگی، اے خاکِ انگلستان

تیرے نصیب کا تو کیا پوچھنا ہے لیکن
ہندی بھی ان دنوں ہیں قسمت پہ اپنی نازاں

مہماں ہے آج اُن کا اس شاہ کا ولی عہد
روے زمیں کے سلطاں جس کے ہوئے ہیں مہماں

---

[1] کلیاتِ حالی جلد اول میں ''ہوئی وصول'' چھپا ہے۔ یہ نظم کسی اور مجموعے میں شامل نہیں۔ قیاس سے 'ہوئی' کی جگہ 'ہوتی' لکھا گیا۔ ''ہوئی'' کو ''ہوتی'' (فاعل) کے وزن پر پڑھنا ہرگز روا نہیں۔ (مرتب)

[2] 'شہزادہ ویلز' سے مراد ملکہ وکٹوریا کے ولی عہد اور جانشین، ایڈورڈ ہفتم ہیں جنہوں نے 1875-76ء کے موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ بحوالہ: King Edward VII by Sir Sydney Lee, Page:

3 شکریہ تشریف آوری سر چارلس اپچی سن ا

(1882ء)

حضور تشریف جب کہ لائیں
تو کیوں نہ آنکھوں کو ہم بچھائیں
خوشی کے کیوں کر نہ گیت گائیں
بدن میں پھولے نہ ہم سمائیں
کہاں یہ قسمت کہ آپ آئیں
ہماری یوں آبرو بڑھائیں

حضور نے کی جو یہ عنایت
کہ آ کے دی مدرسے کو عزت
گھٹی نہ کچھ اس سے شان حضرت
مگر بڑھا دی ہماری وقعت
کہاں یہ قسمت کہ آپ آئیں
ہماری یوں آبرو بڑھائیں

یہ دھوم سنتے تھے ہم برابر
کہ آپ تعلیم کے ہیں یاور
سو آ گیا آج ہم کو باور
کرم کیا آپ نے جو آ کر
کہاں یہ قسمت کہ آپ آئیں
ہماری یوں آبرو بڑھائیں

ا یہ نظم 1882ء میں سر چارلس اپچی سن، لفٹنٹ گورنر پنجاب کی تشریف آوری کے موقع پر اینگلو عربک سکول دہلی کے بچوں کے لیے لکھی گئی۔ جن بچوں نے نظم پڑھی اُن میں خواجہ غلام الحسنین (نبیرہ مولانا حالی) بھی تھے۔ شیخ محمد

اسماعیل صاحب نے خواجہ صاحب کی زبانی یہ چند بند 'جواہرات حالی' میں نقل کیے ہیں۔ (بحوالہ جواہرات حالی صفحہ: 101)

حضور پُرنور سر آنچیسن
ہوئے ہیں یاں جب سے سایہ افگن

یہ آ رہا شہر پر ہے جوبن
بنی ہے دِلّی تمام گلشن

کہاں یہ قسمت کہ آپ آئیں
ہماری یوں آبرو بڑھائیں

4 قطعہ ا ـ

بہ جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکارِ عالی نظام دکن

(1305ھ مطابق 1888ء)

آسماں جاہ کی خدمت میں یہ حالی کی ہے عرض
کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں

شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے
اس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرماں

نہ ہوئی مجھ سے کوئی خدمت سرکار نظام
نہ کیا میں نے کبھی طوف در صدر زماں

نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لائق قدر
اور نہ ایسا کوئی جوہر جو ہو قیمت میں گراں

حق نہ تھا دولت عالی پہ کوئی حالی کا
جس کے جلدو اسے میں وہ اس لطف کا ہوتا شایاں

ہاں مگر ذات میں ہے فیض رسانی جن کی
ڈھونڈھ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں

ا۔ نواب سر آسمان جاہ کی کوشش سے 1888ء میں ریاست حیدر آباد کی طرف سے مولانا حالی کا ماہانہ وظیفہ مقرر ہوگیا۔ یہ قطعہ سپاسیہ اسی موقع پر نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ (1 ص)

ہیں مربی ہنر و بے ہنری کے، جس طرح
خار و گل دونوں کو کرتا ہے نہال آبِ رواں

آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکر گزار
ملک میں اس کا ثنا خواں ہے ہر اک پیر و جواں

یاں وہ ان کھیتیوں کو دے کے گیا ہے پانی
آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگراں

قوم اس وقت ہے تعلیم کی جتنی محتاج
ہے وہ عالم پہ ہویدا، نہیں محتاجِ بیاں

عزت، آسودگی اور مذہب و ملت ان کا
ہو نہ تعلیم تو ہیں سب کوئی دن کے مہماں

پھر نہ قدر ان کی کچھ آنکھوں میں خلائق کی بلند
اور نہ وزن ان کا ترازو میں حکومت کی گراں

آسماں جاہ پہ برکت ہو خدا کی جس نے
درد کا جان لیا ان کے کہ یہ ہے درماں

مدرسے قوم کے اس ملک میں جو ہیں ممتاز
جن میں کچھ کچھ نظر آتے ہیں ترقی کے نشاں

ان کی امداد سے نواب نے کی ہے قائم
چشمِ عالم میں مسیحائی پہ اپنی بُرہاں

کرتے ہیں زندہ جاوید بنی نوع کو، جو
بذل کرتے ہیں پے تربیتِ اہلِ زماں
ہے مدارس کی اعانت وہ نکوئی جس کا
ملک پر قوم پہ تا دیر رہے گا احساں
یہی بخشش ہے یہی جود ہے راس الحسنات
جس پہ موقوف ہے بہبودیِ نسلِ انساں
یہی امداد ہے جس سے ہوئیں قومیں سرسبز
یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملک آباداں
یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس سے ضعیف
یہی حکمت ہے کہ ہوتے ہیں سبک جس سے گراں
دی لگا ایک نے پانی کی سرِ راہ سبیل
کی ہمیشہ کے لیے ایک نے واں نہر رواں
اُس کی خواہش تھی کہ ہوتے رہیں پیاسے سیراب
اس نے چاہا کہ رہے پیاس کا باقی نہ نشاں
برکتیں علم کی جو ملک میں پھیلاتے ہیں
نہر جاری سے ہے ذات اُن کی سوا فیض رساں
بخت اس ملک کے جس ملک میں ایسا ہو وزیر
حامی علم و خریدار کمالِ انساں
اب خدا سے یہ دعا ہے کہ جہاں میں جب تک
شکر احسان کا کرتے رہیں بعد از احساں
آسماں جاہ سے ہو تقویت ملک دکن

315

اور رہے ملک دکن ملجا و ماوائے جہاں

دولت قیصری و دولت آصف جاہی
ایک کی ایک زمانے میں رہے پشتی باں

5 شکریہ حضور لیفٹیننٹ گورنر بہادر ا۔

(ازطرف طلبائے اینگلو عربک سکول دہلی)

(1889ء)

نہیں قلم اور زباں میں طاقت
کہ ہو بیاں آج کی مسرت
کہاں یہ اس مدرسے کی قسمت
کہ لائیں تشریف خود بدولت

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

کریں ادا شکر اس کا ہم کیا
کہ قیمتی وقت کھو کے اپنا
ہماری حالت کو تم نے دیکھا
تمھی کو فرماں دہی ہے زیبا

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

کرم ہو کیا اور اس سے بڑھ کر
کہ جو ہو پنجاب کا گورنر
وہ ایک ناچیز مدرسے پر
ہو لطف سے آ کے سایہ گستر

315

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

ا۔ دسمبر 1889ء میں سر جیمس لائل لفٹنٹ گورنر پنجاب کی تشریف آوری پر یہ نظم، حسب فرمائش ہیڈ ماسٹر صاحب اینگلو عربک سکول دہلی، طلبہ کے لیے لکھی گئی۔ (بحوالہ جواہرات، صفحہ:22)

تھے آسرے جتنے اور سہارے
بھلا دیے ہم نے دل سے سارے
بس اب سہارے ہو تم ہمارے
پڑے ہیں سایے میں ہم تمہارے

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

ہوئی ہے تعلیم جب سے جاری
پھری رہی اُس سے مت ہماری
اب آئی ہے یاں ہماری باری
نظر بس اب چاہیے تمہاری

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

ہے جب سے لائل نے سایہ ڈالا
ہوا ہے پنجاب میں اُجالا
وہ عدل والا وہ رحم والا
رہے سدا بول اس کا بالا

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

ہمیشہ جب تک کہ علم و حکمت
جہاں میں کرتے رہیں حکومت

حضور قیصر کا ظلِ رافت
ہمارے سر پر رہے سلامت
کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی رحمت

6 قطعہ

درتہنیت ولادت فرزند ارجمند
درشبستان اقبال جناب نواب سرآسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی
(1308ھ مطابق 91-1890ء)

فیض رب ذوالمنن سے مژدہ اے اہل دکن
نائب دولت کا نخل آرزو لایا ثمر
دی بشیر دولت و دیں کو وہ چیز اللہ نے
جس سے پایا دیدہ یعقوب نے نورِ بصر
جس کو پیری کا عصا سمجھا خلیل اللہ نے
حق نے دی جس کے عطا ہونے کی سارا کو خبر
جس کے ملنے سے ہوا داؤد ممنون قضا
جس کے پانے سے ہوا ایوب مرہون قدر
جس کے بدلے میں علی الرغم شماتت پیشگان
حق سے ختم الانبیاء نے پائے شبیر و شبر
جو بضاعت ہے گدا کی اور دولت شاہ کی
جو ہے حاصل عمر کا اور زندگانی کا ثمر
جس سے مستغنی ولی ہیں اور نہ عارف بے نیاز
جس سے ہیں اجداد زندہ اور اماجد نامور
صدر اعظم کو دیا صد شکر خالق نے خلف

315

خلق کی آخر دعاؤں کا ہوا ظاہر اثر

یہ پسر یا رب بحق عترت خیر الوریٰ
پائے عمر خضر زیر سایہ مہر پدر

صدر اعظم کی طرح دربار آصف جاہ میں
جایگاہ قرب سلطانی ہو اس کا مستقر

دولت وثروت کو اس کی ذات سے لگ جائے شان
زیور علم و ادب سے ہو محلی اس قدر

سیرت و عادت میں اس کی نکلے آن اجداد کی
جوہر اخلاق فاروقی [1] ہوں اس میں جلوہ گر

ملک آصف جاہ میں سر آسماں جاہ اور وہ
رات دن رکھیں اُجالا صورت شمس و قمر

7 قطعہ در شکر و معذرت [2]

(حیدرآباد 1309ھ مطابق 1891ء)

یاں بلا کر دی ہے جو عزت ہمیں سرکار نے
اول اس کا شکر کرتے ہیں ادا اور بعد ازیں

خدمت والا میں ہیں اک عرض کرنی چاہتے
عرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں

شاعری جس کو سمجھتے ہیں کمال ابنائے دھر
جو لیاقت اس میں ہے درکار وہ ہم میں نہیں

شکر کرنا تھا ہمیں سرکار عالی کا ضرور
چند نظمیں انجمن میں اس لیے ہم نے پڑھیں

---

[1] اس میں یہ اشارہ ہے کہ نواب سر آسماں جاہ بہادر حضرت عمر فاروق b کی اولاد میں سے ہیں۔ (حالی)

۲؎ 1309ھ میں جو راقم اور مولانا محمد شبلی نعمانی اور دیگر بزرگان قوم آنریبل سر سید احمد خان بہادر کے ہمراہ علی گڑھ محمڈن کالج کی طرف سے بطور ڈیپوٹیشن کے حیدرآباد دکن میں بحضور سرکار عالی نظام حاضر ہوئے تھے، اس موقع پر ایک عام جلسہ بصدارت نواب وقار الامرا بہادر بشیر باغ میں منعقد ہوا تھا جس میں راقم نے اور مولانا محمد شبلی اور بعض اور صاحبوں نے کچھ نظمیں سرکار عالی کے شکریے میں پڑھی تھیں۔ جلسے کے بعد جناب صدر انجمن نے مجھ کو اور مولانا محمد شبلی کو خاص طور پر ہماری نظمیں دوبارہ سننے کے لیے دولت خانے پر طلب فرمایا تھا۔ وہاں اپنی نظم پڑھنے سے پہلے یہ قطعہ جو اس وقت موزوں کیا گیا تھا راقم نے پڑھا تھا۔ (حالی)

گرچہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں

بہت

اور جگہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں

رہ گیا پر ہم سے اس کوشش میں باقی اک قصور

درگزر فرمائیں گے سرکار اس سے، ہے یقیں

اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں مگر

جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں

8 قطعہ ۱؎

در شکریہ اضافہ وظیفہ بہ پیش گاہ جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر

(حیدرآباد 1309ھ مطابق 1891ء)

اے بشیر دولت و دیں نائب شاہ دکن

اے مہمات دکن کا ذات پر تیری مدار

مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے

شکر اس کا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار

جو کہ ہوتے ہیں جہاں میں بہرہ ور مقصود سے

پہلے ہو لیتے ہیں صدہا مشکلوں سے وہ دو چار

کوئی دنیا میں نہیں ہوتی بغیر اس کے فتوح

ہے اسی پر کامیابی کا زمانے کی مدار

پر ملا مقصود جب حالی کو اس در سے، ملا
بے تردد، بے تذلل، بے طلب، بے انتظار

قدر دانی گر زمانے میں یونہی ہو جائے عام
پائیں بے مانگے مرادیں اپنی سب امیدوار

یارب اس سرکار کو، ہے جس سے عالم فیض یاب
جب تک دنیا رہے دنیا میں رکھیو برقرار

ا۔ مولانا حالی کا وظیفہ ابتدا میں پچھتر روپے (سکہ حالی) تھا، دورۂ حیدرآباد کے موقع پر سو روپے ہو گیا۔ (ا ص)

9 شکریہ[1] عطائے مدرسہ نواب غازی الدین خاں مرحوم واقع اجمیری دروازہ دہلی، بحضور سر جیمس لائل لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب از طرف طلبائے اینگلو عربی سکول دہلی

(1891-92ء)

آیئے اے دلی کے دل آرا   شہر دعا گو سب ہے تمہارا
شکر کا ہم کو گو نہیں یارا   پر یہ ہے کہنا فرض ہمارا

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے گا

ہے دلی کے فخر کا یہ دن   شہر میں آیا شہر کا محسن
وصف تمہارا گو نہیں ممکن   رہ نہیں سکتے پر یہ کہے بن

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے

آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر   کیسے کیسے رعیت پرور
جن سے ہے ہندوستان منور   فخر ہے انگلستان کو جن پر

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے

آر کلاک احسان کا پتلا   آدمی کی صورت میں فرشتہ

تھا دلی پر فضل خدا کا   تم نے جو دلی میں اسے بھیجا

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے

ا۔ چونکہ یہ نظم صغیرسن طالب علموں کے لیے لکھی گئی تھی تا کہ وہ ہز ہائنس کے روبرو مجتمع ہو کر بطور کورس کے گانے کی لے میں پڑھیں۔ اس لیے بچوں کی سمجھ کے موافق نہایت سیدھے سادے الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں۔ (حالی)
سر جیمس لائل 1887ء سے مارچ 1892ء تک پنجاب کے گورنر رہے۔ چونکہ اس نظم میں جوبلی (منعقدہ 1887ء) کے پنج سالہ وظیفے کی مدت میں اضافے کا ذکر آیا ہے اس لیے قیاس ہے کہ یہ نظم 92-1891ء میں لکھی گئی۔ (ا ص)

آب و ہوا سے شہر کی ساری   آتی تھی خلقت جان سے عاری

تم نے لگا کر نل اک باری   چشمہ حیواں کر دیا جاری

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے

یوں تو ہیں سب احسان مسلم   سب سے ہے یہ احسان مقدم

تھے تعلیم میں کم سب سے ہم   تم نے مدد کی اپنی پیہم

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے

جوبلی کے جو خاص وظیفے   پانچ برس کو ہم کو ملے تھے

لطف سے میعاد ان کی بڑھا کے   جیت لیے دل آپ نے ہم سے

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے

مدرسہ تھا بے ٹھور ہمارا   تھا نہ کہیں ٹکنے کا سہارا

مانگے تانگے پر تھا گزارا   مٹ گیا اب خلجان یہ سارا

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہے

آپ کو ہم پر رحم جو آیا گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
حکم مرمت کا بھجوایا ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے

درس کے کمرے جس میں ہیں اکثر قدر ضرورت سے کچھ بڑھ کر
بورڈروں کے رہنے کو ہیں گھر کھیلنے کو میداں ہے سراسر
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے

شہر میں جا کالج کو عطا کی کیں اصلاحیں آب و ہوا کی
شہر کی جو حاجت تھی روا کی شرط حکومت تم نے ادا کی
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے

تم میں ہیں جو موجود فضائل وہ نہیں کچھ محتاج دلائل
لوگ سب ان کے دل سے ہیں قائل او سر لائل! او سر لائل!
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہے

0اشعار مدحیہ [1]

بحضور سر ڈینس فٹز پیٹرک لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب
(انبالے کے ایک بانی مدرسہ کی طرف سے)
(غالباً 1892ء)

قیصرِ ہند کے ہیں سینکڑوں احسان جہاں
اس کا پنجاب پہ ہے سب سے بڑا یہ احساں

315

حکمراں آئے ہیں پنجاب میں اب تک جتنے
ایک سے ایک کا پلہ ہے عدالت میں گراں

ا۔ اس نظم میں پنجاب کے جن گورنروں کی تعریف کی گئی ہے اُن کے عہدِ حکومت کے سنین درج ذیل ہیں:

سر چارلس ایچی سن: 1882ء تا 1887ء
سر جیمس لائل: 1887ء تا 1892ء
سر ڈینس فٹز پیٹرک: 1892ء تا ?1897ء

(List of the Heads of Administration in India and the India Office in England Page 45)

جب کہ سر چارلس نے پنجاب کو چھوڑا اس دم
وقتِ رخصت تھا ہر اک اُن کو بہ حسرت نگراں

حال جو ہوتا ہے بچوں کا بچھڑ کر ماں سے
یہی احوال تھا پنجاب کا بے وہم و گماں

جانشیں اُن کے ہوئے اُن کے جب سر لائل
عہدِ سابق کو گئے بھول سب ابنائے زماں

شکر سے عہدہ برآ اس کے نہیں ہو سکتے
رحم و انصاف ہوا ذات سے جو ان کی عیاں

اٹھ گیا سر سے جب اس ملک کے سایہ ان کا
ہاتھ میں آپ نے لی آ کے حکومت کی عناں

کارفرما تھے جب اضلاع میں پنجاب کے آپ
معدلت آپ کی اس وقت سے مشہور ہے یاں

حیدر آباد میں، میسور میں، کلکتے میں
نیک نامی کے کیے کام رہے آپ جہاں

ہے یہ اب آپ سے امید کہ پنجاب میں بھی
مشکلیں آپ سے سب ملک کی ہوں گی آساں

بعد سر لائل و سر چارلس کے سر ڈینس بھی
چھوڑ جائیں گے ہر اک دل پہ عقیدت کے نشاں

!شکریہ مسٹر برور[1]

(غالباً1900ء)

سچ ہے کیا نہ شکر بشر جس نے آشکار
اس نے کیا نہ شکر خداوند کردگار

ہم شکر کس زباں سے کریں آپ کا ادا
احسان ہم پہ آپ کے ہیں خارج از شمار

کی یاں حکومت آپ نے دس سال جس طرح
بھولیں گے وہ کبھی نہ سپاہی نہ عہدہ دار

انیسویں صدی کے یہ دس آخری برس
اس ضلع میں رہیں گے ہمیشہ کو یادگار

جو ہے اُسے قلق ہے جدائی کا آپ کی
نوکر ہیں مضطرب تو رعیت ہے بے قرار

تھی آرزو لگے رہیں قدموں سے آپ کے
پورا ہو جب تلک کہ یہ انفاس کا شمار

لیکن خوشی کے ساتھ ہے غم بھی لگا ہوا
دکھ جیسے سکھ کے ساتھ ہے اور گل کے ساتھ خار

315

آ پہنچی وہ گھڑی کہ ہم آئے حضور میں
آج آخری سلام کو با چشمِ اشک بار

اس وقت کو جو دل پہ ہے حالت گزر رہی
لفظوں میں عرض ہو نہیں سکتی وہ زینہار

ا؎ مسٹر برور کرنال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ نیک بھی تھے اور خوش اخلاق بھی۔ کرنال سے تبدیلی کے وقت عبدالمجید صاحب ڈپٹی انسپکٹر پولیس نے مولانا حالی سے یہ نظم لکھوا کر موصوف کے حضور میں پڑھی تھی۔
(بحوالہ "جواہرات حالی" صفحہ:76)
جواہرات حالی میں اس نظم کا سن تصنیف درج نہیں۔ نظم کے چوتھے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1900ء کے لگ بھگ لکھی گئی۔(ا م)

ہے حق سے یہ دعا کہ بھلائی کا تخم یاں
جو بو چلے ہیں آپ وہ ہو نخلِ بار دار

برور نے جس طرح کہ خلائق کو خوش رکھا
خالق اُسے بھی رکھے سدا شاد و کامگار

@ مسٹر آرنلڈ کی روانگی ولایت [1]

(1904ء)

1

دوست اور پھر دوست بھی سچا، عجب نعمت ہے یاں
ہو نہیں سکتا بدل اک دوست کا سارا جہاں

دوست کو دنیا میں سمجھو اک درخت بار دار
پھول جس کے خوش نما اور پھل غذائے جسم و جاں

جس کے شاخ و برگ گونا گوں فوائد سے بھرے
جس کا سایہ راہ رو کے حق میں اک دارالاماں

دوست کے ملنے میں ہے جو لطف ظاہر ہے مگر

315

ہے بچھڑنے میں بھی اس کے اک عجب لذت نہاں

ہجر میں جیتے ہیں اس کے وصل کی اُمید پر
اس لیے مہجور بھی رہتے ہیں اس کے شادماں

آنکھ سے اوجھل کبھی ہوتا نہیں اس کا خیال
دوستوں کے سامنے ہے، وہ رہے جا کر جہاں

اُس کی رخصت سے قلق ہوتا ہے گو دل کو مگر
یاد رہتا ہے سدا وہ وقت رخصت کا سماں

ا۔ 25 فروری 1904ء کو پروفیسر آرنلڈ کی رخصت کے وقت اسٹریچی ہال (علی گڑھ کالج) میں ایک الوداعی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ مولانا حالی نے یہ نظم اُسی موقع پر پڑھی تھی۔ (ا ص)

چُپ کھڑا ہے کوئی، ہے بڑھ کر گلے ملتا کوئی
ایک کا اُڈا ہے دل، ہیں ایک کے آنسو رواں

ہے یہ گو غم کا سماں، لیکن مبارک ہے وہ غم
جس سے ظاہر ہوں محبت اور صداقت کے نشاں

جسم سے انسان کے ہو جان رخصت جس طرح
مل کے پردیسی چلے پردیسیوں سے اس طرح

2

آج ہم اس دوست سے افسوس ہوتے ہیں جدا
دوستی پر جس کی ہم کو فخر کرنا ہے بجا

قوم کا ایک اینگلو سیکسن، پہ دل سے خیر خواہ
ہند کی اک خستہ، درماندہ، شکستہ قوم کا

دین کا پکا مسیحی پر مسلمانوں کا دوست
جس نے ہم کو وہ زمانہ یاد پھر دلوا دیا

جب کہ ہم کو دی گئی تھی یہ خبر قرآن میں

315

پاؤ گے عیسائیوں کو دوست تم سب سے سوا[1]

دین جس کا غیر اور بیگانہ جس کی نسل و قوم
گھر سمندر پار جس کا اور زباں نا آشنا

خیر خواہی میں ہماری اُس نے سب یک بارگی
تفرقے یہ عارضی دل سے دیے اپنے مٹا

جس قدر یاں پیش آئیں ہم کو قومی مشکلات
حاضر و غائب ہمارا اُن میں ساتھ اس نے دیا

---

[1] قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: {وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰی}(المائدۃ:82)

کر دکھایا اُس نے وہ جو حکم تھا انجیل میں
''تم پرایوں کا بھی اپنوں کی طرح چاہو بھلا''

ہے جدائی شاق اس کی پر نہیں جب اختیار
ہے وہی مرضی ہماری جو کہ ہے اس کی رضا

ٹھان لی ہے اُس نے گو ہم سے جدائی کی مگر
ہم تو جب جانیں ہمارے دل سے ہو جائے جدا

قصہ کوتہ ہے ہم اب چھٹتا ہے پیارا آرنلڈ[1]
فخر سے ہم جس کو کہتے تھے ہمارا آرنلڈ

3

کہتے ہیں دوری میں ہو جاتی ہے اکثر یاد کم
پر کریں گے اس کو دوری میں زیادہ یاد ہم

ہند میں رہتی تھی اکثر اس سے ملنے کی اُمید
اس لیے اس کی جدائی کا بنا رہتا تھا غم

پر یہ ظاہر ہے اب اس کی یاد ہی اس کا بدل

315

اس لیے یہ پھانس اب کھٹکا کرے گی دم بہ دم

ایسے غم خواروں کو کوئی کس طرح دل سے بھلائے

آ کے جو پردیس میں کھاتے ہیں بیگانوں کا غم

زندگی ہے جب تلک باقی نہ بھولیں گے کبھی

آرنل کے، مارسن کے، بک کے احسانات ہم

مرحلے دشوار جو یاں ہم کو پیش آتے رہے

وہ رہے ہم دم ہمارے ہر جگہ اور ہر قدم

جن جواں مردوں کے یہ برتاؤ ہیں غیروں کے ساتھ

کیوں نہ ہو قوم اُن کی عالم کی نظر میں محترم

ا۔ عام گفتگو میں آرنلڈ کے بجائے آرنل کہا جاتا تھا۔

ہندیوں سے یہ ہیں گر اخلاق انگلش قوم کے

تو یہ سمجھو بک گئے ہاتھ اُن کے ہندی بے درم

جس علم کی ہے دلوں میں خلق کے بوڑی گڑی

تا قیامت سرنگوں وہ ہو نہیں سکتا علم

ہے محبت ہی کہ وحشی جس سے ہو جاتے ہیں رام

جس کے آگے گردنیں ٹیڑھوں کی ہو جاتی ہیں خم

جو ہے ناسوروں کو بھر دیتا ہو مرہم ہے یہی

جس سے جن تسخیر ہوتے ہیں وہ خاتم ہے یہی

4

ہے محبت کی کہانی میں بھی کیا دل بستگی

ختم ہوتی ہی نہیں یہ داستاں جب چھڑ گئی

آرنل کی مہر و الفت کے بیاں نے یک قلم

315

یاد سے عظمت بھلا دی اس کے علم و فضل کی

ذکر اس کا، ہو نہ جس میں علم کا اُس کے بیاں
حد ناقص ہے نہ قید فصل ہو جس میں لگی

علم میں جو اس کا درجہ ہے وہ ہو کیوں کر بیاں
منہ ہے چھوٹا فی المثل اور بات ہے یارو بڑی

کارنامہ اُس کا ہے جو ''دعوت اسلام'' پر
اس کے علم و فضل پر برہان کافی ہے یہی

مشرق و مغرب میں صدیوں تک رہے گی یادگار
اس نے جو تاریخ پر ڈالی ہے آ کر روشنی

دعوتِ اسلام پر مدت سے تھا چھایا ہوا
اک اندھیرا جس میں تھی ظلمت پہ ظلمت پڑ رہی

ہو رہے تھے سب مسیحی بدگماں اسلام سے
جبر پر سمجھے ہوئے تھے جو بنا اسلام کی

دونوں فرقوں کے دلوں میں تھا بڑھا یاں تک غبار
ہو گئی تھی بیچ میں دیوار اک گویا کھڑی

اک مدت تک رہا تاریخ پر پردہ پڑا
شاہد حق نے نہ جلوہ اپنا دکھلایا کبھی

سب سے پہلے خود مسلمانوں کو لازم تھا کہ وہ
جبر کے الزام سے اسلام کو کرتے بری

پھر مناسب تھا مسیحی کرتے اس کی چھان بین
نکلی کوشش سے ہیں جن کی غلطیاں اکثر دبی

پر نہ کوئی کر سکا سر یہ مہم جز آزل
نام پر گویا اسی کے فتح تھی اس کی لکھی

اُس نے جو لکھا اسے منوا دیا بے چون و چند
مذہب اور تاریخ دونوں اس کے ہیں احسان مند

5

توڑنے والی تھی یہ تصنیف ہمت کی کمر
کامیابی غیر ممکن اس میں آتی تھی نظر

تھی مصنف کو ضرورت اس میں جس سامان کی
جستجو میں اس کی طے کرنے تھے اس کو بحر و بر

مشکلوں کا تھا اُسے ہر ہر قدم پر سامنا
ایک مشکل سے تھی مشکل دوسری دشوار تر

ڈھونڈنے تھے اس کو شرق و غرب کے وہ واقعات
جن سے تھی تاریخ ساکت اور مورخ بے خبر

قافلے کا کھوج واں اس کو لگانا تھا جہاں
نقش پا تھے اور نہ آواز درا تھی راہبر

ہو رہا ہے نظم میں ان مشکلوں کا جو بیاں
بے سر و پا سمجھیں ایسا ہی اُسے اہلِ نظر

جیسے اک گونگا اشاروں میں کرے آ کر بیاں
سامنے اہلِ وطن کے اپنی روداد سفر

جز مصنف کوئی درد اس کا سمجھ سکتا نہیں
جھیلتے ہیں جو یہ کڑیاں بس انہی کو ہے خبر

315

آرنل کا مذہبی دنیا پہ جو احسان ہے
ہو نہیں سکتا ادا شکر اس کا قصہ مختصر

اب دعا یہ ہے کہ پردیسی مسافر خیر سے
برکتوں کے سایے ہی سایے میں سب جا پہنچیں گھر

آرنل، مس آرنل، مسز آرنل سب کے لیے
یہ سفر فتح و ظفر کا ہو وسیلہ سر بسر

آرنل سے فتح علمی جو ہوئی ہے آشکار
ہوں فتوحات آشکارا اس سے ایسے بے شمار

ا۔ سر تھیوڈور ماریسن علی گڑھ کالج میں انگریزی زبان وادب کے استاد تھے۔ 1899ء میں مسٹر بیک کی وفات کے بعد پرنسپل ہو گئے۔ تقریباً پندرہ سولہ سال تک مسلمانوں کی پرخلوص تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد جب 1905ء میں اپنے عہدے سے سبک دوش ہو کر انگلستان جانے لگے تو ایک الوداعی تقریب میں مولانا حالی نے یہ نظم پڑھی۔(ا س)

#مسٹر ماریسن کی روانگی ولایت [ا]

(1905ء)

ہم سے ہوتے ہیں جدا اب آنریبل ماریسن
چھینتا ہے اُن کو ہم سے جذبہ حب وطن

سایہ اپنا سر سے کالج کے اٹھانے کو ہیں وہ
جس کے سر پر تھے ہما کی طرح وہ سایہ فگن

تھی نہ کالج کے ہوا خواہوں کو یہ ہرگز اُمید
چھوڑ جائیں گے وہ یوں پھولا پھلا اپنا چمن

کیا خبر تھی ہم کو یاد آئے گا اپنا جب کہ دیس
بھول جائیں گے انہیں پردیس کے سارے بچن

چھوڑ کر بیڑا مسلمانوں کا یوں منجدھار میں

315

راہ لی تم نے سمندر پار کی اے مارسن
تم نے پوری کر کے آنکھوں سے دکھا دی وہ مثل
وہ جو ہے مشہور "نیکی کن و در دریا فگن"

چاہیے تھا دیکھتے اپنے چمن کی اب بہار
جس کی پہنچی ہے مہک شیراز سے لے تا دکن

پرورش میں تم نے جس بچے کی کاٹے بیس سال
دیکھنی تھی اب تمھیں اس کی جوانی کی پھبن

تم نے باندھی تھی کمر جس قوم کی تعلیم پر
شاد ہوتے دیکھ کر اُن میں کمال علم و فن

پر، لگاتے اور ہیں یاں پود، پھل کھاتے ہیں اور
نوع انساں میں چلی آتی ہے یہ رسم کہن

ہے تمہارے جانشینوں کے لیے اب راہ صاف
کٹ گئیں اس راہ میں تھیں منزلیں جتنی کٹھن

تم نے کی کالج کی خدمت جس خلوص وصدق سے
بس یہی خدمت تمہارا ہے صلہ اے مارسن

ہے صلہ نیکی کا خود نیکی، کہ دل سوزی کا اجر
شمع نے بھر پایا روشن ہو گئی جب انجمن

گو کہ یاں تعلیم کا بویا تھا سرسید نے بیج
پر پھلا پھولا تمہاری سعی سے اُس کا چمن

جیسے پھیلایا مقدس پال [1] نے دین مسیح
تم نے اور بک [2] نے یونہی پھیلایا سید کا مشن

تم نے سرسید کی جو اصلاح میں حصہ لیا
قوم کی سنت ادا کی ہے یہ تم نے بے سخن

تم زمیں کے ہو نمک، مصلح ہو تم اقوام کے

ہے تمہاری قوم کی خصلت یہ مشہور زمن
نوع انساں کی مدد کرنا تمہارا ہے شعار
تقویت دینا ضعیفوں کو تمہارا ہے چلن

مارسن اور مارسن بیگم نے ثابت کر دیا
خیر کے پتلے ہیں انگلش قوم کے سب مرد و زن
نیک دل بانو بھی کالج کی مربی تھیں یونہی
جس طرح شوہر کے دل کو تھی لگی اس کی لگن

اب دعا یہ ہے کہ آپ اور آپ کے اہل وعیال
سایہ افضال ربانی میں پہنچیں تا وطن
رہوے ہر منزل میں توفیق الٰہی ساتھ ساتھ
حافظ و ناصر تمہارا ہو خدائے ذوالمنن

ا۔ مسیحیت کے رکن رکین سینٹ پال مراد ہیں۔
۲۔ مسٹر تھیوڈر بیک جو 1883ء سے 1899ء تک علی گڑھ کالج کے پرنسپل رہے ہے۔

$خطاب بہ حاذق الملک [۱]

(1908ء)

حاذق الملک ! اس خطاب فرخ و مسعود پر
ایک عالم آپ کو دیتا مبارک باد ہے
پر یہ ہے کیسی مبارک باد، ہم حیران ہیں
گو کہ دل ہر اپنے بیگانے کا اس پر شاد ہے

سعی و کوشش آپ نے کی تھی کبھی بہر خطاب
یا کوئی درخواست دی تھی آپ نے کچھ یاد ہے؟
یہ تو یاروں کی دعاؤں کا ہے بس سارا ظہور
غیب سے یہ اُن دعاؤں کی ہوئی امداد ہے

پس مبارک باد یہ جو دے رہے ہیں خاص و عام
مستحق ہیں اس کے ہم، یا آپ، کیا ارشاد ہے؟

%افتتاح ندوۃ العلما ۲؎

(1908ء)

ڈر حادثات دہر کا پھر اس عمارت کو ہے کیا
رکھی گئی ہو علم اور اصلاح پر جس کی بنا
ہوں راج اور مزدور جس کے اہل علم و اتقا
اور مستری جس کا بنے صوبے کا خود فرماں روا
ہیوٹ نے ڈالی تیری نیو اے ندوہ کر شکر خدا

ا؎ ''1908ء کے شروع میں جب حکیم محمد اجمل خاں صاحب کو گورنمنٹ نے 'حاذق الملک' کا خطاب مرحمت فرمایا تو حکیم صاحب موصوف کو مبارک باد دینے اور گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے 7 جنوری 1908ء کو دہلی کی پبلک کا ایک عظیم الشان جلسہ شہر کے ٹاؤن ہال میں نواب امیر الدین احمد خاں صاحب والی ریاست لوہارو کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ مولانا بھی اتفاقاً دہلی میں تشریف رکھنے کے باعث جلسے میں شریک ہوئے، ایک تقریر فرمائی اور آخر میں یہ قطعہ پڑھا۔'' (جواہرات حالی صفحہ:9)

۲؎ 28 نومبر 1908ء کو ندوۃ العلما لکھنؤ کا سنگ بنیاد صوبے کے لفٹنٹ گورنر سر جان پر سکاٹ ہیوٹ ''

اب مشکلیں فضل خدا سے تیری سب آساں
ہوئیں
سر جان ہے تیرا مربی، قوم ہے تیری معیں
رک رک کے آخر جھک چلے ہیں تیری جانب اہل دیں
اے ندوہ یہ سامان بجز تائید ربانی نہیں
پھر ڈر ہے اس بیڑے کو کیا جس کا خدا ہو ناخدا

بے گھر تھا تو اے ندوہ تجھ کو گھر دیا سر جان نے
ویرانہ تھا، آباد تجھ کو کر دیا سر جان نے
موقع تجھے بہتر سے بہتر دیا سر جان نے
خاکہ تھا اک تو، رنگ تجھ میں بھر دیا سر جان نے

315

اب تو قدم آگے بڑھا خواہش ہے گر اس سے سوا

اُس ملک و اہل ملک پر سمجھو خدا ہے مہرباں
آزاد ہوں مذہب جہاں، آباد ہوں معبد جہاں
ہو سلطنت اس قوم کی جو علم کی ہو قدر داں
جلسوں میں پبلک کے شریک آ کر ہوں حکام
زماں

دیں تا کہ اپنے خُلق شاہانہ سے دل سب کے
بڑھا

دیں علم کی ترغیب انہیں جو علم سے بے زار ہوں
اُن کو جگائیں نیند سے غفلت سے جو سرشار ہوں
خیراد پر ان کو چڑھائیں جو کہ ناہموار ہوں
دیں واجبی حق بے دریغ اُن کو کہ جو حق دار ہوں

جس قوم کو دیکھیں گرا لیں دوڑ کر اس کو اٹھا

... نے رکھا اور اس موقع پر ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ یہ نظم حسب فرمائش علامہ شبلی اسی جلسے کے لیے لکھی گئی تھی لیکن مولانا حالی بوجہ علالت شریک جلسہ نہ ہو سکے۔ (بحوالہ: جواہرات حالی، صفحہ:94)

ممکن ہے کچھ دل اس حکومت میں ہوں نالاں اور حزیں
پر اس سے تو خالی حکومت کوئی عالم میں نہیں
وہ بادشاہ قبضے میں جس کے آسماں ہے اور زمیں
اس کی حکومت میں بھی شادی ہے کہیں ماتم کہیں

بارانِ رحمت ہے کہیں زحمت کہیں سیلِ بلا

حق یہ ہے ہو جس ملک میں ہر قوم کی حالت جدا

315

اس قوم کا مقصد الگ، اُس قوم کی حاجت جدا
رسمیں جدا ہر قوم کی، مذہب جدا، ملت جدا
نقشہ جدا، رنگت جدا، صورت جدا، سیرت جدا
ہے انتظام اس ملک کا بس کام انگلش قوم کا

محتاج تھے جو پرورش کے تم نے پالا ہے انہیں
جو ہو گئے تھے پست، پستی سے نکالا ہے انہیں
درجے سے تھے جو گر گئے، تم نے سنبھالا ہے
انہیں
انگھڑ تھے جو تعلیم کے سانچے میں ڈھالا ہے انہیں
ہم سے تمہارا شکر اے برطانیہ کیا ہو ادا

ندوہ کو یور آنر نے عزت دی ہے جو یاں آن کر
ندوہ کا یہ اعزاز ہے احسان ساری قوم پر
خیر اس حکومت کی مناتے ہیں مسلماں سر بسر
حق سے دعا کرتے ہیں جان و دل سے یہ شام و سحر
اڈورڈ ہفتم اور شہنشاہی رہے اس کی سدا

۸ تہنیت مسند نشینی حضور نظام [۱]

(1911ء)

فلک مرتبت میر عثمان علی خاں
مبارک تمہیں مسندِ شہر یاری
مبارک اب و جد کی تم کو خلافت

315

مبارک دکن کی تمھیں تاج داری

مبارک تمھیں ملک کی گلہ بانی
مبارک رعیت کی خدمت گزاری

مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل
جہاں چپے چپے پہ ہے ذمے داری

مبارک وہ منصب کہ جن کو ملا وہ
ہوا چین رخصت، فراغت سدھاری

مبارک بزرگوں کی میراث تم کو
جنھوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری

ارادوں سے، جرأت سے، ہمت سے جن کی
زمانے نے ہے بارہا شرط ہاری

مہموں سے ہے جن کی تاریخ رنگیں
زبانوں پہ ہے ذکرِ خیر ان کا جاری

ادا کر گئے وہ تو اپنے فرائض
ہے اب آپ کے عہدِ دولت کی باری

ا۔ والیٔ دکن، نظام الملک، آصف جاہ ہفتم، میر عثمان علی خاں مرحوم کی تخت نشینی کے موقع پر روزنامہ زمیندار لاہور نے ایک خاص نمبر نکالا تھا۔ یہ نظم ادارہ زمیندار کی فرمائش پر لکھی گئی اور 24 ستمبر 1911ء کے زمیندار (جلد 2 شمارہ نمبر 35) میں شائع ہوئی۔ (بحوالہ: جواہراتِ حالی، صفحہ:72)

اب اُن کی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا
خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری

جو بے بس ہیں دینا ہے اُن کو سہارا
جو بے یار ہیں اُن کی کرنی ہے یاری

نکمے ہیں جو اُن کو کامی بنانا
بڑھانا دل ان کا جو ہیں کاروباری

جگانا انہیں نیند کے جو ہیں ماتے
بڑھانا انہیں علم سے جو ہیں عاری

جو زردار ہیں اُن کی ہے پاسبانی
جو نادار ہیں اُن کی حاجت برآری

جو سر زور ہیں اُن کی ہے گوش مالی
جو مظلوم ہیں اُن کی ہے غم گساری

بڑوں نے تھا عہد وفا جن سے باندھا
سدا کرنی اس عہد کی پاس داری

سمجھنا ہر اک قوم و ملت کو یکساں
کہ خصلت ہے یہ زیور شہر یاری

مبارک یہ بار گراں تم کو شاہا
اٹھانے سے ہیں جن کے افلاک عاری

بہت مشکلوں کا ہے گو سامنا یاں
کہ بہتوں نے یاں آ کے ہمت ہے ہاری

مگر مشکلیں ہیں یہ سب اُن کو آساں
پڑی جن کی گھٹی میں ہے ملک داری

پلے جو ہیں آغوش میں سلطنت کی
سیاست ہے جن کی رگ و پے میں ساری

یہ اُمید ہے آصف ہفتمیں سے
ریاست کی حل مشکلیں ہوں گی ساری

رہے گا اسی طرح جیسے رہا ہے
دکن پر سدا سایہ فضلِ باری

دعا گوے دیرینہ ناچیز حالی
کہ مدحت گری کے ہنر سے ہے عاری

دعا کے سوا کچھ نہیں پاس اس کے
ادا جس سے ہو فرضِ مدحت نگاری
الٰہی طفیل اس کا پھیلائی جس نے
خلائق میں توحید و پرہیز گاری
منادی نے، تعلیم نے، جس کی آ کر
زمانے کی بگڑی ہوئی کل سنواری
طفیل اس کا فرماں روائے دکن کی
حکومت کو دے غیب سے استواری!
رہے رہتی دنیا تک وہ سلامت
یہ اقبال و فیروزی و کام گاری

&شہرِ حیدرآباد [1]

(1912ء)

پانی دیتا ہے کوئی پودا لگاتا ہے کوئی
پھول چنتا ہے کوئی آ کے کوئی برگ و ثمر
آ کے کرتا ہے چمن میں کوئی آئیں بندی
تاکہ ہو سیرِ چمن سے نہ کبھی سیر نظر

[1] جواہراتِ حالی میں سن تصنیف مذکور نہیں۔ مطالعہ حالی (مولفہ شجاعت علی سندیلوی و ناظر کاکوروی، ص:219) میں1912ء درج ہے۔ (مرتب)

کرتے ہیں علمِ نباتات کی بعضے تحقیق
تاکہ تحقیق سے ہو اُن کی فزوں علم بشر
الغرض باغ میں ہیں وارد و صادر جتنے
ایک سے ایک کی ہیں مختلف اغراض، مگر
صحنِ گلشن میں کسی کام کو آئے کوئی

315

جائے گا بوئے ریاحیں سے معطر ہو کر

حیدر آباد بھی اک باغ ہے ماشاء اللہ
ہے جہاں فیض کا دروازہ کشادہ سب پر

*شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خاں [1]

(از طرف جملہ مسلماناں)

(1913ء)

اے مالک دفتر زمیندار
اے نازشِ قوم و فخرِ اقراں

اے روح و روانِ جمع احباب
اے چشم و چراغ بزم اخواں

---

[1] جنگ بلقان کے دوران میں مولانا ظفر علی خاں (مدیر و مالک اخبار مزین دار لاہور) کے جذبہ ملی اور قومی خدمات سے متاثر ہو کر مولانا حالی نے یہ نظم لکھی تھی جو 10 اگست 1913ء کے اخبار زمیندار (جلد 3 نمبر 79) میں شائع ہوئی۔

3 اگست 1913ء کے ایک خط میں مولانا حالی اس قطعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جب وہ (مراد مولانا ظفر علی خاں ...... مرتب) مغرب کی جانب روانہ ہونے کو تھے، میں نے چند ابیات اُن کی شان میں لکھی تھیں مگر جب وہ روانہ ہو گئے تو وہ نظم ناتمام رہ گئی۔ کل بمقام دہلی، پانی پت سے اُن کو تار دیا گیا تھا کہ لاہور جاتے ہوئے تھوڑی دیر یہاں بھی قیام فرمائیں۔ ارادہ تھا کہ یہ نظم میں خود اُن کے سامنے پڑھوں گا۔ مگر ...... ہمارے واجب التعظیم مسافر بالا بالا، لاہور کو روانہ ہو گئے ......'' (مکاتیب حالی صفحہ: 111)

اے دین کے امتحاں میں جاں باز
اے نصرتِ حق میں تیغ عریاں

اے صدق و صفا کی زندہ تصویر
اے شیر دل، اے ظفر علی خاں!

قدرت نے بھرے تھے تجھ میں جو گن

جب تک وہ رہے نظر سے پنہاں
فوقیت و برتری پہ تیری
قائم کوئی ہو سکی نہ برہاں

پر وقت کی تاک میں برابر
ہمت تری گن رہی تھی گھڑیاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ
اُٹھا ستم و جفا کا طوفاں

ہمدردیِ اہلِ دیں نے آخر
جوہر ترے کر دیے نمایاں
جمعیت و صبر کا سراسر
دامن ہوا چاک تا گریباں

پھیلے وہ بہ شکلِ سیلِ آتش
دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں
ڈالا یہ تری پکار نے غل
جی اُٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں

جو دل غمِ قوم سے تھے بے حِس
چلنے لگیں اُن دلوں پہ چُھریاں
وہ بن گئے آپ اپنے رہ زن
جو مال کے اپنے تھے نگہباں

اسلام کی سمجھے اب حقیقت
جو نام کے تھے فقط مسلماں
ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ

315

سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں!

نازاں ہے وہ درس گاہ تجھ پر
تعلیم پہ جس کی تو ہے نازاں

کاش ایسے جنے سدا وہ فرزند
جو قوم کے درد کے ہوں درماں

سوزِ غمِ دینِ حق سے جن کے
سینے ہوں کباب دل ہوں بریاں

جو ملک و وطن کے ہوں فدائی
جو قوم کے نام پر ہوں قرباں

مشرق میں ہوں دردِ دل سے بے چین
مغرب میں سنیں جو رنجِ اخواں

پنجاب کو تجھ پہ ہو اگر فخر
ہے اُس کو یہ فخر و ناز شایاں

زندہ ہے وہ ملک اور ملت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

io

بابِ ہفتم

مراثی

(اُردو)

حالی کے شخصی مراثی کا تجزیہ

حالیؔ اُردو شخصی مرثیے کے مجدد تھے۔ اگر چہ عربی میں کربلائی مراثی سے پہلے اور بعد میں شخصی مرثیوں کا رواج تھا لیکن اُردو شاعری میں یہ کمی قطعہ تاریخ وفات سے منسلکہ چند شعروں میں پوری کی جاتی تھی چناں چہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں بعض نظمیں مرنے والے کے غم اور اس کے اخلاق حسنہ اور اعمال عمدہ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں لیکن اس صنف نے غدر کے بعد ایک بڑے شعرا کے گروہ کو اپنا طرف دار کر لیا جس کی وجہ سے ایک بڑا ذخیرہ شخصی مراثی کا اُردو شاعری میں جمع ہو گیا۔ غالبؔ نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین عارف اور اپنی معشوقہ کے مرنے پر مرثیے لکھے۔ دونوں مرثیے غزل کی شکل میں ہیں جن میں درد و غم اور رنج و محن سے لبریز جذبات اور احساسات ہیں۔ مومنؔ نے اپنی معاشقہ کی وفات پر بارہ اشعار پر مشتمل مرثیہ لکھا جو ترکیب بند میں شمار ہوتا ہے۔ حالیؔ نے دس سے زیادہ قطعات تاریخ وفات اور نو سے زیادہ شخصی مرثیے لکھے جس میں ایک مرثیہ فارسی میں سرسید پر بھی نظر آتا ہے۔ حالیؔ نے شخصی مرثیے لکھنے کی تاکید بھی کی جس کے نتیجہ میں درجنوں شخصی مرثیے تخلیق ہوئے۔

حالیؔ کے شخصی مراثی ترتیب وار نیچے دیے گئے ہیں:

1- مرثیہ مرزا غالبؔ ترکیب بند تصنیف 1869ء تعداد شعر سو (100)

2- مرثیہ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین قطعہ کی شکل میں تصنیف 1885ء تعداد شعر بیس (20)

3- مرثیہ حکیم محمود خان مسدس کی شکل میں تصنیف 1892ء تعداد شعر (138)

4- مرثیہ ملکہ معظمہ وکٹوریا ترکیب بند کی شکل میں تصنیف 1901ء تعداد شعر (66)

5- مرثیہ قیصر ہند بشکل غزل تصنیف 1901ء تعداد شعر (9)

6- مرثیہ سرسید کے دو رفیق قطعہ کی شکل میں تصنیف 1905ء تعداد شعر (39)

7- مرثیہ محسن الملک ترکیب بند کی شکل میں تصنیف 1907ء تعداد شعر (9)

8- مرثیہ سرسید فارسی میں ترکیب بند تصنیف 1898ء تعداد شعر (70)

9- مرثیہ سالار جنگ نزار علی خان فارسی میں ترجیع بند کی شکل میں تصنیف 1883ء تعداد شعر (27)

حالیؔ کے قطعات وفات تاریخ جو انہوں نے اُردو اور فارسی میں لکھے یہ ہیں:

1- قطعہ تاریخ وفات مرزا غالب دہلوی((8

2- قطعہ تاریخ وفات خواجہ ناصر وزیر دہلوی((3

3- قطعہ تاریخ وفات محمد حسین آزاد((8

4- قطعہ تاریخ وفات محمد علی خان رشکی (فارسی)(16)

5- قطعہ تاریخ وفات سید محمود علی (فارسی)(10)

6- قطعہ تاریخ وفات خلیفہ سید محمد حسن (فارسی)(19)

7- قطعہ تاریخ وفات خلیفہ سید محمد حسین (فارسی)(19)

8- قطعہ تاریخ وفات مولوی چراغ علی (فارسی)(10)

9- قطعہ تاریخ وفات خواجہ کرامت علی (فارسی)(2)

10- قطعہ تاریخ وفات محمد ابراہیم (فارسی)(2)

11- قطعہ تاریخ وفات خواجہ فریدالدین احمد (فارسی)(2)

12- قطعہ تاریخ وفات مولوی چراغ علی (فارسی)(2)

13- قطعہ تاریخ وفات نواب محسن الملک (فارسی)(2)

14- قطعہ تاریخ وفات نواب ضیاءالدین نیر (فارسی)(2)

آزاد وہ دریائے سخن کا دُرِ یکتا
جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا

ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ
جو اُس کے قلم سے دمِ تحریر ہے ٹپکا

ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر
چھوڑا نہ دقیقہ کوئی رنج اور تعب کا

دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں
تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا لپکا

صحت میں، علالت میں، اقامت میں، سفر میں

ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے، مشتاق
بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شب، عاشور کو تھی جس کی تمنا
آ پہنچا نصیبوں سے بلاوا اُسے رب کا
تاریخ وفات اُس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ ''ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا''

غالب کا مرثیہ:

الطاف حسین حالیؔ کا ایک زندہ شاہکار غالب کی موت پر شخصی مرثیہ ہے۔ غالب کی موت پر نثری تحریروں کے علاوہ منظوم گلدستہ خراج عقیدت میں رباعی قطعات ترکیب بند اور ترجیع بند نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کا انتقال فروری 1879ء کو دہلی میں ہوا۔ غالب کی وفات کے قطعات ان کی وفات کے فوری بعد ''اکمل الاخبار'' میں شائع ہوتے رہے اور ہر شمارے میں ایک سے زیادہ قطعات شائع ہوئے۔ مدیر ''اکمل الاخبار'' نے جولائی 1879ء میں میر مہدی مجروحؔ کے ترجیع بند کو شائع کر کے اس سلسلے کو ختم کیا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ غالب کے انتقال کے زیادہ سے زیادہ چار مہینے بعد دس بند کا مرثیہ لکھا جس کا ہر بند اس شعر پر ختم ہوتا ہے:

رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

یہ شعر مجروحؔ کے مرثیے میں ترجیع بند ہونے کی وجہ سے دس بار دہرایا گیا۔ اسی ترجیع بند شعر کو قربان علی بیگ سالکؔ کے ترجیع بند مرثیے کے چھے بندوں میں دہرایا گیا اور حالیؔ نے اپنے ترکیب بند میں اس شعر کو ایک بار استعمال کیا۔ ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان تینوں شاعروں میں کس نے سب سے پہلے غالب کا مرثیہ لکھا لیکن غالب کے خطوں سے یہ ظاہر ہے کہ خود غالبؔ نے 1277ھ میں اپنی تاریخ وفات ''غالبؔ مرد'' نکالی تھی جب مذکور تاریخ گزر گئی تو ان کے چہیتے شاگرد مجروح نے لکھا کہ مذکور تاریخ سلامتی سے گزر گئی اب حضور کیا فرماتے ہیں۔ غالبؔ نے 17

محرم 1278 کے خط میں لکھا۔ ''لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں 1277ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لایق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔'' اگرچہ مرزا غالب کی وفات پر مختلف شاعروں نے اشعار لکھے، تاریخ وفات نکالی جن کا اجمالی ذکر کرنے سے پہلے ہم غالب کے دو اہم شاگردوں کے ترجیع بند پر حالی کے ترکیب بند پر مفصل گفتگو کرنے سے پہلے اس لیے بھی کریں گے یہ شخصی مرثیے ایک ہی بحر میں ہیں ان کا تاریخی شعر بھی ایک ہی ہے لیکن رنگ اور مطالب جدا جدا ہیں۔

مجروح کا مرثیہ جو دس بند اور ہر بند میں آٹھ مختلف اور ایک یکساں شعر یعنی ((81 اشعار پر مشتمل ہے۔ مجروح نے غالب کی شخصیت اور ان کے فن سے آغاز کیا:

کیوں نہ ویران ہو دیارِ سخن — مر گیا آج تاجدارِ سخن
بلبلِ خوش ترانہ معنی — گلِ رنگین شاخسارِ سخن
عرصہ نظم کیوں نہ ہو ویراں — ہے عناں کش وہ شہسوارِ سخن
کیوں نہ حرفوں کا ہو لباس سیاہ — ہے غمِ مرگ شہر یارِ سخن
ساتھ ان کے گئی سخن سنجی — ان کا مرقع ہی ہے مزارِ سخن
آبیاری تھی جس سے وہ نہ رہا — اب خزاں ہو گئی بہارِ سخن
نغمہ پیرائیاں کہاں ویسی — اب یہ ہے نالہ ہائے زارِ سخن

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خاں غالب مرد

غالب کے اس مرثیے میں مجروح نے جو اشعار اپنے دیوان میں شامل کیے ہیں وہ اکمل الاخبار کے ترجیع بند سے ذرا مختلف ہیں اور یہاں ان کی تعداد بھی زیادہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجروح نے کچھ ترمیم کے ساتھ اشعار میں اضافہ بھی کیا۔ تمہیدی یا تشبیب کے بند میں غالب کو تاجدارِ سخن، شہسوارِ سخن، بہارِ سخن اور شہر یارِ سخن کہہ کر غالب کی موت سے جو ویرانی تباہی اور

خزاں سخن پر چھائی اس کا ذکر کیا ہے یہاں فن کے لحاظ سے ان کی خوش ترانہ معنی، سخن سنجی اور نغمہ پیرائی کے ساتھ عرفی شیرازی اور طالب آملی کے رشک کے ساتھ غالب کی موت کا ذکر ہے۔ مجروح نے غالب کے مزاج کی تہذیب وشرافت، ان کا صلح جو برتاؤ ان کی گفتگو کی اثر اندازی اور بات سے بات بنانے کے ہنر کو خوبصورتی سے اشعار میں ڈھالا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ غالب کی ان شخصی باتوں سے مہدی مجروح سے زیادہ کون واقف ہوگا وہ غالب کے سب سے چہیتے شاگرد تھے جو غالب کے خطوں سے ظاہر ہے۔ مجروح کہتے ہیں:

تھی جو ان کے مزاج میں تہذیب	وہ جہاں میں نہیں کسی کو نصیب
صلح کل کا رکھا تھا وہ برتاؤ	تھے وہ دشمن کی بھی نظر میں حبیب
گفتگو میں بڑی وضاحت تھی	ہوتے تھے محو جس کو سن کے ادیب
تھا ہر اک بات کا نیا انداز	ہر سخن کی تھی ایک نئی ترکیب

مجروح کا یہ کہنا کہ ہر بات کہنے کا ڈھنگ نرالا تھا یعنی ''ہر سخن کی تھی ایک نئی ترکیب'' غالب شناسی کا اہم نکتہ ہے کیوں کہ: ع

کہتے ہیں کہ غالب کا تھا اندازِ بیاں اور

مجروح کے مرثیے میں جو غالب کی موت کا درد والم اور رنج وغم کا منظر نظر آتا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب کے شاگردوں میں کوئی بھی اتنا غالب سے مانوس اور قریب نہ تھا۔

ان کی شفقت جو یاد آتی ہے	چشم دریائے خوں بہاتی ہے
ان کی دوری میں ہے یہ بد مزگی	کہ نہیں زیست اپنی بھاتی ہے
یہ انہیں کا مزار ہے شاید	یاں سے کچھ بوئے الفت آتی ہے
ہائے جنگل میں اس کی قبر بنی	کاخِ معنی کی جو کہ تھا بنیاد

مقطع کے بند میں کہتے ہیں:

گرد تابوت تھا ہجومِ کبیر	اہلِ ماتم میں تھی یہی گفتار
جو کہ جاتے تھے ہمرہِ تابوت	یہی کہتے تھے وہ پکار پکار

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد

اسد اللہ خان غالب مرد

اس تحریر میں آگے چل کر ہم یہ بتائیں گے کہ حالی اور مجروح کے مرثیوں میں متن کے لحاظ سے اور انداز بیان کی رو سے بڑا فرق ہے کیوں کہ دونوں بڑے فطری شاعر ہیں اگر چہ دونوں غالب کے شاگرد ہیں جن کو ایک ماحول ملا اور دونوں کا مبدا، ماوئی، ملجا اور محسن ایک تھا جس نے دونوں پر عنایت، شفقت اور محبت کی تھی۔

غالب کے ایک اور ممتاز شاگرد اور عمدہ شاعر قربان علی سالکؔ نے بھی ترجیع بند چھے بند کا مرثیہ اسی بحر میں لکھا اور ہر بند میں:

رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد
اسد اللہ خاں غالبؔ مرد

کے ٹیپ کے شعر کو دہرایا۔ سالکؔ نے حالیؔ کی طرح ایک علاحدہ 19 اشعار کا قطعہ تاریخ بھی لکھا جس کی ادب میں ان کے مرثیے سے زیادہ پذیرائی ہوئی۔ کیوں کہ یہ مطلب ہماری گفتگو کا مقصد نہیں اس لیے ہم یہاں صرف ترجیع بند مرثیے پر اکتفا کرتے ہیں جس میں غالب کی شخصیت اور سالک سے ان کی نسبت ایک غم آلودہ فضا میں دکھائی گئی ہے:

خضر راہ سخن جہاں سے گیا ہادی راہ کارواں سے گیا
اب کہاں گل فشانی مضمون خاصہ حسرت فگار سونا تھا
تھا سکوں میں جو مرکز خالی نہیں اس دل کو مچل برق قرار
سطحِ خاک کی الہی خبر آج رکتے نہیں ہیں دیدہ تر
غم استاد ہے اگر یہ بھی یا خدا کیوں کہ زندگی ہو گی
کیا کہوں کون مر گیا سالکؔ آپ کہتے ہیں طالب و عرفی
رشکِ عرفیؔ و فخر طالبؔ مرد اسد اللہ خان غالبؔ مرد

حالیؔ کے ترکیب بند پر تفصیلی تشریح اور تجزیے سے قبل ہم خدائے سخن میر انیسؔ اور دوسرے شاگردانِ غالب کے نمونوں کو پیش کر رہے ہیں۔

نواب سید رضا دہلوی آگاہؔ:

اب کہاں آگاہ غالبؔ سا شفیق | روئے دل کھول کر استاد کو
یہ بھی اک رنگ ہے محبت کا | روئیں ہم اور ہنسا کرے کوئی

شاہ باقر علی باقرؔ:

کجا شد غالبؔ شیریں نوا باقرؔ کہ آہ اکنون
صدا زاں طوطیِ ہند خوش الحانم نمی آید

سید مدد علی اکبر آبادی تپشؔ:

گل شد از مردنِ غالبؔ چراغ شاعری
اے تپشؔ در خلق مثلش کیست یکتائے دیگر

ہرگوپال تفتہؔ:

غالبؔ وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے | ہم سے ہزاروں ہیچ مداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق | چھے لفظ اس کے مرنے سے بے پا و سر ہوئے

بال مکند بےصبرؔ:

ہماں میرزا غالبؔ استاد من | بجاں آفریں جاں چو آخر سپرد
بہ پرسیدم از دل سن رحلتش | بنالید و گفت "آہ غالبؔ بمرد"

1285ھ

اسد اللہ خان وہ غالبؔ آہ | جس سے اہلِ کلام تھے مغلوب
جب سدھارے بسوے خلد ہوے | سخن ان کے الم میں سینہ کوب
اس سپہرِ سخن کے اختر کا | مجکو سالِ غروب تھا مطلوب
کہا عیسیٰ نے از سرِ حسرت | ہوا حیف آفتابِ ہند غروب

1869ء

خدائے سخن میر انیسؔ (رباعی):

گلزارِ جہاں سے باغِ جنت میں گئے

مرحوم ہوئے جوارِ رحمت میں گئے
مداحِ علیؑ کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالبؔ اسد اللہ کی خدمت میں گئے

حالیؔ کے ترکیب بند مرثیے پر بات کرنے سے پہلے ہم ان کے آٹھ شعر کے قطعہ تاریخ وفات غالب پر یہ کہیں گے کہ اس قطعہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ سال تاریخ 1285ء کا شعر خود غالب کے مصرع ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' سے صنعت تخرجیہ کی مدد سے نکالی گئی ہے یعنی پہلے مصرعے میں ''تاریخ'' ہم نکال چکے پڑھ ''بغیر فکر''

''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' 2796-1511=1285ھ غالب کے مصرعہ کے اعداد سے اگر ''تاریخ'' اور ''بغیر فکر'' کے اعداد نکال دیے جائیں تو غالب کی تاریخ وفات کے عدد نکلتے ہیں۔ اُردو شاعری میں حالیؔ کا یہ عمل جدید تھا جس کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ اس کی تقلید کی گئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور جگرؔ جیسے شاعروں کی تاریخ وفات بھی ان کے مصرعوں سے نکالی گئی۔ جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں۔ (انیسؔ) ؟؟ سعادت کو دبیر آتا ہے۔ (دبیرؔ)......................................؟؟؟

حالیؔ نے اس قطعے میں غالب کے پرستاروں غالب کی دلی اور سب سے اہم خود اپنی کیفیت بیان کی ہے جہاں تک غالب کی شخصیت اور ان کے فن کا تعلق ہے اس کا پرتو اور ان کے مقام کا تعین بھی اس مختصر قطعے میں نظر آتا ہے۔ غالب کی موت کی خبر سن کر جو دلی کا حال ہوا۔

غالبؔ نے جب کہ روضہ رضواں کی راہ لی　　ہر لب پہ آہِ سرد تھی ہر دل میں درد تھا
اس دن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہ پوچھ　　دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا

حالی غالبؔ کے مقام کو تقابلی انداز میں یوں پیش کرتے ہیں:

تھا گو وہ اک سخنور ہندوستاں نژاد　　عرفیؔ و انوریؔ کا مگر ہم نبرد تھا
اس قافلے میں آ کے ملا گو وہ سب کے بعد　　اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا

حالیؔ کے حال کی تصویر کشی دیکھئے:

حالیؔ کہ جس کو دعویٰ تمکین و ضبط ہے　　دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا

ہم اور صبح و شام یہ اندوہ جانگزا دل تھا کہ فکر سال میں بے صرفہ گرد تھا

حالیؔ غالب کے شاگرد ہیں ہر شاعری کی منزل پر غالب سے رہنمائی کے طلب گار ہیں یہ استاد غالب ہی کا فیض تھا کہ انہیں ایک جاویدانہ مصرعہ ملا جس میں غیر فانی تاریخ نکلی جو غالب کی تاریخ وفات پر نکالی گئی تمام تاریخوں میں عمدہ اور شاہکار ہے:

ناگاہ دی یہ غالب مرحوم نے صدا سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا
''تاریخ'' ہم نکال چکے پڑھ ''بغیر فکر'' ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''

حالیؔ کا ترکیب بند مرثیہ غالبؔ کے انتقال 1869ء کی تخلیق ہے۔ اس مرثیے میں دس بند ہیں اور ہر بند میں دس شعر۔ ہر بند کے ٹیپ کا شعر جدا ہے اور تمہیدی بند کے بعد کے دوسرے بند کا آخری شعر وہی ہے جو مجروحؔ، سالکؔ اور دوسرے شعرا نے نظم کیا ہے جس کا ماخذ خود غالبؔ کا فقرہ ''غالب مرد'' ہے۔

رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد
اسد اللہ خاں غالبؔ مرد

بعض افراد نے اس شعر کی اولیت کا سہرا حالیؔ کے سر باندھا ہے لیکن کوئی معتبر حوالہ ایسا نہیں پیش کیا جس میں یہ دکھایا جائے کہ حالیؔ نے یہ مرثیہ مجروحؔ سے پہلے یعنی جون 1869ء سے قبل کہا ہو۔ البتہ مرثیے کے اس شعر کی اولیت اور تقدم سے اس بات پر کچھ اثر نہیں پڑتا کہ یہ مرثیہ غالب پر کہے گئے تمام مراثی اور قصاید سے بہت بلند و برتر ہے۔ مرثیہ کیا ہے غالب کی شخصیت، حیات، منزلت، قابلیت اور فن کا مرقع ہے۔ اس مرثیے کے سو اشعار میں جن مطالب کی عکاسی کی گئی ہے ان کی تشریح، تجزیہ اور تحلیل کے لیے پورے رسالے کی ضرورت ہے۔ حالیؔ کے اسی مرثیے نے برصغیر کی افسردہ و پژمردہ سوسائٹی میں غالب کے نام و مقام زمانے کے پرآشوب ماحول میں مٹ جانے سے بتایا چناں چہ غالب کا کلام ہمیشہ عوام اور خواص میں مقبول رہا اور مسلسل شائع ہوتا رہا اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی جس کو پورا کرنے کے لیے بیس ((20 سال بعد حالیؔ نے غالب کی سیرت اور فن کی شناخت کا تاج محل ''یادگار غالب'' تیار کیا جو آج تقریباً سوا سو سال کے گزرنے کے باوجود معتبر اور معروف صحیفہ مانا جاتا ہے۔ یہاں اس مرثیے کے تجزیے اور تشریح

سے پہلے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ جس وقت یہ مرثیہ تصنیف ہوا اُس وقت حالیؔ کی عمر ((32 سال تھی۔ حالیؔ کی کچھ مشاعروں کی غزلوں کے علاوہ کوئی قابل دید فنی کاوش عوام کے سامنے نہ تھی۔ حالیؔ اگرچہ شیفتہؔ اور دوسرے ارباب شعروادب دہلی کے مصاحب ضرور تھے اور سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ غالب کو اپنا کچھ کلام دکھا کر وہ فطری شاعر ہونے کی سند بھی لے چکے تھے۔ ''تمہارے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔'' سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ کے اس جملے نے حالیؔ کی شعری زندگی بنا دی جس طرح غالب کی آئین اکبری کی تقریظی مثنوی نے سرسید کو ان کی داخلی قوتوں سے آشنا کروایا یا دوسرے الفاظ میں سید احمد خان کو سرسید بنایا۔ حالیؔ غالب سے چالیس سال چھوٹے تھے لیکن جوانی ہی سے جرات اور اپنی فکر کے اظہار میں تامل نہیں کرتے تھے چناں چہ حالیؔ نے جو خط قطعہ وغیرہ لکھا اور غالبؔ نے اس کا جواب دیا اس بات کی دلیل ہے کہ غالبؔ اور حالیؔ کو ایک دوسرے کا لحاظ اور احساس تھا شاید غالب اپنے آیندہ نشوونما پانے والے باغ کو دیکھ رہے تھے جہاں ان کا عندلیب چہچہائے گا۔ اسی لیے غالبؔ نے جو قطعہ لکھا اس میں حالیؔ ہی کو محورِ سخن بنایا۔

چوں حالیؔ از من آشفتہ بے سبب رنجید
توگر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بہ فرض محال
برآں سرم کہ درآں عمر این دو کار کنم
یکی ادائے عباداتِ عمر پشینہ
دگر بہ پیش گہہ حالیؔ اعتذار کنم

اگرچہ حالیؔ اور غالبؔ کے تعلقات گیارہ بارہ سال سے زیادہ نہ تھے وہ بھی کبھی ملاقات کی صورت میں اور کبھی خط و کتابت کے ذریعے لیکن حالیؔ غالبؔ کی زندگی کے تمام تر واقعات اور حالات سے واقف تھے کیوں کہ غالب کی فطرت میں عیب و ہنر سب کچھ لوگوں کے سامنے ہوتے یعنی وہ ایک عمدہ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کھلی کتاب کے مانند تھا جسے ہر شخص پڑھ سکتا تھا۔ حالیؔ نے اس کتاب زندگی کے ورق ورق کا مطالعہ کیا تھا تب ہی تو مرثیہ کے ایک شعر میں سو

اشعار کا خلاصہ کر دیا۔

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیٔ لفظ آدمیت تھا

حالیؔ نے مرثیہ غالب کے علاوہ ایک قطعہ تاریخ وفات بھی لکھی جس کو غالبؔ ہی کے مصرع ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' سے نکالی۔ حالیؔ کے اجتہادی تخلیقی رویے کی تقلید کی گئی اور کئی مصرع تاریخی وفات انہی شاعروں کے مصرعوں سے نکالے گئے۔

میر انیسؔ نے شہدائے کربلا کے مرثیوں کی آئین بند کرتے ہوئے کہا تھا۔

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

یہی آئین شخصی مرثیوں پر بھی عاید ہوتا ہے اس میں درد کا ہونا ضروری ہے۔ حالیؔ سے پہلے شخصی مرثیے لکھے گئے۔ خود غالبؔ نے مرثیہ عارف، مومنؔ نے محبوبہ کا مرثیہ وغیرہ کے علاوہ کئی قطعات تاریخ وفات مختلف شعرا کے جو دردوالم کے مضامین سے بھرے ہیں نظر آتے ہیں۔

ہم نے حالیؔ کے اس مرثیے کو اس کے متن اور مضمون کے لحاظ سے تقسیم کر کے اشعار کو بندوں سے گل چین کیا ہے تاکہ بکھرے ہوئے پھولوں کو جن کا رنگ تقریباً ایک جیسا ہے گلدستہ بنا کر پیش کر سکیں۔

حالیؔ نے اگرچہ انیسؔ کے مرثیوں کا بغایت مطالعہ کیا تھا اور صنف مسدس میں آگے بڑھ کر انہوں نے مدوجزر اسلام لکھا۔ شخصی مرثیوں میں حکیم محمود خاں دہلوی کا مرثیہ بھی مسدس میں تصنیف کیا لیکن یہاں ترکیب بند کا انتخاب، چھوٹی بحر میں اظہار اور مضامین کا بکھراؤ وغیرہ اس بات کا سراغ دیتے ہیں کہ وہ اس مرثیہ کا جاودانہ شعر:

رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

کو پیوند کرنا چاہتے ہوں۔ (اللہ ہوالعالم)

مرثیہ کی تمہید مرثیے کے مضمون کے اعتبار سے عمدہ ہے جو دنیا کی بے ثباتی، چرخ کی بے

رہی، فلک کی جفاکشی کے ساتھ سوائے اللہ ہر چیز فانی، بے اعتبار ہے یعنی لاموجودالا اللہ کی تفسیر بھی ہوسکتی ہے۔

حالیؔ مطلع کے شعر میں صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ اس نظم میں اپنا درد بیان نہیں کر سکتا کیوں کہ: ع

وقت کوتاہ قصہ طولانی

مرثیہ کا آخری شعر جو عربی شعر ہے اس کے معنی ہیں۔ ہم اس کے غم میں کتنا روتے اور آہ وزاری کرتے ہیں اور کتنی مدت سے زمانے کو ملامت کر رہے ہیں۔

کم لعافیہ من بکے و وعتاب مع الزمان
عویل طویل

حالیؔ نے تمہید مرثیے کے پہلے دو بندوں میں باندھی ہے۔ شاعر کہتا ہے دنیا فانی ہے ہر چیز یہاں کی وہم اور گماں کی کہانی ہے۔ تمام عیش وعشرت نام ونمود حقیقت نہیں بلکہ طلسمِ زندگانی ہے۔ شاعر ان چیزوں سے دل سیر ہو چکا ہے۔

حالیؔ یہاں تلمیحات اور اصطلاحات سے مصرعوں کے کوزوں میں سمندر بھر دیتے ہیں۔ تاج فغفور چین کے بادشاہ کا تاج، تخت خاقانی ترکستان کے بادشاہ کا تخت، جمشید کا جام جس پیالے میں وہ ملک کے تمام حالات دیکھ سکتا تھا، راح ریحانی وہ خوشبو بھری شراب، عقل یونانی یعنی افلاطون ارسطو وغیرہ کی عقل مندیاں، حضرت داؤدg کا وہ لحن جس کو سن کر پرندے تک مست ہو جاتے تھے حُسنِ کنعانی حضرت یوسفg کا حسن، چشمہ خضر جس سے خضر نے آبِ حیات پیا ہے خاتم سلیمانی یعنی حضرت سلیمانg کی انگوٹھی جس پر کہتے ہیں اسم اعظم لکھا ہوا تھا اور اس کے باعث تمام مخلوقات آپ کی مطیع تھیں۔ یہ تمام چیزیں فریب بے حقیقت غلط اور دھوکا ہے۔ میں ان تمام کی پروانہیں کرتا۔

ہے سراسر فریب وہم و گماں تاج فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے شکل موج سراب جامِ جمشید و راحِ ریحانی
لفظ مہمل ہے نطق عرابی حرف باطل ہے عقل یونانی

315

ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی | اک تماشا ہے حسنِ کنعانی
بحرِ ہستی بجز سراب نہیں | چشمہ زندگی میں آب نہیں

اس لیے شاعر کہتا ہے:

نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک | چشمہ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے | گر ملے خاتمِ سلیمانی

اس لیے بہتر یہ ہے کہ عمر بے وفا پر بھروسہ نہ کیا جائے اور زمان اور مکان سے دل کو جوڑا نہیں بلکہ توڑا جائے۔

تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر | تو نے کی جس سے بے وفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ | ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
جس سے دنیا نے آشنائی کی | اس نے آخر کو کج ادائی کی

حالیؔ نے مصرعوں میں صنعت تضاد سے معنی آفرینی پیدا کی ہے۔ آشنائی، بیگانہ، وفا، بے وفا، صلح اور لڑائی وغیرہ۔ ع

صلح میں چاشنی لڑائی کی

پھر گریز کر کے اس درد اور بے وفائی کو غالب کی موت سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس گریز کی خوبصورت اور حاصل بند شعر کا کمال یہ ہے کہ غالبؔ کا تقابل اور مقام چار فارسی کے عظیم شاعروں یعنی خاقانی، سنائی، عرفی اور طالب آملی سے اس طرح سے ہوتا ہے کہ وہ اس گلدستہ کے گل سرسبد نظر آتے ہیں:

بات بگڑی رہی سہی افسوس | آج خاقانیؔ و سنائیؔ کی
رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد | اسد اللہ خان غالبؔ مرد

دوسرے بند کا ٹیپ کا شعر فارسی میں ہے لیکن اُردو میں عام فہم ہے۔

حالیؔ نے غالب کی نظم و نثر سے ایسے نکات چنے ہیں جن کو اگر عنوان بنا کر ان کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ حالیؔ نے غالب کو صرف دیکھا اور سنا ہی نہ تھا بلکہ پڑھا اور بڑی حد تک سمجھا بھی تھا۔ جہاں تک غالب کے شاگردوں کا تعلق ہے کوئی بھی حالیؔ کی غالبؔ شناسی

اور غالبؔ فہمی تک نہیں پہنچا۔ حالیؔ نے غالبؔ کے کلام کے قطروں میں دجلہ دیکھا اور دکھایا۔ ممکن ہے دوسرے ارباب فکر وفراست نے بھی ان چیزوں کا بغور مشاہدہ کیا ہو لیکن کیوں کہ انہوں نے اس بصیرت کو فضا میں بکھیرنے کے بجائے قبر کی تاریکی میں سینوں میں بند رکھا ہم ان پر کیا کہہ سکیں گے۔ کچھ اشعار اور مصرعوں کو جوڑ کر ہم غالب کے فن کے کمال پر حالیؔ کی فکر کی روشنی دکھاتے ہیں:

بلبل ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس
نثر حسن و جمال کی صورت
نظم غنج و دلال کی صورت
قال اس کا وہ آینہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت
اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی
شکل امکاں محال کی صورت
اس کی تاویل سے بدلتی تھی
رنگ ہجراں وصال کی صورت
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

حالیؔ نے اس مرثیے میں غالبؔ کا ذکر فارسی کے دس بارہ شاعروں سے کیا ہے۔ حالیؔ جانتے تھے کہ غالبؔ نے اپنے ایک قطعہ میں خود کو بھی ان شاعروں کی محفل کا شاعر کہا تھا:

ای کہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم
چہ بما منت بسیار نہی از کم شان

315

ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود
یاد در خلوت شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالبؔ سوختہ جان گرچہ نیرزد بشمار
ہست در بزم سخن ہم نفس وہم دم شان

یعنی اے کہ تو نے ایرانی شعرا کی بات کر کے ہم پر ان چند شعرا کے احسان دھرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان میں ایسے خوش گوشاعر موجود ہیں جن کی معطر سانس سے ہوا ان کی خلوت کو مشک کی خوشبو کر دیتی ہے۔ اُن میں مومن خان مومن، ضیاءالدین احمد خان نیر، امام بخش صہبائی، عبداللہ خان علوی، مصطفی خان حسرتی، اشرف اور مفتی صدرالدین آزردہ جیسے عظیم شعرا موجود ہیں۔ اگر چہ غالبؔ بدنصیب کسی شمار کے قابل نہیں لیکن پھر بھی بزم سخن میں ان عظیم شعرا کا ہمدم اور ہم نفس ہے۔

غالبؔ نے متعدد مقامات پر اپنے فارسی کلام میں کہیں عجز وانکساری کے ساتھ اور کہیں تعلّی کے ساتھ اپنا تعارف کروایا ہے۔

بیا و ریدگر اینجا بود زبان دانی   غریب شہر سخن ھای گفتنی دارد

اگر کوئی زبان کا ماہر ہے تو لائیں میں جو اس شہر کی زبان کا بیگانہ ہوں بات کرنا چاہتا ہوں۔

زلہ بردار کس چرا باشم   من ہمائیم مگس چرا باشم

کسی کے دستر خوان کے ٹکڑے کھانے والا کیوں رہوں میں ہما ہوں مجھے مکھی بننے کی ضرورت کیا ہے:

تو ای کہ محو سخن گستران پیشی   مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

تو جو گزرے بڑے شاعروں کا ذکر رہا ہے غالب کا منکر نہ ہو جو تیرے دور میں موجود ہے۔

کیفیت عرفیؔ طلب از طینت غالبؔ　　　جام دگران بادۂ شیراز نہ دارد

چاہتے ہو عرفی کی شعریت کا مزا چکھو تو غالب کا جام لو دوسرے ساغروں میں شیرازی شراب نہیں۔

مسنج شوکت عرفی کہ بود شیرازی
مشو اسیرِ زلالی کہ بود خوانساری
بہ سومناتِ خیالم درآی تا بینی
روان فروز بر و دوشھای زناری

تم شوکتؔ عرفیؔ کے شیرازی اور اسیرؔ کے خوانساری یعنی ایرانی ہونے کی وجہ سے مرعوب نہ ہو بلکہ تم میرے سومناتی خیالات کی دنیا میں آ کر تو دیکھو جہاں میری روحانی تجلی میرے کاندھوں سے بکھر رہی ہے اگرچہ میرے سینے پر زنار پڑا ہوا ہے۔

حالیؔ نے مرثیہ میں غالبؔ کے مقام کا تعین کیا ہے۔ آج تک کسی نے ایسا ہنرمندانہ تنقیدی کام نہیں کیا۔ کوئی فارسی غیر ملکی یہ کام نہیں کر سکتا۔ عربی محاورہ ہے کہ سب سے اچھی ہماری انگلی ہی ہوتی ہے جو اپنی پیٹھ کھجا سکتی ہے۔ حالیؔ کے کچھ شعر دیکھیں:

اہل ہند اب کریں گے کس پر ناز
رشک شیراز و اصفہان نہ رہا
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت
بات بگڑی رہی سہی افسوس
آج خاقانیؔ و سنائیؔ کی
رشک عرفیؔ و فخر طالبؔ مرد
اسد اللہ خاں غالبؔ مرد
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہل انصاف غور فرمائیں

قدسیؔ و صائبؔ و اسیرؔ و کلیمؔ
لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھیرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

ناظم ہروی نے فارسی کے عظیم شاعروں کو اپنی مثنوی میں نظم کیا تھا جس میں عنصریؔ سے جامیؔ تک کا ذکر تھا۔ اس مثنوی کے اشعار میں غالب نے آخری شعر کا اضافہ کر کے فارسی کلاسیک شاعری پر مہر لگادی۔ ناظم ہروی کہتے ہیں:

شنیدم کہ در دور گاہ کھن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساط سخن
نظامی چو جام اجل در کشید — سر چتر دانش بہ سعدی رسید
چون اورنگ سعدی فروشدز کار — سخن گشت برفرق خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

اس مثنوی میں غالبؔ نے اضافہ کیا۔

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

غالبؔ کے مرنے سے جو اقلیم سخن کو نقصان پہنچا اس کا ذکر بڑی خوبی کے ساتھ حالیؔ نے کیا حالیؔ جانتے تھے غالبؔ کی مسند خالی رہے گی:

نقد معنی کا گنج داں نہ رہا — خوان مضموں کا میزباں نہ رہا
رونق حسن تھا بیاں اس کا — گرم بازار گل رخساں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں — گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن — کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن

شاعری کا کیا حق اس نے ادا پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے علم و فضل و کمال کی صورت

ہند میں نام پائے گا اب کون سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون

ملک یک سر ہوا ہے بے آئیں اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں

حصر تھی اک بیاں میں رنگینی کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں

لب جادو بیاں ہوا خاموش گوشِ گل وا ہے کیوں گلستاں میں

جہاں تک اخلاق انسان دوستی احترام عجز و انکساری اور بھائی چارگی تھی غالبؔ ایک فرشتہ صفت آدمی تھے۔ حالیؔ نے یہ اخلاق کچھ اپنی فطرت کچھ اپنے استاد غالبؔ سے سیکھے تھے۔

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج رند اور مرجع کرام و ثقات

پاک دل پاک ذات پاک صفات۔

بے ریائی تھی زہد کے بدلے زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی سر بلندوں سے انکسار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا معنیٔ لفظ آدمیت تھا

حالیؔ نے مرزا غالبؔ کی شخصیت اور فطرت کو "معنیٔ لفظ آدمیت" کہہ کر قلم توڑ دیا۔ غالبؔ دہلوی تھے۔ حالیؔ دلی کے عاشق تھے۔ دلی غالب کی تھی اور غالب دلی کے لیے تھے۔ حالیؔ نے غالبؔ کے بغیر دلی کو ویرانہ بنا کر جو پیش کیا ہے وہ سچ ہے:

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

شہر سارا بنا ہے بیت حزن ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے جا کے دلی سے آئے گا اب کون

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد کس سے خالی ہوا جہاں آباد

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلی خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ آغا حیدر حسن نے حالی کے مصرعہ میں تضمین کر کے "مرزا نوشہ تھا اور دلی برات" /1879ء تاریخ وفات نکالی ہے۔

حالی کے اس مرثیے میں ایسے بھی مصرع موجود ہیں جن سے جلوس جنازہ اور تدفین کی منظر کشی کا سماں پیدا ہوتا ہے:

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے	اس کو دل سے بھلائے گا اب کون
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے	غالب بے مثال کی صورت
بارِ احباب جو اٹھاتا تھا	دوش احباب پر سوار ہے آج
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں	اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر	ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو	سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

مرثیے میں حالی نے شاگردی کا فیض استاد غالب کی اصلاح شاعری کے وہ رموز جس نے خالی ذہنوں کو عالی کر دیا بیان کیا ہے۔ ان شعروں میں جذبات کی شدت ہے جیسے وہی شخص پوری طرح سے درک کر سکتا ہے جس پر یہ سانحہ گزرا ہے۔

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل	کس سے داد سخن وری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب	کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضمون ہے نوحہ استاد	کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
مر گیا تشنہ مذاق کلام	ہم کو گھر سے بلائے گا رب کون
مر گیا قدر دانِ فہم سخن	شعر ہم کو سنائے گا رب کون
تھا بساط سخن میں شاطر ایک	ہم کو چالیں بتائے گا رب کون
شعر میں نا تمام ہے حالی	غزل اس کی بنائے گا رب کون

خواجہ امداد حسین نے جو حالی کے بڑے بھائی تھے حالی کی پرورش اور تربیت اس خوبی سے کی کہ کبھی حالی کو ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ حالی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کو باپ کی جگہ مانتے تھے۔ امداد حسین ہی کے کہنے پر حالی نے ماموں کی بیٹی اسلام النساء سے شادی کی

تھی۔ حالیؔ کے بڑے بیٹے اخلاق حسین کو انہوں نے گود لیا تھا کیونکہ ان کی خود کوئی اولاد نہیں تھی۔ حالیؔ اپنے بڑے فرزند اخلاق حسین کو تمام عمر برادر زادہ کہہ کر یاد کرتے تھے۔ خواجہ امداد حسین کو شعر و ادب سے لگاؤ تھا اور وہ بھی شعر کہتے تھے اور مظہرؔ تخلص کرتے۔

ان کا انتقال 1304 ہجری مطابق 1886ء۔ 1887ء میں دہلی میں ہوا اور وہ وہیں خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ مرنے سے چند مہینے قبل وہ علاج کے سلسلے میں حالیؔ کے پاس دہلی میں مقیم تھے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی حالیؔ کی لگن اور دن رات کی تیمارداری نے بھی ان کو موت سے بچا نہ سکی۔ خواجہ امداد حسین کی موت کا صدمہ حالیؔ پر شدید ہوا۔ حالیؔ نے ان کی موت پر ایک 20 بیس اشعار کا مرثیہ لکھا جو ان کے جذبات کا ترجمان ہے اس کے چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

حالیؔ ہی کو معلوم ہے حالیؔ کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی
آتے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑنے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالیؔ کا سا بھائی
غم بھائی کا مر جانے کی ہے اس کی نشانی
جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سائے میں کٹی اس کی جوانی
شفقت نے دیا جس کی بھلا مہرِ پدر کو
دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

حالی نے سرسید اور مختار الملک تراب علی خان سالار جنگ کے مرثیے فارسی میں لکھے۔ سالار جنگ کا مرثیہ 1883 عیسوی میں تصنیف کیا جس میں ((27 شعر ہیں جب کہ سرسید کے شاہکار مرثیے میں ((70 اشعار ہیں اور یہ 1898ء میں تصنیف کیا گیا۔ ان مراثی کے علاوہ حالی نے دس سے زیادہ قطعات تاریخ وفات فارسی میں لکھے۔

سر سالار جنگ کے انتقال پر جو مرثیہ ترجیع بند میں لکھا۔ اس کا تکراری شعر ہے:

اے اجل گرتن بے جاں تہ خاکش سپری
نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

یعنی اے موت اگر چہ تو نے بے جان بدن کو خاک میں چھپا دیا ہے لیکن تو نیک نامی کو لوگوں کی یاد سے مٹا نہیں سکتی۔

سالار جنگ کی علی گڑھ کالج کو مدد کے علاوہ ان کی فکر و تدبر کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس کی مثال مشکل ہے اور ہندوستان کی خاک سے ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے۔

آہ از آن عقل و کفالت کے نہ بینیش مثال
سپس از ہند چنین مرد نہ خیزد صد سال

سرسید کا مرثیہ:

سچ ہے: ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

یہ مرثیہ حالی کے فن اور ان کے سرسید سے خلوص کا شاہکار ہے۔ حالی نے سرسید کے مرثیہ کو فارسی میں ترکیب بند کے سات بندوں میں تخلیق کیا جس کے ہر بند میں دس شعر ہیں۔ یہ مرثیہ ایرانی شاعر محتشم کاشی کے مرثیے کی بحر میں ہے۔ یہ فارسی کا مرثیہ مئی 1898ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔ مرثیہ کے پہلے حصے میں سرسید کے انتقال سے جو رنج و غم کی لہر برصغیر میں پھیلی اور ان کی کمی سے جو شدید نقصان قوم کو ہوا اس کا بڑے ہی خوبصورت اور پر تاثیر انداز میں کیا ہے جو ان کی قلبی واردات اور فن پر مہارت کی دستاویز بھی ہے:

اے عجب کز مردن یک پیر مرد سال خورد

تاب و تب در کودک و پیر و جواں انداختند

اے عجب کز سوزِ اندوہِ وفاتِ مسلمے
مردمِ ہر کیش را آتش بجاں انداختند

سید اندر قوم نقدے بود اندر کیسہ
کیسہ خالی ماندہ و نقد از میاں انداختند

قوم را سرمایہ مجد و علا از دست رفت
بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند

یعنی تعجب ہے کہ ایک بڈھے کے مرنے سے اضطراب اور بے چینی بچوں، جوانوں اور بزرگوں میں پھیل گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان کی موت نے ہر قوم وملت کے لوگوں کے دلوں کو جلا دیا ہے۔ سرسید قوم کی تھیلی کی نقدی تھے چناں چہ نقدی گر گئی اور اب تھیلی خالی ہے۔ قوم کی تعمیر اور عظمت کی دولت ہاتھ سے نکل گئی اور بعد میں اُسے خاک میں دفن کر دیا گیا۔ سرسید نے تمام عمر ملت اور دین کی حفاظت کی یہی ان کا حج تھا یہی روزہ اور یہی ان کی نماز وہی قوم کا سید اور سردار ہے جو قوم کا خدمت گزار ہے یقیناً سرسید کی سیادت اس کی گواہی بھی دے رہی ہے:

درمصافِ دہر بودن دین و ملت را سپر
حج او ایں بود ایں بیش صوم و ایں بودش صلوٰۃ
سید القوم ست ہرکس قوم را خدمت کند
خدمت او بر سیادت بس بود او را گواہ

حالی مرثیے کے تیسرے بند میں انسان بننے کی اہمیت کو بہت خوبصورت تمثیلوں اور تلمیحوں سے مضمون باندھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ حالی کہتے ہیں کوئی فضل وعلم میں نابغہ روز ہوسکتا ہے کوئی فصاحت میں مثل سحبان یا عقل وحکمت میں لقمان جیسا بن سکتا ہے، دولت میں قارون کو پیچھے کر سکتا ہے سلطنت اور ثروت میں خسرو اور پرویز بن سکتا ہے کہیں بہادری میں رستم تو کبھی قطب اور غوث سب کچھ ہوسکتا ہے مگر انسان ہونا دوسری چیز ہے۔

315

انسان وہ ہے جو ہمسائے کے رنج و درد سے بے تاب رہتا ہے وہ جنت کی ہوا میں بھی محروموں کی زندگی سے افسردہ رہتا ہے وہ دوسروں کے مقابل خود کو خوار و ذلیل محسوس کرتا ہے اس کا دل دکھ سے بھرا رہتا ہے اگر چہ شبستان ہی میں کیوں نہ ہو کیونکہ وہ محنت کشوں کی زحمتوں کا احساس رکھتا ہے۔

می تواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن
در فصاحت ہمچو سحباں، در خرد لقماں شدن

می تواں در جاہ و ثروت گوے از قاروں ببرد
می تواں در زہد و طاعت غیرتِ صنعاں شدن

می تواں در ملک و دولت خسرو پرویز گشت
می تواں در زور و طاقت رستم دستاں شدن

می تواں قطب زماں شد، می تواں شد غوثِ وقت
ہرچہ خواہی می توانی شد بجز انساں شدن

چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسایگاں
از سموم نجد در باغِ عدن پژماں شدن

خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنتِ زنداں شدن

پھر اس مضمون کو خوبصورت گریز سے دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔ قوم کی فکر میں زندگی گزارنا اور قوم ہی کے زندان میں گھٹ کر مر جانا اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ سرسید احمد خان بن سکتا ہے۔

زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم
گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

حالیؔ نے مرثیے کے چوتھے بند میں بتایا کہ سرسید کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ سرسید کو ہر طرح سے برا کہا گیا۔ سرسید پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا یعنی ایک پورا محاذ سرسید کے

خلاف کھڑا کیا گیا لیکن سرسید کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی وہ شیر مردوں کی طرح اپنی داخلی روشنی اور حرارت سے کام کرتا رہا وہ محفل کو روشن رکھنے کے لیے شمع کی طرح خود پگھلتا رہتا لیکن اپنے گھوڑے کی لگام آخری وقت تک منزل مقصود کے پہنچنے تک تھامے رہا اگرچہ راستہ کانٹوں بھرا تھا حیف کہ نادانوں میں جو دانا تھا چلا گیا، جو بنجر زمین میں میوہ دار درخت تھا اکھڑ گیا:

بود در امت بہ بدعت متہم از راستی
آرے ایں باشد دریں عالم سزائے راستاں

یار جز علمش نہ بود و علم دانی نا درست
ایں چنیں بے کس سزد کز جہل پردازد جہاں

بود یاراں را سپر تا بود در ہر شور و شر
لیک یاراں بر سرش تیغ جفا می آختند

خواجہ در فکرِ صلاحِ دین و ملت در گزشت
لیک اہلِ دین و ملت قدرِ اُو نشناختند

کار کارِ شیر مردان است کز سوزِ دروں
بزم را افروختند و شمع ساں بگداختند

سید از رہ تا دمِ آخر عناں را برنتافت
گرچہ در راہش بسے خار و خسک انداختند

حیف کاندر جمعِ مستاں ہوشیارے بود، رفت
در زمینِ شور نخلے بار دارے بود، رفت

اے علی گڑھ! ذرا تو ہی بتا کس نے تجھے شہروں میں شہرت یافتہ کیا کس نے تیری خاک آسمان پر پہنچا دی۔

اے علی گڑھ آں کہ کردت شہرہ در امصار، کو؟
آں کہ از خاکت بہ گردوں برد آں معمار، کو؟

حالیؔ مصلح بھی ہیں مجدد بھی ہیں۔ وہ سب سے زیادہ قوم کی فکر میں ہیں انہیں معلوم ہے کہ

ہمارے قدم رکنے نہ پائیں یہ تعلیمی تربیتی ادارے اسی طرح سے ترقی کے راستے پر گامزن رہیں۔ وہ مرثیہ کے آخری بند میں اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں جس کے لیے یہ سارا مرثیہ کہا گیا۔ وہ ملت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں سرسید نے دارالعلوم تمہارے لیے بنایا ہے تاکہ نسل در نسل دولتِ علم سے مالا مال رہے انہوں نے پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر نکالی ہے جو پانی نالے میں بہہ چکا تھا اُسے واپس لوٹا دیا ہے مجھے خوف یہ ہے کہ مخالفت کے زور سے یہ چشمہ کا پانی استعمال کے قابل نہ رہے ہاں یہی اور صرف یہی وقت ہے کہ ہم سب باہم متفق ہو جائیں۔ عزم و استقلال کے ساتھ کھڑے ہوں ہاتھوں میں ہاتھ ہو اور ہماری کمریں کام کرنے کے لیے کسی ہوئی ہوں۔

خواجہ دارالعلمے از بہرِ شما بگذاشت است
تا بود نسلِ شما از علم و دولت بہرہ ور

کوہ باکندہ است تا ایں جوئے شیر آوردہ است
بو کہ آب رفتہ در جوئے شما آید ز سر

ترسم ایں سر چشمہ گردد تیرہ از سنگِ خلاف
ہان و ہاں وقت است، وقتِ اتفاقِ ہم دگر

عزم جزم آرید و برخیزید و ہم دستاں شوید
دست بکشائید و بربندید دامن بر کمر

جہاں تک زبان و بیان، سوز و تاثیر زور و جذبات کا تعلق ہے یہ فارسی کا مرثیہ حالیؔ کی فارسی تصانیف کا گل سرسبد ہے۔ یہاں تشبیہات کی ندرت، استعارات کی لطافت، ترکیبوں کی بلاغت اور لفظوں کی فصاحت حالی کی فارسی شاعری کا سکہ منوا رہی ہے۔ خلیفہ سید محمد حسن خان اور خلیفہ سید محمد حسین خان جو ریاست پٹیالہ کے وزیر تھے اور حالیؔ سے ان کے تعلقات ان کی آنکھ کے آپریشن کے سلسلے میں برقرار تھے۔ دونوں بھائی سرسید کے حامی تھے اور علی گڑھ کے خیرخواہ تھے حالیؔ نے دو جداگانہ قطعات میں دونوں مرحومین کی علم دوستی، تدبر اور پختہ کاری پر روشنی ڈالی ہے دونوں بھائیوں کا انتقال کچھ سالوں کے فاصلے سے ہوا۔ ان نو نو اشعار کے دونوں قطعات سے دو دو شعر یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔ خلیفہ سید محمد حسن کے بارے میں حالیؔ لکھتے ہیں:

گر بکاوند ہمہ مملکت خالصہ را
این چنین صاحب تدبیر و خرد نتواں دید
در علی گرھ کہ بنا یافتہ دارالعلمی
از مددگاری و یارش بسی داشت امید

یعنی اگر ریاست خالصہ یعنی پٹیالہ کو پوری طرح تلاش کیا جائے تو اس طرح کا عقل مند اور مدبر وزیر نہیں مل سکتا۔ علی گڑھ جو دارالعلوم بنایا گیا موصوف کی مدد اور یاری سے مستفید ہے۔ خلیفہ سید محمد حسین خان بھی بڑے عالی مدبر اور سیاست مدار تھے۔ وہ ایک پختہ کار مشیر سلطنت تھے۔

آن بہ صورت انس در سیرت ملک
آن بہ دانش پیر و در ہمت جواں
آن بہ تدبیر و خرد بوزرجمہر
آن بہ حزم ورائے سولونِ زماں

یعنی وہ اگر چہ صورت شکل میں انسان تھے لیکن فرشتہ صفت سیرت کے مالک تھے ان کی حکمت عملی پختہ اور ان کی ہمت جوان تھی۔ وہ عقل اور تدبیر میں ایران کے بوزرجمہر معلوم ہوتے تھے جب کہ رائے اور مشورے میں اپنے دور کے سولون تھے۔

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی کی وفات کی قطعہ تاریخ نکالی جو یہ ہے:

زخمے از مرگِ چراغ علی آمد بر دل — کہ از و خاطرِ افکار بصد غم شدہ جفت
از خرد سال دفاتش جو بجستم 'محمود' — ''شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا'' گفت

مولوی چراغ علی کے انتقال پر ان کی تاریخ وفات 1895ء سرسید کے فرزند سید محمود نے نکالی ''حیف چراغ علی از دنیا نہاں شد''۔ حالیؔ نے اس تاریخ کو قطعہ میں نظم کیا۔

اس کے علاوہ مولانا حالیؔ نے خود بھی ایک قطعہ مرحوم کی وفات پر لکھا ہے، جس میں گویا مرحوم کے کام اور سیرت کی کامل تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہ ہے:

آہ آہ از رحلتِ بے گاہ اعظم یار جنگ — گزمیانِ رہ ہمراہان عناں پیچید و رفت
حیف دنیا را بہ پنجابہ سالگی کردہ وداع — بزمِ ما را بزمِ ماتم باز گردانید و رفت

مستفیداں پُر نہ کردہ دامن معنی ہنوز مشتے از گنجینہ لعل و گہر پاشید و رفت
از سحابِ فیض کلکش ناشدہ سیراب خلق ساعتے برقِ یمانی ازافق تابید و رفت
عقد ہانکشودہ ماند و نکتہ ہا نوشتہ ماند بہر جوئے شیر کوہِ بے ستوں کوکندید و رفت
کرد بے آزارِ خلق اعمالِ سلطانی ادا نے زکس رنجیدو نے کس رابرنجانید و رفت
یادراں قوم راتا زیست یادر بود و یار ہرچہ بتوانست در تائیدِ شاں کوشید و رفت
از دل پُر دردِ اوگاہے صدائے برنجاست مدتے چوں بحر کامل در نہاں جوشید و رفت
طبعِ آزادش بہر ملت کو بیٔ صلح داشت دردل خویش و دل بیگانہ در گنجید و رفت

گر رید صد سال کس انجامِ او مرگست و بس
چوں شرر وضعِ دوراں مینواں خندید و رفت

محمد چراغ علی سرسید کے اہم مصاحبین سے تھے۔ وہ پہلے یوپی میں سرکاری ملازم تھے بعد میں حیدر آباد چلے گئے انہوں نے مذہبی مناظروں اور بحثوں میں حصہ لیا۔ سرسید کی حیات میں 1895ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے مضامین عمدہ رسالوں میں چھپتے تھے۔ بقول سرسید کے عربی، فارسی کے علاوہ عبرانی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے دو اہم کتابیں انگریزی میں لکھیں جن کا اُردو ترجمہ تحقیق جہاد اوراعظم الکلام فی ارتقاءالاسلام کے نام سے اُردو میں شائع ہوا۔

حالؔی کی تحریروں اور تقریروں کے علاوہ ان کے اشعار میں سرسید تحریک سے منسلک سرسید کے دوست واحباب، ان کے مصاحب اوران کے حامیوں کے کارناموں پر عمدہ معلومات ملتے ہیں۔ حالؔی نے سرسید کے دودیرینہ ساتھی خان بہادر ملک برکت علی خاں اور سیدزین العابدین کے انتقال پر 1905ء میں ایک مرثیہ سرسید کے دورفیق کے عنوان سے لکھا جس کے کچھ منتخب شعر یہ ہیں:

حیف دنیا سے کیا برکت علی خاں نے سفر جس سفر سے ہے جوانوں کو نہ بوڑھوں کو مفر
قوم کی خدمت کا جو سید سے سیکھا تھا سبق وہ سبق مرحوم نے بھولا نہ ہرگز عمر بھر
ایسے مالی اور کمیرے گر نہ ہوتے دست یاب پود سید کی نہ ہوتی تا قیامت بارور
دست و بازو تھے یہی اُس جاں نثار قوم کے جن کی سرگرمی سے لائیں کوشش اس کی ثمر
ورنہ تھی چھائی ہوئی بیڑے پہ سرسید کے یاس رات اندھیری وقت بھیانک اور دریا پُرخطر

ان عزیزوں نے دیا اس وقت سرسید کا ساتھ — جب کہ پرچھائیں سے اس کی قوم کرتی تھی خدر
بعد اس ماتم کے زین العابدین خاں کی وفات — وہ اگر داغِ جگر تھا تو یہ ہے داغِ دگر
کوئی چیز اُس نے کبھی رکھی نہ سید سے عزیز — بے تکلف اس کا گھر گویا کہ تھا سید کا گھر
کی علی گڑھ میں سکونت اس کی خاطر اختیار — سب وطن اور رشتہ داری کا تعلق توڑ کر
آخرش پہلو میں سید کے کیا اس نے مقام — جب کیا مہماں سرائے دار فانی سے سفر

حالی یہاں یہ بھی بتانا چاہ رہے ہیں کہ سرسید کے یہ قریبی دوست ومصاحب اگر چہ اختلاف رائے رکھتے تھے ان میں بعض مسائل پر بحث ورنجش ہوتی لیکن ان سب کا مقصد ایک تھا اور وہ قوم کی فلاح اور بہبود۔

دیکھتے اے کاش ان بوڑھوں کے یارانے کا رنگ
وہ جواں جو طعنہ زن بوڑھوں کے ہیں اخلاص پر
رنجش الفت بھری شکوے سراسر مہر خیز
چھیڑ لطف انگیز خفگی اس سے لطف انگیز تر
رائے ہر اک کی جدا تیل اور پانی کی طرح
متحد لیکن مقاصد صورت شیر و شکر

حالی نے محسن الملک کے نو((9 شعر کے مرثیے میں انہیں سرسید ثانی کہا ہے:

سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اُس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار — سر کے مہم قوم کے کام آ گیا آخر

ملکہ وکٹوریا کا مرثیہ:

حالی نے مارچ 1901ء میں علی گڑھ کالج کے ایک ٹرسٹی کی حیثیت سے ترکیب بند ہیت میں((75 اشعار پر مشتمل مرثیہ لکھا جس میں ملکہ اور انگریز حکومت کی تعریف کی۔

آج گھر گھر ہے وہی ماتم جہاں میں جس سے ہے

315

زلزلے میں کینیڈا سے لے کے تا ہندوستاں

اے کوئن وکٹوریا اک تجھ کو کیا آئی اجل
کچھی دنیا کے ہاتھوں سے گئی گویا نکل

ہے دلیل اس کے لیے کافی فقط تیری مثال
مرد پر عورت فضیلت کا کرے گر ادعا

کی تجارت نے ترقی عہد میں یاں تک ترے
سلطنت ہے اُس کے آگے ہیچ بے چون و چرا

جس قدر علمی فتوحات اس زمانے میں ہوئیں
دہر کی تاریخ میں ملتا نہیں اُن کا پتا

علم میں روزِ ازل سے تھی جو اک طاقت نہاں
صاحبی میں تیری یہ راز آشکارا ہو گیا

ہو گئے ہر برِّاعظم میں ترے برپا علَم
تیرے بیڑوں اور جہازوں سے سمندر پٹ گیا

شاعروں کے جس قدر مدح سلف میں تھے غلو
حق میں تیرے وہ حقائق بن گئے سر تا بہ پا

سچ ہے "وہ وارث زمیں کے ہوں گے جو ہوں گے حلیم"
حلم سے اپنے ملی آفاق میں مکنت تجھے

"وہ تسلی پائیں گے دنیا میں جو جھیلیں گے غم"
ہو چکے غم بس تسلی دے گی اب راحت تجھے

فرد تھی اقبال میں تو، بے نظیر اخلاق میں
تیرے مرنے سے ہے سناٹا سا اک آفاق میں

وہ نہیں لاتے بجا شکر خدائے ذوالجلال

io

ہند نے پایا ترے دورِ حکومت میں وہ امن
اگلے دوروں میں نہ تھا جس کا کہیں خواب وخیال

لی گئی قحط اور وبا میں ملک کی جو یاں خبر
تھا زمانہ تیرا اس میں آپ ہی اپنی مثال

شکر آزادی کا تیرے عہد کی ممکن نہیں
سب کا اس احسان میں جکڑا ہوا ہے بال بال

ہم سمجھ لیتے کہ ہیں ہر قید سے آزاد ہم
قید احساں سے ترے چھٹنے کی گر ہوتی مجال

ہے علی گڑھ میں ہماری یہ جو قومی درس گاہ
ہے حقیقت میں یہ تیرے نام کی اک یادگار

اس کی رسم فونڈیشن اور جشن قیصری
دونوں تقریبیں ہوئی ہیں ایک ہی وقت آشکار

جب تلک قائم ہے کالج جب تلک باقی ہے قوم
یہ شہنشاہی عطیہ یاں رہے گا یادگار

حالؔی نے ملکہ وکٹوریا کے مرثیہ میں اس کی عورت ہو کر بھی مردوں سے زیادہ کام کرنے اور علم اخلاق، انصاف اور معاشرے کے مثبت اقدامات کا تذکرہ کر کے اُسے اعلیٰ انسانوں کی صف میں شمار کیا ہے۔ علی گڑھ کی تاسیس اور ترقی میں اس کا گراں قدر حصہ بتایا ہے۔ ملکہ کی نجات اور اس کی رعایا پروری پر بائبل کے حوالے بھی دیے ہیں۔ حالؔی نے اسی مرثیے میں ایڈورڈ ہفتم سے امید بھی دکھائی ہے۔

حالؔی کا ایک نو اشعار کا نوحہ بھی ہمیں ملتا ہے جو رسالہ معارف میں 1901ء میں شائع ہوا تھا۔

ہند پر شاق ہے اے قیصرہ رحلت تیری
تھی رعیت کے لیے موت قیامت تیری
کر لیا تھا تیری سیرت نے دلوں کو تسخیر

گو کہ دیکھی نہ تھی ہم نے کبھی صورت تیری

حالی کی اس قسم کی انگریزوں کی مدح وثنا میں نظمیں خصوصاً اُن افراد کو جن کی آزادی ملک اور زندگی کو قیصر نے تسخیر کر لیا تھا وہ ملکہ کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے چناں چہ اگر انہوں نے حکومت کے دباؤ اور ظلم وستم کی وجہ سے کچھ نہیں کہا تو ان کی نسلوں نے یہ نفرت اپنے سینوں سے اگل دی جو نسل درنسل سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔ چناں چہ حالی پر کیے گئے اعتراضات کا بڑی حد تک منصفانہ جائزہ صالحہ عابد حسین نے یادگارِ حالی میں لیا ہے جس کے کچھ اقتباسات ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

''حالی پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ سچے محبِ وطن نہ تھے بلکہ انگریز کے بہی خواہ، مدح خواں اور ساتھی تھے۔ اُنہوں نے انگریزی حکومت کی تعریف کی ہے۔ ملکہ وکٹوریا اور بعض دوسرے حاکموں کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ مسلمانوں کو انگریز حکومت کا ساتھ دینے اور مغربی تعلیم کا حامل بنانے کی تبلیغ اور کوشش کی ہے۔ (یادگارِ حالی کے ایک محترم تبصرہ نگار نے اس پر یہ اعتراض فرمایا تھا کہ مصنفہ نے حالی جیسے انگریز پرست کو زبردستی قوم پرست بنانے کی ناکام کوشش کی ہے) ان اعتراضوں کا کچھ حصہ صحیح ہے اور کچھ غلط اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے ابتدا میں انگریزی یعنی ملکہ وکٹوریا کی حکومت کو ہندوستانیوں کے لیے خصوصاً مسلمانوں کے لیے رحمتِ الٰہی سمجھا تھا۔ انہوں نے انگریز حاکموں کی تعریف بھی کی اور مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی۔ مغربی تعلیم کے زبردست حامی تھے اور اہلِ وطن کی ترقی وفلاح کا واحد ذریعہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ مغربی علوم حاصل کریں۔ لیکن کیا اس سے حالی کے محبِ وطن ہونے پر کوئی حرف آتا ہے؟ یا وہ انگریز پرست اور ابن الوقت ثابت ہوتے ہیں؟ یہ کہنا تعصب اور تنگ نظری کی دلیل اور حالی کی زندگی، سیرت اور خیالات سے ناواقفیت پر مبنی ہوگا۔ ہم حال اور ماضی کے فرق کو اور حالات کے تضاد کو پیشِ نظر رکھ کر ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حالی محبِ وطن، قوم پرور اور وطن پرست تھے یا انگریز پرست۔

حالی نے جب ہوش سنبھالا تو اُدھر ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا تسلط بٹھا رہی تھی اور ایک کے بعد ایک ریاست ہڑپ کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ 1857ء میں غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ پہلے شورش

پسند عناصر نے ملک کی آزادی کے نام پر ظلم و بربریت کے مظاہرے کیے اور پھر کمپنی نے بدلے میں ظلم واستبداد کی انتہا کر دی۔ اس بغاوت میں مسلمان پیش پیش تھے اور انتقام کا شکار بھی زیادہ تر وہی ہوئے۔ دلی کی حکومت ختم کر دی گئی بادشاہ کو قید کر کے جلا وطن کیا گیا۔ ملکہ وکٹوریا نے ہندوستان کو براہ راست اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

ہنگامی دور گزر جانے کے بعد برادرانِ وطن نے بہت جلد بدیسی حکومت کو اپنا لیا اور مغربی تعلیم حاصل کرنے میں بھی وہ پیش پیش نظر آنے لگے۔ لیکن دوسری طرف مسلمانوں کو ایک طرف ''اپنی حکومت'' کے جانے کا غم تھا تو دوسری طرف بدیسی حکومت سے مذہبی تعصب بہت بڑھا ہوا تھا۔ وہ انگریزی حکومت سے ٹکر نہ لے سکتے تھے البتہ غم و غصے میں مغربی علوم سے دشمنی مول لے لی تھی اور تہیہ کیے ہوئے تھے کہ اس حکومت کے رائج کردہ علوم سے روگرداں رہیں گے اور ہرگز کوئی فائدہ نہ اُٹھائیں گے۔

لیکن ایک چھوٹا سا حلقہ ایسا بھی تھا جس کی دوراندیشانہ نگاہوں نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی یہ اور وہ ہندوستان میں نفاق، تعصب اور تفریق پیدا کر کے اپنی حکومت باقی رکھنا اور اپنا گھر بھرنا چاہتے ہیں تو بے اختیار وہ پکار اُٹھے:

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح　　واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی　　یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر　　مانو اُسے، اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام کیے جاؤ وہ لیکن　　جو بات سبک ہو اُسے منہ سے نہ نکالو

رائے کی جگہ سیاست کا لفظ رکھ دیجیے، انگریزی سامراج کی ساری پالیسی اور حکومت کو چند شعروں میں کس طرح آئینہ کر دیا ہے اور جب حالیؔ نے یہ دیکھا کہ مغربی قوم کی لوٹ محض مادی چیزوں تک محدود نہیں بلکہ اس کی ''حکمت'' اور ''سیاست'' کی بدولت مشرقی قوموں کی اخلاقی حالت بھی بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے تو وہ اور بھی مایوس اور بد دل ہو گئے۔ وہ جدید مغربی تعلیم کے حامی ضرور ہیں مگر مشرقی خوبیوں اور مشرقیت کو اپنا بیش بہا قومی سرمایہ بھی سمجھتے ہیں جسے کسی قیمت پر چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ ایک جگہ مغربی قوموں کی تاجرانہ لوٹ کا ذکر کس انداز میں کرتے ہیں:

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے، نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گلچینی ہے یا لٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی

جب وہ دیکھتے ہیں کہ بدیشی ہر جگہ دیسیوں کو ذلیل کرتے ہیں، ہر موقع پر ''کالے'' اور ''گورے'' کا فرق کیا جاتا ہے تو اُن کا غیرت مند دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ اُنہوں نے طنزیہ انداز میں اس فرق کو خوب بیان کیا ہے جو ایک کالا اور گورا اور دونوں کی تکرار اور بیماری کے سرٹیفکیٹ کے بارے میں ہے۔

حالی کو اپنی زندگی ہی میں اندازہ ہونے لگا تھا کہ انگریزی حکومت سے جو توقعات اُنہوں نے قائم کی تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتیں تو اُن کے دل میں بار بار ایک کانٹا سا چُبھا اُٹھتا ہے:

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا
دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

کبھی بے چین ہو کر کہہ اُٹھتے ہیں:

داد طلب سب غیر ہوں جب تو اُن میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں
صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حالی اگر دس بیس برس اور زندہ رہتے اور وہ سب آنکھوں سے دیکھتے جو ملک اور قوم کو بدیسی حکومت کی بدولت سہنا پڑا تو وہ ضرور آزادی کی پُرخلوص اور پُرجوش تحریک سے متاثر ہوتے۔ بہرحال یہ سچ ہے: ع

چھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد

افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ حالی کے اشعار ان کی نیک نیتی یا مثبت نظریہ کی وجہ سے

ہمیشہ ان کے دامن پر عیب دار داغ بن کر باقی رہیں گے۔ ہم نے یہاں حالی کی شاعری کا وہ رُخ بھی پیش کیا ہے جو عام طور سے پیش نہیں ہوتا ہم حالؔی کا قصیدہ نہیں لکھ رہے بلکہ حالؔی فہمی کی دستاویز مکمل کر رہے ہیں جس سے حالؔی کے مرثیے اور مقام میں کمی کا کوئی امکان نہیں۔

مرثیہ حکیم محمود خان دہلوی:

حالؔی کا سب سے طویل مرثیہ حکیم محمود خان دہلوی کا ہے جو دہلی کے ممتاز حکیم، عظیم شخصیت اور مہاراجہ پٹیالہ کے خاص طبیب تھے۔ یہ حکیم محمود خان کی دانشوری تھی کہ غدر کے موقع پر مہاراجہ پٹیالہ سے فوج طلب کر کے دلی کے کچھ علاقوں مخصوصاً بلی ماران کی حفاظت کروائی چناں چہ یہ علاقہ غارت اور لوٹ سے محفوظ رہا۔ یہ مرثیہ مسدس کی شکل میں پینتالیس بند یعنی ایک سو پینتیس اشعار پر مبنی ہے۔ یہ مرثیہ 1310 ہجری مطابق 1892ء کی تصنیف ہے۔ اس مرثیے کے چہرے میں کوئی بیس ((20 بندوں میں دہلی کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ دلی کا تذکرہ حالؔی کا محبوب مشغلہ ہے جیسے انہوں نے غزلوں نظموں اور مرثیوں میں برتا ہے لیکن جس تفصیل سے اس مرثیہ کی تمہید میں لکھا ہے وہ حالؔی کے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ حالی نے شاید مرثیے کی تمہید میں دلی کا تذکرہ اس لیے بھی کیا ہو کہ محمود خان دہلوی تھے انہوں نے دہلی کو تباہ ہونے سے بچانے میں مدد کی وہ دہلی کی تہذیب اور اس کے تمدن کی آخری شمع تھے جو 1892ء میں بجھ گئی۔ حالؔی جب دلی کا ذکر کرتے ہیں تو ہر لفظ سے خلوص، محبت، جذبہ اور صداقت ٹپکتی نظر آتی ہے۔

مرثیے کے مطلع کے بند میں لہجہ دیکھیے:

اے جہاں آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنر ور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا

نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علم و دیں
جیسے امی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں

شاذ و نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیر
آب و گل تیرے تھا گویا تصوف سے خمیر

ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
حسن معنی تیرا حصہ اے جہاں آباد تھا

رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں
طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند سال
ڈھل گئے سانچے میں گویا اس کے عادات اور
خصال

جمگھٹا تھا تجھ میں ترک و فرس و روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تو گل ہائے رنگا رنگ کا

گزری دلی کی عظمت بتا کر حالیؔ نے لکھا کہ اس چمن کو نظر لگ گئی اور خزاں کا دور شروع ہوگیا۔

گردش افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار

دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر

تجھ سے اے دارالعلوم اٹھنے لگا علم و ہنر
مجلسیں برہم ہوئیں زیر و زبر دیواں ہوئے
خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے
جھڑ گئے تاجِ شرف سے تیرے سب لعل و گوہر
تجھ کو اے دارالخلافت کھا گئی کس کی نظر

حالیؔ یہاں مرثیے میں وہ مقام لاتے ہیں جس میں محمود خاں کا وجود باعثِ روشنی ہے:

خاک نے یاں تیری پھر اگلے وہ لعل بے بہا
جن سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا
علم و دیں و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر اپنی تو نے چارسو ہر فن میں دھوم
چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا چھا گیا
اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

پھر حالیؔ نے محمود خان دہلوی کے علم و ہنر، اوصاف و کردار، خدمات اور کارناموں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ ہم صرف کچھ اشعار اور مصرعے پیش کرتے ہیں:

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب
اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارالشفا
صفت بیماریوں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا
راستی اور راست بازی اس کی تھی ضرب المثل
اس کے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل

غدر کے بعد جو دہلی میں لوٹ اور قتل و غارت ہو رہی تھی اس کی روک تھام کا ذکر ہے:

315

وہ زمانہ جب کہ تھا دلی میں اک محشر بپا
شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار
بالیقین جن ملزموں کو اس نے سمجھا بے خطا
مارشل لا میں ثبوت ان کی گواہی کا دیا
زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانہ بے گھروں کو گھر دیا
بے گناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پاؤں اک اس کا عدالت تھا اور اک گھر میں تھا

محمود خان اس دور میں بھی عادی زندگی بسر کر رہے تھے:

عمر کاٹی دوزخ دنیا میں جنت کی طرح
مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

io

حالیؔ اپنی شاعری کا نوحہ اس مرثیے سے جوڑ دیتے ہیں:

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے
لوگ
پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا

ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

نوحہ قیصرہ ہند:

حالیؔ نے ایک نو (9) شعر کا نوحہ غزل کی ہیت میں ''نوحہ قیصرہ ہند'' کے عنوان سے لکھا۔ درحقیقت یہ نظم جنوری 1901ء کے رسالے معارف میں حافظ محمد یعقوب مجددی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی جواہرات حالیؔ میں لکھتے ہیں: ''میرے دریافت کرنے سے حافظ محمد یعقوب مجددی نے خود فرمایا کہ یہ نوحہ میری تصنیف نہیں بلکہ مولانا حالیؔ نے میری فرمایش پر میرے لیے لکھا اور میرے ہی نام سے شائع ہوا تھا۔''

شریعت شعر میں کسی بھی شاعر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے اشعار کسی اور کو دے یہ بالکل جائز نہیں لیکن صحیفہ شاعری میں یہ ناجائز تحریریں نظر آتی ہیں جن کو بعد میں نکال کر حق دار تک پہنچایا جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہر بڑے اور معتبر شاعر کا ایک خاص رنگ اور کہنے کا ایک منفرد ڈھنگ ہوتا ہے چناں چہ شعر شناسوں کے لیے اُسلوب اور طرزِ نگارش بڑی حد تک اس گتھی کو سلجھا دیتے ہیں:

ع

چھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد

اس حقیقت کے بعد ہمیں یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ اور کتنے حالیؔ کے اشعار دوسروں کے نام سے مشہور ہیں؟

حالیؔ کا یہ نوحہ دراصل ملکہ وکٹوریا کا قصیدہ ہے جس میں مبالغہ، غلطی بیانی، جھوٹ اور چاپلوسی ہے۔ ایک مقبوض جابر حکومت کی سربراہ کے اخلاق کی تعریف اور ظالم کے وجود کو نعمت کہنا اپنے آپ کو ہی نہیں بلکہ قوم کو بھی دھوکا دینا ہے۔ یہ اشعار حالیؔ کے دامن پر سیاہ دھبے ہیں جن کا مٹانا ممکن نہیں۔

ہند پر شاق ہے اے قیصرہ رحلت تیری ۔۔۔ تھی رعیت کے لیے موت قیامت تیری
کر لیا تھا تری سیرت نے دلوں کو تسخیر ۔۔۔ گو کہ دیکھی نہ تھی ہم نے کبھی صورت تیری

315

نام اخلاق میں اتنا ہی ترا تھا روشن   جتنی تھی دولت و اقبال میں شہرت تیری
قدر نعمت کی سدا ہوتی ہے یاں بعد زوال   ہوئی معلوم ترے مرنے سے عظمت تیری
امن نے کھول ترقی کے دیے دروازے   ملک سب ہو گیا گلزار بدولت تیری

مرثیہ محسن الملک:

حالؔی نے محسن الملک کے انتقال پر ایک (9 شعر کا مرثیہ ترکیب بند ہیت میں نظم کیا۔ یہ مرثیہ حالؔی کے دلی جذبات کا آئینہ ہے۔ سرسید کے بعد لوگوں کو محسن الملک سے بڑی توقعات تھیں کیوں کہ انہوں نے سرسید کے بعد تک وتنہا علی گڑھ کالج کرسنبھال رکھا تھا۔

سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا   اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار   سر کر کے مہم قوم کے کام آ گیا آخر
جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اس کے   وہ خون کے آنسو انہیں رُلوا گیا آ کر

مہدی کے لیے قوم عزا دار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

حالؔی نے ان کی موت پر فارسی میں ایک قطعہ تاریخ وفات بھی لکھی اور ''انجمن آرائے بہشت بریں'' سے 1325 ہجری نکالی۔ یہ قطعہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ نومبر 1907ء میں شائع ہوا۔

محسن الملک آہ از دنیا رفت
خلق شد از رحلتش اندوہ گیں
سال وفاتش شدہ ملہم نہ غیب
''انجمن آرائے بہشت بریں''

1325ھ

مراثی اُردو

1 مرثیہ جناب مرزا اسداللہ خاں مرحوم دہلوی

متخلص بہ غالب (1285ھ مطابق 1869ء)

کیا کہوں حال دردِ پنہانی
وقت کوتاہ و قصہ طولانی
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد
دیکھ کر رنگ عالم فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال

گوشہ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں
تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے شکل موجِ سراب
جامِ جمشید و راحِ ریحانی
لفظ مہمل ہے نطقِ اعرابی
حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی
اک تماشا ہے حُسنِ کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک
چشمہ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے
گر ملے خاتمِ سلیمانی
بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمہ زندگی میں آب نہیں
جس سے دنیا نے آشنائی کی
اس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر
تو نے کی جس سے بے وفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ
ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی
صلح میں چاشنی لڑائی کی

ہے یہاں حظِ وصل سے محروم
جس کو طاقت نہ ہو جُدائی کی

ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس
جس کو عادت نہ ہو گدائی کی

خندہ گل سے بے بقاتر ہے
شان ہو جس میں دل ربائی کی

جنسِ کاسد سے ناروا تر ہے
خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی

بات بگڑی رہی سہی افسوس
آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

io

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

دل میں چبھتا تھا وہ اگر بشل

دن کو کہتا دن اور رات کو رات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات
ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا

io

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
کس سے دادِ سخن وری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضموں ہے نوحہ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں

اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

io

نثر حسن و جمال کی صورت
نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت

قال اس کا وہ آئنہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت
اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی
شکل امکاں محال کی صورت

اس کی تاویل سے بدلتی تھی

رنگِ ہجراں وصال کی صورت

لُطفِ آغاز سے دکھاتا تھا
سخن اس کا مآل کی صورت

چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈھے نہ پائیں گے یہ لوگ

io

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشک بار ہے آج

نازشِ خلق کا محل نہ رہا
رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج

تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع
رُخصتِ موسمِ بہار ہے آج

بارِ احباب جو اٹھاتا تھا
دوشِ احباب پر سوار ہے آج

تھی ہر اک بات نیشتر جس کی

اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
دل میں مدت سے تھی خلش جس کی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
دلِ مضطر کو کون دے تسکیں
ماتمِ یارِ غم گسار ہے آج
تلخیٔ غم کہی نہیں جاتی
جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر
ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج
غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہان آباد

io

نقدِ معنی کا گنج واں نہ رہا
خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اس کے گئی بہارِ سُخن
اب کچھ اندیشہ خزاں نہ رہا
ہوا ایک ایک کارواں سالار
کوئی سالارِ کارواں نہ رہا
رونقِ حسن تھا بیاں اس کا
گرم بازارِ گُل رخاں نہ رہا
عشق کا نام اس سے روشن تھا

قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں
گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اہلِ ہند اب کریں گے کس پر ناز
رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا
زندہ کیونکر رہے گا نامِ ملوک
بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا
کوئی ویسا نظر نہیں آتا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
اٹھ گیا، تھا جو مایہ دارِ سخن
کس کو ٹھہرائیں اب مدارِ سخن

io

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا
اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
شاعری کا کیا حق اس نے ادا
پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا
بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں
سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذر سائل تھی جان تک، لیکن
درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا

جان دینے پہ اختیار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شِعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب
ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا
مظہرِ شانِ حُسنِ فطرت تھا
معنیٔ لفظِ آدمیت تھا

io

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں
آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیتِ حُزن
ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
ملک یک سر ہوا ہے بے آئیں
اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی
ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رُمان میں
حصر تھی اک بیاں میں رنگینی

کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں

لب جادو بیاں ہوا خاموش
گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں

گوشِ معنی شنو ہوا بے کار
مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں

وہ گیا جس سے بزم تھی روشن
شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر
سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہ کامل میں آ گئی ظلمت
آب حیواں پہ چھا گئی ظلمت

io

ہند میں نام پائے گا اب کون
سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون

ہم نے جانی ہے اس سے قدر سلف
ان پر ایمان لائے گا اب کون

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
اس کو دل سے بھلائے گا اب کون

تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش
وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے

جا کے دلی سے آئے گا اب کون

مر گیا قدر دانِ فہم سخن
شعر ہم کو سنائے گا اب کون

مر گیا تشنہ مذاقِ کلام
ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون

تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک
ہم کو چالیں بتائے گا اب کون

شعر میں نا تمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

کم لنا فیہ من بکے و عویل
و عتاب مع الزمان طویل[1]

---

[1] اُس کے غم میں ہم کتنا روتے اور آہ وزاری کرتے ہیں اور کتنے عرصے سے ہم زمانے کو ملامت کررہے ہیں۔

2 مرثیہ مہیں برادر راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم

(1303ھ مطابق 86-1885ء)

کل سوگ میں بھائی کے اُسے دیکھ کے چپ

چپ
حالی سے کہا ہم نے کہ اے بحرِ معانی
خاموش کبھی ہم نے تجھے یوں نہیں دیکھا
کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی

شادی میں تری تہنیتیں ہم نے سنی ہیں
ماتم میں بھی دیکھی ہے تری مرثیہ خوانی

315

ہنستا ہے نہ روتا ہے نہ ہذلہ ہے نہ نوحہ
کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی

دنیا ہے یہ اک دارِ فنا جس کا اثاثہ
سب خاک سے تا انجم و افلاک ہے فانی

ہو جائے گر انساں یونہی ہر رنج میں خاموش
کس طرح دلوں کے ہوں عیاں رازِ نہانی

اک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے
دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی

فرمایا کہ موجوں سے بھنور کے نہیں آگاہ
ساحل پہ ہیں جو راہ سپر قاصی و دانی

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی

پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی
غم بھائی کا مر جانے کی ہے اس کے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی

جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سایے میں کٹی اس کی جوانی

شفقت نے دیا جس کی بھلا مہرِ پدر کو
دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی

جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھائی

دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو
کیا ڈھونڈھتے ہو اس کی طبیعت میں روانی

یہ چُپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ
یہ چُپ نہیں مر جانے کی ہے دل کے نشانی

بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں
یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لگانی

پر آہ، کلی وہ جو ہے مُرجھا گئی دل کی
مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپس میں کھلانی

باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

3 مرثیہ جناب حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی

(1310ھ مطابق 1892ء)

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنر ور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاق علم و دیں

جیسے اُمی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں
ہند میں جو تھا محدث، تھا وہ تیرا خوشہ چیں
تھی محدث خیز اے پاتخت تیری سر زمیں
تھا تفقہ بھی مُسَلَّم تیری خاک پاک کا
بیہقی وقت تھا ایک اک فقیہ اس خاک کا

شاذ و نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیر
آب وگل کا تیرے تھا گویا تصوف سے خمیر
تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مہر منیر
تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مستنیر
آج سے دولت کا بازار جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان اس دولت سے مالا مال ہے

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اُس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغ ارم
بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم
ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

خاک سے اٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور
اک جہاں شیوا بیانی سے ہے ان کی با خبر
راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہو گی نہ راس اتنی ہوائے غاتفر[1]

حسن صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد[2] تھا
حسن معنی تیرا حصہ اے جہاں آباد تھا

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم
جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم
کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے ان کے جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں
تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہور انام
آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام
شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں، آئین میں، اوضاع میں، اطوار میں
طرز میں، انداز میں، رفتار میں، گفتار میں

ا۔ غاتفر: سمرقند کے قریب ایک قطعۂ زمین ہے جہاں کا سرو خوبی و زیبائی و راستی میں ضرب المثل ہے۔
۲۔ نوشاد اور خلخ دو شہر قدیم ترکستان میں تھے جو حسن خیزی میں مشہور تھے۔

رہ گیا باہر سے آ کر جو کہ تجھ میں چند سال
ڈھل گئے سانچے میں گویا اس کے عادات اور
خصال
آ کے بن جاتا تھا یاں نقصان انساں کا کمال
تیرے پرچھاویں سے موتی بن کے جاتے تھے
سفال

آتے ہی انساں کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں

315

چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں

تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب
آن کر لیتے تھے یاں تھکی جہاں کے انتخاب
بستے تھے اطراف سے آ آ کے تجھ میں شیخ وشاب
کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب
جمگھٹا تھا تجھ میں ترک وفرس و روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تو گل ہائے رنگا رنگ کا

لیکن آخر طبعِ دوراں کا ہے جیسے اقتضا
ہر ترقی کی ہے حد، ہر ابتدا کی انتہا
جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا
وقت اے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آ لگا
گردشِ افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار

تجھ پہ اے دارالخلافت انقلاب آنے لگے
غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے
طالعِ مشفق کے پیغام عتاب آنے لگے
تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے
دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر
تجھ سے اے دارالعلوم اٹھنے لگا علم و ہنر

ہو گئے تیرے محدث راہی دارالسلام
کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام
ہو گیا رخصت جہاں سے تیرا جاہ و احتشام
رفتہ رفتہ ہو گئی سب صاحبی تیری تمام
مجلسیں برہم ہوئیں زیر و زبر دیواں ہوئے

315 خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے

چل دیے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب
مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب
اس گلستاں سے نہ اٹھی پھر صدائے عندلیب
جن کو کھو بیٹھے نظیر ان کا کہیں پایا نہ پھر
جو گیا اس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

کر گئے اخلاق اور آداب سب تجھ سے سفر
گر گیا نظروں سے تیرا سب جلال و جاہ و فر
جھڑ گئے تاج شرف سے تیرے سب لعل و گہر
تجھ کو اے دارالخلافت کھا گئی کس کی نظر
علم ہے باقی نہ اب دولت ہے تیرے پاس وہ
اے گل پژ مردہ تیری کیا ہوئی بو باس وہ

دور آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا
بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یاں تیری پھر اُگلے وہ لعل بے بہا
جن سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا
عہد ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی
پر نہ کی عرض ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گزاری تیرہویں تو نے صدی
پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دور اکبری
علم و دین و شعر و حکمت، طب و تاریخ و نجوم

ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو ہر فن میں دھوم

ملک میں ہر سو وہی پھر بول بالا تھا ترا
تھا جہاں علم و ہنر گودوں کا پالا تھا ترا
تھی جہاں کچھ روشنی وہ سب اُجالا تھا ترا
پھر جو دیکھا غور سے وہ اک سنبھالا تھا ترا

چاند نکلا تھا گہن سے جو وہ پھر گہنا گیا
چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا چھا گیا

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے
کچھ سخن ور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے
کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیلِ فنا اس کو بھی اے دلی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی
ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی
اُٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہان آباد تو

تجھ میں ہے دلی ! کوئی اب ایسا مقبول جہاں
نازشِ دارالخلافت مرجعِ ہندوستاں
ہند سے لے تا عرب، کشمیر سے تا انڈماں
بچے بچے کی زباں پر نام ہے جس کا رواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب

315

خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں
واقعات زندگی کر دیجے گر اس کے بیاں
سمجھیں اک افسانہ نا واقف اسے اور داستاں
ہے تعجب خیز الحق سیرت محمود خاں
یا وہ اک جوہر الگ تھا جو ہر انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارالشفا
خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا
فکر نذرانے کا تھا اس کو نہ شکرانے کا تھا
اس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

بے حقیقت اس نے سمجھا مال و دولت کو سدا
تھے برابر اس کے نزدیک اغنیا اور بے نوا
گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا
کوئی مفلس کا نہ تھا پرسانِ حال اس کے سوا
کرتے ہیں جو دعویٰ ہمدردیِ نوعِ بشر
اس نے باطل کر دیے تھے ان کے دعوے سر بسر

طب مسلمانوں کی لی اس کی مسیحائی نے تھام
ورنہ اب تک اس کی ترکی ہو چکی ہوتی تمام
رونق طب جدید اور اس پہ میل خاص و عام
درس گاہوں اور دوا خانوں کا اس کے انتظام
دیکھ کر تھا اک زمانہ اس کی خوبی کا مقر

315

طب یونانی گئی تھی خلق کی نظروں سے گر

سرجنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمال وحیل
آ گیا تھا رائے میں زود اعتقادوں کی خلل
دیں مگر اس کی مسیحائی نے سب رائیں بدل
طب یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل

سلطنت اور عقل تھی جس فوج کی ہمت فزا
ایک طاقت اس کے حملوں سے ہوئی عہدہ برآ

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں میں خاص وعام سب
پر اُلجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب
خلق کا پھر ملجا و ماویٰ اسی کا تھا مطب
اس کے بیماروں کو گو مایوس ہوں یا جاں بلب

سوءِ تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مہلک دوا کا ڈر نہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جس قدر
کرتے ہیں معلوم جو جو ان سے امراض بشر
وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھ کے اُنگلی نبض پر
اس کی اک اُنگلی پہ تھے قربان سو تھرما مٹر

نارسا تھیں دوربینیں اہل صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہ دوربیں اس کی وہاں

شہر کے سب مرد و زن پیر و جواں خرد و کلاں
تھے قوی پشت اس سے ایسے جیسے پشتے سے
مکاں
جس کو نسخہ دے دیا لکھ کر وہ یہ سمجھا کہ ہاں
زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں یاں

315

گو کہ ماتم ملک میں ہے اس کا ہر سو آج کل
پر گئی اے شہر تیری جان ہی گویا نکل

کیا عجب پیدا ہوں پھر ایسے طبیب اور چارہ گر
جو کہ تشخیصِ مرض میں رکھتے ہوں غائر نظر
خلق کو تکیہ ہو جن کی رائے اور تدبیر پر
شہر میں ہوں مرجعِ کل، ملک میں ہوں نام ور

جمع ہوں محمود خاں کے ذات میں ان کی کمال
ہے یہ سب ممکن، مگر محمود خاں ملنا محال

راستی اور راست بازی اس کی تھی ضرب المثل
اس کے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل
امتحاں کے وقت جب تھا نظمِ عالم میں خلل
راست بازوں کی گئی تھی ٹھیک جب ہر سو نکل

کھوٹ سے اس آنچ میں نکلا وہ خالص اس طرح
آگ میں تپ کر کھرا رہتا ہے کندن جس طرح

وہ زمانہ جب کہ تھا دلی میں اک محشر بپا
نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا
باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موج زن تھا جب کہ دریائے عتابِ ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار
ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دو چار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرم سار
شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار

315

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلے سے کہیں سب خشک و
تر

ہو رہا تھا جبکہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں
کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پتلا عیاں
ایک جانب تھی اگر خندق تو اک جانب کنواں
بال سے باریک تر تھی راہ ان کے درمیاں

راہ رو دگدا میں تھے اور راہ پر خوف و خطر
اس نے دکھلایا کہ یوں چلتے ہیں سیدھی راہ پر

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ
عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ
مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ
پر نہ تھا کوئی شفیع ان کا کہ جو تھے بے گناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اُس نے کی
اہل انصاف اس کو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی

بالیقیں جن ملزموں کو اس نے سمجھا بے خطا
مارشل لا میں ثبوت ان کی گواہی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا
جو کہ تھے نادار، کی ان کی اعانت برملا

زر دیا، کھانا دیا، کپڑا دیا، بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا، بے گھروں کو گھر دیا

قصے جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی جس کی خو نہ تھی
دی گواہی جس نے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی
جس نے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی

ہاتھ سے جس نے بڑوں کی آن اب تک دی نہ تھی
بے گناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پاؤں اک اس کا عدالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

جب کہ عنقا تھی دیانت بین ابناء الزماں
تھی امانت جس کی اس کے پاس ہلکی یا گراں
خوف میں پاس اپنے رکھا اس کو مثل پاسباں
کی حوالے مالکوں کے جب ہوا امن و اماں
ایک عالم نا خدا ترسی میں جب بے باک تھا
اس کا دامن تھا کہ ہر دھبے سے بالکل پاک تھا

وضع داری میں نہ تھا اس کا زمانے میں بدل
وضع میں اس کی تغیر تھا نہ عادت میں خلل
وقت کی تاثیر کا اس پر نہ چلتا تھا عمل
انقلاب دہر کی زد سے گیا تھا وہ نکل
اس کے آگے ان نئے سانگوں کی کچھ ہستی نہ تھی
اس پہ چلتی کچھ زمانے کی زبردستی نہ تھی

کی تھی جو بچپن سے طرزِ زندگانی اختیار
اس میں فرق آیا نہ وقت واپسیں تک زینہار
کوہ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار
وضع اس کی، جو کہ تھی وضع سلف کی یادگار
قوم کے از یاد رفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہد عالمگیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

سر پہ دنیا کے علایق کا تھا جو بار گراں
پر ہر اک حالت میں ہلکی پھول سی رہتی تھی جاں
پا بہ گل دنیا میں، پر دنیا کے غم سے برکراں

رنج ہو یا ہو خوشی جب جا کے دیکھو شادماں

ظاہرا پابند تھا دنیا کی رسم و راہ کا
دل مگر پایا تھا ایسا جیسا اہل اللہ کا

منقبض اس کو نہ مکروہات میں پایا کبھی
غم سے دنیا کے نہ پیشانی پہ بل لایا کبھی
دل کسی باد مخالف سے نہ کملایا کبھی
تلخیِ دوراں سے چتون پر نہ سیل آیا کبھی

کی بسر دارالمحن میں بزم عشرت کی طرح
عمر کاٹی دوزخ دنیا میں جنت کی طرح

مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار
قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار
گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب باد بہار
رنگ ہو گا جن میں لیکن بو نہ ہو گی زینہار

کرتے ہیں جب ان حوادث کے نظر انجام پر
قوم میں اک ہم کو سناٹا سا آتا ہے نظر

اک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار
اہل علم وفضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار
ایسے حاصل خیز دنیا میں نہ ہوں گے کشت زار
جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار

مرتا تھا کامل تو کامل تر نظر آتا تھا یاں
سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یاں

یا یہ اب پہنچی ہے ہم میں نوبت قحط الرجال
ایک اُٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال

دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اس کی مثال
ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے ہمال

ظاہرا اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخن ور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے
لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے
لوگ

پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

4 مرثیہ ملکہ وکٹوریا [1]

(1901ء)

1

شاہ ہوں یا ہوں گدا، محکوم ہوں یا حکمراں
وہ نہیں مرتے کبھی جیتی ہیں جن کی نیکیاں

جاگتا ہے اُن کا تا روزِ قیامت نامِ نیک
گو کہ ہیں وہ بے خبر سوتے لحد کے درمیاں

چپ ہیں، پر ہے بحر و بر میں پڑ رہی ان کی پکار
گم ہیں لیکن چپے چپے پر ہیں ثبت ان کے نشاں

یاں رہے جب تک، رہے ایسے مرنجان و مرنج
غیر سمجھے اُن کو اپنا اور دُشمن مہرباں

اور چلے جس وقت دنیا سے، گئے دنیا میں چھوڑ
خوبیوں کی اپنی ایک اک کی زباں پر داستاں

اُن کا جینا کیسی نعمت ہو گی دنیا کے لیے
جن کا مرنا اُن کے حق میں ہے حیاتِ جاوداں

زندگی سے اُن کی ہرگز نیتیں بھرتی نہیں
پائیں گر بالفرض عمر نوح بھی آ کر یہاں

وقتِ رحلت یوں ترستی اُن کو رہ جاتی ہے خلق
ایک بجلی سی چمک کر ہو گئی گویا نہاں

جن کی ایسی زندگی اور جن کی ایسی موت ہو
اُن کا اُٹھ جانا ہے بدبختی کا دنیا کی نشاں

---

[1] مارچ 1901ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے یہ نظم علی گڑھ کالج کے ایک ٹرسٹی کی حیثیت سے لکھی تھی۔ (مکتوبات حالی، حصہ اول، صفحہ 40) اسی لیے پانچویں بند میں کالج کا ذکر کیا گیا ہے۔ (ا ص)

315

آج گھر گھر ہے وہی ماتم جہاں میں جس سے ہے
زلزلے میں کینیڈا سے لے کر تا ہندوستاں

اے کوئن وکٹوریا اک تجھ کو کیا آئی اجل
لچھمی [1] دنیا کے ہاتھوں سے گئی گویا نکل

2

ہے تری نیکی سے اُمید اے زمیں کی بادشاہ
آسمانی بادشاہت [2] میں خدا دے تجھ کو جا

کر لیے تھے سب یگانوں اور بیگانوں کے دل
نیکیوں سے تو نے اپنی فتح اے وکٹوریا [3]

ہے دلیل اس کے لیے کافی فقط تیری مثال
مرد پر عورت فضیلت کا کرے گر اِدّعا

کیجیے اقبال مندی پر اگر تیری نظر
سامنے تیرے نہیں جچتا کوئی کشور کشا

مرتبہ ہے جو کہ سرحد سے تصور کی پرے
قوم کو واں تک ترے اقبال نے پہنچا دیا

کی تجارت نے ترقی عہد میں یاں تک ترے
سلطنت ہے اُس کے آگے ہیچ بے چون و چرا

جس قدر علمی فتوحات اس زمانے میں ہوئیں
دہر کی تاریخ میں ملتا نہیں اُن کا پتا

علم میں روزِ ازل سے تھی جو اک طاقت نہاں
صاحبی میں تیری یہ راز آشکارا ہو گیا

---

[1] لچھمی: ہندوؤں میں دولت کی دیوی کا نام ہے۔
[2] بائبل کی زبان میں آسمانی بادشاہت سے مراد جنت ہے۔
[3] یہاں وکٹوریا کے لغوی معنی (فاتح، ظفر مند) کی طرف اشارہ ہے۔

ہو گئے ہر براعظم میں ترے برپا علَم
تیرے بیڑوں اور جہازوں سے سمندر پٹ گیا

شاعروں کے جس قدر مدحِ سلف میں تھے غلو
حق میں تیرے وہ حقائق بن گئے سرتا بہ پا

تھی خبر کس کو ہو اک خر دل کا پیڑ اتنا بڑا
جس کی شاخوں پر کریں بسرام مرغانِ ہوا[1]

3

دستِ قدرت نے بنایا گو کہ تھا عورت تجھے
پر جواں مردوں پہ تھی عالم کے فوقیت تجھے

سچ ہے "وہ وارث زمیں کے ہوں گے جو ہوں گے حلیم"[2]
حلم سے اپنے ملی آفاق میں مکنت تجھے

"وہ تسلی پائیں گے دنیا میں جو جھیلیں گے غم"[3]
ہو چکے غم بس تسلی دے گی اب راحت تجھے

تو مبارک تھی کہ تجھ کو صلح تھی دل سے پسند
دے گا فرزندی کا اب اپنی خدا خلعت تجھے[4]

---

[1] "آسمان کی بادشاہت ایک خردل کے دانے کے برابر ہے جسے ایک شخص نے لے کر اپنے کھیت میں بویا۔ وہ سب بیجوں میں چھوٹا تھا پر جب وہ اُگا تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوا اور ایسا درخت ہوا کہ چڑیاں آ کر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتیں۔" (انجیل متی باب 13)۔ اس شعر میں ملکہ کے بچپن کی طرف اشارہ ہے جب کہ اُن کی نسبت کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ تختِ انگلستان کی وارث ہوں گی اور اُن کی سلطنت اس قدر ترقی کرے گی۔
1 تا 6 ان اشعار میں حضرت عیسیٰ کے پہاڑ کے وعظ (انجیل متی باب: 5) کی مختلف آیات کے حوالے ہیں:
[2] "مبارک وہ جو نہ حلیم ہیں کیوں کہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔"

۳۔ ''مبارک وہ جو غمگین ہیں کیوں کہ وہ تسلی پائیں گے۔''
۴۔ ''مبارک وہ جو صلح کرنے والے ہیں کیوں کہ وہ خدا کے فرزند کہلائیں گے۔''

تو مبارک تھی کہ تھا پہلو میں تیرے پاک دل
ہو مبارک خلد میں دیدار کی نعمت تجھے[۱]

ملک میں اک نور تھی تو جیسے ڈیوٹ پر چراغ[۲]
دیکھ کر ہوتا تھا روشن ملک اور ملت تجھے

تو نمک تھی سر بسر گویا زمیں کے واسطے[۳]
ملک کا مصلح تصور کرتی تھی خلقت تجھے

دشمنوں پر مہرباں تھی تو بروں سے تھی بھلی
حق نے دی اپنی خلافت کی تھی اہلیت تجھے

تجھ سے غیروں کو محبت تھی، تو تھا اپنوں کو فخر
غیر اور اپنے کریں گے یاد تا مدت تجھے

برکتیں دنیا میں پھیلیں، تیرے دم سے جس طرح
بس یونہی کنجِ لحد میں دے خدا برکت تجھے

فرد تھی اقبال میں تو، بے نظیر اخلاق میں
تیرے مرنے سے ہے سناٹا سا اک آفاق میں

4

ہو گیا برٹن[۴] تو تیرے عہد دولت میں نہال
ہم پہ بھی کچھ کم نہیں برسا ترا ابرِ نوال

شکر بندوں کا خدا کے جو نہیں کرتے ادا
وہ نہیں لاتے بجا شکرِ خدائے ذوالجلال

۱۔ ''مبارک وہ جو پاک دل ہیں، کیوں کہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔''
۲۔ ''تم دنیا کے نور ہو، اور چراغ روشن کر کے نیچے نہیں رکھتے بلکہ چراغ دان پر رکھتے ہیں، تب ان سب کو جو گھر

315

میں ہیں چراغ روشنی دیتا ہے۔ اسی طرح تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھیں۔

۳۔ ’’تم زمین کے نمک ہو‘‘، یعنی تم دنیا کی اصلاح کرنے والے ہو۔

۴۔ Britain (برطانیہ)

ہند نے پایا ترے دورِ حکومت میں وہ امن
اگلے دوروں میں نہ تھا جس کا کہیں خواب وخیال

لی گئی قحط اور وبا میں ملک کی جو یاں خبر
تھا زمانہ تیرا اس میں آپ ہی اپنی مثال

شکر آزادی کا تیرے عہد کی ممکن نہیں
سب کا اس احسان میں جکڑا ہوا ہے بال بال

ہم سمجھ لیتے کہ ہیں ہر قید سے آزاد ہم
قیدِ احساں سے ترے چھٹنے کی گر ہوتی مجال

گرچہ ممکن ہے کہ تیرے عہدِ دولت مہد میں
ہوں رعیت میں تری کچھ لوگ زار اور خستہ حال

پر خدا کی سلطنت میں بھی یہی ہے حالِ خلق
یاں خوشی ہے واں مصیبت، واں سماں ہے یاں ہے کال

گو کوئی قانونِ قدرت خالی از حکمت نہیں
پر نہیں راس ایک کو جو ایک کے ہے حسبِ حال

ہوں قوانینِ الٰہی یا قوانینِ بشر
ہے برابر سب کا راضی اور خوشی رہنا محال

الغرض اس سے سوا خوبی نہ تھی امکان میں
کر گئی تو راج جس خوبی سے ہندوستان میں

5

خود ہمارے حال سے اے عازمِ دارالقرار

315

برکتیں عہدِ ہمایوں کی ہیں تیرے آشکار

ہم پڑے سوتے تھے غافل ایسی گہری نیند میں
جاگنے کا تھا نہ گویا قصد تا روزِ شمار

جہل و نادانی سے تھی نوبت گئی یاں تک پہنچ
ہو گئے تھے خود وطن پر اپنے ہم گویا کہ بار

پر جگا کر چھوڑا بانگِ طبلِ شاہی نے ہمیں
ایسی ڈالی ملک میں ہر سو ترقی کی پکار

سن کے اُٹھ بیٹھے صدائے طبل جو تھے تیز ہوش
سر سے اُترا نیند کا صدیوں کی وہ آخر خمار

قوم میں ڈالی بنا تعلیم کی، جس کے بغیر
کھو چکے تھے اپنا ہم ہندوستاں میں اعتبار

ہے علی گڑھ میں ہماری یہ جو قومی درس گاہ
ہے حقیقت میں یہ تیرے نام کی اک یادگار

اس کی رسمِ فونڈیشن اور جشنِ قیصری
دونوں تقریبیں ہوئی ہیں ایک ہی وقت آشکار [1]

نیو رکھنے اُس کی یاں آیا ترا قائم مقام [2]
تو نے خود اس کو کتابیں بھیج کر بخشا وقار [3]

جب تلک قائم ہے کالج، جب تلک باقی ہے قوم
یہ شہنشاہی عطیہ یاں رہے گا یادگار

ہے یقیں کالج کو پھلتا پھولتا دیکھیں گے ہم
جانشیں تیرا، قدم پر تیرے رکھے گا قدم

[1] 24 مئی 1875ء کو جب ملکہ وکٹوریا کی سال گرہ کا دن تھا، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی رسم افتتاح عمل میں آئی۔

''رسم فونڈیشن'' کی ترکیب محل نظر ہے۔(ا س)
۲۔ کالج کا سنگ بنیاد لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے رکھا تھا۔
۳۔ ملکہ وکٹوریا نے چند کتابیں جن کی جلدیں طلائی تھیں، اپنے دستخط ثبت فرما کر اس موقع پر کالج کو مرحمت کی تھیں۔

(بحوالہ: جواہرات حالی، ص:62)

6

ہے اب اے اڈورڈ ہفتم اس کا تو نعم البدل
سایہ شفقت گیا ہے جو ہمارے سر سے ٹل

ہے رگوں میں تیری خوں اڈورڈ اور البرٹ کا
ہوں گے عقدے ملک کے تدبیر سے سب تیری
حل

ہو پھننگ امبر میں جس کی اور جڑ پاتال میں
ہوں گے پھول اُس نخل کے کیسے مبارک اور پھل

ہے لطافت تجھ میں ماں کی اور حلاوت باپ کی
تیری گھٹی میں پڑا ہے شربتِ شیر و عسل

باپ کی بھی تجھ کو کہہ سکتے ہیں ماں کی بھی مثال
جیسے کہہ سکتے ہیں جل کو امرت اور امرت کو جل

تم نے پھیلائی ہے اور پھیلاؤ گے نیکی سدا
ہیں گھرانے کی تمہارے نیکیاں ضرب المثل

ہو غلو اس میں نہ شاید اے برنزک خاندان
گاسپل کا کہیے گر تم کو نمونہ فی المثل

جو محبت نے تمہاری یاں مہمیں کی ہیں سر
وہ نہیں کر سکتے سر میدان میں فوجوں کے دل

جس عقیدت کا گیا تھا ہند میں تو بیج بو

اب ملا ہے ملک کو اظہار کے اُس کا محل
ہے دعا حق سے کہ جب تک عدل سے قائم ہیں ملک
تیری شاہی اور شہنشاہی رہے یا رب اٹل
ملک ہر آفت سے تیرے عہد میں ماموں رہے
دبدبہ بیٹے کا ماں کی طرح روز افزوں رہے

5 نوحہ قیصرہ ہند [1]

(1901ء)

ہند پر شاق ہے اے قیصرہ رحلت تیری
تھی رعیت کے لیے موت قیامت تیری
کر لیا تھا تری سیرت نے دلوں کو تسخیر
گو کہ دیکھی نہ تھی ہم نے کبھی صورت تیری
نام اخلاق میں اتنا ہی ترا تھا روشن
جتنی تھی دولت و اقبال میں شہرت تیری
قدر نعمت کی سدا ہوتی ہے یاں بعد زوال
ہوئی معلوم ترے مرنے سے عظمت تیری
ہے خبر تجھ کو بھی اے قبر میں سونے والی
یاد کرتی ہے بہت تجھ کو رعیت تیری
امن نے کھول ترقی کے دیے دروازے
ملک سب ہو گیا گلزار بدولت تیری
جانشینی تجھے راس آئی چچا کی جس طرح
تیرے فرزند کو راس آئے خلافت تیری
شاہ اڈورڈ کا عالم یونہی محکوم رہے
جیسے عالم کے دلوں پر تھی حکومت تیری

بابِ ہشتم

اخلاقی درسی اور مناظراتی نظمیں

حالی کی نظمیں

اُردو کے ادیبوں، مورخوں، شاعروں، محققوں اور ناقدوں کا یہ بھی عجیب مزاج اور طریقہ کار ہے کہ بغیر صحیح تحقیق اور ادبی چھان بین کے ہر مثبت اور منفی مسئلہ کو کسی ممدوح یا مطعون کے نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں جو عموماً کسی معروف و مشہور شخص کی تحریر یا تقریر کا حصہ ہوتا ہے۔ تحقیق اور تنقید کا ایک اہم عمل حق دار کو اس کا حق دینا بھی ہے۔ حالیؔ کی شاعری اور نظریہ شاعری کی تبدیلی اور شعری اور نثری انقلاب جس کی عمدہ مثالیں ان کی نظمیں بالخصوص مسدس مدو جزر اسلام اور مقدمہ شعروشاعری کے ہمراہ سوانح نگاری کے نمونے حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید ہیں وہ سب صرف اور صرف سرسید کی علی گڑھ ادبی تحریک کا نتیجہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسدس حالی سرسید کی تحریک پر تصنیف ہوا جس کا ذکر خود حالیؔ نے کیا لیکن اس طرح کی نظم لکھنے کی مشق اور ایسی پرخلوص جذباتی سچی پر جوش نظم جس میں سماجی اخلاقی اقتصادی اور تہذیبی حقیقتوں کا سلیس اور واضح ذکر ہو تا کہ عامی سے عالم تک اس سے فائدہ اٹھا سکیں صرف سرسید کی ایک ملاقات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک طرف حالی کے دل کے الاؤ میں یہ خیالات پک رہے تھے تو دوسری طرف انجمن پنجاب کی تحریک کے منعقدہ مشاعرے میں اس کی مشق جاری تھی۔ دلی کی بضاعت لٹنے کے بعد اُردو شعر و ادب کا جو قافلہ لاہور پہنچ کر شمع اُردو کی لو کو اونچا کیا اس کے سرخیل محمد حسین آزاد تھے ان کے ساتھ قافلے میں آہستہ آہستہ شامل ہونے والوں میں مولوی کریم الدین، سید احمد دہلوی، پنڈت من پھول پیارے لال آشوب، الطاف حسین حالیؔ اور درگاہ پرشاد نادر شامل تھے۔ لاہور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹز نے انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی اور محمد حسین آزاد نے اسے ایک فعال تحریک میں تبدیل کیا جس کا مقصد سیاسی نہیں بلکہ خالص ادبی

سماجی، اخلاقی اور اقتصادی تھا تا کہ برصغیر کے لوگوں کی اصلاح ہو سکے۔ آزاد کے ذہن میں 1867ء سے ہی اُردو شعروادب کی پاک سازی کا رجحان تھا چناں چہ غزل کے بے رمق عشقیہ شعروں پر سر دھنے کے بجائے نیچر کے موضوعات کو مشاعروں کا مضمون بنایا گیا۔ پنڈت کیفی لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد کو 1874ء سے بہت برس پہلے اُردو کی تجدید اور اصلاح کا خیال پیدا ہوا تھا۔ تاریخی ثبوت ہمیں 1867ء تک پہنچاتا ہے۔ چناں چہ اگست 1867ء کے ایک جلسے میں آپ نے ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' پر ایک مفصل تقریر فرمائی۔'' شاید یہی جدید فکر نے برصغیر کے شعرا کو متحرک کیا جس کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُسی زمانے میں اسماعیل میرٹھی نے انگریزی کی چار نظموں کے منظوم ترجمے کیے جو کامیاب رہے۔

سرسید 1869ء انگلینڈ گئے اور پھر آنے کے بعد سائنٹیفک سوسائٹی، مدرسہ دارالعلوم اور تہذیب الاخلاق رسالے کا اجرا کیا جس میں وہ آزاد کی جدید نیچر کی شاعری کا ذکر کر کے اس پیغام کو اپنی تحریک کا حصہ بناتے ہیں۔ سرسید نے علی گڑھ گزٹ میں لکھا: ''اہل پنجاب کی کوششوں سے ہماری شاعری سے عیوب دور ہو رہے ہیں سال گزشتہ کا وہ پہلا مشاعرہ ہماری زبان کی تاریخ میں یادگار رہے گا جب لاہور میں فطری شاعری کی قلم لگائی تھی۔''

محمد حسین آزاد کی ایما پر ڈاکٹر ہال رائیڈ کی کوششوں سے 1874ء اور 1875ء میں دس مشاعرے سکھشا سبھا ہال لاہور میں منعقد کیے گئے۔ ان مشاعروں میں جن موضوعات پر نظمیں پڑھی گئیں ان میں برسات، زمستان، امید، حب وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت، تہذیب اور اخلاق شامل تھے۔ ان مشاعروں میں پندرہ بیس شاعر شرکت کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد ہر مشاعرے کی روح رواں تھے۔ حالی نے صرف چار مشاعروں میں شرکت کی جو 1874 مئی، اگست، ستمبر اور نومبر کو برسات، امید، حب وطن اور انصاف کے موضوعات پر برگزار ہوئے۔ مشاعرے میں جو شعرا شریک ہوئے اُن میں سوائے حالی اور آزاد کے کوئی بڑا اور نامور شاعر نہ تھا۔ ان مشاعروں سے متاثر ہو کر انگریز حکام نے نظم کو نصاب میں شامل کیا۔ محمد حسین آزاد کے

خیالات'' آفتاب پنجاب'' کے ذریعے اُردو شعرا کو متاثر کرنے لگے اُدھر تہذیب الاخلاق نے نئی نسل کو ہموار کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے سچ کہا ہے:

''لاہور کے مشاعروں نے حالیؔ کا ادبی مزاج بدلنے میں اتنا اہم کردار ادا کیا کہ وہ بالآخر ''مسدس مدوجزرِ اسلام'' جیسی مربوط، اور اثر انگیز طویل نظم لکھنے پر قادر ہو گئے۔ حالیؔ مشاعرہ انجمن کے کامیاب اور مقبول شعراء میں سے تھے۔ تاہم ان کی شاعری کا جدید انداز دلی کو مراجعت کے بعد نسبتاً زیادہ کھل کر سامنے آیا اور انہوں نے مستقبل کے ادبی منظر کو متاثر کیا۔ چنانچہ نظم جدید کو مقبول بنانے کا سہرا ان کے سر بھی بندھتا ہے۔ بلاشبہ حالیؔ اس اعزاز کے پورے حق دار ہیں تاہم انجمن پنجاب کی تحریک میں اوّلیت اور فوقیت کا جو بلند مقام آزادؔ کو حاصل ہے وہ صرف انہیں کو سجتا ہے تحریک انجمن پنجاب اپنے عہد کی ایک فعال سماجی اور ادبی تحریک تھی۔ مشاعرہ انجمن نے اُردو نظم میں انقلاب بپا کرنے اور شاعری کو فطرت اور صداقت کے قریب تر لانے میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔''

حالی معترف ہیں کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم قدامت پرست اساتذہ کی نگرانی میں حاصل کی۔ جب آزاد لاہور میں اُردو شاعری میں انقلاب لانے کے لیے انجمن پنجاب کی تحریک کو فروغ دے رہے تھے تو حالی عیسائی مبلغ پادری عمادالدین کے ساتھ مناظروں میں اُلجھے ہوئے تھے اور ''ہدایت المسلمین'' کے جواب میں ''تریاق مسموم'' لکھ رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے ان کے خیالات کو منقلب کرنا شروع کر دیا تھا اور انہیں بے جا مبالغہ آرائی سے نفرت ہو گئی تھی تاہم جدید تصورات سے ان کا اولین سابقہ لاہور میں ہوا اور انجمن پنجاب نے مشاعرہ جاری کیا تو حالی نے نہ صرف اس میں شرکت کی بلکہ چار مثنویاں بھی لکھیں اور پیروی مغرب کی طرف مائل ہو گئے۔

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

حالی اب آؤ پیروی مغرب کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ ہو چکی

چناں چہ اسی لیے حالی نے جب آزاد کی آب حیات پر اعتراضات ہونے لگے تو آب حیات کی تائید اور آزاد کے خیالات کی حامی بھری۔ حالیؔ آزاد کی بہت عزت کرتے تھے۔ شبلی بھی آزاد کے رطب اللسان تھے۔ مولوی عبدالحق کا ''ہم عصر'' میں آزاد کو حالیؔ کا حاسد بتانا اور حالیؔ کی تعریف نہ کرنے کا الزام دھرنا سوت کا رنگ نہیں بلکہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتا ہے۔ جب تک آزاد ذہنی اعتبار سے تندرست رہے ہر اُردو خدمت گزار کے مدح خواں رہے۔

حالی نہ صرف آزاد کی آب حیات کے دل دادہ تھے بلکہ ان کی دیگر تصانیف کے عاشق تھے اور جدید خیالات کے مقلد۔ ایک تخلیقی ذہن کے ساتھ ایک سلجھا ہوا تنقیدی رویہ بھی رکھتے تھے۔ اُردو نظم نگاری کے بانی نہ حالی تھے اور نہ آزاد اُردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں موضوعات پر کئی نظمیں ملتی ہیں اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے بھی نظموں میں جان ڈالی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آزاد نے سب سے پہلے نظم مُعَرّیٰ اپنے دیوان میں شامل کی جس میں ردیف اور قوافی کو ترک کیا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری سے بیس ((20 سال پہلے آزاد نے جو نیچرل شاعری پر لیکچر دیا اُس کے اقتباسات کو مقدمہ کے متن سے ملا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ نقوش حالیؔ کے ذہن میں پختہ تجربوں کی طرح محفوظ تھے۔ آزاد کہتے ہیں: ''اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم، کسی شے پر رغبت یا اس سے نفرت، کسی شے سے خوف یا خطر یا کسی شے پر قہر یا غضب، غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اس کے بیان سے وہی اثر، وہی جذبہ، وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو اصل کے مشاہدے سے ہوتا۔ بے شک مبالغے کا زور، تشبیہ اور استعارے کا نمک، زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر پیدا کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک......۔''

''......ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں، لیکن پھر بھی قناعت جائز

نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار، طرے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور بے چاری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر کھڑی ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔''

''نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں انگریزی صندوقوں میں بند پڑے ہیں۔''

اُردو موضوعاتی نظم کا بانی کوئی بھی ہو ہمیں اُس سے سروکار نہیں مگر ہم اتنا جانتے ہیں جس شاعر نے سب سے پہلے نظم جدید کو مقبول اور معروف کیا وہ صرف الطاف حسین حالیؔ تھے۔ حالیؔ کا کمال یہ بھی تھا کہ وہ مغربی طرز کی شاعری کرتے ہوئے بھی مشرقی مثبت قدروں کے محافظ تھے۔ انجمن پنجاب کے مناظموں میں آزاد اور حالیؔ کے علاوہ اشرف بیگ اشرف، الٰہی بخش رفیق، انور حسین ہما، محمد مقرب علی، قادر بخش، دلی دہلوی، علاء الدین محمد اور دیگر مقامی شعرا شرکت کرتے تھے۔ اگرچہ آزاد کی نظمیں طولانی اور زبان و اُسلوب سے استادانہ رنگ رکھتی تھیں لیکن حالیؔ کی نظمیں جو مثنوی کی ہیت میں سادگی اور سلاست سے بھری رہتیں گلدستہ شعر کا گل سر سبد قرار پاتیں۔ چناں چہ لاہور کی ان نظموں کی شہرت برصغیر میں ہونے لگی۔ سر سید نے جو آگے چل کر حالیؔ سے مسدس لکھوایا وہ انہی نظموں کی کشش اور قدرت سے مرعوب ہو کر کہا تھا۔ سر سید حالیؔ کی ان نظموں پر جو مثنویوں کی ہیت میں پیش ہوئی تھیں ریویو کرتے ہوئے تہذیب الاخلاق 1992 ہجری میں لکھتے ہیں:

''مولوی خواجہ الطاف حسین...... کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے ان کی مثنوی حب الوطن اور مثنوی ''مناظرہ رحم و انصاف'' جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے در حقیقت ہمارے علم و ادب کا ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگی الفاظ، صفائی بیان، عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آبِ زلال سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ بیان میں، زبان میں، آمد میں، الفاظ کی ترکیب میں سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔''

ہم اس تحریر میں کچھ منتخب نظموں پر مختصر اور اجمالی تبصرہ کریں گے۔

ان نظموں کو ہم نے باب ہشتم کی اخلاقی درسی اور مناظراتی نظموں باب نہم کی حقوق زنان اور ہمدردی نسواں کی نظموں باب دہم کی قومی اور ملی نظموں اور باب یازدہم کی تعلیمی اور اصلاحی نظموں سے انتخاب کیا ہے۔

چپ کی داد: تصنیف : 1905ء

ہیت : ترکیب بند

تعداد شعر: 47

یہ نظم رسالہ خاتون میں دسمبر 1905ء، مخزن میں فروری 1906ء کو شائع ہوئی۔ حالی نے حیدرآباد دکن کے جلسہ عام میں اسے جون 1906ء میں پڑھا۔

یہ نظم مناجات بیوہ کے تقریباً بیس سال بعد لکھی گئی۔ اس نظم میں حالیؔ نے عورتوں کی عظمت اور سماج اور مذہب میں ان کا مقام دکھایا ہے۔ ان کی وجہ سے اولاد کی پرورش اور انسانی قدروں کی نمود بتائی ہے پھر ان پر جو مظالم ہوئے جو حق تلفی ہر دور میں ہوئی اس کی طرف بڑے درد بھرے لہجہ میں گزارش کی۔ آخر میں ملکہ بھوپال سلطان جہاں بیگم کی مدد اور سرپرستی سے کئی مقامات پر خواتین کے حق میں مثبت کاموں کی نشان دہی کی۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے:

اے ماؤں بہنوں بیٹیوں دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہی قوموں کی عزت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

دنیا کی تاریخ اور خاص طور پر عرب اور برصغیر میں عورتوں پر جو ظلم ہوئے یعنی لڑکی کی پیدائش کو ذلت جان کر اُسے زندہ دفن کیا گیا۔ بیوہ عورت کی زندگی کو ایک گناہ اور جرم سمجھ کر اُسے مردہ شوہر کے ساتھ زندہ زندہ جلایا گیا۔ بہت کم سنی میں بلوغ سے بھی پہلے شادی کے رشتے میں قید کر دیا گیا اور اگر وہ بیوہ ہو جائے تو اُسے دوسری شادی کا حق نہیں دیا گیا۔ عورت ذات کے لیے تعلیم اور ہنر بے کار تصور کیے گئے چناں چہ صرف علم و ہنر مردوں کے لیے مخصوص سمجھا گیا۔ ان

تمام عورتوں پر ہوئے مظالم اور ناانصافیوں کو اس نظم میں حالیؔ نے بیان کیا۔

گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا مگر کوئی نہ جز ذاتِ خدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاہی گئیں اس وقت تم، جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانو اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
گزری اُمید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ
بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر

چناں چہ عورتوں کے صبر اور حوصلوں نے مردوں کو متوجہ کیا اور اس طرح ان ناانصافیوں کو دور کرنے کی کوشش ہوئی۔ ستی کی رسم ممنوع قرار دی گئی۔ بچپن کی شادیوں پر پابندی لگائی گئی عورتوں کے حقوق کے لیے قوانین بنائے گئے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست شروع ہوا ڈاکٹر شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کی کوششوں سے علی گڑھ میں گرلز اسکول قائم ہوا۔ بھوپال کی ملکہ سلطان جہان نے لڑکیوں کا ہاسٹل بنوایا۔ عورتوں کے علاحدہ میگزین نکلنے شروع ہوئے۔ حالیؔ نے ان نکات کی طرف اس نظم میں اشارہ کیا ہے:

زیبا ہے گر کہیے تمہیں فخرِ بنی نوعِ بشر — کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے گزر
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب — آتا ہے وقتِ انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب

آخر تمہاری چپ دلوں میں اہلِ دل کے چبھ گئی — سچ ہے کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
اے بے زبانوں کی زبانو بے بسوں کے بازوؤ — تعلیمِ نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے

یہ جیت بھی کیا کم ہے خود حق ہے تمہاری پشت پر
بھوپال کی جانب سے یہ ہاتف کی آواز آئی ہے

مناجاتِ بیوہ: تصنیف : 1884ء
ہیت : مثنوی
تعدادِ شعر: 445

اس نظم میں حالیؔ نے برصغیر کی بیوہ کے دکھ درد کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ جذبات نگاری میں گھریلو محاورات سادہ نرم اور شیریں الفاظ سے نظم کو پُر تاثیر اور دل نشین بنایا گیا ہے جو پُرنم آنکھوں ہی سے پڑھی جاسکتی ہے۔ اس نظم کا ترجمہ برصغیر کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ نظم دراصل ہندوستانی زبان ہے اسی لیے بابائے اُردو عبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا اگر آپ اُس زبان کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے تو حالیؔ کی مناجات پڑھیے۔ مناجاتِ بیوہ میں کم سن لڑکیوں کی شادیاں اور بیوہ ہونے کے بعد عمر بھر کی مصیبت اور افسردگی کا بیان ہے۔ حالیؔ کی اس نظم کی وجہ سے کم سن لڑکیوں کی شادیاں قانونی طور پر ممنوع قرار دی گئیں۔ اس کے علاوہ بیوہ عورت کی دوسری شادی بھی قانونی طور پر قبول کی گئی:

دولہا نے جانا نہ دلہن کو — دلہن نے پہچانا نہ سجن کو
شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہی کنواری
ایک کو تو نے شاد کیا ہے — ایک کے دل کو داغ دیا ہے
پھول کہیں کمہلائے ہوئے ہیں — اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں
عورت ذات کا تنہا جینا — ہر دم خونِ جگر کا پینا
گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے — تیرے سوا جو سب کو بھلا دے

اس نظم کی زبان اور تاثیر پر عبدالماجد دریابادی نے سچ کہا کہ ''باتیں اتنی سچی اور روح کی

گہرائیوں سے نکلی ہوئی کہ آسمان کے فرشتے بھی وجد میں آ آ کر رہیں۔ اگر حالؔی نے اس نظم کے علاوہ ایک شعر بھی نہ کہا ہوتا تو بھی دنیا و عقبیٰ کے لیے بس تھا۔

حالؔی ایک پُر درد اور حساس قلب و جگر کے مالک تھے۔ انہوں نے صرف شاعری میں ان مسائل کو بیان نہیں کیا بلکہ عملاً اس پر عمل کیا۔ حالی اس زمانے میں عورتوں کے حقوق کے پاسبان اور ان کی تعلیم کے حامی تھے جب سر سید اکبرالہ آبادی اور دوسرے افراد اسے ضروری نہیں سمجھتے تھے انہوں نے پانی پت میں اپنے گھر کے قریب لڑکیوں کا مدرسہ کھولا۔ لکھنا پڑھنا اپنی پوتی مشتاق فاطمہ کو سکھایا چناں چہ تعلیم نسواں اور حقوق زناں میں حالؔی برصغیر کے بنیاد گزاروں میں صف اوّل میں نظر آتے ہیں۔

مناجات بیوہ لکھ کر حالؔی نے ذیل کی سماجی اور ادبی خدمات انجام دیں:

1- برصغیر کے معاشرے میں رائج مضر اور نقصان رساں رسومات کا کھلے الفاظ میں انکشاف ان کی مخالفت اور ان کا علاج۔ اس قومی بیداری کی وجہ سے بچپن کی شادیوں کی روک تھام اور بیوہ کو دوسری شادی کا اختیار حاصل ہوا۔ اسی نظم سے متاثر ہو کر برصغیر کی دوسری زبانوں میں ایسی نظمیں لکھی گئیں جن کا متن مناجات بیوہ سے ملتا جلتا تھا۔

2- مناجات بیوہ میں حالؔی نے جو ہندوستانی زبان کا نمونہ پیش کیا وہ عوام کا روز مرہ معلوم ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اسی نظم کا ذکر کرتے ہوئے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اس نظم کی زبان عام فہم ہندوستانی زبان کا عمدہ نمونہ ہے یعنی جسے اہل زبان عامی اور عالم کے سوا غیر زبان کے افراد جو ہندوستانی سے واقف ہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

3- مناجات بیوہ سے عورتوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کمیٹیاں بنیں، مختلف خواتین کے گروہوں نے اپنی اپنی محفلوں میں اسے پڑھا اور پڑھایا۔ اس نظم کی بدولت حقوق زنان کی پاسداری کا احساس شدید ہوا۔

4- اگر اس نظم کا ادبی تنقیدی جائزہ لیں تو ہمیں اس میں کئی موضوعات کا پتا چلتا ہے جنہیں حالی نے نظم کے رشتے میں پرویا ہے۔ یہاں ایک دکھیاری دل کی فریاد جو اپنے بھاگ اور قسمت پر نالاں ہے اور قسمت بنانے والے سے گلہ بھی ہے کیوں کہ گلہ اُس سے ہوتا ہے جس سے

محبت اور توقع ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کے شکوہ میں گلہ خاکم بدہن ہو کر پیش ہوا یہاں ایک ان پڑھ معمولی بیوہ کا لہجہ اس طور رہا:

تو ہے ٹھکانہ مسکینوں کا — تو ہے سہارا غمگینوں کا
تو ہے اکیلوں کا رکھوالا — تو ہے اندھیرے گھر کا اجالا
تو ہی دلوں میں آگ لگا دے — تو ہی دلوں کی لگی بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے — مارے مارے پھر چمکارے

حالی کی اس نظم میں عبد اور معبود کے رشتے کو دکھایا گیا ہے۔ عشق کا رشتہ جتنا مضبوط ہوگا لہجہ کا انداز اتنا رنگین ہوگا۔ حالی کا محور انسان اور اس کی زندگی ہے اور ایک قابل قبول زندگی جس میں لذت و درد، عشق اور محبت، مروت اور شفقت، جذبہ اور گداز شامل ہو ہر مرد اور عورت کا حق ہے وہ حق کو حق دار تک پہنچانے کے حق میں ہیں۔ مناجات بیوہ میں ہمارے معاشرے کی فضا اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ ہر بات اور جذبے کو بے نقاب اور برہنہ بیان کیا جائے اس نزاکت کو جانتے ہوئے حالی نے اس نظم کو اشاروں، علامتوں، محاوروں، استعاروں اور تشبیہوں سے تیار کیا ہے۔ یہ عمل حالی کی اس نظم کو ان کی مشہور نظم مسدس مدو جزر اسلام پر فوقیت دیتی ہے۔ زندگی کے معمولی اور روزمرہ کے حالات سے بنائی گئی یہ نظم دل کے تاروں کو اس لیے بھی چھیڑ دیتی ہے کہ اس کے نغمے میں حقیقی زندگی کی خواہش کی بربادی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ چند منتخب اشعار دیکھیے:

چین سے جاگی اور نہ سوئی — میں نہ ہنسی جی بھر کے نہ روئی
گھر پر برہا پیا بدیسی — آئیوں برکھا کہیں نہ ایسی
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
خوشی میں بھی سکھ پاس نہ آیا — غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
کیسا تھا یہ بیاہ نناواں — یوں ہی پڑا اُس کا پرچھاواں
چین سے رہنے دیا نہ جی کو — کر دیا ملیا میٹ خوشی کو
دن بھیانک اور رات ڈرانی — یوں گزری ساری یہ جوانی
آئے دن تیوہار کا آنا — اور سب کا تیوہار منانا

وہ گرمی کی چاندنی راتیں	وہ ارماں بھری برساتیں
رہ گیا دے کر چاند دکھائی	چاند ہوا پر عید نہ آئی
راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی	سدا برت میں چلی ہوں بھوکی
رہی اکیلی بھری سبھا میں	پیاسی رہی بھری گنگا میں
سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی	سکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی
گر سسرال میں جاتی ہوں میں	نحس قدم کہلاتی ہوں میں
میکے میں جس وقت ہوں آتی	رو رو کر ہوں سب کو رلاتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی	بال نہیں برسوں گندھواتی
دو دو چاند نہیں سر دھوتی	اٹھواروں کنگھی نہیں ہوتی
اڑ گئیں دل کی سب وہ ترنگیں	چاو رہے باقی نہ امنگیں
یوں نہ بری اس جان پہ بنتی	ماں مجھ کو اے کاش نہ جنتی

پس اس نظم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر اثر کو پر تاثیر کیا اور تمام مسائل رکھتے ہوئے بھی یہ نظم ایک کامیاب تجربہ کی شکل میں ہمارے سامنے عمدہ ترین اُردو نظموں میں شامل رہی۔

برکھارت:

حالی نے 1874ء میں ایک سو چوالیس ((144 اشعار کی مثنوی برکھا رت اُس جدید مشاعرے میں پڑھی جو ہال رائیڈ کی ایما پر محمد حسین آزاد نے موضوعاتی شاعری کے فروغ کے تحت لاہور میں برگزار کیا تھا۔ حالی کی یہ نظم پسند کی گئی اور اس پر سرسید کے علاوہ اخبار پنجاب نے بڑی تعریف کی جس کو گارساں دتاسی نے اپنے مضمون میں نقل کیا:

> ''جس نے یہ نظم نہ پڑھی ہو وہ پڑھ کر دیکھے کہ شاعر نے کس خوبی سے یہ تصویر بنائی ہے۔ جنھوں نے شاعر کی زبان سے اسے سنا وہ مرحبا کہہ اٹھے اور کوئی صاحب ذوق اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وطن کی خصوصیتوں کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہے کہ اور کسی مثنوی میں اس کی نظیر نہ ملے گی۔ بڑی بات یہ ہے کہ شاعر نے کوئی بے

موسم کی راگنی نہیں چھیڑی اور نہ حسن وعشق کے چرچے کیے پھر بھی اس کی سادگی اور رنگینی جادو کا کام کر گئی۔"

مشہور ہے کہ اشیا اپنی ضد سے جانی جاتی ہیں۔ ہم روشنی کو اندھیرے سے، غم کو خوشی سے، خشکی کو تری سے گرمی کو سردی سے جانتے اور ان کی اہمیت اور برکت سے آشنا ہوتے ہیں۔ چونکہ جس موضوعی مشاعرے میں حالیؔ نے یہ نظم پڑھی اس کا موضوع برسات تھا اس لیے شاعر نے برسات کی اہمیت اور اس کی ضرورت بتانے کے لیے خشک سالی اور گرمی کا بیان پہلے کیا کہ زمانہ مضطرب، جاندار بے چین اور پریشان، نباتات اور جمادات بھی ویران اور سنسان ہو چکے ہیں۔ حالیؔ کے چند مصرعے دیکھیے:

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار
اور کھول رہا تھا آب دریا
اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں ست
پھولوں سے پٹے ہوئے کہسار
دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
کرتے ہیں پپیہے پہیو پہیو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

ہر مذہب کے ماننے والے اپنے اپنے طریقے پر رحمت باری کا شکر ادا کر رہے ہیں:

مسجد میں ورد اہل تقویٰ — یا رب لنا ولا علینا[1]
مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا — کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو گرو گرنتھی — گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے — ڈھکنے ہیں دیوں پہ ڈھکتے پھرتے

[1] اے خدا اس سے ہمیں فائدہ ہو، نقصان نہ ہو۔

حالی کے برسات کے مثبت اور کچھ منفی اثرات کو جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں پر بڑے ہی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ اس نظم میں منظر نگاری، آسان زود فہم تشبیہات استعارات سے اشعار کو رنگین بنایا گیا ہے۔ یہ نظم بہار کا مرقع معلوم ہوتی ہے، پرندوں کی نغمہ سرائی، پھولوں کی جلوہ نمائی، دریاؤں کی تیز روانی، جھیلوں اور تالابوں کی طوفانی کے ساتھ ساتھ سڑکوں کی ناہمواری گھروں کی نابودی اور بیماریوں کی زیادتی وغیرہ کا بھی نقشہ کھینچا گیا ہے تاکہ برسات کے سکے کے دونوں رخ دکھائی دیں۔

قدرت کے عجائبات کی کان	عارف کے لیے کتاب عرفان
گلشن کو دیا جمال تو نے	کھیتی کو کیا نہال تو نے
طاؤس کو ناچنا بتایا	کوئل کو الاپنا سکھایا
دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان	اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
دولت جو زمین میں تھی مخفی	آگے ترے اس نے سب اگل دی
جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے	واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی	آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی

اس نظم کے آخری چند شعر حالی نے اپنے گھر اور وطن کی یاد میں لکھے۔ یہاں یہ بات بھی خارج ازمحل نہیں کہ حالی کو لاہور کی آب وہوا سازگار نہ تھی وہ ہمیشہ بیمار اور دکھی رہتے تھے چناں چہ اس نظم کے چند مہینوں بعد وہ ہمیشہ کے لیے دلی چلے گئے:

پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد	جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی	چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا	طوفاں تھے آندھیوں کے برپا
اٹھتا تھا بگولے پر بگولا	شعلے تھے زمین سے نکلتے

حالی کے ان مصرعوں پر انیس کی گہری چھاپ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان مضامین میں انیس کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ مضمون باندھتے وقت اقلیم انیس سے نکلنا دشوار ہے۔ انیس کے مرثیے

''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' میں جو انیسؔ نے آٹھ بندوں میں گرمی کا ذکر کیا ہے اس کے چند مصرعوں سے اوپر بیان کیے گئے حالیؔ کے مصرعوں سے ملا کر دیکھیے:

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا
آہو جو کالے تھے تو تھے چیتے سیاہ فام
شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرداب پر تھا شعلہ جوالہ کا گماں

یہی نہیں بلکہ اسی گرمی کے اثر کو حالیؔ نے جو بچوں پر بتایا ہے وہ بھی مرثیے کی دین میں محسوب ہوگا۔

اور صبح سے شام تک برابر — تھا العطش العطش زباں پر
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال — کمہلائے ہوئے تھے پھول سے گال
ہر بار پکارتے تھے ماں کو — ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

کیا یہ اشعار مرثیہ کے معلوم نہیں ہوتے؟

حالیؔ نے گرمی کی زحمت اور تکلیف بتانے کے بعد برسات کی رحمت اور نعمت کا ذکر کیا ہے:

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں — جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسماں پہ برپا
باغوں نے کیا ہے غسل صحت — کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

حقوق اولاد: تصنیف : 1888ء
ہیت : مثنوی
تعداد شعر : 351

یہ مثنوی مکالمے کی صورت میں ایک قصے کے پیرائے میں لکھی گئی ہے جو باپ اور بیٹے کے

درمیان واقع ہوئی ہے۔ یہاں سماج کی خرابیاں، بچوں کی تربیت میں کوتاہیاں جس میں باپ اور بیٹا دونوں ایک حد تک اسی خرابی کے ذمہ دار ہیں بتایا گیا ہے۔

باپ نے لاڈلے بیٹے کو ہر طرح کا آرام اور آسائش دیا۔ پیسوں کی فراوانی، محنت سے دوری کھیل کود کی فراوانی اور آوارہ گردی نے لاڈلے بچے کو نکما کر دیا۔ چناں چہ سونے پر سہاگا ایسے بے کار نوجوان کی بڑی شاندار شادی رچائی۔ باپ نے جو کچھ پیسہ جمع کیا تھا وہ جھوٹی شان نبھانے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے خرچ کر دیا جس کا نتیجہ برا ہوا اور یہ خاندان مالی اور اخلاقی مسائل سے دو چار ہوا۔ شادی کے بعد بھی لڑکا بگڑتا گیا اب اُسے کئی بری عادتیں لگ چکی تھیں جبکہ اس کا باپ ضعیف اور غریب ہو چکا تھا۔ بیٹے نے باپ کی پہلے تعریف کی کہ اُس کا بے حد خیال رکھا لیکن اس ناز و نعمت نے اُسے صحیح زندگی بسر کرنے سے باز رکھا۔ اگر باپ کی اتنی بے وجہ ہمدردیاں نہ ہوتیں تو وہ دنیا میں کام کرنے اور محنت سے روٹی اور روزگار کمانے کے قابل ہو جاتا۔ باپ نے اس اعتراض کو سن کر یہ اقرار کیا کہ بچوں کے ساتھ حد سے زیادہ لاڈلا پن، آسانیاں، ان کی تربیت میں رکاوٹ بن جاتی ہیں لیکن پھر بیٹے کو دوبارہ نصیحت کی کہ اب بھی وہ جوان ہے وقت باقی ہے محنت اور سچی لگن سے دنیا میں کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔ یہ ساری نظم سیدھی سادی بیانیہ نظم ہے اس میں محاسن زبان، صنائع بدائع نہیں ہیں بلکہ تمام بول چال میں مکالمے کی زبان ہے جیسے کوئی بات کر رہا ہے۔ سیدھے سادے مطالب نصیحتوں اور شکایتوں کے انداز میں بیان ہوئے ہیں اور نظم کے آخر میں اس طرح سے نتیجہ گیری کی گئی ہے۔

راہ پر چاہو تو آ سکتے ہو تم	ہم نے جو کھویا ہے پا سکتے ہو تم
ہر کوئی بیج اپنا خود بوتا ہے خوب	کام اپنا آپ ہی ہوتا ہے خوب
پہلے اپنا سوچ لو انجام تم	دیتے رہنا پھر ہمیں الزام تم
ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے مگر	اب تو تم عاقل ہو خود جاؤ سنور

جواں مردی کا کام:

حالیؔ کی قدیم ترین نظموں میں ایک مثنوی 1872ء کی تصنیف ''جواں مردی کا کام'' ہے جو ستر (70) اشعار پر مشتمل ہے۔ حالیؔ لکھتے ہیں کہ یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور

کچھ خیالات کے اضافے سے منظوم کیا ہے۔ اس مثنوی کی زبان سادہ سلیس اور بیانیہ ہے۔ نظم کا متن واقعہ نگاری اور مکالمہ بندی سے بنا عام فہم طرزِ بیان میں ہے تاکہ بچے جوان بوڑھے عامی اور عالم سب اسے سمجھیں اور انسانی قدریں سیکھیں۔

نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بوڑھے باپ جس کے تین بیٹے تھے اپنی جائیداد اور ثروت کو تینوں میں تقسیم کر کے جواہرات کو الگ ایک صندوق میں رکھ کر تینوں بیٹوں سے کہا کہ یہ جواہرات کا مالک وہ ہوگا جس نے سب سے اچھا کام انجام دیا ہو چناں چہ بڑے بیٹے نے بیان کیا کہ ایک شخص نے بغیر کسی گواہ یا رسید کے اس کے پاس بڑی رقم امانت رکھوائی تھی جس کو وہ آسانی سے ہڑپ کر سکتا تھا لیکن اس نے امانت میں خیانت نہیں کی اور وہ رقم اس شخص کے مانگنے پر واپس کر دی اور اُس مال دار شخص سے وہ انعام بھی قبول نہیں کیا جو اُسے پیش کیا گیا تھا اُس پر بوڑھے باپ نے کہا:

اک برائی سے بچے تم تو کیا — اس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا
اک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز — شرم کی جا ہے تری عمر دراز

منجھلے بیٹے نے کہا کہ اُس نے ایک ڈوبتے لڑکے کو بچایا اور اس کی ماں سے ملا دیا۔ بوڑھے باپ نے کہا:

آدمیت کا کیا تم نے کام — جاؤ بس ہے یہی اس کا انعام
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے — نہ ہو اتنا بھی تو انساں کیا ہے

چھوٹے بیٹے نے کہا کہ اُس نے ایک مدہوش شخص کو موت سے بچایا جو اُس کا جانی دشمن تھا چھوٹے لڑکے نے اس کام کو کرتے ہوئے اپنے چہرے کو ڈھانک لیا تاکہ وہ شخص شرمندہ نہ ہو۔ بوڑھے باپ اور دونوں بھائیوں نے یہ اقرار کیا کہ سب سے جواں مردی کا کام چھوٹے بیٹے نے کیا اور وہی اس جواہرات کے صندوق کا حق دار ہے۔

''کلمۃ الحق'' معروف بہ ''راست گوئی'':

حالی کی یہ مثنوی ((121 اشعار سے بنی ہے۔ یہ عجیب طرزِ بیان کی مثنوی ہے جس میں راست گوئی یا سچ بولنے پر جو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا ذکر فقروں میں، محاوروں میں تشبیہوں اور استعاروں میں بیان کر کے شاعر نے اُن برگزیدہ ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی حق

گفتاری سے دنیا میں انسانی اور دینی قدریں باقی رہ گئیں اگر چہ وہ خود قربان ہو گئے۔ حالی کی یہ نظم اخلاقیات کا درس اور انسانی قدروں کو مہمیز کرنے کا عمل معلوم ہوتی ہے۔ سچائی یا راست گوئی تلخ ہے، تند ہے، کڑوی ہے، برہنہ تلوار، زہر ہلال اور شہادت ہے۔

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہو گی
چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
تو آشتی کی رہتی ہے دشمن

یہی سچ گفتاری نے تاریخ میں وہ نقش بنائے جو آج بھی تر و تازہ ہیں۔ حالی نے راست گویوں سر بازوں کا ذکر کئی مقامات پر علاحدہ علاحدہ کیا ہم اسے کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔

سقراط کو زہر تو نے دلایا
شبیرؓ کو قتل تو نے کرایا
بدر و اُحد میں رن تو نے ڈالے
موسیٰ کو مدین تو نے بھگایا
احمد e سے مکہ تو نے چھڑایا

حالی نے راست گوئی کو ہر زاویہ سے دیکھا اور ہم کو دکھایا ہے۔ حالی اُس عظیم شاعر کے شاگرد ہونے کا شرف رکھتے ہیں جس کے لیے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کا انداز بیاں اور ہم یہاں اس کی جھلک دیکھ رہے ہیں:

اے راست گوئی اے تیغ براں — تیرا مخالف کیوں ہو نہ دوراں
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر — دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر
اٹھتا ہے عملہ لات اور صفا کا — ہوتا ہے گھر پر قبضہ خدا کا
ہوتے ہیں اغیار احمد کے ساتھی — بوجہل کے سب چھٹتے ہیں ناتی
ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت — تو جھوٹ پر واں کرتی ہے لعنت

یاں نام تیرا جس نے لیا ہے
عالم کو اپنا دشمن کیا ہے

کتنوں نے مانا ساحر نبی e کو
کتنوں نے جانا کافر علیؑ کو

طوفان اٹھائے اہل ہدیٰ پر
بہتان باندھے زین العبا پر

نعمان کو دی بدعت سے نسبت
کی شافعی پر برپا قیامت

مالک پہ لائے آفت جفا جو
یاں تک کہ اکھڑا مفصل سے بازو

کی ابن حنبل کی یہ مدارا
چہرے پہ تھوکا کوڑوں سے مارا

نکلے ایمہ اکثر وطن سے
خالی ہوا رے ابن حسن سے

مرتد بنایا اہل یقیں کو
ٹھہرایا زندیق ارباب دیں کو

حالیؔ یہ بتا رہے ہیں کہ ان تمام مشکلات اور تکالیف کے باوجود راست گوئی پیروز رہی اُس نے دلوں پر حکومت کی، تاریکیوں کو اجالوں سے بدل دیا ظلم و جور کو نابود کر دیا، اس لیے آج دنیا میں راست گویوں کے نام زندہ ہیں:

اے کلمہ حق تیری بدولت
تجھ پر ہوے وہ دیوانے جب سے
دامن انہوں نے تیرا نہ چھوڑا
دنیا نے ان پر گو ظلم توڑا
ہوتا نہ ہرگز جگ میں اجالا
حق کا نہ ہوتا گر بول بالا

دولت اور وقت کا مناظرہ:

اُردو شعر و ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ بعض گراں بہا جواہر اُردو کے پرستاروں سے ظاہر ہو کر بھی مخفی ہیں۔ حالیؔ کی بہت سی نظمیں نہ صرف ہمارے مطالعے میں ہوتیں بلکہ ان کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں ہونا چاہیے تھا۔ حالیؔ کے مسدس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ ان کی دوسری مثنویاں اس کے سامنے بے نور ہو کر اُردو دشت میں جلتی رہیں جن میں ایک سینتالیس (47(اشعار کی مثنوی دولت اور وقت کا مناظرہ ہے۔ ہمارے مطالعے میں علم و دولت، شاعری و موسیقی، حسن و

عشق اور کئی دوسری قدروں کے مناظرے نظر آتے ہیں لیکن دولت کا وقت کے ساتھ مناظرہ جس میں دونوں قدروں کی مثبت جہتیں بتائی گئی ہیں کم ہے۔ حالؔی نے یہ مثنوی اُس دور میں لکھی جب وہ غزل گوئی سے زیادہ شغف نہیں رکھتے تھے۔ حالؔی کی دوسری نظموں، قطعوں، غزلوں، رباعیوں اور نظموں کی طرح اس مثنوی میں بھی سادہ و سلیس زبان ملتی ہے جس سے عامی اور عالم دونوں مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حالؔی نے نہ صرف اُردو شاعری کے مضامین کو بدلا بلکہ اس کی زبان کو بھی زمانے کے اعتبار سے بنایا۔

مثنوی یوں شروع ہوتی ہے:

ایک دن وقت نے دولت سے کہا
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایہ عزت یا میں؟

کیوں کہ دولت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور وقت کا اثر صرف کامیاب افراد سمجھ سکتے ہیں اس لیے:

وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا
سبز ہے گلشن دنیا مجھ سے
مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشوونما
نام اقبال ہے آنے کا مرے
لقب ادبار ہے جانے کا مرے
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر
میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدر بشر
کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا
درمیاں گر نہ قدم ہو میرا
جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں
ہو اگر شیر تو روباہ کروں

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
میری عظمت نہیں باور تجھ کو

مناظرہ کرتے وقت مثبت اور منفی قوتوں کو آمنے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ حالیؔ کا کمال ہے کہ دونوں قدروں کی قدر و قیمت میں تقابل کر کے مناظرے میں جان ڈالتے ہیں اور ملٹن کے قاعدے کے مطابق شعر کو سچا اور سادہ بناتے ہیں۔ ہم کسی مزید تشریح کے بغیر واں مصرعوں سے نثر کا کام لیتے ہیں جو بقول شبلی نعمانی وہ شعر جس کی نثر نہ ہو سکے وہ عمدہ شعر ہے کیونکہ سادہ سلیس الفاظ میں روزمرہ میں کہا گیا ہے:

وقت نے سن کے کہا اے دولت
ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر
اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر
کیجئے فرض تجھے گر چشمہ
تو ہوں چشمے کا میں سر چشمہ
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں
ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
تو ہے گر مال تو میں راس المال

جن لوگوں نے وقت کا لحاظ رکھا وہی لوگ دنیا و آخرت میں کامیاب اور سرخ رو ٹھہرے۔ وقت دریا کے پانی کی طرح واپس نہیں لوٹتا، دنیاوی کام کاج وقت کے محتاج، دینی ذمہ داریاں سب وقت کی پابند۔ وقت کی اہمیت قدر و قیمت سے واقف دنیا کے عظیم افراد ہیں اگرچہ ان کے پاس شاید دولت کا انبار نہ ہو۔ دولت مٹھی میں رہتی ہے لیکن وقت آزاد ہے:

ان کی مٹھی میں ہے تو اے دولت — طائر رشتہ بہ پا کی صورت
نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود — جس کا نایاب ہے عالم میں وجود
کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر — جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر

جانتے ہیں حکما و عرفا مجھ کو سرمایہ دین و دنیا
گن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت ہے مگر تنگ مجال فرصت

مناظرہ رحم وانصاف:

1876ء میں حالیؔ نے ایک (119)اشعار پر مبنی مثنوی رحم وانصاف کے درمیان گفتگو مکالمے کی صورت میں مناظرے کے عنوان سے تصنیف کی۔ یہ حالیؔ کی تخلیقات کا وہ دور تھا جب ان پر جدید شاعری نے پورا تسلط حاصل کر لیا تھا وہ اب اپنی نظموں میں موضوع سے گلشن شعر سجا رہے تھے جس کا بیج پنجاب میں محمد حسین آزادؔ کے ترتیب دیئے گئے مشاعروں نے حالیؔ کے ذہن میں بود یا تھا۔ ان نظموں کی تخلیق کر کے حالیؔ یہ بتانا چاہتے تھے کہ عشقیہ فلاسفانہ اور تصوفی مضامین کے علاوہ بھی اُردو شاعری میں ایسے موضوعات کی کمی نہیں جس سے شاعری کو دلچسپ اور دل پسند بنایا جا سکتا ہے جس سے ہر طبقہ استفادہ کر کے اپنی اور معاشرے کی فکری صلاحیت کو بلند کر سکتا ہے۔ حالیؔ جن دنوں ایسی نظمیں لکھ رہے تھے تو اس کا خیر مقدم اُس طرح کا نہیں ہوا جن کی حق دار یہ نظمیں تھیں جس کی وجہ قوم کی جہالت اور عوام وخواص کا خاص شعری مذاق تھا جس میں عشق کی تندی، چوما چاٹی کے چٹخارے اور ہرزہ سرائی کے علاوہ اساتذہ شعرا کے دفتر جو ان لغویات سے خالی تھے لیکن فلسفہ اور تصوف سے بھرے ہوئے تھے۔ حالیؔ کی شاعری کو بیانیہ کہہ کر اس کو سپاٹ اور بے مزا بتا کر ان نظموں کو کچھ اس طرح قدیم بستوں میں باندھ دیا گیا کہ آج سوا سو سال گزرنے کے بعد بھی ان نظموں پر خاطر خواہ کام نہ ہو سکا۔

مناظرے کے لغوی معنی بحث کرنے کے یا باہمی مباحث کے ہیں۔ اس علم میں مدح اور قدح کر کے سکے کے دونوں رخوں کو دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالیؔ کی کئی نظمیں مکالمے کی شکل میں مناظرہ پیش کرتی ہیں۔ اس مثنوی میں حالیؔ نے انصاف اور رحم کا تعارف کر کے ان دونوں میں بحث کروائی اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا کے یہاں دونوں فریقین کی جج عقل بنی اور دونوں کی لن ترانیاں سن کر کہا کہ رحم اور انصاف۔ سنو!

خیر اک کان ہے تم جس کے ہو گوہر دونوں

صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف
تو ہے اک قالب بے روح نہ ہو گر انصاف
اور سن اے عدل نہیں اس میں تکلف سرمو
گر نہ ہو رحم تو اک دیدہ بے نور ہے تو
فرق اصلا نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو
رحم کہلاے جو مظلوم کی فریاد سنے
عدل ٹھہرے جو سزا ظالم بے رحم کو دے
کہیں وہ مہر کی صورت میں عیاں ہوتی ہے
اور کہیں قہر کے پردے میں نہاں ہوتی ہے

انصاف اور رحم کا مکالمہ سنیے اور حالی کے فن کی داد دیجیے ہم کچھ اشعار اور مصرعے یہاں کسی ترتیب بغیر پیش کرتے ہیں:

ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر پوچھا — کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں — دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں
قتل انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری — سیکڑوں چڑھ گئے سولی پہ بدولت تیری
تیرے فتوے پہ کروڑوں ہوے سر تن سے جدا — اور ترے حکم سے لاکھوں ہوے مسکن سے جدا
اسی کرتوت پہ اے عدل یہ دعوے ہیں تجھے — کہ بنا امن کی دنیا میں ہے قائم مجھ سے
رحم ہے نام مرا لطف و کرم کام مرا — فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام مرا
لطف ہے عام سدا اہل خطا پر میرا — ہاتھ اٹھتا نہیں خونی کی سزا پر میرا

حالی اپنی نظموں کے مضمون کو تلمیحات سے سجاتے ہیں:

جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے — اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے
فوج روان کی لڑائی میں کھپائی کس نے — آگ لنکا میں سوا تیرے لگائی کس نے
مصر میں قید سے یوسف کو نکالا میں نے — اور ایوب کے بیڑے کو سنبھالا میں نے

بیڑا فرعون کا جب غرق فنا ہوتا تھا میں وہاں ساحل دریا پہ کھڑا روتا تھا

رحم کی بات سن کر انصاف نے اپنی کارکردگی بتائی اور کہا:

یوں تو اے رحم تری ذات میں جوہر ہیں بہت خیر تھوڑی ہے مگر آپ میں اور شر ہیں بہت
بے مروت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا جس کو تو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا

یہاں حالی بلاتفریق مذہب وملت دنیا میں جو ظلم ہوئے ہیں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ انصاف کہتا ہے:

جس قلم رو میں کہ جاری نہیں میرا فرماں ظلم کے ہاتھ میں واں فکر وعمل کی ہے عناں
دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب وہاں اور مسیحائے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں
نیک فرزند ہیں ماں باپ کے جو حلقہ بگوش رام لچھمن کی طرح پھرتے ہیں واں خانہ بدوش
مان رکھا ہے جنھیں قوم نے اولاد رسول e قوم کے ہاتھ سے ہو جاتے ہیں پیاسے مقتول
زہر سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں اور یوسف سے برادر کو دغا دیتے ہیں

حبِ وطن:

حالی نے اپنے لاہور کے قیام کے دوران انجمن پنجاب کے برگزار مشاعرے میں شرکت کر کے ایک طویل مثنوی ''حبِ وطن'' 1874ء میں پڑھی جس کی دھوم شعر وادب میں آج بھی باقی ہے۔ ملٹن نے جو تین شرطیں اچھے شعر کے لیے بیان کی تھی وہ سادگی، جذبات اور اصلیت تینوں یہاں موجود ہیں۔ اس مثنوی میں کل دو سو پندرہ ((215 اشعار محبت کے دھاگے میں پیروے گئے ہیں۔ یہاں شاعر وطن کے ہم وطنوں کو باہم محبت، اخوت، ہمکاری، ہمدردی، ہمنوائی، ہمراہی اور ہم بستگی کی طرح احساس ملی قومی اور وطنی سے جوڑ رہا ہے۔

حالی کے فن پر کام کرنے والوں نے اس مثنوی کے کئی اشعار مختلف پیرائے میں نقل کیے ہیں۔ اس مقام پر ہم پوری مثنوی کا مختصر اور جامع جائزہ لیں گے۔ اس مثنوی کا حسن یہ بھی ہے کہ اسے بلاتفریق مذہب وملت صرف اہل وطن ہونے کی نسبت سے پیش کیا گیا ہے۔ تمہید میں وطن کی تاریخ جغرافیہ کے علاوہ اس کی تہذیب اور تمدن کا ذکر بھی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی زمین، اس کے پربت، اس کی ہوائیں، اس کے موسم، اس کے دشت و باغات، اس کے چرند و پرند سب اہل وطن کے لیے دل شاد اور نور چشم معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کے دل و دماغ میں یہ تمام مناظر اور یادیں تازہ ہیں جن کی قدر و قیمت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب وطن سے دوری ہوتی ہے:

اے پہاڑوں کی دل فریب فضا	اے لب جو کی ٹھندی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمہ سحری	اے شب ماہتاب تاروں بھری
تیری دوری ہے مورد آلام	ترے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں	سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
مٹ گیا نقش کامرانی کا	تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے	یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
تیری اک مشت خاک کے بدلے	لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا	کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

وطن کی محبت کی تمہید کے بعد حالیؔ نے قدیم تاریخ کا دروازہ کھولا جہاں ہندوستان کے اصلی باشندوں کو آریا قوم نے اپنا غلام بنالیا اور پھر اس وطن پر حملہ آوروں نے حکومت برقرار کی۔

گو غلامی کا لگ گیا دھبا	نہ چھٹا اُن سے دیس پر نہ چھٹا

وطن کی اہمیت اور محبت کو شاعر نے تین مختلف مقامات اور واقعات سے اجاگر کیا۔ ہندوستان میں رام چندر جی کو ان کے وطن اجودھیا سے نکل کر چودہ برس پردیس میں بن باس میں گزارنا پڑا:

جب ملا رام چندر کو بن باس	اور نکلا وطن سے ہو کے اُداس
پاؤں اٹھتا تھا اس کا بن کی طرف	اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
گزرے غربت میں اس قدر مہ و سال	پر نہ بھولا اجودھیا کا خیال
تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا	آتی تھی جب اجدھیا کی ہوا

پیغمبر اکرم e اور ان کے اصحاب سے جب وطن مکہ چھوٹا اور انھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اس کا نقشہ یوں کھینچا:

766

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی	سید بطحٰی کے ہم راہی
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا	پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے	سنگریزے زمین بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کے چھوٹا تھا	دل سے رشتہ نہ ان کا ٹوٹا تھا

حضرت یوسف g سے بھی کنعان وطن چھوٹا وہ ہمیشہ نہ صرف کنعان کی یاد میں تھے بلکہ وطن والوں کی مدد بھی کرتے تھے:

ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور	اور ہوا ملک مصر پر مامور
یاد کنعاں جب اُس کو آتی تھی	سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دکھ اٹھائے تھے جس وطن میں سخت	تاج بھاتا تھا اُس بغیر نہ تخت

ان کو بیان کر کے حالی گریز کرتے ہیں کہ وطن کی محبت اگر سچی ہو تو وہ صرف وہاں کے جمادات، نباتات اور حیوانات کی حد تک محدود نہ ہو بلکہ اصل چیز تو انسانوں اور ہم وطنوں کی محبت اخوت اور ان کی خوشی میں ان کے غم میں غم ہونا چاہیے۔

حالی نے ایک طولانی پند و نصیحت کیا ہے وہ اصلی وطن دوستی اہل وطن کی مدد سمجھتے ہیں:

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ	ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی	جن پہ پڑتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ	کہ ہے اترن تمہاری جن کا بناؤ
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ	تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

شاعر کہتا ہے ہندوستان میں اتحاد اور اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اُسے بیرونی حملہ آوروں نے آسانی سے زیر کر لیا۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب بھائی بھائی ہیں:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر	نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو	بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی	جین مت ہووے یا ہو بیشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو	سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ہند میں اتفاق ہوتا اگر کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی ایک شائستہ قوم مغرب کی

شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف مختلف مذاہب اور ملتوں کے نفاق کی بات کر رہا ہے بلکہ ایک ہی قوم کے مختلف گروہوں کی آپس کی رسا کشی جو خودکشی کے مترادف ہے ذکر کر رہا ہے:

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار خوش نویسوں کو ہے یہی آزار
نسخہ اک طب کا جس کو آتا ہے سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے
سب کمالات اور ہنر ان کے قبر میں ان کے ساتھ جائیں گے

حالی اہلِ وطن کو غیرت اور حمیت کا سبق دے کر انہیں نصیحت کرتے ہیں:

عزت قوم چاہتے ہو اگر جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر
ان کی عزت تمہاری عزت ہے ان کی ذلت تمہاری ذلت ہے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
گر نہیں سنتے قول حالی کا پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

نشاطِ امید:

حالی نے یہ اناسی (79اشعار کی مثنوی 1874ء میں محمد حسین آزاد کے موضوعی مشاعرے لاہور میں پڑھی۔ ہر دین میں اور خصوصی طور پر اسلام میں ناامیدی کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ شاعروں نے امید کو زندہ دلی اور ناامیدی کو مردہ دل کہہ کر اس بات کو بانگ دہل کہنے کی کوشش کی ہے:

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اس مثنوی کا اصلی محور، جوہر اور مبدا اُمید ہے جو ایک صحت مند، کارآمد اور کامیاب ذہن کی

نشوونما کے لیے وہی کام کرتی ہے جو خون میں آکسیجن۔ حالیؔ کی یہ نسبتاً طویل مثنوی عنوان کے گرد ہی گردش کرتی نظر آتی ہے۔ مثنوی کیا ہے ایک گلدستہ ہے جس میں خیالات، جذبات، واقعات تلمیحات، استعارات، تشبیہات، محاورات کو سلیقے اور رنگینی سے نرم خوش رنگ الفاظ کی ڈور سے باندھا گیا ہے تا کہ خیالوں کے پھول ایک دوسرے سے الگ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بندھے رہیں۔

نظم کے آغاز میں امید کو جان نواز، دل سوز، کارساز، عیش اور رنج کی شفیق، دکھ اور سکھ کی رفیق وغیرہ بتایا گیا ہے۔ ہر مصرعہ سچا اور سادگی سے لبریز ہے:

اے مری امید مری جاں نواز	اے مری دل سوز مری کارساز
عیش میں اور رنج میں میری شفیق	کوہ میں اور دشت میں میری رفیق
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ	تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ
جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج	کھول دیے تو نے قناعت کے گنج
خاطر رنجور کا درماں ہے تو	عاشق مہجور کا ایماں ہے تو

تمہید کے بعد حالیؔ قدیم واقعات کا ذکر تلمیحات اور اشارات میں کرتے ہیں یعنی مصرعہ میں پوری داستان کو گھول کر یہ بتاتے ہیں کہ یہی امید تھی جس سے کامیابی، روشنی، زندگانی اور کامرانی کا راستہ طے ہوا:

نوحؑ کی کشتی کا سہارا تھی تو	چاہ میں یوسفؑ کی دل آرا تھی تو
تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس	ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

ذیل کے شعر میں حالیؔ کو رام کی جگہ پانڈو اور پانڈو کی جگہ رام لکھنا تھا کیوں کہ رام کو بن باس ملا اور پانڈوں کو جنگ کرنی پڑی۔ حالیؔ کہتے ہیں:

رام کے ہمراہ چڑھی ان میں تو	پانڈو کے بھی ساتھ پھری بن میں تو

حقیقت یہ ہے کہ امید ایک ایسی مثبت قدر ہے جس میں منفی کا شائبہ بھی نہیں۔ امید ہی نیکی اور ایمان وایقان سے بندھی ہے۔ امید ہی دین و دنیا کی کامیابی کا راز ہے اور یہی عاقبت کی کلید بھی ہے:

دین کی تجھ بن کہیں پرسش نہ ہو
تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو

دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ
دین کی تو اصل ہے دنیا کی جڑ

نام ہے سدرہ کبھی طوبیٰ ترا
روز نرالا ہے تماشا ترا

کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل
جلوے ہیں سب تیرے یہ بے قال و قیل

دنیا کے کاموں میں امید کی وجہ سے کامیابی ہے۔ امید کسی مثبت اور خوشحالی ماحول سے پہلے اس کا نقشہ ذہنوں میں کھینچ دیتی ہے۔ امید ہی ہے جو لا علاج مریضوں کو بھی تندرست ہونے کے خواب دکھاتی ہے۔ فقیر اور لاچاروں کو ہوائی محلوں میں سلاتی ہے۔ حالیؔ نے مثنوی میں محاورے اور معروف فقیروں کو جوڑ کر اشعار میں شعری چاشنی پیدا کی ہے:

وعدہ وفا کرتی ہے گو چند تو
رکھتی ہے ہر ایک کو خور سند تو

آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس
رکھے غنی اس کو ہے جس کے پاس

جن کو میسر نہیں کملی پھٹی
خوش ہیں تو قع پہ وہ زر بفت کی

چٹنی سے روٹی کا ہے جن کے بناؤ
بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ

حالیؔ امید کی تمام قدریں بتا کر اس نظم کے آخر میں یہ بتاتا ہے کہ جب ناامیدی انسان کو اسیر کر لیتی ہے اور اس کے دین و دنیا کے رشتے کو توڑ دیتی ہے تو زندگی وبال جاں بن جاتی ہے:

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم
آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم کر

جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھایئے
پھاڑ کے کپڑے باہر نکل جایئے

ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا
اڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا

مگر جیسے ہی امید کی کرن چمکتی ہے:

کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں
رخت سفر یاس نے باندھا وہیں

ساتھ گئی یاس کے پژ مردگی
ہو گئی کافور سب افسردگی

قوم کا متوسط طبقہ:

حالیؔ نے ''قوم کا متوسط طبقہ'' ترکیب بند دسمبر 1891 میں علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل

کانفرنس میں پڑھا۔ طبقہ سے مراد وہ لوگ جو سلف بلپ علم و ہنر سیکھ کر دولت عزت نام و مقام پائے ہیں۔ یہ لوگ متوسط فقیر اور امیر دونوں گروہوں سے بہتر ہیں۔ ادنیٰ لوگ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کرتے اعلیٰ طبقہ اشراف وہ لوگ ہیں جو دولت اور اپنی حالت میں مست ہیں اس میں ترقی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ حالی نے اس نظم میں جو ترکیب بند ہیئت میں لکھی گئی ہے قوم کے متوسط طبقہ کو کارمند کارکن اور کارآمد و کامیاب دکھایا ہے۔ اس نظم کا مطلع ہے:

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیوں کر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں

حالیؔ نظم میں گدائی، محتاجی اور ناداری کی مذمت کرتے ہوئے یہاں مولانا رومؔ کے شعر کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ مولانا رومؔ نے کہا تھا:

آنچہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

الحذر اس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
لومڑی جاتے ہیں بن جن کی بدولت شیر نر

حالی پھر یہ بتاتے ہیں کہ مسلسل کوشش اور محنت سے انسان کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ حالی انگریزی ضرب المثل Rome was not built in day کو یوں نظم کرتے ہیں:

انجمن ہے قوم کی ہنگامہ شادی نہیں
ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

حالیؔ متوسط طبقہ میں مزدور اور علم و ہنر کے اشخاص کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

متوسط طبقہ (مزدور):

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جاں آتی ہے مردوں میں وہ طاقت ہے یہی
آدمیت سیکھتے ہیں ان سے سب چھوٹے بڑے

نوعِ انساں میں بقائے آدمیت ان سے ہے

کرتے ہیں اخلاق ادنیٰ اور اعلیٰ ان سے اخذ
آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت ان سے ہے

پھونکتے ہیں روح قومیت یہی افراد ہیں
ہے جہاں قوموں میں یک رنگی ووحدت ان سے ہے

دم سے ہے وابستہ ان کے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

متوسط طبقہ (علم وہنر):

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیوں کر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی
فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنے سے بری

یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں
رونق بازارِ جنس علم و حکمت ان سے ہے

پاؤ گے ان میں طبیب ان میں ادیب ان میں
خطیب
ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت ان سے ہے

ان میں قوموں کے ہیں مصلح ان میں ملکوں کے وکیل
آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت ان سے ہے

مشکلیں اکثر انہی سے قوم کی ہوتی ہیں حل
بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت ان سے ہے

سرسید اس نظم پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اے دوستو! آج یہ نظم جو مولانا حالیؔ نے پڑھی ایک عجیب نظم ہے کہ شاید ایسی نظم فارسی اُردو عربی میں کسی شاعر نے نہیں لکھی...... جو طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہے وہ ایسا مشکل ہے کہ اُس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا، اس طرح کہ لوگوں کے کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے، مولانا حالی ہی کا کام ہے۔ ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آئندہ زمانے میں جو کہا جائے گا کہ فخر قوم، فکر شعرا، فخر علماء اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دینے والا قوم کا کون ہے؟ تو کہا جائے گا کہ حالی۔''

علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے؟

یہ کالج قوم کو آپ اپنے بل چلنا سکھاتا ہے
سہارا غیر کا چھوڑیں یہ ایک اک کو سجھاتا ہے

نہ چھوڑیں دین کا دامن، رہیں دنیا میں عزت سے
سبق سب قوم کے بچوں کو یہ دونوں پڑھاتا ہے

نہیں پاتا کبھی عزت کی خواہش سے کوئی عزت
معزز کس طرح بنتے ہیں؟ گر اُس کے بتاتا ہے

خدا نے کر دیا ہے حکمراں جس قوم کو ہم پر
خلوص اور دوستی اُس قوم کی دل میں بٹھاتا ہے

رعیت کو برابر حق دیے ہیں جو حکومت نے
طلب سے پہلے اُن کا مستحق بننا بتاتا ہے

زمانہ قوم نے غفلت میں جو پہلے گزارا ہے
ڈرانی صورتوں میں بار بار اس کو دکھاتا ہے

یہ باہم مذہبی فرقوں کو ہے شیر و شکر کرتا
یہ روٹھوں کو مناتا ہے، یہ بچھڑوں کو ملاتا ہے
کھلاتا ہے یہ کھانا ایک دستر خوان پر سب کو
نمازیں پنجگانہ ایک مسجد میں پڑھاتا ہے
وفا کا بیج بوتا ہے، تعصب دل سے کھوتا ہے
مسلمانوں کو گڈ سبجکٹ [1] بننا یہ سکھاتا ہے
نہ چھوڑے گا یہ باقی قوم میں دیکھے گا جو خامی
خدا کی برکتیں اُن پر جو اس کالج کے ہیں حامی

---

[1] Good Subject: اچھی رعایا۔

حالیؔ نے اس ایک دس شعر کے قطعہ بند میں علی گڑھ کالج کا منشور مرتب کیا ہے۔ یہاں انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کے ساتھ سماجی، مذہبی اور اقتصادی قدروں کی حفاظت کا درس دیا گیا ہے۔ اس پیغام میں قوم کو پسماندگی سے نجات اور انسانیت کی رہ پر گامزن رہنے کا حوصلہ سکھایا گیا ہے۔ وطن دوستی اہل وطن سے محبت اور حکمران جو عدل و مساوات کے حامی ہوں اُن سے خلوص کرنے کا سبق پڑھایا گیا ہے۔ مسلمان قوم کی تفرقہ بازی، کاہلی، غفلت، جہالت، تعصب اور دوسری حیوانی عادتوں سے نجات کا سامان مہیا کر کے ان کو اچھے عوام بننے کی تلقین کی گئی ہے یہ چھوٹی سی نظم سلیس اور رواں بحر میں آب زلال کی طرح شیریں ہے جو مضطرب فکر کو سکون بخشتی ہے۔ آج کے اس دور میں علی گڑھ یونیورسٹی کے علاوہ علی گڑھ المنائی انجمنیں دنیا کے مختلف ملکوں میں سرسید اور علی گڑھ کی یاد مناتی ہے۔ کیا بہتر ہوگا اگر اس نظم کے منشور کو یہ ادارے اپنے مینوفسٹو میں شامل کریں۔

1 جواں مردی کا کام [1]

(1872ء)

تھا کسی ملک میں اک دولت مند

حق نے تین اس کو دیے تھے فرزند
دور و نزدیک تھا گھر گھر چرچا
باپ بیٹوں کی جواں مردی کا

باپ ہوں جن کے مروت والے
بیٹے پھر کیوں نہ ہوں ہمت والے
ہو چکا عمر کا جب سرمایا
ایک دن باپ کے جی میں آیا

گھر ہے تکرار کا یہ دولت و زر
مشترک چھوڑ مرے اس کو اگر
جلد ہو جائے کہیں یہ تقسیم
آخر اک روز ہے مرنا تسلیم

ا؎ یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور اُس کو اردو میں بہ اضافہ بعض خیالات نظم کیا گیا ہے۔(حالی)

بس کہ تھا اس کو بہت فکر مآل
ایک دن بیٹھ کے ، سب مال و منال
اک گراں مایہ جواہر کے سوا
تینوں بیٹوں کو وہیں بانٹ دیا

پھر کہا اُن سے کہ اے اہل ہنر!
باپ کی جان فدا ہو تم پر
تم میں جس سے ہو بڑا کام کوئی
یہ جواہر ہے امانت اُس کی

باپ نے اُن سے کہا جب یہ سخن
پھر تو تینوں کو لگی اور ہی دھن
کہ کوئی کارِ نمایاں کیجے
جس طرح ہو یہ جواہر لیجے

اُن میں بیٹا جو بڑا تھا سب سے

اس کو یہ فکر سوا تھا سب سے

ایک دن اس کا کوئی واقف کار
کہ نہ تھا جس سے کچھ اخلاص اور پیار

رکھ گیا آ کے جواں مرد کے پاس
ایک بھاری سی رقم بے وسواس

تھے رقم سے وہی دونوں آگاہ
نہ نوشتہ تھا کوئی اور نہ گواہ

کچھ بھی نیت میں گر آ جائے خلل
تو یہ تھا عین خیانت کا محل

جب رقم اُس نے طلب کی اُس سے
وسوسے دل میں بہت سے آئے

مگر اُس شیر کی نیت نہ پھری
لی تھی جن ہاتھوں اُنہی ہاتھوں دی

نفس سرکش کو کیا مات اُس نے
دی رقم اور نہ دی بات اُس نے

صاحبِ زر نے جو کچھ نذر کیا
وہ بھی اُس دل کے غنی نے نہ لیا

باپ کو آن کے دی جب یہ خبر
ہنس کے فرمایا کہ اے جانِ پدر!

اک برائی سے بچے تم تو کیا
اس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا؟

اک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز
شرم کی جا ہے، تری عمر دراز!

منجھلے بیٹے نے پھر اک دن یہ کہا
میں جو دریا کی طرف جا نکلا

دیکھتا کیا ہوں کہ اک طفل صغیر
گر کے پانی میں چلا صورت تیر

تھا جہاں یار نہ کوئی یاور
ماں کا پہلو تھا نہ آغوش پدر

آنکھ تھی جانب مادر نگراں
ماں کنارے پہ ادھر تھی حیراں

گرچہ تھا کام خطرناک بڑا
پر اُسے دیکھ کے دل رہ نہ سکا

جان و تن کی نہ رہی مجھ کو خبر
جا پڑا نام خدا کا لے کر

جان تو جا ہی چکی تھی اُس کی
پر مری شرم خدا نے رکھ لی

ایک دم بھر میں گیا اور آیا
لا کے بیٹے کو دیا ماں سے ملا

باپ نے سن کے یہ سب اُس سے کہا
کام مردوں کے یہی ہیں بیٹا!

آدمیت کا کیا تم نے کام
جاؤ بس ہے یہی اس کا انعام

فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے
نہ ہو اتنا بھی تو انساں کیا ہے

io

پسر خورد کا اب سنیے بیاں

جو کہ تھا سب سے بزرگی میں کلاں
عرض کرتا ہے بصد عجز و نیاز
باپ سے اپنے کہ اے بندہ نواز!
بات گو لائق اظہار نہیں
آپ سے کہنے میں کچھ عار نہیں
خوب اک روز گھٹا چھائی تھی
رات آدھی کے قریب آئی تھی
شب تاریک میں وہ ابر سیاہ
کہ جہاں کام نہ کرتی تھی نگاہ
اک پہاڑی پہ چلا جاتا تھا
خوف چھاتی پہ چڑھا جاتا تھا
ساتھ تم تھے نہ کوئی بھائی تھا
میں تھا اور عالمِ تنہائی تھا
کوندی اک سمت سے بجلی ناگاہ
جس سے آگے کو کھلی راہ نگاہ
پڑی اک غار پہ واں میری نظر
جس کی صورت سے برستا تھا خطر
موت کھولے ہوئے تھی منہ گویا
جس کے دیکھے سے جگر ہلتا تھا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک مرد غریب
جس کو روتے ہیں کھڑے اُس کے نصیب

جیسے رستے کا تھکا ہو کوئی
یا کہ جینے سے خفا ہو کوئی

جان و تن کا نہیں کچھ نیند میں ہوش
غار کے منہ میں پڑا ہے مدہوش

اپنی ہستی کی نہیں اُس کو خبر
اور قضا کھیل رہی ہے سر پر

اجل آ جائے تو ہے روک نہ تھام
ایک کروٹ میں ہے بس کام تمام

اتنے میں اور جو بجلی چمکی
شکل پھر غور سے دیکھی اُس کی

مرد نکلا وہ شناسا میرا
تھا مگر خون کا پیاسا میرا

مجھ میں اور اُس میں عداوت گہری
ایک مدت سے چلی آتی تھی

واں عداوت پہ گر آؤں اپنی
اور اصالت پہ نہ جاؤں اپنی

مارنا اُس کا نہ تھا کچھ دشوار
اک اشارے میں وہ تھا لقمۂ غار

آ گیا مجھ کو مگر خوفِ خدا
اور پہلو سے یہ دی دل نے صدا

مرتے کو مارنا بے دردی سے
ہے بہت دور جواں مردی سے

حوصلے کا ہے یہی وقت، کہ آج
ہے عدو اپنی مدد کا محتاج

جی میں یہ کہہ کے بڑھا جانبِ غار
کہ اسے کیجیے چل کر بیدار

واں سے جا اُس کو اُٹھا لایا میں
موت کی زد سے بچا لایا میں

منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا
اُس کو شرمندہ احساں نہ کیا

io

سن کے دی باپ نے بیٹے کو دعا
اور چھاتی سے لیا اُس کو لگا

پھر بڑے بیٹوں کو بلوا کے کہا
بولو اب ، کس سے ہوا کام بڑا؟

داستاں جب یہ سنی دونوں نے
باپ سے عرض کی یہ دونوں نے

خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف
پوچھیے ہم سے تو ہے یہ انصاف

جس جواہر کے طلب گار تھے ہم
اس کے لائق تھے نہ حق دار تھے ہم

766

اور کو اس کی ہوس نا حق ہے
حق یہی ہے کہ وہ اس کا حق ہے

باپ یہ سن کے ہوا شاد بہت
اُن کے انصاف کی دی داد بہت

چھوٹے بیٹے کو بلا کر پھر پاس
پہلے خالق کا کیا شکر و سپاس

پھر جواہر اُسے دے کر یہ کہا
لو ، یہ ہو تم کو مبارک بیٹا!

io

2برکھارُت

(1874ء)

گرمی کی تپش بجھانے والی
سردی کا پیام لانے والی

قدرت کے عجائبات کی کان
عارف کے لیے کتابِ عرفان

وہ شاخ و درخت کی جوانی
وہ مور و ملخ کی زندگانی

وہ سارے برس کی جان برسات
وہ کون ؟ خدا کی شان برسات

آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد

وہ آئی تو آئی جان میں جان
سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار

بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا
اور کھول رہا تھا آبِ دریا

تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں

سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے
اور ہانپ رہے تھے چارپائے

تھیں لومڑیاں زباں نکالے
اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے

چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ
ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سدھ

تھے شیر پڑے کچھار میں ست
گھڑیال تھے رودبار میں ست

ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا
بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا

بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں
اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں

گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ
تھا پیاس کا اُن پہ تازیانہ

گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا
اور انس نکل رہا تھا سب کا

طوفان تھے آندھیوں کے برپا
اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا

آرے تھے بدن پہ لو کے چلتے
شعلے تھے زمین سے نکلتے

تھی آگ کا دے رہی ہوا کام
تھا آگ کا نام مفت بدنام

رستوں میں سوار اور پیدل
سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بے کل

گھوڑوں کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں
ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں

تھی سب کی نگاہ سوے افلاک
پانی کی جگہ برستی تھی خاک

پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی
وہ بادِ سموم سے سوا تھی

بجھتی نہ تھی آتش درونی
لگتی تھی ہوا سے آگ دونی

سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک
جانداروں پہ دھوپ کی تھی دستک

ٹٹی اُس میں تھا دن گنواتا کوئی
تہ خانے میں منہ چھپاتا کوئی

بازار پڑے تھے سارے سنسان
آتی تھی نظر نہ شکل انسان

چلتی تھی دکان جن کی دن رات
بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہات

خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا
یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا

تھا شہر میں قحط آدمی زاد

سلطان [2] کا اک کنواں تھا آباد

پانی سے تھی سب کی زندگانی
میلہ تھا وہیں جہاں تھا پانی

تھیں برف پہ نیتیں لپکتی
فالودے پہ رال تھی ٹپکتی

پھل پھول کی دیکھ کر طراوت
پاتے تھے دل و جگر طراوت

کنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی
بھر آتا تھا سن کے منہ میں پانی

تھے جو خفقانی اور مراقی
گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی

ا۔ خس کی ٹٹی مراد ہے۔
۲۔ لاہور میں جہاں یہ مثنوی لکھی گئی تھی، ایک سلطان کا کنواں مشہور ہے جس کا پانی نہایت ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں وہاں آدمیوں کا ہجوم رہتا ہے۔ (حالی)

کھانے کا نہ تھا انہیں مزا کچھ
آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ

بن کھائے کئی کئی دن اکثر
رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر

شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے
مر پیٹ کے صبح تھے پکڑتے

اور صبح سے شام تک برابر
تھا العطش العطش زباں پر

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال
کمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال

آنکھوں میں تھا اُن کا پیاس سے دم
تھے پانی کو دیکھ کرتے ''مم مم''

ہر بار پکارتے تھے ماں کو
ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

پانی دیا گر کسی نے لا کر
پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر

بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر
تھا حال بڑوں کا اُن سے بدتر

تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری
پانی سے نہ تھی کسی کو سیری

io

کل شام تلک تو تھے یہی طور
پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور

پروا کی دہائی پھر رہی ہے
پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے

ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی

766

ایک آتی ہے فوج ایک جاتی

جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی

مینہ کا ہے زمین پر دریڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
قدرت ہے نظر خدا کی آتی

سورج نے نقاب لی ہے منہ پر
اور دھوپ نے تہہ کیا ہے بستر
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت
کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار
اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی
عالم ہے تمام لاجوردی

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار
دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل

766

ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اُٹھاتے
سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر
پانی میں مگر، کچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مست
قلانچ ہیں اپنی کھال میں مست
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر
کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر
مسجد میں ہے ورد اہلِ تقویٰ
"یا رب لنا ولا علینا ا؎"
مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا
کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو، گرو گرنتھی
گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
جاتا ہے کوئی ملہار گاتا
ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے
اور بانسریاں بجاتے پھرتے

766

سروں کوئی گا رہا ہے بیٹھا
چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے
ڈھکنے ہیں دیوں پہ ڈھکتے پھرتے

کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھشا
تا جل نہ بجھے کوئی پتنگا

io

ہیں شکر گزار تیرے برسات
انساں سے لے کے تا جمادات

دنیا میں بہت تھی چاہ تیری
سب دیکھ رہے تھے راہ تیری

اے یارب ہمیں اس سے فائدہ ہو، نقصان نہ پہنچے۔

تجھ سے ہے کھلا یہ رازِ قدرت
راحت ملتی ہے بعد کلفت

شکریہ فیض عام تیرا
پیشۂ دہر پر ہے لکھا

گلشن کو دیا جمال تو نے
کھیتی کو کیا نہال تو نے

طاؤس کو ناچنا بتایا
کوئل کو الاپنا سکھایا

جب مور ہے ناچنے پہ آتا
آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا

کوئل کو نہیں قرار اک کل

766

ایسی کوئی تو نے کوک دی کل

شب بھر میں ہوا سماں دگرگوں
کیا پڑھ دیا آ کے تو نے افسوں

سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا
اُٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا

لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن
کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن

امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ
اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

دریا تجھ بن سسک رہے تھے
اور بن تری راہ تک رہے تھے

دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان
اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان

جن جھیلوں میں کل تھی خاک اُڑتی
ملتی نہیں آج تھاہ اُن کی

جو دانے تھے خاک میں پریشان
سب آ کے چڑھائے تو نے پروان

دولت جو زمین میں تھی مخفی
آگے ترے اُس نے سب اُگل دی

پڑتے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر
واں سبزہ و گل ہیں جلوہ گستر

جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے
باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے

766

جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے
واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار
ہے بیر بہٹیوں سے گلنار

io

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں
جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن
جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری
اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی
جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے
اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے اُن میں کوئی ملہار گاتی
اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا
کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر
سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں
تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
گھڑ ناؤ پہ ہے سوار کوئی

766

اور تیر کے پہنچا پار کوئی

بگلوں کی ہیں ڈاریں آ کے گرتی
مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی

چیکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے
دن بھر میں ہیں بیڑے جا کے لگتے

زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی
موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی

ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں
موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں

ملاحوں کے اُڑ رہے ہیں اوسان
بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان

منجدھار کی رو بھی زور پر ہے
مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

io

بے زار اک اپنی جان و تن سے
بچھڑا ہوا صحبت وطن سے

غربت کی صعوبتوں کا مارا
چلنے کا نہیں جس کو یارا

غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو
اک باغ میں ہے پڑا لب جو

ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی
آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی

ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا
اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا

766

برق آ کے لگی تڑپنے پیہم
اور پڑنے لگی پھوار کم کم

آنے جو لگے ہوا کے جھوکے
تھے جتنے سفر کے رنج بھولے

سامان ملے جو دل لگی کے
یاد آئے مزے کبھی کبھی کے

دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم
وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم

وہ آپ ہی آپ گنگنانا
اور جوش میں آ کبھی یہ گانا

---

۱ یہاں سے اخیر تک کچھ اشعار بہ رعایت موسم اپنے حسب حال بے اختیار ٹپک پڑے ہیں۔ اُن دنوں ہجوم امراض اور دیگر عوارض کی وجہ سے لاہور میں رہنا فی الواقع نہایت شاق معلوم ہوتا تھا اور وطن کی طرف واپس آنے کے لیے کوشش کی جاتی تھی۔ (حالی)

اے چشمہ آبِ زندگانی
گھٹیو نہ کبھی تری روانی

جاتی ہے جدھر تری سواری
بستی ہے اُسی طرف ہماری

پائے جو کہیں مری سبھا کو
دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو

اوّل کہیو سلام میرا
پھر دیجیو یہ پیام میرا

قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا
فرقت میں تمہاری آئی برکھا

766

آتا ہے تمہارا دھیان جس دم
مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تم یونہی صبح و شام اکثر
تالاب میں تیرتے تھے جا کر

جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے
صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یونہی ہات میں دیے ہات
پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات

جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا
میں تم کو ادھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو
دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو

رت آم کی آئے اور نہ ہوں یار
جی اپنا ہے ایسی رت سے بے زار
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی
چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی

ہے سرد ہوا بدن کو سلگتی
پر دل میں ہے آگ سی سلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد
جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد

نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی
فریاد یہ درد ناک اُس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز
بگڑا دل سن کے اُس کی آواز

حیرت رہی دیر تک کہ آخر
روڑا ہے کہاں کا یہ مسافر
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

3 نشاطِ اُمید

(1874ء)

اے مری اُمید مری جاں نواز
اے مری دل سوز مری کارساز

میری سپر اور مرے دل کی پناہ
درد و مصیبت میں میری تکیہ گاہ

عیش میں اور رنج میں میری شفیق
کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

کاٹنے والی غمِ ایام کی
تھامنے والی دلِ ناکام کی

دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ
تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ

تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ
تو نے اُٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج
کھول دیے تو نے قناعت کے گنج

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس
تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس

خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو

عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو
نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو
چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو
رام کے ہمراہ چڑھی بن میں تو
پانڈو کے بھی ساتھ پھری رن میں تو
تو نے سدا قیس کا بہلایا دل
تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل
ہو گیا فرہاد کا قصہ تمام
پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام
تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس
ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس
ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب
مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب
ہاتھ میں جب آ کے لیا تو نے ہات
سات سمندر سے گزرنا ہے بات
ساتھ ملا جس کو ترا دو قدم
کہتا ہے وہ یہ ہے عرب وہ عجم
گھوڑے کی لی اپنے جہاں تو نے باگ
سامنے ہے تیرے گیا اور پراگ
عزم کو جب دیتی ہے تو میل جست
گنبد گردوں نظر آتا ہے پست
تو نے دیا آ کے اُبھارا جہاں
سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں

ذرے کو خورشید میں دے تو کھپا
بندے کو اللہ سے دے تو ملا

io

دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ
دین کی تو اصل ہے دنیا کی جڑ

نیکیوں کی تجھ سے ہے قائم اساس
تو نہ ہو تو جائیں نہ نیکی کے پاس

دین کی تجھ بن کہیں پرسش نہ ہو
تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو

خشک تھا بن تیرے درختِ امل
تو نے لگائے ہیں یہ سب پھول پھل

دل کو لبھاتی ہے کبھی بن کے حور
گاہ دکھاتی ہے شراب طہور

نام ہے سدرہ کبھی طوبیٰ ترا
روز نرالا ہے تماشا ترا

کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل
جلوے ہیں سب تیرے یہ بے قال و قیل

روپ ہیں ہر پنتھ میں تیرے الگ
ہے کہیں فردوس کہیں ہے سرگ

چھوٹ گئے سارے قریب اور بعید
ایک نہ چھوٹی تو نہ چھوٹی اُمید

تیرے ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت
تیرے ہی صدقے سے ملا تاج و تخت

خاکیوں کی تجھ سے ہے ہمت بلند
تو نہ ہو تو کام ہوں دنیا کے بند

تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکاں
تو نہ ہو تو ہے ابھی برہم جہاں

کوئی پڑا پھرتا ہے بہر معاش
ہے کوئی اکسیر کو کرتا تلاش

ایک تمنا میں ہے اولاد کی
ایک کو دل دار کی ہے لو لگی

ایک کو ہے دھن کہ جو کچھ ہاتھ آئے
دھوم سے اولاد کی شادی رچائے

ایک کو کچھ آج اگر مل گیا
کل کی ہے یہ فکر کہ کھائیں گے کیا

قوم کی بہبود کا بھوکا ہے ایک
جس میں ہو اُن کے لیے انجام نیک

ایک کو ہے تشنگی قرب حق
جس نے کیا دل سے جگر تک ہے شق

جو ہے غرض اُس کی نئی جستجو
لاکھ اگر دل ہیں تو لاکھ آرزو

تجھ سے ہیں دل سب کے مگر باغ باغ
گل کوئی ہونے نہیں پاتا چراغ

سب یہ سمجھتے ہیں کہ پائی مراد
کہتی ہے جب تو کہ اب آئی مراد

وعدہ ترا راست ہو یا ہو دروغ
تو نے دیے ہیں اُسے کیا کیا فروغ

وعدہ وفا کرتی ہے گو چند تو
رکھتی ہے ہر ایک کو خورسند تو

بھاتی ہے سب کو تری لیت و لعل
تو نے کہاں سیکھی ہے یہ آج کل

تلخ کو تو چاہے تو شیریں کرے
بزمِ عزا کو طرب آگیں کرے

آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس
رکھے غنی اس کو رہے جس کے پاس

یاس کا پاتی ہے جو تو کچھ لگاؤ
سیکڑوں کرتی ہے اُتار اور چڑھاؤ

آنے نہیں دیتی دلوں پر ہراس
ٹوٹنے دیتی نہیں طالب کی آس

جن کو میسر نہیں کملی پھٹی
خوش ہیں توقع پہ وہ زر بفت کی

چٹنی سے روٹی کا ہے جن کی بناؤ
بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ

پاؤں میں جوتی نہیں پر ہے یہ ذوق
گھوڑا جو سبز ہو تو نیلا ہو طوق

فیض کے کھولے ہیں جہاں تو نے باب
دیکھتے ہیں جھونپڑے محلوں کے خواب

تیرے کرشمے ہیں غضب دل فریب
دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب

تجھ سے مہوس نے جو شوری لیا
پھونک دیا کان میں کیا جانے کیا

دل سے بھلایا زن و فرزند کو
لگ گیا گھن نخلِ برومند کو

کھانے سے پینے سے ہوا سرد جی
ایسی کچھ اکسیر کی ہے لو لگی

دین کی ہے فکر نہ دنیا سے کام
دھن ہے یہی رات دن اور صبح شام

دھونکنی ہے بیٹھ کے جب دھونکتا
شہ کو سمجھتا ہے اک ادنیٰ گدا

پیسے کو جب تاؤ پہ دیتا ہے تاؤ
پوچھتا یاروں سے ہے سونے کا بھاؤ

کہتا ہے جب ہنستے ہیں سب دیکھ کر
''رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر''

ہے اسی دھندے میں وہ آسودہ حال
تو نے دیا عقل پہ پردہ سا ڈال

تول کے گر دیکھیے اس کی خوشی
کوئی خوشی اس کو نہ پہنچے کبھی

پھرتے ہیں محتاج کئی تیرہ بخت
جن کے بڑوں میں تھا کبھی تاج و تخت

آج جو برتن ہیں تو کل گھر گرو
ملتی ہے مشکل سے اُنہیں نانِ جو

تیرے سوا خاک نہیں اُن کے پاس
ساری خدائی میں ہے لے دے کے آس

پھولے سماتے نہیں اس آس پر

''صاحب عالم'' انہیں کہیے اگر
کھاتے ہیں اس آس پہ قسمیں عجیب
''جھوٹے کو ہو تخت نہ یا رب نصیب''

io

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم
آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے
حوصلے کا لگتا ہے جی چھوٹنے

ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ
عرصہ عالم نظر آتا ہے تنگ
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھایئے
پھاڑ کے یا کپڑے نکل جایئے

بیٹھنے لگتا ہے دل آوے کی طرح
یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا
اُڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا

ٹھنتی ہے گردوں سے لڑائی کبھی
ہوتی ہے قسمت کی ہنسائی کبھی
جاتا ہے قابو سے دل آخر نکل
کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل

کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں
رختِ سفر یاس نے باندھا وہیں

766

ساتھ گئی یاس کے پژمردگی
ہو گئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحت جاں کا ہے بھید
چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے اُمید

4حب وطن

(1874ء)

اے سپہرِ بریں کے سیارو
اے فضائے زمیں کے گل زارو

اے پہاڑوں کی دل فریب فضا
اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

اے عنادل کے نغمۂ سحری
اے شبِ ماہتاب تاروں بھری

اے نسیم بہار کے جھوکو
دہر ناپائیدار کے دھوکو

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رمنا
تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم مری دل لگی کے ساماں تھے
تم مرے دردِ دل کے درماں تھے

تم سے کتنا تھا رنج تنہائی

766

تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

آن اک اک تمہاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی

کرتے تھے جب تم اپنی غم خواری
دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری

جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے
ہو کے خوش حال گھر میں آتے تھے

بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لب آب
دھوکے اُٹھتے تھے دل کے داغ شتاب

کوہ و صحرا و آسمان و زمیں
سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں

پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار
جی ہوا تم سے خود بخود بے زار

نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے
نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے

سیر گلشن ہے جی کا اک جنجال
شب مہتاب جان کو ہے وبال

کوہ و صحرا سے تا لب دریا
جس طرف جائیں جی نہیں لگتا

کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں
تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں

ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور
یا تمہارے ہی کچھ بدل گئے طور

766

گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا
پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

io

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے مورد آلام
تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا
تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا
اُن کو کیا ہو گا زندگی کا مزا

ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال
تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے
یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے؟

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار
یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار؟

766

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں؟
اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں

جن و انسان کی حیات ہے تو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

ہے نباتات کو نمو تجھ سے
روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشوونما
سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

io

حملہ جب قوم آریا نے کیا
اور بجا اُن کا ہند میں ڈنکا

ملک والے بہت سے کام آئے
جو بچے وہ غلام کہلائے

شدر کہلائے راکشس کہلائے
رنج پردیس کے مگر نہ اٹھائے

گو غلامی کا لگ گیا دھبا
نہ چھٹا اُن سے دیس ، پر نہ چھٹا

io

قدر اے دل وطن میں رہنے کی

پوچھے پردیسیوں کے جی سے کوئی

جب ملا رام چندر کو بن باس
اور نکلا وطن سے ہو کے اُداس

باپ اک حکم رکھ لیا سر پر
پر چلا ساتھ لے کے داغ جگر

پاؤں اُٹھتا تھا اس کا بن کی طرف
اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف

گزرے غربت میں اس قدر مہ و سال
پر نہ بھولا اجدھیا[1] کا خیال

دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا
دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا

تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا
آتی تھی جب اجدھیا کی ہوا

کٹنے چودہ برس ہوئے تھے محال
گویا ایک ایک جگ تھا ایک اک سال

io

[1] اجدھیا (سنسکرت: ایودھیا، ہندی: اجودھیا یا اجدھیا) اودھ میں دریائے گھاگھرا کے کنارے ایک قدیم تاریخی شہر، راجہ دسرتھ کی راجدھانی۔ یہاں یہ لفظ ہندی تلفظ کے مطابق (بہ تخفیف یا) نہیں باندھا گیا بلکہ ''دھیا'' کو ''پیا'' اور ''دیا'' کے وزن پر پڑھا جائے گا۔ (ا ص)

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی
سید بطحیٰ کے ہم راہی

رشتے اُلفت کے سارے توڑ چلے
اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے

گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا

پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل لگی کے بہت ملے ساماں
پر نہ بھولے وطن کے ریگستاں
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے
سنگریزے زمین بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کی چھوٹا تھا
دل سے رشتہ نہ اُن کا ٹوٹا تھا

io

ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور
اور ہوا ملک مصر پر مامور
مصر میں چار سو تھا حکم رواں
آنکھ تھی جانب وطن نگراں
یاد کنعاں جب اُس کو آتی تھی
سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دکھ اُٹھائے تھے جس وطن میں سخت
تاج بھاتا تھا اُس بغیر نہ تخت
جن سے دیکھی تھی سخت بے مہری
لو تھی اُن بھائیوں کی دل کو لگی

io

ہم بھی حب وطن میں گو ہیں غرق
ہم میں اور اُن میں ہے مگر یہ فرق
ہم ہیں نامِ وطن کے دیوانے
وہ تھے اہل وطن کے پروانے

جس نے یوسف کی داستاں ہے سنی
جانتا ہو گا روئداد اُس کی

مصر میں قحط جب پڑا آ کر
اور ہوئی قوم بھوک سے مضطر

کر دیا وقف اُن پہ بیت المال
لب تک آنے دیا نہ حرفِ سوال

کھتیاں [1] اور کوٹھے کھول دیے
مفت سارے ذخیرے تول دیے

قافلے خالی ہاتھ آتے تھے
اور بھر پور یاں سے جاتے تھے

یوں گئے قحط کے وہ سال گزر
جیسے بچوں کی بھوک وقتِ سحر

io

اے دل ! اے بندہ وطن ہشیار!
خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار

او شرابِ خودی کے متوالے
گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے

[1] کھتایا کھتی: زمین دوز گڑھا جس میں اناج بھرا جاتا ہے۔

نام ہے کیا اسی کا حبِ وطن
جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن

کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے

766

کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے

یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی
لو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی

نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار
پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار

کیا وطن کی یہی محبت ہے؟
یہ بھی اُلفت میں کوئی اُلفت ہے؟

اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ[1] فرقت میں

جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آ کے کابل سے یاں بہی و انار
ہو نہیں سکتے بارور زنہار

مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے

آگ سے جب ہوا سمندر دور
اس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں

---

[1] روکھ: (ہندی) درخت

766

جان کے لالے اُن کی پڑتے ہیں

گائے یا بھینس ، اُونٹ یا بکری
اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی
کہیے حب وطن اسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کم تر

io

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد
جس پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح
جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
سمجھے اُن کی خوشی کو راحت جاں
واں جو نو روز ہو تو عید یہاں
رنج کو اُن کے سمجھے مایۂ غم
واں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم
بھول جائے سب اپنی قدر جلیل
دیکھ کر بھائیوں کو خوار و ذلیل
جب پڑے اُن پہ گردشِ افلاک
اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک

io

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو!

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ ، پیو ، چلے جاؤ

جب کوئی زندگی کا لطف اُٹھاؤ
دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ

پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک
کرو دامن سے تا گریباں چاک

کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ
ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ

کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار
زندگی سے ہے جن کا دل بے زار

نوکروں کی تمہارے جو ہے غذا
ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو
واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو

کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی
جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی

پہنو تو پہلے بھائیوں کو پنہاؤ
کہ ہے اُترن تمہاری جن کا بناؤ

ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
ہے کوئی ان میں خشک اور کوئی تر

سب کو ہے ایک اصل سے پیوند
کوئی آزردہ ہے کوئی خورسند

مقبلو ! مدبروں کو یاد کرو

766

خوش دلو ! غم زدوں کو شاد کرو

جاگنے والو ! غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو ! ڈوبتوں کو تراؤ

ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر
لو جو لی جائے کور و کرّ کی خبر

تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو
لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ
رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی
جین مت ہووے یا ہو بیشنوی [1]

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد

[1] وشنو کا پیرو، ایک قسم کا ہندو فقیر

ہند میں اتفاق ہوتا اگر

کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ
لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی
جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

پاؤں اقبال کے اُکھڑنے لگے
ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا
کبھی درانیوں نے زر لوٹا

کبھی نادر نے قتل عام کیا
کبھی محمود نے غلام کیا

سب سے آخر کو لے گئی بازی
ایک شائستہ قوم مغرب کی

یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام
کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام

ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم
پڑتی جو سر پہ وہ اُٹھاتے تم

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے
چین کس کو ملا ہے غیروں سے

io

قوم سے جو تمہارے ہیں برتاؤ

سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ

اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا
کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا

شہر میں قحط کی دہائی ہے
جانِ عالم لبوں پہ آئی ہے

بھوک میں ہے کوئی نڈھال پڑا
موت کی مانگتا ہے کوئی دعا

بچے اک گھر میں بلبلاتے ہیں
رو کے ماں باپ کو رلاتے ہیں

کوئی پھرتا ہے مانگتا در در
ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر

پر جو ہیں ان میں صاحبِ مقدور
ان میں گنتی کے ہوں گے ایسے غیور

کہ جنہیں بھائیوں کا غم ہو گا
اپنی راحت کا دھیان کم ہو گا

جتنے دیکھو گے پاؤ گے بے درد
دل کے نا مرد اور نام کے مرد

عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات
عید ہے دن تو شب برات ہے رات

قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے
کام انہیں اپنے حلوے مانڈے سے

ان کو اب تک خبر نہیں اصلا
شہر میں بھاؤ کیا ہے غلے کا

غلہ ارزاں ہے ان دنوں کہ گراں

کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں

کال کیا شے ہے کس کو کہتے ہیں بھوک

بھوک میں کیونکہ مرتے ہیں مفلوک

سیر بھوکے کی قدر کیا سمجھے

اس کے نزدیک سب ہیں پیٹ بھرے

io

اہل دولت کا سن چکے تم حال

اب سنو روئدادِ اہلِ کمال

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد

پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد

ہے طبیبوں میں نوک جھوک سدا

ایک سے ایک کا ہے تھوک جدا

رہتے دو اہل علم ہیں اس طرح

پہلوانوں میں لاگ ہو جس طرح

عیدو والوں [1] کا ہے اگر پٹھا

شیخو والوں میں جا نہیں سکتا

شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار

خوش نویسوں کو ہے یہی آزار

لاکھ نیکوں کا کیوں نہ ہو اک نیک

دیکھ سکتا نہیں ہے ایک کو ایک

اس پہ طرّہ یہ ہے کہ اہل ہنر

دور سمجھے ہوئے ہیں اپنا گھر

---

[1] 'عیدو والے' اور 'شیخو والے' پہلوانوں کے دو متقابل گروہ دلی میں تھے جن میں سے ایک کے سرگروہ اور اُستاد کا نام عیدو اور دوسرے کا نام شیخو تھا۔ (حالی)

ملی اک گانٹھ جس کو ہلدی کی

اُس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری

نسخہ اک طب کا جس کو آتا ہے
سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے

جس کو آتا ہے پھونکنا کشتہ
ہے ہماری طرف سے وہ گونگا

جس کو ہے کچھ رمل میں معلومات
وہ نہیں کرتا سیدھے منہ سے بات

باپ بھائی ہو یا کہ ہو بیٹا
بھید پاتا نہیں منجّم کا

کام کندلے[1] کا جس کو ہے معلوم
ہے زمانے میں اس کے بخل کی دھوم

الغرض جس کے پاس ہے کچھ چیز
جان سے بھی سوا ہے اس کو عزیز

قوم پر ان کا کچھ نہیں احساں
اُن کا ہونا نہ ہونا ہے یکساں

سب کمالات اور ہنر اُن کے
قبر میں اُن کے ساتھ جائیں گے

قوم کیا کہہ کے ان کو روئے گی
نام پر کیونکہ جان کھوئے گی

تربیت یافتہ ہیں جو یاں کے
خواہ بی۔اے ہوں اس میں یا ایم۔اے

بھرتے حب وطن کا گو دم ہیں
پر محب وطن بہت کم ہیں

---

[1] کندلا: (ھ، سنسکرت: کندل) سونے کا تار، سونے کا ڈلا۔ ''کندلے کا کام'' سے مراد تارکشی کا کام۔

قوم کو اُن سے جو اُمیدیں تھیں

اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں

ہسٹری ان کی اور جو گرفی [1]

سات پردوں میں منہ دیے ہے پڑی

بند اُس قفل میں ہے علم ان کا

جس کی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا

لیتے ہیں اپنے دل ہی دل میں مزے

گویا گونگے کا گڑ ہیں کھائے ہوئے

کرتے پھرتے ہیں سیر گل تنہا

کوئی پاس ان کے جا نہیں سکتا

اہل انصاف شرم کی جا ہے

گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے

تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ

تم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ

یہ جو دولت تمہارے پاس ہے آج

ہم وطن اس کے ہیں بہت محتاج

منہ کو ایک اک تمہارے ہے تکتا

کہ نکلتا ہے منہ سے آپ کے کیا

آپ شائستہ ہیں تو اپنے لیے

کچھ سلوک اپنی قوم سے بھی کیے؟

---

[1] تاریخ (History) اور جغرافیہ (Geography)

میز کرسی اگر لگاتے ہیں آپ

قوم سے پوچھیے تو پن[1] ہے نہ پاپ

منڈا[2] جوتا گر آپ کو ہے پسند
قوم کو اس سے فائدہ نہ گزند

قوم پر کرتے ہو اگر احساں
تو دکھاؤ کچھ اپنا جوشِ نہاں

کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو
پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو

علم کو کردو گو بہ گو ارزاں
ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

io

سنتے ہو سامعینِ باتمکیں!
سنتے ہو حاضرینِ صدر نشیں!

جو ہیں دنیا میں قوم کے ہمدرد
بندہ قوم اُن کے ہیں زن و مرد

باپ کی ہے دعا یہ بہرِ پسر
قوم کی میں بناؤں اس کو سپر

ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد
قوم پر سے نثار ہو اولاد

بھائی آپس میں کرتے ہیں پیماں
تو اگر مال دے تو میں دوں جاں

اہلِ ہمت کما کے لاتے ہیں
ہم وطن فائدے اُٹھاتے ہیں

---

[1] پن: نیکی یا ثواب کا کام۔ پاپ: بدی یا گناہ
[2] ایک قسم کا جوتا جس میں نوک نہیں ہوتی۔ چوڑی نو کا بوٹ

کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری
دخل اور خرج جن کے ہیں بھاری

اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم
مبحثِ حکمت و ادب قائم

نت نئے کھلتے ہیں دوا خانے
بنتے ہیں سیکڑوں شفا خانے

ملک میں جو مرض ہیں عالم گیر
قوم پر اُن کی فرض ہے تدبیر

ہیں سدا اس اُدھیڑ بن میں طبیب
کہ کوئی نسخہ ہاتھ آئے عجیب

قوم کو پہنچے منفعت جس سے
ملک میں پھیلیں فائدے جس کے

رسم بد کا اثر جہاں پایا
حملے پر حملہ اُس پہ ہونے لگا

کہیں مجلس میں ہوتی ہے تقریر
کہیں مضمون ہوتے ہیں تحریر

ایک ناٹک بنا کے لاتا ہے
دوسرا اس کو کر دکھاتا ہے

لاکھ تدبیریں جی سے جوڑتے ہیں
آخر اس کو مٹا کے چھوڑتے ہیں

قوم کی خاطر اُن کے ہیں سب کام
خواہ اس میں سفر ہو خواہ مقام

سیکڑوں گل رخ اور مہ پارے
لاڈلے ماں کے ، باپ کے پیارے

جان اپنی لیے ہتھیلی پر
کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر

شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے
پر کوئی بات کام کی ہاتھ آئے

جس سے مشکل ہو کوئی قوم کی حل
ملک کا آئے کوئی کام نکل

کھپ گئے کتنے بن کے جھاڑوں میں
مر گئے سیکڑوں پہاڑوں میں

لکھے ، جب تک جیے ، سفر نامے
چل دیے ہاتھ میں قلم تھامے

گو سفر میں اُٹھائے رنج کمال
کر دیا پر وطن کو اپنے نہال

ہیں اب اُن کے گواہ حبِ وطن
در و دیوارِ پیرس و لندن

کہیے دنیا کا جس کو باغ جناں
ہے فرانس آج یا ہے انگلستاں

کام ہیں سب بشر کے ، ہم وطنو!
تم سے بھی ہو سکیں جو مرد بنو

چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ
بس بہت سوئے اُٹھو ہوش میں آؤ

قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں
رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں

قافلوں سے اگر ملا چاہو
ملک اور قوم کا بھلا چاہو

گر رہا چاہتے ہو عزت سے
بھائیوں کو نکالو ذلت سے
اُن کی عزت تمہاری عزت ہے
اُن کی ذلت تمہاری ذلت ہے

قوم کا مبتذل ہے جو انساں
بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز
ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز

عزت قوم چاہتے ہو اگر
جا کے پھیلاؤ اُن میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور
اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور

اب نہ سید کا افتخار صحیح
نہ برہمن کو شدر پر ترجیح
ہوئی ترکی تمام خانوں کی
کٹ گئی جڑ سے خاندانوں کی

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے
علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

نہ رہیں گے سدا یہی دن رات
یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

5 مناظرہ رحم و انصاف

(1876ء)

ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر پوچھا
کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا

نیک نامی سے تری سخت تحیر ہے ہمیں
ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کون سی خوبی تجھ میں

دوستی سے تجھے کچھ دوستوں کی کام نہیں
آنکھ میں تیری مروت کا کہیں نام نہیں

اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں
دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں

قتل انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری
سیکڑوں چڑھ گئے سولی پہ بدولت تیری

جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے
اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے

فوج راون کی لڑائی میں کھپائی کس نے؟
آگ لنکا میں سوا تیرے لگائی کس نے

قید خانوں میں جہاں کے ہے پڑا غل تیرا
جتنے قیدی ہیں تری جان کو دیتے ہیں دعا

تیرے فتوے پہ کروڑوں ہوئے سرتن سے جدا
اور ترے حکم سے لاکھوں ہوئے مسکن سے جدا

لطف ہے تیری طبیعت میں نہ کچھ جوش وغضب
تجھ کو خوردوں پہ ہے شفقت نہ بزرگوں کا ادب

کانپتے آتے ہیں محفل میں تری شاہ و گدا
تجھ سے تھراتے ہیں احباب ہوں یا ہوں اعدا

جان پہچان کا ساتھی ہے نہ انجان کا دوست
یار ہندو کا ہے تو اور نہ مسلمان کا دوست

نہیں جائز ترے مذہب میں کسی کی امداد
تیرے نزدیک برابر ہے غلام اور آزاد

دم میں تو صحبت دیرینہ بھلا دیتا ہے
دوستی خاک میں برسوں کی ملا دیتا ہے

طور برتاؤ کا ہے سب سے نرالا تیرا
تجھ سے روکھا کوئی دنیا میں نہ دیکھا نہ سنا

ہٹ پہ تو اپنی جہاں نام خدا آ جائے
باپ کے ہاتھ سے بیٹے کا گلا کٹوائے

اسی کرتوت پہ اے عدل! یہ دعوے ہیں تجھے
کہ بنا امن کی دنیا میں ہے قائم مجھ سے

ایک تو ہے کہ یگانوں کے ہیں دل تجھ سے فگار
ایک میں ہوں کہ نہیں غیر بھی مجھ سے بے زار

رحم ہے نام مرا لطف و کرم کام مرا
فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام مرا

حق کی الطاف و عنایت کا بہانہ ہوں میں
خلق کی کام روائی میں یگانہ ہوں میں

میری سرکار میں ہو جاتے ہیں سب عذر قبول
میرے دربار سے جاتے نہیں مجرم بھی ملول

لطف ہے عام سدا اہل خطا پر میرا
ہاتھ اُٹھتا نہیں خونی کی سزا پر میرا

غم مرے سامنے شادی سے بدل جاتے ہیں
ہنستے جاتے ہیں جو یاں روتے ہوئے آتے ہیں

مجرئی شرم و مروت مرے دربار کے ہیں
بخشش و جود ملازم مری سرکار کے ہیں

موج زن ہوتا ہے جب فیض کا میرے قلزم
یاس ہو جاتی ہے انبوہ میں اُمید کے گم

مصر میں قید سے یوسفؑ کو نکالا میں نے
اور ایوبؑ کے بیڑے کو سنبھالا میں نے

میں ہر اک درد میں ہو جاتا ہوں انساں کے شریک
میں نہ ہوتا تو نہ دیتا کوئی محتاج کو بھیک

میں ہی دیتا ہوں یتیموں کو سہارا جا کر
میں ہی لیتا ہوں برے حال میں رانڈوں کی خبر

میرے ہی دم سے ہے آدم کا نمونہ باقی
میرے ہی دم سے ہے عالم میں نمودِ بشری

ورنہ انسان کہ ہے جرم و خطا کا پتلا
میں نہ ہوتا تو بھلا اس کا ٹھکانا کیا تھا

بیڑا فرعون کا جب غرق فنا ہوتا تھا
میں وہاں ساحل دریا پہ کھڑا روتا تھا

تجھ سے ہوتے اگر اے عدل جہاں میں دو چار
لٹ گئی ہوتی کبھی کی مرے گلشن کی بہار

جب سنا رحم سے یہ ولولہ انگیز خطاب
کہا انصاف نے ہو حکم تو دوں اس کا جواب

آپ کی نیکیوں سے کس کو ہے انکار یہاں
کیوں کہ ہے ذکرِ جمیل آپ کا مشہور جہاں

مگر اے رحم ! برا ماننے کی بات نہیں
نیکیاں آپ کو کر دیں نہ یہ بدنام کہیں

ہم نے مانا کہ مروت بھی بڑی اک چیز
پر مروت کے لیے شرط ہے اے دوست ! تمیز

کھو دیا ، جس نے مروت کو یہاں عام کیا
اس کو رسوا کیا اور آپ کو بدنام کیا

بول میٹھے نہیں ، آفت کے یہ پر کالے ہیں
اس مروت نے تری سیکڑوں گھر گالے ہیں

دوستوں کو ہے اشارہ کہ کسی سے نہ ڈرو
دشمنوں سے یہ مدارا کہ جو چاہو سو کرو

چور چوری سے نہیں ڈرتے بدولت تیری
لیے پھرتی ہے اُچکّوں کو حمایت تیری

جتنے قزاق ہیں یاں اُن کا مددگار ہے تو
اور سب ڈاکوؤں کا قافلہ سالار ہے تو

ہوا جس ملک پہ سرکار کا جاری فرماں
اس کو سمجھو کہ ہوا اب کوئی دن میں ویراں

باپ کا حکم نہیں مانتے فرزند رشید
اور نوکر نہیں دیتے کبھی آقا کو رسید

لڑکے اُستاد کی گھر کی کو نہیں مانتے کچھ
بد معاش اہل پولیس [1] کو نہیں گردانتے کچھ

---

[1] ''رحم فونڈیشن'' کی طرح یہ ترکیب بھی حالی کی اجتہادی غلطی سمجھی جائے گی۔

اہلکاروں کا کچہری میں جو دیکھو بیوہار ؎
سمجھو دیوان عدالت کو کہ ہے اک بازار
پیٹ پکڑے ہوئے واں پھرتے ہیں حاجت والے
روا منہ کھولے ہوئے بیٹھے عدالت والے

نہیں حاکم کی مروت سے انہیں خوف مآل
''بول کیا لایا ہے؟'' اظہار کا پہلا ہے سوال
ہر طرف بیچ میں دلال ہیں کچھ چھوٹ رہے
دونوں ہاتھوں سے غرض مندوں کو ہیں لوٹ رہے

یوں تو اے رحم تری ذات میں جوہر ہیں بہت
خیر تھوڑی ہے مگر آپ میں اور شر ہیں بہت
ایک رہ زن کو جو تو قید سے چھٹواتا ہے
بیسیوں قافلوں کو جان کے لٹواتا ہے

باپ کو ہونے نہیں دیتا جو بیٹے سے خفا
بے ادب رکھنا اُسے چاہتا ہے تو گویا
مار پر اُٹھنے نہیں دیتا جو اُستاد کا ہاتھ
یہ سلوک اچھے نہیں ہیں ترے شاگرد کے ساتھ

میٹھی باتوں میں تری زہر ہلاہل ہے بھرا
تیرا آغاز تو اچھا ہے پہ انجام برا
کاش تو بھی مرے قانون پہ چلتا اے رحم
اپنے اندازے سے باہر نہ نکلتا اے رحم

بے مروت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا
جس کو تو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا
راست بازی جو سنی ہو وہ طبیعت ہے مری
اور عدالت جسے کہتے ہیں وہ عادت ہے مری

ا؎ مختلف نسخوں میں ''بہوار'' چھپا ہے لیکن صحیح صورت ''بیوہار'' ہے۔

معتدل نام ہے جس کا وہ مزاج اپنا ہے
بھاگ اس ملک سے جس ملک میں راج اپنا ہے

میں ہی تھا جس نے کہ ویرانوں کو آباد کیا
میں ہی تھا جس نے کہ اخباروں کو آزاد کیا

حکم سے میرے ہوئی کونسلوں کی ماموری
رائے سے میری بنیں سلطنتیں جمہوری

کھو دیا میں نے نشاں سلطنت شخصی کا
اور دنیا سے غلامی کو مٹا کر چھوڑا

مجلسیں سیکڑوں ملکوں میں بٹھائیں میں نے
راہیں اغلاط سے بچنے کی سجھائیں میں نے

حکم و قانون کسی گھر میں مُقیّد نہ رہا
سلطنت نام ہے اب قوم کی پنچایت کا

جس طرح ظلم کا اے رحم ! روادار نہیں
میں اسی طرح سے تیرا بھی مددگار نہیں

سر ذرا جس نے اُٹھایا اُسے کھو کر چھوڑا
پاپ کی ناؤ کو دریا میں ڈبو کر چھوڑا

حکم عالم میں مرا شرق سے تا غرب ہے عام
جس نے مانا نہ مرا حکم ، رہا وہ ناکام

رائے کرتی نہیں میری کسی حالت میں خطا
تیر لگتا ہے مرا جا کے نشانے پہ سدا

میں دکھا دیتا سیاست کی گر اپنی تلوار
چل نہ سکتا کبھی قابیل کا ہابیل پہ وار

کار فرما ہے جہاں میری عدالت اے رحم

دم نہیں مارتی واں تیری مروت اے رحم

واں تعصب کا پتا اور نہ عداوت کا گزر
نہ قرابت کا نشاں اور نہ محبت کا اثر

حکم جاری ہے جدھر دیکھیے آزادی کا
بڑھ کے چلتا نہیں واں شاہ سے لے تا بہ گدا

کج روی مکر سے کہتی ہے میں آئی تو چل
ٹیڑھے ترچھوں کے بل اک آن میں جاتے ہیں نکل

پاک بازوں کو نہیں عہد میں میرے کھٹکا
جو کنوڈے[1] ہیں وہی مجھ سے کھٹکتے ہیں سدا

سات پردوں میں اگر عیب کسی کا ہے چھپا
نہ ہوا آج تو کل ہو گا مقدر رسوا

ہیں خطا کار کے دشمن در و دیوار یہاں
بھائی بھائی کے نہیں ہوتے مددگار یہاں

اور اگر عیب سے ہے پاک کسی کا دامن
غم نہیں اس کا ہو گر سارا زمانہ دشمن

نہ رعیت کا اُسے خوف نہ کچھ شاہ کا ڈر
نہ اُسے چور کا خطرہ نہ اُسے ساہ[2] کا ڈر

نہ عدالت میں اُسے ڈر کسی فریادی کا
اور نہ کچھ دغدغہ اخباروں کی آزادی کا

جو ہنر مند ہیں دل اُن کے بڑھاتا ہوں میں
خوبیاں اُن کی زمانے میں جتاتا ہوں میں

---

[1] کنوڈا: (1) شرمندہ، احسان مند۔ (2) ذلیل، رسوا۔ (3) ناقص، عیب دار۔ (نور اللغات)

۲۔ مختلف نسخوں میں ''شاہ کا ڈر'' چھپا ہے، لیکن یہاں ''ساہ'' ہونا چاہیے جو ہندی میں مہاجن اور مال دار کے علاوہ کھرا اور دیانت دار کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

بے ہنر ہو کسی پیرائے میں یاں جلوہ نما
عہد میں میرے ہنر مند نہیں بن سکتا

یاں نہ اُستاد کو شاگرد کی اصلاح سے عار
اور نہ شاگرد کو اپنی غلطی پر اصرار

سنتے جاہل سے ہیں گر فائدے کی بات حکیم
مستمندوں کی طرح کرتے ہیں اُس کو تسلیم

نوکر آقا کی جتاتا ہے اگر کوئی خطا
بن نہیں آتا کچھ آقا سے ندامت کے سوا

کرنے پاتے نہیں گاہک پہ دکاں دار ستم
جنس یاں تل نہیں سکتی کبھی مقدار سے کم

بیل بے وجہ نہیں آر کسی کی کھاتا
سدھ منے گھوڑے پہ چابک نہیں اُٹھنے پاتا

اُونچے اُونچوں سے یہاں لیتے ہیں خدمت پوری
اور مزدوروں کو دیتے ہیں کھری مزدوری

محنتی جتنے ہیں یاں خرم و دل شاد ہیں سب
خوار پھرتے ہیں وہی جو کہ ہیں آرام طلب

اہل مقدور کو کھٹکا نہیں کچھ چوروں سے
زور مند آنکھ ملاتے نہیں کم زوروں سے

خوب کو خوب سمجھتے ہیں یہاں زشت کو زشت
ناپ سے کم نہیں لگتی کہیں تعمیر میں خشت

جھوٹے سچوں کا نہیں بھیس بدلنے پاتے
دام بازار میں کھوٹے نہیں چلنے پاتے

766

جس طرف جایئے واں امن و اماں کا ہے عمل
فتنہ سرحد سے مری جاتا ہے کترا کے نکل

جس قلم رو میں کہ جاری نہیں میرا فرماں
ظلم کے ہاتھ میں واں فکر و عمل کی ہے عناں

دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب ؎ وہاں
اور مسیحائے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں

نیک فرزند ہیں ماں باپ کے جو حلقہ بگوش
رام چھمن کی طرح پھرتے ہیں واں خانہ بدوش

مان رکھا ہے جنہیں قوم نے اولاد رسول e
قوم کے ہاتھ سے ہو جاتے ہیں پیاسے مقتول

زکریا کی طرح جو ہیں خدا کے پیارے
اُن کے سر پر ہیں سدا ظلم کے چلتے آرے

زہر سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں
اور یوسفؑ سے برادر کو دغا دیتے ہیں

io

گفتگو ختم پہ انصاف کی جب آ پہنچی
عقل پرکار قضا کار وہاں جا پہنچی

واں جو دیکھا تو ہے دو بھائیوں میں کچھ تکرار
اور ہر اک کو بزرگی پہ ہے اپنی اصرار

رحم ادھر عدل سے کہتا ہے کہ تو ہے کیا چیز
اور ادھر رحم کو ہے عدل سمجھتا ناچیز

عقل نے دونوں کی تقریر سنی سر تا پا
کہہ چکے وہ تو یہ سنجیدہ جواب اُن کو دیا

ا۔ صحیح لفظ معاتب ہے مگر اردو میں بجائے معاتب کے معتوب بولا جاتا ہے جیسے بجائے مفعو کے معاف۔ پس اُردو میں یہی صحیح اور فصیح ہے۔ (حالی)

خیر اک کان ہے تم جس کے ہو گوہر دونوں
ایک سے ایک ہو تم بہتر و برتر دونوں

صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف
تو ہے اک قالب بے روح نہ ہو گر انصاف

اور سن اے عدل! نہیں اس میں تکلف سرِ مُو
گر نہ ہو رحم تو اک دیدہ بے نور ہے تو

دونوں تم خلق کے ہو مایہ آرام و شکیب
گل و شبنم کی طرح ایک سے ہے ایک کو زیب

سرسری فیصلہ تو یہ ہے اگر تم مانو
اور نہیں مانتے گر بات مری، تم جانو

ابھی اک نکتے میں تم دونوں کو جھٹلاتی ہوں
لو سنو غور سے، میں کہتی ہوں اور جاتی ہوں

فرق اصلا نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو
جب کہ تم ایک ہو آپس میں جھگڑتے کیوں ہو

وہی اک شے ہے کہ ہے عدل کہیں نام اس کا
کہیں مظلوم کی فریاد رسی کام اس کا

رحم کہلائے، جو مظلوم کی فریاد سنے
عدل ٹھہرے، جو سزا ظالم بے رحم کو دے

وہی شفقت ہے کہ اُستاد کی ہے مار کبھی
اور ماں باپ کی ہو جاتی ہے چمکار کبھی

وہی شفقت ہے کہ ہے گھور کہیں پیار کہیں
وہی جلوہ ہے کہ ہے نور کہیں نار کہیں

کہیں وہ مہر کی صورت میں عیاں ہوتی ہے
اور کہیں قہر کے پردے میں نہاں ہوتی ہے

کہیں وہ قندِ مکرر کا مزا دیتی ہے
اور کہیں چاشنی موت چکھا دیتی ہے

یہی شفقت تھی کہ جب اُس نے بھایا انجام
شیخ فاروق ؓ نے بیٹے کا کیا کام تمام

یہی شفقت تھی کہ جب ہو گیا بے جان پسر
ایک برچھی سی لگی باپ کے دل میں آ کر

یہی شفقت ہے کہ زخمی کہیں کرواتی ہے
یہی شفقت ہے کہ پھر زخم کو بھرواتی ہے

رحم اور عدل سے جب عقل نے تقریر یہ کی
اور دی ساتھ ہی حالی نے شہادت اس کی

رہی باقی نہ فریقین کو جاے انکار
چار و ناچار کیا یک جہتی کا اقرار

بڑھ کے پھر دونوں ملے ایسے کہ تھے گویا ایک
مل کے ہو جائیں کہیں جیسے کہ دو دریا ایک

6 تعصب وانصاف

(1882ء)

یاد ہے ہم کو وہ عالم اپنا
جب کہ ہم آپ تھے اپنے پہ فدا

اپنی جو بات تھی خوش آتی تھی
اپنی ایک ایک ادا بھاتی تھی

اپنی ہر آن پہ ہم مرتے تھے
اپنی رعنائی کا دم بھرتے تھے

766

اپنے انداز کے سودائی تھے
اپنے جلوے کے تماشائی تھے

کان کو اپنی ہی بھاتی تھی الاپ
سر دُھنا کرتے تھے ہم آپ ہی آپ

آپ خوبی پہ تھے اپنی مفتوں
خود ہی لیلیٰ تھے ہم اور خود مجنوں

جس جزیرے میں ہوئے تھے پیدا
اپنی لے دے کے وہی تھی دنیا

روم کی تھی نہ خبر شام کی تھی
آگہی طوس نہ بسطام کی تھی

تھے تماشائی دستِ پُر خار
کبھی گلشن کی نہ دیکھی تھی بہار

پی کے شور اب ہی ہوتے تھے بحال
کہ نہ چکھا تھا کبھی آبِ زُلال

نالہ زاغ و زغن پر تھے فدا
نہ سنی تھی کبھی بلبل کی صدا

سیر و انگوزہ اُسے کی بو پر تھے نثار
کہ نہ برتا تھا کبھی مشک تتار

پرنیاں جانتے تھے کمبل کو
کہ نہ برتا تھا کبھی مخمل کو

اوپری تھی نہ سنی بات کبھی
بدلے دیکھے تھے نہ دن رات کبھی

ہم بسر کرتے تھے جس عالم میں
واں سماں ایک تھا ہر موسم میں

رخ ہوا کا نہ بدلتا تھا کبھی

766

موسم آ کر نہ نکلتا تھا کبھی

ا۔ سیر بلبسن، انگوزہ، ہینگ

ایک ہی فصل پہ تھا دار و مدار
واں خزاں جا کے نہ آتی تھی بہار

ایک سے رہتے تھے دن رات سدا
آسماں کو تھی نہ گردش اصلا

تھی سمجھ پیر و جواں کی یکساں
عقل تھی خرد و کلاں کی یکساں

رکھتے تھے ایک سبق ازبر یاد
مبتدی ، منتہی ، شاگرد ، اُستاد

واں نہ تھی حدِ بلوغِ صبیاں
پیر بالغ تھے ، نہ بالغ تھے جواں

نئی بولی کا وہاں صرف نہ تھا
تیس حرفوں کے سوا حرف نہ تھا

تھے خدا کے وہی ننیانوے نام
اور لینا تھا وہاں نام حرام

اہلِ دولت کی نہ تھی عام عطا
ایک ہی سمت برستی تھی گھٹا

تھا نہ دین داروں کو غیروں سے لگاؤ
ایک ہی سمت تھا رحمت کا جھکاؤ

دعوے غیروں کے تھے سب بے صرفہ
فیصلے ہوتے تھے نت یک طرفہ

راستی کا نہ تھا غیروں پہ گماں
حق نہ دائر تھا فریقین میں واں

766

تھی عناصر میں نہ واں آگ نہ باد
خلق سے اک موئی مٹی تھی مراد

حس و حرکت کے کوئی پاس نہ تھا
واں کا حیوان بھی حساس نہ تھا

تھی درختوں کو نہ واں نشوو
چلنے پاتی تھی نہ گلشن میں ہوا

گل شگفتہ تھے نہ پودے شاداب
واں زمانے پہ نہ آتا تھا شباب

وہی مرغوب تھی واں پوشش تن
جس سے آدمؑ نے چھپایا تھا بدن

تھے پسندیدہ اُسی شان کے گھر
کی تھی حوا نے جہاں عمر بسر

اسی انداز کے چلتے تھے جہاز
کشتیِ نوح کا جو تھا انداز

تھی اسی نسخے پہ موقوف شفا
جو تھا بقراط نے ترتیب دیا

ٹوٹ سکتی نہ تھی واں رائے قدیم
تھا امٹ لکھ گئے جو اگلے حکیم

واں کسی طرح نہ ممکن تھا خلا
واں نہ پانی تھا مرکب نہ ہوا

گھوڑے دوڑائے تھے اگلوں نے جہاں
وہی جولاں گہ مردم تھی وہاں

کی تھی جس جا قدما نے منزل
بڑھنے پاتے تھے نہ واں سے محمل

766

علم و فن تھے نئے سارے مردود
غیب کے واں تھے خزانے محدود

نئی لذت سے تھی ہر طبع نفور
نعمتیں حق کی وہاں تھیں محصور

سب کی گُدّی پہ لگی تھیں آنکھیں
کچھ نہ آگے نظر آتا تھا اُنہیں

پیچھے گر دیکھتے تھے ریگستاں
سوجھتا تھا اُنہیں وہ آبِ رواں

آگے ہوتا تھا اگر چشمہ آب
وہ سراسر نظر آتا تھا سراب

روشنی رکھتی تھی اُن سے ان بن
جیسے خُفّاش سے سورج کی کرن

تھا لکیر اپنی پہ ایک ایک فقیر
دل پہ ہر نقش تھا پتھر کی لکیر

رسم و عادت نہ بدلتی تھی وہاں
برف جم کر نہ پگھلتی تھی وہاں

آگ واں بجھ کے سلگتی کم تھی
اور سلگتی تھی تو لگتی کم تھی

شان میں واں نہ سنا تھا حق کی
''کل یوم ہو فی شان ؔ'' کبھی

وضع میں تھا نہ تغیّر خو میں
جائے دل سنگ تھا ہر پہلو میں

سمجھا جاتا تھا وہ دل بے فرماں
مہر جس دل پہ نہ ہوتی تھی وہاں

بات مشکل تھی دلوں سے جانی

766

نقش تھے دل کے خط پیشانی

اے یعنی ہرآن اس کی ایک نرالی شان ہے۔

غیر کی بات خطا ، اپنی صواب
سب سوالوں کا تھا واں ایک جواب
چڑھ کے گر بحث کو جاتے تھے کہیں
فتح کا پہلے سے ہوتا تھا یقیں
تھی وہاں حق کی یہی ڈیفینیشن اے
منہ سے جو اپنے نکل جائے سخن
اسی عالم میں پلے تھے ہم بھی
اُسی ساون کے تھے اندھے ہم بھی

io

جانتے تھے کہ جہاں میں ہم پر
ختم ہیں سارے کمالات بشر
حق نے جو ہم پہ کیے ہیں احساں
ان سے محروم ہے نوع انساں
سب سے ہر بات میں ہم ہیں افضل
اب نہیں کوئی ترقی کا محل
اپنے حصے میں ہے ساری تہذیب
خانہ پرور ہے ہماری تہذیب
جو قدیم اپنا چلن ہے اور چال
خردہ گیری کی نہیں اس میں مجال
ہے بری عیب سے خوراک اپنی

766

پاک دھبے سے ہے پوشاک اپنی

رسم اپنی نہیں بے جا کوئی
طور اپنا نہیں بھونڈا کوئی

آدمیت کے ہمی ہیں مصداق
ہم سے سیکھے کوئی حُسنِ اخلاق

سب سے عالی ہیں خیالات اپنے
سب مسلّم ہیں کمالات اپنے

ہم چلے جاتے ہیں جس رستے پر
واں نہ کھٹکا ہے کہیں کا نہ خطر

تھے سمائے ہوئے جو دل میں خیال
تھا تصور بھی خلاف ان کے محال

جس کو اک بار برا جان لیا
عمر بھر پھر اُسے اچھا نہ کہا

ٹوٹتی تھی نہ کبھی اپنی دلیل
وہی دعویٰ تھا وہی اپنی دلیل

وہم و شک کی کوئی صورت ہی نہ تھی
ہم کو تحقیق کی حاجت ہی نہ تھی

جو بدلتی تھی نہ بدلی تھی کبھی
رائے ایسی تھی ، پسند ایسی تھی

ہم سمجھتے تھے نہ سمجھانے سے
اور اُلجھ جاتے تھے سلجھانے سے

سچ وہی تھا جسے سچ جان لیا
جھوٹ تھا ، جھوٹ جسے مان لیا

ا؎ Definition:تعریف

766

حق و باطل کی یہی تھی میزان
جھوٹ اور سچ کی یہی تھی پہچان

ذات باری کو نہیں جیسے زوال
رائے اپنی بھی بدلنی تھی محال

کوہ ہٹ جائے تو یہ تھا ممکن
ہم نہ ہٹتے تھے جگہ سے لیکن

حسن ظن تھا یہ سمجھ پر اپنی
غلطی کا تھا گماں تک نہ کبھی

تھے لڑکپن کے خیالات تمام
دل میں اُترے ہوئے شکل الہام

دیکھتے سنتے تھے جو اس کے خلاف
نظر آتا تھا وہ سب لاف و گزاف

تھی نئی بات سے یاں تک نفرت
ہوتی تھی سننے سے پہلے وحشت

بو نئی شے کی جو پا لیتے تھے
ناک بن دیکھے چڑھا لیتے تھے

عقل کی تھیں نہ صلاحیں مقبول
تھی وہ سرکار میں اپنی معزول

فکر پر زور نہ ڈالا تھا کبھی
ہوش ہم نے نہ سنبھالا تھا کبھی

جو کہ تھا اپنی کتابوں میں لکھا
کوئی حرف اس میں جز الہام نہ تھا

جو کہانی تھی بزرگوں نے کہی
تھا وہی فلسفہ اور علم وہی

766

تھا لباسوں میں لباس اپنا لباس
اور سب سوختنی بے وسواس

تھی زباں اپنی زبانِ پاکاں
ماسوا ، اہل جہنم کی زباں

جلوہ دہر کا باقی تھا نہ ہوش
تھے نشے میں یہ خودی کے مدہوش

کان میں پڑتی تھی جب بات نئی
غیر ہو جاتی تھی حالت دل کی

خرق عادت بھی اگر دیکھتے تھے
آنکھ اُٹھا کر نہ ادھر دیکھتے تھے

نئی آواز سے چونک اُٹھتے تھے
اوپری شکل پہ بھونک اُٹھتے تھے

ساری دنیا سے نرالا تھا مذاق
ہم کو تھا زہر بھی اپنا تریاق

اپنی حجت کو قوی جانتے تھے
بات ہر پھر کے وہی مانتے تھے

تھا نہ قصدِ حق و باطل مطلق
جو پڑھا تھا وہی از بر تھا سبق

خصم سے بحث اگر کرتے تھے
حق سے ہم قطع نظر کرتے تھے

کاٹ دی خصم نے جو بات کہی
بحث و تکرار کی غایت تھی یہی

خصم کی بات کو کرنا تسلیم
اپنے نزدیک ہزیمت تھی عظیم

766

حق کا خطرہ جو کبھی آتا تھا
نفس آپ اپنے کو جھٹلاتا تھا

دشمنی کے یہی معنے تھے کہ جو
ہم کہیں بات وہ تسلیم نہ ہو؟

ہم اندھیرے کو اگر کہتے تھے نور
دوستوں کو یہی کہنا تھا ضرور

گر خلاف اپنے کوئی بول اُٹھا
اس سے بڑھ کر کوئی بدخواہ نہ تھا

ذکر غیروں کا نہ تھا بے نفریں
کوئی مردود تھا اور کوئی لعیں

غیر کے واسطے تھی نارِ سعیر
باغ فردوس تھی اپنی جاگیر

اور تھے حرص و ہوا کے بندے
ہم تھے مخصوص خدا کے بندے

بخششیں ختم تھیں ساری ہم پر
وقف تھی رحمت باری ہم پر

نیک اعمال تھے غیروں کے تباہ
اور مغفور تھے سب اپنے گناہ

عین تحقیق تھی اپنی تقلید
شرک اپنا تھا سراسر توحید

تھا بدی کا نہ گنہ کا کچھ ڈر
پاس ایسی کوئی رکھتے تھے سپر

سب دعا گو تھے ہمارے ملکوت
تھے ہمیں آدم و حوا کے سپوت

766

حوض کوثر پہ تھا قبضہ اپنا
سلسبیل اپنی تھی طوبیٰ اپنا

اپنی ظلمت تھی سراسر تنویر
اپنے اندھوں کو بھی کہتے تھے بصیر

رکھتے جنت میں نہ تھے ہم ساجھی
غیر ناری تھے سب اور ہم ناجی

تھے قضا اور قدر کے مالک
ہم تھے اللہ کے گھر کے مالک

io

عصبیت میں رہے جب تک چور
کھنچتے یوں ہی رہے آپ کو دور

نظر آتا تھا نہ کچھ پست و بلند
تھے ہم اک کلبہ تاریک میں بند

دی جب انصاف نے دستک آ کر
حجرۂ تنگ سے نکلے باہر

جلوۂ علم و یقیں کو دیکھا
آسماں اور زمیں کو دیکھا

رخ حقیقت نے دکھایا ہر سو
چندنا سا نظر آیا ہر سو

کی تعصب سے جونہی قطع نظر
ہوا اک اور ہی عالم میں گزر

علم پر تھا نہ جہاں کوئی حجاب
دھوکا پانی کا نہ دیتا تھا سراب

766

جھوٹ سے سچ نتھر آتا تھا الگ
دودھ پانی نظر آتا تھا الگ

نکتہ چیں یار تھے واں یاروں کے
قدر داں غیر تھے اغیاروں کے

دور بیگانہ نہ تھے خویش سے واں
خویش اول تھا نہ درویش سے واں

عیب سب کہتے تھے اپنے خوش خوش
دوغ واں اپنی بھی ہوتی تھی ترش

تھی نجس کوئی نہ انساں کی زباں
گاڈ بھی کہتے تھے اللہ کو واں

حق کی پہچان جز اخلاص نہ تھی
حق کی پوشش کوئی واں خاص نہ تھی

ساتھ اغیار کے کھاتے تھے اگر
کبھی ایماں کا نہ ہوتا تھا ضرر

صلحا لمپ جلاتے تھے وہاں
اتقیا میز پہ کھاتے تھے وہاں

نہ سمجھتا تھا وہاں کوئی بشر
آپ کو نوعِ بشر سے بہتر

بھائی انساں تھے سب انسانوں کے
میت ہندو تھے مسلمانوں کے

ایک معدن کے تھے سب لعل و گہر
ایک ڈالی کے تھے سب برگ و ثمر

اشعری ، معتزلی ، ، لا مذہب
ایک ماں باپ کی اولاد تھے سب

اپنی ہر رائے پہ کرنا اصرار

766

کفر واں بس یہی پایا تھا قرار

ا۔ معتزلی: عقلیت پسند حکما و متکلمین، قدریہ۔ اشعری: وہ حکما جو عقل پر وحی و وجدان کی فوقیت کے قائل اور جبریت کی طرف مائل تھے۔

بحث سے باز آتے نہ تھے جو زنہار
تھے وہ بوجہل کی اُمت میں شمار

پاؤں واں جن کے پھسل جاتے تھے
خود پھسل کر وہ سنبھل جاتے تھے

ٹیڑھ واں دل کی نکل سکتی تھی
رائے اپنی بھی بدل سکتی تھی

دیکھ حجت کو قوی پیر و جواں
بند ہو جاتے تھے بچوں سے وہاں

حق کی آواز جہاں آتی تھی
مت کروڑوں کی بدل جاتی تھی

پاک عقلیں تھیں خطا سے نہ علوم
جز نبی کوئی نہ تھا واں معصوم

غور ہر بات میں کی جاتی تھی
مشورت عقل سے لی جاتی تھی

تھی وہاں عقل معطل نہ حواس
سب قویٰ کام میں تھے بے وسواس

آنکھ رہ سکتی نہ تھی بن دیکھے
کان سننے سے نہ باز آتے تھے

سوجھتی تھی جو انوکھی کوئی چیز
جانچتی تھی اُسے واں چشمِ تمیز

سنتے تھے بات نرالی جس دم

کہتے تھے اس کو محک پر پیہم
کڑوے اور میٹھے کو چکھ لیتے تھے
کھرے کھوٹے کو پرکھ لیتے تھے

پھول ہر خار سے چن لیتے تھے
بھوگ اے نیچوں کے بھی سن لیتے تھے

عادتیں سب کی بدلتی ہیں سدا
ایک اللہ کی عادت کے سوا

عیب جس رسم میں پا لیتے تھے
دل وہیں اس سے ہٹا لیتے تھے

اُجلی پوشاک جو مل جاتی تھی
ملگجے کپڑوں سے شرم آتی تھی

دیکھ لی جس نے کہ شمع کافور
تھا وہ چیکٹ بھرے ڈیوٹ سے نفور

ہاتھ آ جاتا تھا جب مال نیا
پھینک سب دیتے تھے عطار دوا

گر کے ہو جاتے تھے گھر جن کے کھنڈر
گھر کی واجب تھی مرمت اُن پر

نت نئی ریت نکلتی تھی وہاں
رُت سماں روز بدلتی تھی وہاں

قافلے چلتے تھے دن رات تمام
کسی منزل پہ نہ کرتے تھے مقام

قبلہ تھا علم الٰہی اُن کا
تھا سفر لامتناہی اُن کا

۱؎ بھوگ: (دینا یا سنانا کے ساتھ) گالیاں دینا، (کھانا یا سننا کے ساتھ) گالیاں کھانا۔ (نور اللغات)

تشنہ علم تھے واں سب ایسے
پیاسے پانی کے ہوں طالب جیسے

نہ ''مجسطی'' پہ قناعت تھی اُنہیں
نہ ''اشارات'' کفایت تھی اُنہیں

عرش تحقیق تھا استھان اُن کا
مصر تیرتھ تھا نہ یونان اُن کا

دیکھا جب عالم انصاف کا رنگ
ہم کو خود آنے لگا آپ سے ننگ

خوبیاں اپنی تھیں جو ذہن نشیں
اُن پہ ہم کرنے لگے خود نفریں

عیب سب اپنے نظر آنے لگے
آپ ہم اپنے سے شرمانے لگے

ہوئی وہ بزمِ خیالی برہم
تھا طلسمات کا گویا عالم

جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا
اک وہ ناچیز سا قطرہ نکلا

تھا کیا جس کو یقیں چشمہ آب [1]
وہ نمائش تھی حقیقت میں سراب

قصر و ایواں کا گماں تھا جن پر
نکلے آخر وہ گڑھے اور کھنڈر

۱؎ ''تھا جس کو یقین چشمۂ آب''۔ (نسخۂ شجاعت، صفحہ:105۔ نسخۂ فاضل، صفحہ:145)

تھا سبک دانہ خر دل سے سوا ۱؎
کوہ الوند جسے سمجھا تھا

جب ہر ایک قوم کا ساماں دیکھا ۲؎
ہم نے واں آپ کو عریاں دیکھا

نکلے سب ہیچ خیالات اپنے
ٹھہرے سب پوچ کمالات اپنے

آپ کو اونٹ سمجھتا تھا بڑا
نکلا جب تک کسی گھاٹی سے نہ تھا

چوٹیاں آئیں جو پربت کی نظر
پھر اُٹھایا نہ کبھی اُونٹ نے سر

بھنگا ۳؎ جب تک رہا گولر میں نہاں
تھا وہی اُس کے تصور میں جہاں

پر وہ گولر سے جو باہر آیا
اپنی ہستی سے بہت شرمایا

پردہ جب تک رہا آنکھوں پہ پڑا
حسن پر اپنے گماں تھے کیا کیا

منہ جب آئینے میں دیکھا جا کر
ہم کو اک شکل مہیب آئی نظر

ہوا حیرت سے دگرگوں احوال

ڈر گئے دیکھ کے اپنے خط و خال

ا۔ ''کے سوا''۔(صفحہ:105و145)
۲۔ ''ہر اک قوم''(نسخۂ شجاعت،صفحہ:105۔نسخۂ فاضل،صفحہ:145)
۳۔ نہایت چھوٹے، پر دار کیڑے جو گولر میں بھرے رہتے ہیں۔

دیکھا جب آپ کو بالکل معیوب
چھپ گئے غیروں کی آنکھوں کے عیوب

یک قلم ہو گئی نخوت کافور
بن گیا رشک ہمارا وہ غرور

ناخن فکر نے کی دل میں خراش
عیب جویوں کی لگے کرنے تلاش

جن کے طعنوں کی تھی ہم پر بھر مار
اُن کے ہم دل سے ہوئے شکر گزار

ہم نے جانا کہ یہی ہیں دل سوز
چل رہے تیر ہیں جن کے دل دوز

اُن کا غصہ ہے سراسر رحمت
زہر میں اُن کے بھرا ہے امرت

اُنھی بندوں کے ہیں ایماں سچے
یہی کافر ہیں مسلماں سچے

قائم انصاف کا جب ہو گا نشاں
مانے جائیں گے اُنھی کے احساں

بے خبر کب کے پڑے سوتے تھے
اُن کی آواز سے ہم چونک اُٹھے

اُن کے طعنوں نے جگایا ہم کو
زہر نے اُن کے جلایا ہم کو

یار و اغیار کے عیب اور ہنر
آشکارا ہوئے ایک اک ہم پر

حق کے جلوے نظر آئے ہر جا
اہل باطل میں بھی اک پائی ادا

نہ ملا راہ میں باطل کا سراغ
اہل حق کو بھی نہ پایا بے داغ

اہل تقویٰ کی ریائیں دیکھیں
اہل حکمت کی خطائیں دیکھیں

زشتیاں دیکھیں نکو کاروں میں
خوبیاں پائیں گنہگاروں میں

کلب کی پاک سرشتی دیکھی
پاے طاؤس کی زشتی دیکھی

عیب بھی دیکھے ہنر بھی دیکھے
خار بھی دیکھے ثمر بھی دیکھے

ہنر اغیار میں پائے اکثر
عیب اپنے نظر آئے اکثر

دفتر علم کو ابتر پایا
علم کو جہل سے بدتر پایا

مجلسیں غیبت و بہتان سے پر
صحبتیں جھوٹ کے طوفان سے پر

منقطع بھائی کی بھائی سے اُمید
اپنا بیگانہ ، لہو سب کے سفید

پاک بندوں کی زباں پر دشنام
نہ ثقات اس سے بری اور نہ کرام

فقرا مکر و ریا کے پتلے
اغنیا حرص و ہوا کے پتلے

شیخ عیار تو زاہد پر فن
مولوی ، عقل کے سارے دشمن

پیاز کی طرح نرے پوست ہی پوست
قوم کے دوست مگر ناداں دوست

حالت القصہ جو دیکھی اپنی
کوئی کل سیدھی نہ پائی اپنی

سارے آوے کو ٹٹولا جا کر
کوئی برتن نہ سڈول آیا نظر

پایا اک دین کا محکم قانون
وہ بھی یاروں کی بدولت مطعون

دیکھی آنکھوں سے جو یہ حالتِ زار
جی بھر آیا ، نہ رہا صبر و قرار

گو نہ تھا تلخ نوائی کا محل
آہیں دو چار گئیں دل سے نکل

تلخ گزرے جو کسی کو یہ صدا
حق میں تلخی کے سوا اور ہے کیا؟

7 کلمۃ الحق معروف بہ "راست گوئی"

(1883ء)

اے راست گوئی! کیا قہر ہے تو
اے حق کی تلخی! کیا زہر ہے تو
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہو گی
حنظل میں ایسی تلخی نہ ہو گی

ہے ناگواری پہچان تیری
"اَلْحَقُّ مُرٌّ"[1] ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے
چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے

رشتے ہزاروں تو نے تڑائے
باپوں سے بیٹے تو نے چھڑائے
سقراط کو زہر تو نے دلایا
شبیرؓ کو قتل تو نے کرایا

بے جرم مسموم تو نے کرائے
سولی پہ معصوم تو نے چڑھائے
رخنے عرب میں تو نے نکالے

بدر و اُحد میں رن تو نے ڈالے

موسیٰ کو مدین تو نے بھگایا
احمد e سے مکہ تو نے چھڑایا

تو نے صلے میں بخشے ہیں اکثر
سولی کے اورنگ ، کانٹوں کے افسر

ا۔ سچ کڑوا ہوتا ہے۔

مظلوم کتنے تیرے سہارے
''ایلی'' اے بھی ''ایلی'' کہتے سدھارے

خوں خوار لشکر ہیں ساتھ تیرے
رنگیں لہو میں ہیں ہاتھ تیرے

تیری جلو میں رسوائیاں ہیں
سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں

تدبیر ہے تو ناکامیوں کی
تقریب ہے تو بدنامیوں کی

تو آشتی کی رہتی ہے دشمن
تو مصلحت سے رکھتی ہے ان بن

قطع و برش ہے تاثیر تیری
رہتی ہے ننگی شمشیر تیری

ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر
دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر

پڑتی ہے ہلچل ہر مرحلے میں
آتی ہے دنیا اک زلزلے میں

حق معبدوں میں ہوتا ہے داخل
ہوتے ہیں جھوٹے معبود باطل

اُٹھتا ہے عملہ لات اور صفا کا
ہوتا ہے گھر پر قبضہ خدا کا

عبرانیوں کا اُڑتا ہے پرچم
صف قبطیوں کی ہوتی ہے برہم

ہوتے ہیں اغیار احمد e کے ساتھی
بوجہل کے سب چھٹتے ہیں ناتی

io

ا۔ ایلی: غالباً عبرانی لفظ ہے بمعنی اللہ۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ نے مصلوب ہوتے وقت خدا کو اسی نام سے پکارا تھا۔

اے راست گوئی اے تیغ براں
تیرا مخالف کیوں ہو نہ دوراں

سب وحشت آگیں مضموں ہیں تیرے
نت مصلحت پر شب خوں ہیں تیرے

گن تیرے جن پر ظاہر ہوئے ہیں
وہ تیری دھن میں آخر ہوئے ہیں

اُمڈا جہاں سے سیلاب تیرا
پھر واں نہ کشتی ٹھہری نہ بیڑا

اُٹھتی ہیں دل سے جب تیری موجیں
ہوتی ہیں نازل واں حق کی فوجیں

دیتی ہے ہمت ان کو سہارے
کرتی ہے اُمید پنہاں اشارے

عزم اُن کی مشکل کرتا ہے آساں
دل اُن سے لاکھوں کرتا ہے پیماں

چھا جائے ظلمت گو بحر و بر میں
ہے روز روشن اُن کی نظر میں

زور اُن پہ تیرے ہیں آشکارا

مٹھی میں اُن کی عالم ہے سارا

عظمت جہاں ہے تیری سمائی
پربت وہاں ہیں نظروں میں رائی

شاہوں سے گردن جھکتی نہیں واں
طوفاں سے کشتی رکتی نہیں واں

اے راست گوئی تو ہے وہ افسوں
منکر بھی دل سے ہیں جس پہ مفتوں

تلخی میں تیری طرفہ مزا ہے
ہر دل میں چبھتی تیری ادا ہے

تو نے جہاں دی آواز جا کر
لاکھوں اُٹھے سو تیری صدا پر

ہوتی ہے دھیمی پرواز تیری
بڑھتی ہے کم کم آواز تیری

پھر دوڑتی ہے یوں مرد و زن میں
جس طرح آتش لگتی ہے بن میں

بنتے ہیں دشمن انصار تیرے
ہوتے ہیں قیدی احرار تیرے

پطرس نے چھوڑے یار آشنا سب
یرون پہ دیکھی تیری ادا جب

ڈالا عمرؓ پہ جب تو نے سایا
ارقمؓ کے گھر میں آ سر جھکایا

آہٹ سے تیری کرتے ہیں جو رم
ہیں گد گداتے دل اُن کے ہر دم

جوں جوں وہ زد سے کرتے ہیں دوری
ضرب اُن پہ تیری پڑتی ہے پوری

جاتا ہے آہو جب چوٹ کھا کر
گرتا ہے آخر کچھ دور جا کر

ا ارقم: حضرت ابوعبداللہ بن عبد مناف، مشہور صحابی جن کا مکان (دارارقم) میں تبلیغ اسلام کا مرکز تھا۔

تجھ سے بھی جو ہیں وحشی بدکتے
پھر پھر کے تجھ کو جاتے ہیں تکتے

گو حق کی تلخی پائے ہوئے ہیں
پر چوٹ دل پر کھائے ہوئے ہیں

بھاگے ہیں کھا کر زخم نہاں وہ
جائیں گے بچ کر تجھ سے کہاں وہ

دل دوز ہیں سب تیری ادائیں
کڑوی ہیں تیری ساری دوائیں

زہر ہلاہل برسوں پئیں جب
بیمار تیرے پائیں شفا تب

دیتی ہے اول تو زخم کاری
مرہم کی آخر آتی ہے باری

کل ہے مسرت، ہے آج غم تو
دیتی ہے امرت کہتی ہے سَم تو

ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت
تو جھوٹ پر واں کرتی ہے لعنت

جس جا تعصب ہے عین ایماں
انصاف کا غل کرتی ہے تو واں

رسم سلف پر مرتے جہاں ہیں
رسموں پہ حملے تیرے وہاں ہیں

تقلید جس جا ہے طوقِ گردن
تقلیدیوں سے ہے تیری ان بن

کرتی ہے واں تو واعظ کو رسوا
ہے وحیِ مُنْزَلْ قول اس کا جس
جا

واں مفتیوں پر ہیں تیرے دھاوے
ہیں مثلِ قرآن جس جا فتاوے

پجتی ہیں قبریں جب اولیا کی
تو ہے دہائی دیتی خدا کی

جس ملک میں ہے تیری غلامی
ہوتی ہے تو واں بردوں کی حامی

غل بھیڑیوں کا پڑتا جہاں ہے
تو بکریوں کی واں پاسباں ہے

زہر اُس عسل کو تو ہے بتاتی اے
جس میں حلاوت ہے سب کو آتی

اس نیش میں تو کہتی شفا ہے
نیش اجل کا جس میں مزا ہے

ہندی میں تیری تازی کی بو ہے

مشرق میں کہتی مغرب کی تو ہے

جس سر زمیں میں پانی ہے عنقا
تو چھیڑتی ہے واں ذکر دریا

ہر سو جہاں ہے طغیان باراں
شور العطش کا کرتی ہے تو واں

سانپوں کا خطرہ پاتی جہاں ہے
اندھوں کے آگے کرتی فغاں ہے

ا۔ مثنویات کے دونوں نسخوں میں ''بتاتی'' ہے۔(صفحہ 111و151)

طوفاں کی حالت پہلے سے پا کر
بیڑوں میں چرچا کرتی ہے جا کر

ڈاکے کی آمد ڈاکے سے پہلے
کہتی ہے جا کر تو کارواں سے

بلبل ہے گل پر جب چہچہاتی
اُس دم خزاں سے تو ہے ڈراتی

پاتی ہے گھر میں جب کچھ دھواں تو
آگ آگ کا غل کرتی ہے واں تو

جب دیکھتی ہے قومیں بگڑتی
ہے آگ میں تو قوموں کی پڑتی

کرتی ہے ظاہر ان کی خطائیں
دیتی ہے ان کو پیچیدہ رائیں

گہ منعموں پر تو ہے برستی
گہ جھاڑتی ہے مفلس کی مستی

دیتی ہے طعنے بے غیرتوں کو

کرتی ہے رسوا بے عزتوں کو

للکارتی ہے تو کاہلوں کو
پھٹکارتی ہے تو جاہلوں کو

جھڑکی ہے تیری عادت میں داخل
ترشی ہے تیری طینت میں داخل

بگڑے ہیں تجھ سے دل بے نہایت
لاکھوں نے کی ہے تیری شکایت

یاں نام تیرا جس نے لیا ہے
عالم کو اپنا دشمن کیا ہے

احکام تیرے ٹلتے رہے ہیں
تیرے نوشتے جلتے رہے ہیں

پہنچایا جس نے پیغام تیرا
جمہور میں وہ بدنام ٹھہرا

کتنوں نے مانا ساحر نبی e کو
کتنوں نے جانا کافر علی t کو

طوفاں اُٹھائے اہل ہدیٰ پر
بہتان باندھے زین العبا پر

نعمانؒ کو دی بدعت سے نسبت
کی شافعیؒ پر برپا قیامت

مالکؒ پہ لائے آفت جفا جو
یاں تک کہ اکھڑا مفصل سے بازو

کی ابن حنبلؒ کی یہ مدارا

چہرے پہ تھوکا ، کوڑوں سے مارا
نکلے ائمہ اکثر وطن سے
خالی ہوا رے ابن حسنؓ سے
کتنوں کی باندھیں ذلت سے مشکیں
کتنوں کے رسی ڈالی گلے میں
مرتد بنایا اہل یقیں کو
ٹھہرایا زندیق ارباب دیں کو

io

اے کلمہ حق ! تیری بدولت
مردوں پہ گزری کیا کیا مصیبت
ٹھہرے جہاں میں بیگانے سب سے
تجھ پر ہوئے وہ دیوانے جب سے
دنیا نے اُن پر گو ظلم توڑا
دامن اُنھوں نے تیرا نہ چھوڑا
ہے تلخ و شیریں ہر بات تیری
سننے میں کڑوی کہنے میں میٹھی
کانوں کو ہے تو گو ناگوارا
منہ سے نکلنا تیرا ہے پیارا
جو حرفِ حق سے بھاگے بگڑ کر
حق اُن کو لایا گردن پکڑ کر
حق کے سب آخر طالب ہوئے ہیں
نت حق کے دعوے غالب ہوئے ہیں
ہوتا نہ ہرگز جگ میں اُجالا

766

حق کا نہ ہوتا گر بول بالا

io

اے راست گوئی ! اے ابرِ رحمت!
ہے اس چمن میں سب تیری برکت
گر تو نہ ہوتی یاں سایہ افگن
برباد ہوتا کب کا یہ گلشن

عالم ہے سر سبز تیرے قدم سے
آباد یہ گھر ہے تیرے دم سے
باغِ جہاں کو چھانٹا ہے تو نے
اکثر خزاں کو ڈانٹا ہے تو نے

تو بے کسوں کی یاور رہی ہے
تو گمراہوں کی رہبر رہی ہے
جن بستیوں میں تو چھچھائی
کھیتی اُنھی کی یاں لہلہائی

بند اپنی جس جا تو نے زباں کی
نکبت نے منزل آ کر وہاں کی
رہبر نہ ہوتا گر نور تیرا
یوناں میں ہوتا ہر سو اندھیرا

گر مصر کی تو کھوتی نہ خامی
مصری نہ ہوتے عالم میں نامی
سریا میں حق کا جھنڈا نہ گڑتا
سایہ اگر واں تیرا نہ پڑتا

جنبش نہ ہوتی گر تیرے لب کو
قبلہ نہ کرتے خاکِ عرب کو

ہوتے رہے ہیں سب ملک و ملت
سر سبز تجھ سے نوبت بہ نوبت

مشرق میں جب تھی تیری حکومت
چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت

جب دور تیرا مغرب میں آیا
مغرب کو تو نے مشرق بنایا

کھلتے رہے ہیں گل تیرے ہر سو
مہکی ہے اکثر یاں تیری خوشبو

گو تجھ میں تلخی حد سے سوا ہے
پر تیری دارو صحت فزا ہے

ہر بول تیرا جوشِ غضب میں
ہے حق کی آواز راہِ طلب میں

گو علم کی ہے تو زندگانی
پر جہل تیرا دشمن ہے جانی

جاہل ہمیشہ تجھ سے لڑے ہیں
ناداں ہزاروں تجھ سے اڑے ہیں

لاکھوں بلائیں آئی ہیں تجھ پر
اکثر گھٹائیں چھائی ہیں تجھ پر

ملکوں نے تجھ پر حملے کیے ہیں

قوموں نے تجھ سے بدلے لیے ہیں

io

اے کلمہ حق ! اے سر یزداں
جس وقت ہو تو پردے سے عریاں
ہوں تیرے جس دم انصار تھوڑے
دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے
عالم ہو تیرا جب نا شناسا
حالی کو رکھیو اپنا شناسا

io

8 مناظرہ واعظ و شاعر

(1883ء)

کل جو میں نے بسترِ راحت پہ جا کر دم لیا
دل کو اک وقفہ غم دنیا سے فرصت کا ملا
کی تصور نے وہیں اک بزمِ رنگیں آشکار
مجلس اربابِ معنی جس کو کہنا ہے بجا
گرم تھا واں ہر طرف ہنگامہ بحث و نظر
سرخ رو گلگونہ حجت سے تھا ہر مدعا
شمع استدلال میں روشن تھا فانوس بیاں
چار سو ہنگامہ آرا تھی "لم ولا ا ے" کی صدا
تھے فراہم جس قدر اس بزم میں اہل کمال
تھا شرف کا اپنے اپنے فن کے سب کو ادّعا
مولوی کہتے تھے غیر از علم دیں سب ہیچ ہے

766

فلسفی کہتے تھے ہر فن کی ہے حکمت پر بنا

صوفی صافی ادھر کچھ کہہ رہا تھا زیرِ لب
واعظ معجب اُدھر کچھ بک رہا تھا برملا

خود فروشی کا غرض تھا ہر طرف بازار گرم
ساز گوناگوں تھے لیکن ایک تھی سب کی صدا

شاعرِ مغرور بھی اک سمت خنداں زیرِ لب
سن رہا تھا لاف اہلِ فضل اور خاموش تھا

جا کے پہنچا جب وہاں تک دورِ صہبائے سخن
دفعتہً مجلس سے اٹھا اور ہوا یوں خود ستا

ا۔ لم اور لا دونوں حروفِ نفی ہیں، مراد انکار و تردید۔

دعویٰ فضل و براعت اُس کو زیبا ہے یہاں
جو کوئی تلمیذ رحماں [ا]۔ تم میں ہو میرے سوا

ہے تصرف میں ہمارے عرصہ دشت خیال
کچھ نہیں معلوم جس کی ابتدا اور انتہا

رہ روی میں ہم کو چشم و گوش پر تکیہ نہیں
ہیں ہمارے بال و پر اندیشہ فکر رسا

صاف ہوتا ہے بیاں اپنا خس و خاشاک سے
پاک ہو جیسے وساوس سے دلِ اہلِ صفا

اتفاقاً گر کسی کی مدح پر آجائیں ہم
خاطرِ دشمن میں اس کا نقش الفت دیں بٹھا

خاک کو چرخ بریں پر دیں اگر ترجیح ہم
ماند ہو ذرے کے آگے مہر تاباں کی ضیا

وصفِ خوباں ہم سے گر سن پائے سالک ایک بار
ہو نہ ہرگز پنجۂ عشقِ مجازی سے رہا

گر کریں ہم گل رخوں کی بے وفائی کا بیاں
ہو نہ بلبل پھر چمن میں روئے گل پر مبتلا

کھینچ دیں گر خاطرِ مشتاق کی تصویرِ شوق
قیس کی کرنی پڑے لیلیٰ کو جا کر التجا

ہیں ہماری مدح کے پیر و جواں اُمید وار
اور ہماری ہجو سے ٹھہراتے ہیں شاہ و گدا

ا۔ الشعرا تلمیذ الرحمان (شعرا خدا کے شاگرد ہیں یعنی شاعری کا ملکہ وہبی ہے، کسبی نہیں)
براعت: فضیلت، کمالِ ہنر (نیز روشنی، فصاحت)

گرمیِ بزمِ حریفاں ہے ہماری ذات سے
بادہ گلگوں کا ہے ہر بات میں اپنی مزا

فکر اپنی لغزشِ اہلِ نظر سے پاک ہے
ہم جہاں چلتے ہیں واں مسدود ہے راہِ خطا

کچھ نہیں اپنا ضرر گر ہو روایت میں خلل
جھوٹ سے ہوتی ہے یاں رونقِ عبارت کو سوا

دی نہیں گویا شریعت نے ہمیں تکلیف کچھ
جو نہیں جائز کسی کو ہے وہ سب ہم کو روا

خود ستائی جو کسی کو جز خدا پھبتی نہیں
آ کے ہو جاتی ہے شاعر کی زباں پر خوش نما

فحش اور دشنام کو ملتا ہے یاں رنگِ قبول

گالیاں دے دے کے ہم سنتے ہیں اکثر مرحبا

io

جب یہ بالا خوانیاں شاعر کی واعظ نے سنیں
مسکرایا اور یہ فرمایا کہ اے ہذیاں سرا!
شیوہ تیرا بوالفضولی اور یہ لاف و گزاف
پیشہ تیرا باد خوانی اور اتنا ادعا
اُمت برحق کے عالم جو ہیں از روے خبر
وارثِ علم نبی قائم مقامِ انبیا
کیا ادب جاتا رہا ان کا بھی تجھ کو اے سفیہ
بر سر مجلس ہے تو جو اس طرح بکارتا
گو نہیں گنتی میں اہل علم کی یہ خاکسار
پر سنے جاتے نہیں یہ تیرے دعوے نارو ا
ہر سخن کا اک جدا ہوتا ہے موقع اور محل
ہزل و تحریت کجا ، بزم خرد منداں کجا
علم اور حکمت کے ہوں جس بزم میں دفتر کھلے
کس نے دی ہے تجھ کو واں اس ہرزہ گوئی کی رضا
شعر مستحسن اگر ہوتا تو قرآں میں اسے
کیوں خلاف شانِ ختم المرسلیں کہتا خدا ا
شان میں "بالعلم یزری" جس کی آیا ہے
صریح
فخر ہے اس شعر پر تجھ کو یہ اے شر الوریٰ

چاہیے انفاسِ اہل الذکر سے ہو مستفید

ہو نہ جس کو علم سنت اور کتاب اللہ کا

خود ہو تم بے علم اور صحبت سے اہل علم کی

بھاگتے ہو جیسے شیطاں ہے اذاں سے بھاگتا

ہے یہی باعث کہ بک اُٹھتے ہو تم بے اختیار

جو تمہارے منہ میں آتا ہے سزا اور نا سزا

اس زبانِ یاوہ گو کو اپنی کیا سمجھا ہے تو

جرم گو چھوٹا ہے اُس کا جرم ہے لیکن بڑا

بے حقیقت ہیں ترے سارے خیالات بلند

ہجو ہے تو بے اثر اور مدح ہے تو بے صفا

ا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر e کے بارے میں فرماتا ہے: ''وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ'' (ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا اور یہ اُس کی شان کے لائق بھی نہیں)

ہے جہاں خامے کو تیرے خدمت مشاطگی

مورت اک پتھر کی ہے واں حور جنت سے سوا

بال سے باریک تر معشوق کی تیرے کمر

رات سے تاریک تر ہجر صنم میں دن ترا

شش جہت میں تو کرے برپا قیامت سات بار

یار سے اپنے اگر دم بھر کو ہو عاشق جدا

تیغ چوبیں کی ہو گر برش بیاں کرنی تجھے

ہے تنزل گر اسے ٹھہرائے تو تیغ قضا

ہو جہاں لکھنی تجھے اسپ گلی کی جست و خیز

اک ترارے میں اسے پہنچائے تو فوق السما

تو ہوا مدح و ثنا میں جس کی سر گرمِ غلو

اور اُلٹا خوبیوں پر اس کی پردہ پڑ گیا

پرلے درجے کا تنزل ہے اگر ٹھہرائے تو

جم کو اس کے در کا درباں اور بہمن کو گدا

بہمن و جمشید یاں بے چارے کس گنتی میں ہیں

تنگ ہیں ہاتھوں سے تیرے انبیا اور اولیا

لکھے تو اک گربہ مسکیں کو سارا[1] منزلت

اور کہے اک لعبت سنگیں کو تو یوسف لقا

فی المثل گر ہو ترا ممدوح اک برگِ گیاہ

اس میں ثابت کر کے چھوڑے تو صفاتِ کبریا

---

[1] مراد حضرت سارا (حضرت ابراہیم کی بیوی) جیسی تقدس مآب

باد خوانوں سے سوا ہو تجھ کو فکر تہنیت

خواب میں سن پائے تو گر کوسِ[1] شادی کی صدا

ہند میں غل ڈال دے تو نالہ ہائے شوق سے

چین میں شہرہ ہو گر ایک شاہد نو خیز کا

شعر کو الہام سمجھے گر نصیبوں سے کبھی

کان میں پڑ جائے تیرے ایک جھوٹی واہ وا

مذہب شاعر میں جس کا دین باطل نام ہے

راستی اور صدق سے بڑھ کر نہیں کوئی خطا

سر بسر اقوال تیرے کچھ ہیں اور افعال کچھ

766

ہے زبانِ گوہر افشاں پر 'نعم' اور دل میں 'لا'
شان میں آیا ہے جن کے قول ''مالا یفعلون''[۲]

چشم بد دور آپ کے ہادی ہیں وہ اور مقتدا
ایسے دروازے بہت کم پائیں گے آفاق میں
جن پہ صبح و شام تو نے دی نہ ہو جا کر صدا

ہے زبان و خامہ تیرے تابع فرمانِ حرص
کام تجھ کو کچھ نہیں جز مدح و قدحِ اغنیا

مدح میں حد سے زیادہ جن کی کرتا ہے غلو
گالیاں دیتا ہے تو اکثر انہی کو برملا

جیسے دروازوں سے پھرتے ہیں دعا دے کر فقیر
مدح تو بھی ختم کرتا ہے یونہی دے کر دعا

---

[۱] ''گوش شادی''، مجموعہ نظم حالی، طبع لاہور (صفحہ:77)
[۲] سورۃ الشعراء کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: وَ اَنَّہُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ (اور وہ جو کچھ کہتے ہیں، خود اُس پر عمل نہیں کرتے)۔ (القرآن 226:26)

ہر دعا میں ہے مقدر شرط ''اِنْ اَعْطَیْتَنِیْ''[۱]

صاف لعنت کا دعا میں تیری آتا ہے مزا
پردہ عرض ہنر میں مانگتا ہے بھیک تو
گر یہی شاعری تو تجھ سے بہتر ہے گدا

io

زہر دل کا جب کہ واعظ نے لیا سارا اُگل
اور نہ کوئی تیر باقی اس کے ترکش میں رہا

سن کے شاعر نے کہا، بس اے خدنگ انداز بس
ہے زباں تیرے دہن میں یا سنانِ جاں گزا

چوٹ تھی تیری سخن پر ، جا پڑی اخلاق پر
تو نے چاکِ پیرہن کو تا جگر پہنچا دیا

خردہ گیری کے لیے حاضر ہے شاعر کا کلام
اس سے کیا مطلب کہ ہے وہ بندہ حرص و ہوا

تو اگر معصوم ہے تو کچھ کہی جاتی نہیں
پھنس رہا ہے ورنہ اس پھندے میں ہر شاہ و گدا

کھیلتے پھرتے ہیں میدان جہاں میں سب شکار
آڑ میں ٹٹی کی ، لاکھوں اور ہزاروں برملا

حرص ہوتی جسم میں انسان کے گر جائے خون
شاعروں سے تیرے چہرے کی دمک ہوتی سوا

میں نے ان آنکھوں سے اے واعظ لباس وعظ میں
جو فروشی کرتے دیکھے ہیں بہت گندم نما

ا۔ اِنْ اَعْطَیْتَنِیْ: اگر تو نے مجھے عطا کیا۔

خبط ہے اک تم کو ، کہہ دوں گر برا مانو نہ تم
آپ ہو بیمار اور دیتے ہو اوروں کو دوا

آپ میں تسبیح و ذکر و طاعت و زہد و ورع
خوبیاں سب کچھ سہی پر دل کا مالک ہے خدا

میں بتاؤں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے
جو ہیں خود اچھے وہ اوروں کو نہیں کہتے برا

بات حق ہو یا کہ باطل تیری مرضی کے خلاف
منہ سے نکلی اور تجھے تکفیر کا پہلو ملا

ترک اولی پر فضیحت جس قدر کرتا ہے تو
قتل انساں پر نہیں ملتی کہیں ایسی سزا

ہے فقط دوزخ تری سرکار میں جنت نہیں
چوک جس سے ہو گئی کچھ پھر نہیں تو بخشتا

عاصیوں کی مغفرت جن سے نکلتی ہے صریح
ایسی آیات اور حدیثوں سے ہے تو جی میں خفا

گر خدا بھی واعظو! ہوتا تمہی سا سخت گیر
اس چمن کو دیکھتا کوئی نہ پھر پھولا پھلا

گرم بازاری اسی میں اپنی بس سمجھے ہو تم
لوگ ہوں بد راہ اور ان کے بنو تم رہ نما

چاہتے ہو تم یہاں کثرت معاصی کی یونہی
ہیں اطبا چاہتے جس طرح امراض اور وبا

آپ ان باتوں کو اک بہتان سمجھیں گے مگر
سوجھتی اکثر نہیں انسان کو اپنی خطا

جو کہوں میں اس کو باور کر نہیں اس میں خلاف
شاعروں کے کذب سے بدتر ہے واعظ کی ریا

یہ بھی کوئی جھوٹ ہے، ہم جس کے خود ہیں معترف
جھوٹ وہ ہے جو ہو پردے میں تقدس کے چھپا

دعوتوں میں سچ بتا جس شوق سے جاتا ہے تو
ایک بھی کی ہے نماز اس شوق سے تو نے ادا

یاد ہے وہ تیرا کہنا دیکھ کر کھانے چنے
دین قائم ہے ابھی یارو کرو شکر خدا

مدرسے کوشش سے تیری گو بنے ہیں شہر شہر
مسجدیں بھی تو نے بنوائی ہیں اکثر جا بجا

پر یہ حیرت ہے کہ ان کاموں میں جو لاگت لگی
اس سے دہ چند آپ کے دیوان خانے میں لگا

مجرموں کے جرم شاید ہوں نہ اتنے خوف ناک
نیکیاں تیری ہیں جیسی پُر خطر روزِ جزا

ہے یقیں اتنا ہی ہوگا اپنے دل میں تو حقیر
جس قدر مانا ہے زید و عمرو نے تجھ کو برا

کر دیا رسوا تری تزویر نے تذکیر کو
ورنہ اک منصب تھا یہ شایانِ شانِ انبیا

لطف ہے تو دل ربا اور قہر ہے تو دل فریب
سحر ہے، افسوں ہے، جادو ہے، تری جو ہے ادا

گہ جہنم سے ڈرا کر چاہتا رشوت ہے تو
گاہ حوروں پر لبھا کر مانگتا ہے رونما

گونجتا منبر پہ ہے یوں بیٹھ کر گویا کہ آپ
آسماں سے لے کے اُترے ہیں ابھی حکمِ خدا

ہاتھ میں تیرے ہے گویا نار و جنت کی کلید
جس نے پوجا تجھ کو وہ فردوس میں داخل ہوا

نیکیاں برباد ہیں ساری تری خدمت بغیر
فرقہ ناجی ہے بس اک پوجنے والا ترا

اپنی اک امت الگ سب سے بنانے کے لیے
تفرقے ڈالے ہیں دینِ حق میں تو نے جا بہ جا

تیرے گہرے ہیں مسلمانوں میں جب تک ہے
نزاع

اختلاف امت کا حق میں تیرے رحمت ہو گیا

جس طرح جھگڑوں کے خواہاں ہیں عدالت میں وکیل
مانگتا ہے تو یونہی باہم خصومت کی دعا

چاہتا ہے قوم میں جوتی سدا چلتی رہے
کشتی اسلام کا پھر کیوں نہ ہو تو ناخدا

شاعروں کو بس اسی منہ سے گدا کہتا ہے تو
اے اسیرِ دامِ نفس ، اے بندہ حرص و ہوا

کچھ گدا کہنے سے تیرے ، ہم گدا ہوتے نہیں
ورنہ ہم بھی یوں تو کہہ اٹھتے ہیں بعضوں کو گدا

شاعری پر ہے بڑا یہ طعن حضرت کا کہ ہم
حد سے بڑھ جاتے ہیں جب کرتے ہیں مدحِ اغنیا

طعن کچھ بے جا نہیں ، رکھتے ہیں پر اک عذر ہم
غور کرنا عذر پر ہے شیوۂ اہل صفا

سب پہ روشن ہے کہ ہم لوگوں کا اک پیشہ ہے مدح
جیسے تم لوگوں کا پیشہ ہے یہی مکر و ریا

اپنے اپنے کام اور پیشے میں ، ہم ہوں یا کہ تم
کرتے ہیں ، ہوتا ہے جو کچھ مصلحت کا مقتضا

وعظ میں دیتے ہو آخر داستاں کی چاٹ تم
راستی سے کام جب چلتا نہیں تسخیر کا

مدح میں ہم بھی یونہی کرتے ہیں رنگ آمیزیاں
جب تن ممدوح پر کھلتی نہیں سادی قبا

پھول پھل سے سرو کو بے بہرہ جب پاتے ہیں ہم
ایک طرہ اس میں آزادی کا دیتے ہیں لگا

سوسن و نسرین و گل میں جب وفا پاتے نہیں

وصف رنگ و بو سے ہم دیتے ہیں عیب اُن کا چھپا
پر ہم اس پردے میں خود اپنا دکھاتے ہیں کمال
ورنہ ایسی مدح ہے ممدوح کے حق میں ہجا
اس سے بڑھ کر ہجو ہو سکتی ہے کیا انسان کی
لکھیں اعمیٰ کو بصیر و راہ زن کو رہ نما
عدل میں لکھتے ہیں ہم نوشیروانِ عہد انہیں
ایک منکوحہ کا حق ہوتا نہیں جن سے ادا
حاتم وقت ان کو ٹھہراتے ہیں جن کا بذل و جود
اس لیے ہے تاکہ حاصل حاکموں کی ہو رضا
زیرکی میں ان کو کہتے ہیں ارسطوے زماں
ہم نشیں احمق بناتے ہیں جنہیں صبح و مسا
کہتے ہیں کس شد و مد سے ہم انہیں بیدار مغز
جو نہیں واقف کہ آمد کیا ہے اور ہے خرچ کیا
جو غلامانہ خوشامد کرتے ہیں حکام کی
ان کی آزادی پہ ہم کہتے ہیں سو سو مرحبا
اُن پہ ثابت کرتے ہیں ہمدردی نوع بشر
آپ کو گنتے ہیں جو نوعِ بشر سے ماورا
حامی اسلام دیتے ہیں خطاب اُن کو کہ جو
کرتے ہیں رسوا چلن سے اپنے نام اسلام کا
یاورِ خلق ان کو کہتے ہیں جنہیں اے واعظو!
تم کسی کے کام کا رکھتے نہیں اپنے سوا
مدح کی جاتی ہے یاں اکثر اسی انداز سے
شیخ ہو ممدوح یا واعظ ، غنی ہو یا گدا

قطبِ دوراں اُن ریا کاروں کو ٹھہراتے ہیں ہم
آپ کو بھی جو سکھائیں مدتوں مکر و دغا
ان فسوں سازوں کو ہم لکھتے ہیں ذوالنون ا؎
زماں
بیٹھ کر منبر پہ جو آنکھوں کا کاجل لیں اُڑا
آپ جھپٹ اس کو کہے جو مدح وہ بے مغز ہے
نام اسی کا مدح ہے تو ہجو ہے پھر چیز کیا

io

چبھتی اور دُکھتی سخن ور نے یہ کی تقریر جب
اور لگے سب مسکرانے دیکھ کر یہ ماجرا
دل میں واعظ نے پڑھی لاحول اور سمجھا کہ میں
چھیڑ کر اک بے ادب کو مفت میں رسوا ہوا
پر بہ ظاہر داغ یہ دامن سے دھونے کے لیے
ہنس کے اک سنجیدگی سے اور متانت سے کہا
ہو چکیں باتیں ہنسی کی اب کرو کچھ اور ذکر
ہزل و استہزا زیادہ حد سے ہوتا ہے برا
کہیے فکر شعر کا ہوتا ہے اب بھی اتفاق
آپ نے دیواں مرتب کیوں نہیں اب تک کیا
ہیں ہنسی کی اور باتیں کیجیے انصاف اگر
ہے غزل میں آپ کی دیوانِ حافظ کا مزا
عرض کی شاعر نے حضرت کا ہے یہ سب حسنِ ظن
ورنہ میں کیا اور مرا مجموعہ اشعار کیا

قبلہ! اب وہ دن گئے جب شاعروں کی قدر تھی
شاعری اور نکتہ پر دازی میں ہے اب کیا دھرا

شعر اگر کہیے تو روٹی جا کے کس گھر کھایئے
سیکڑوں پھرتے ہیں شاعر تنگ دست و بے نوا

اب تو یہ کہتا ہوں شعر و شاعری کو چھوڑ کر
وعظ میں شاگرد ہو جاؤں کسی اُستاد کا

اس گئے گزرے زمانے میں بھی یہ فن شریف
کیمیا ہے ، کیمیا ہے ، کیمیا ہے ، کیمیا

آپ لوگوں کی تو اس میں ریس کرنی ہے محال
پر ہمیں بھی سیکھنے سے کچھ نہ کچھ آ جائے گا

روز اک سونے کی چڑیا گر نہ ہاتھ آئی ، نہ آئے
ہم گنہگاروں کا پیٹ ایسا نہیں ہے کچھ بڑا

کی سخن پرداز نے واعظ سے جب یہ گفتگو
قہقہوں سے چار سو مجلس میں اک غل پڑ گیا

خواب کا سا وہ سماں جاتا رہا سب یک بہ یک
اور دی پہلو سے دل نے کان میں میرے صدا

ہزل ہو یا جد نصیحت لیجیے ہر بات سے
کہہ گئے ہیں اہل دل ''دع ما کدر خذ ما صفا''[1]

---

[1] جو کچھ کثیف و مکدر ہے اُسے چھوڑ دے، جو پاکیزہ ہے اُسے لے لے۔

9 پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ

(1887ء ۱؎)

پھوٹ سے ایکے نے کی یہ گفتگو
میں ہوں جہاں کا چمن آرا کہ تو؟

میرا ہے یا تیرا مبارک قدم؟
مجھ سے ہے یا تجھ سے بقائے اُمم؟

اپنی ستائش نہیں زیبا، مگر
حق نہ جتاؤں تو ہے خوف ضرر

منزل ہستی کا ہوں میں رہنموں
کچھ نہ ہو اے پھوٹ اگر میں نہ ہوں

مجھ سے ہی اجسام کو ہے التیام
مجھ سے ہی اجرام میں ہے انتظام

میری بدولت ہے کھنچا اور تنا
جال یہ سب ثابت و سیّار کا

میرا اگر ہو نہ قدم درمیاں
زیر زبر ہو ابھی نظم جہاں

دانوں کو دیتا ہوں میں خرمن بنا
قطروں سے دیتا ہوں میں دریا بہا

ڈھیلوں سے چنتا ہوں حصارِ حصیں
ریشوں کو کر دیتا ہوں حبل المتیں

میں ہوں اگر مورچوں کے درمیاں
ان کا سلیماں کو کروں میہماں

۱؎ مثنویاتِ حالی کے دونوں نسخوں میں اس نظم کا سن تصنیف 1882ء درج ہے، لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا خیال ہے کہ غالباً یہ نظم 1887ء میں لکھی گئی۔ (حالی کا ذہنی ارتقاء، صفحہ 107)۔ ڈاکٹر شجاعت علی نے بھی اپنے تحقیقی مقالے "حالی بحیثیت شاعر" (صفحہ 86) میں 1887ء درج کیا ہے۔ (ا ص)

مجھ سے ہے ہر قوم اعانت طلب
کرتے ہیں طاقت مری تسلیم سب

766

قوموں کے اقبال کی میں ہوں دلیل
میں نہیں جس قوم میں وہ ہے ذلیل

مجھ سے گھرانوں کی ہے چھاتی پہاڑ
میں نہیں جس گھر میں وہ گھر ہے اُجاڑ

ملک ہیں آباد میری ذات سے
یمن ہے اک میری کرامات سے

میں نے ہے جس قوم کو بخشا وقار
قوم وہی قوم ہے باقی کمہار

بخت عدو مال ہے اس قوم کا
بندہ خود اقبال ہے اس قوم کا

نرغے میں گھر جائے گر اک ان کا فرد
لاکھ پہ بھاری ہے بہ وقت نبرد

ڈال نہیں سکتا کوئی اس پہ ہاتھ
سوجھتی ہے قوم تمام اس کے ساتھ

میرا ہے جس ملک میں جاری عمل
واں کبھی آنے نہیں پاتا خلل

میرے تصرف میں ہے جو سر زمیں
واں کوئی بے کس کوئی تنہا نہیں

ایک ہے زخمی تو ہیں سب دل فگار
ایک ہے مظلوم تو حامی ہزار

ایک کو گر دیکھتے ہیں مضطرب
پیٹ کو پکڑے ہوئے پھرتے ہیں سب

آگ اگر گھر میں لگی ایک کے
قوم میں گھر گھر دھوئیں اُٹھنے لگے

766

کل کی مصیبت میں ہیں کل مبتلا
ایک پر آتی نہیں کوئی بلا

ضعف دباتا نہیں ان کو کبھی
رکھتے ہیں کمزور بھی واں دل قوی

غم نہیں افلاس کا مفلس کو واں
ایک کا افلاس ہے سب پر گراں

ایک کی خواری سے ہیں نادم ہزار
ایک ہے رسوا تو ہیں سب شرم سار

ایک کی عزت ہو تو نازاں ہیں سب
ایک ہو گر شاہ تو سلطاں ہیں سب

io

سنتی ہے اے خانہ بر انداز پھوٹ
سچ ہے یہ سب میرا بیاں یا کہ جھوٹ

مجھ میں نہیں عیب کچھ اس کے سوا
ساتھ مرے تیرا ہے کھٹکا لگا

ذات ہے میری مہ کامل مگر
دیتی ہے گہنا مجھے تو آن کر

ہوتی اگر تیری نہ یاں ہست و بود
میرا مبارک تھا جہاں میں وجود

چشمہ رحمت ہے جماعت ولے
کرتی ہے تو آ کے مکدر اسے

چار جو مل بیٹھتے ہیں یاں کبھی
سب نظر بد سے ہیں لرزاں تری

صلح کا رہتی ہے برا تکتی تو
دو کو بہم دیکھ نہیں سکتی تو

766

قطع و برش تیری جبلی ہے خو
گوشت جدا کرتی ہے ناخن سے تو

بھائیوں کو کرتی ہے اغیار تو
یاروں کو کر دیتی ہے بے یار تو

ڈالتی ہے ان میں نزاع و خلاف
دو کے نہیں چھوڑتی دل ان میں صاف

قوم میں جو دیکھیے چھوٹا بڑا
چنتا ہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا

مضحکہ خود اپنا بناتے ہیں وہ
اپنے پہ عالم کو ہنساتے ہیں وہ

سوجھتی ملت کی نہیں کوئی بات
یہ جو کہے دن تو وہ کہتا ہے رات

رہتا ہے ایک ایک کے در پے نہاں
جس سے جسے دیکھیے ہے بد گماں

زید کا ہے عمرو سے ظاہر ملاپ
دل میں بھرا دونوں کے لیکن ہے پاپ

ایک یہ کہتا ہے کہ میری چلے
دوسرا خواہاں کہ زک اس کو ملے

دیکھیے جس کو وہ ہے اس تاک میں
یاروں کے منصوبے ملیں خاک میں

قوم کی قوم آتی ہے بے کس نظر
جاتی ہیں جھاڑوں کی سی سینکیں بکھر

عیب ہیں جو تجھ میں وہ مجھ میں نہیں
خوبیاں جو مجھ میں ہیں تجھ میں نہیں

io

پھوٹ نے ایکے سے سنا جب یہ لاف

بولی کہ تقصیر ہو میری معاف

نام ہے بدنام مقرر مرا
ذکر برائی سے ہے گھر گھر مرا

پر کوئی انصاف سے دیکھے اگر
میں ہوں وہی جو کہ ہے تو سر بسر

عیب ہیں کچھ مجھ میں تو تجھ میں بھی ہیں
خوبیاں تجھ میں بھی ہیں مجھ میں بھی ہیں

خلق کے ہم دونوں مددگار ہیں
دوست کا تو یار ہے ، دشمن کی میں

اپنوں سے تو غیر کو کرتا ہے زیر
میں ہوں کہ دل غیروں کے رکھتی ہوں شیر

میں کروں تائید نہ تیری اگر
ہو کوئی خوبی نہ تری جلوہ گر

کام رہیں سارے ادھورے ترے
ہوں کبھی منصوبے نہ پورے ترے

میرے ہی بل چلتی ہے گاڑی تری
مجھ سے ہی سر سبز ہے باڑی تری

میں جو نہ ایراں کو دلاتی شکست
رومیوں کے حوصلے ہو جاتے پست

ڈالتی بغداد میں گر میں نہ جال
کرتی نہ عباسیوں کو پائے مال

کام نہ آتا کوئی تیرا ہنر
فتح نہ پاتی کبھی فوج تتر

ہوتی بخارا میں نہ گر میں مخل

کرتی نہ ساسانیوں کو مضمحل
غزنوی اس طرح نہ پاتے فروغ
ٹھہرتے دعوے ترے سارے دروغ

ہند میں میں گُل نہ کھلاتی اگر
رنگ نہ یاں اپنا جماتی اگر
غوریوں کو فتح دلاتا نہ تو
خلجیوں کے کام کچھ آتا نہ تو

لودیوں کے بڑھتے نہ آگے قدم
مغلوں کا یاں آ کے نہ گڑتا علم
ہند میں کرتی نہ اگر میں وطن
پھیلتے مغرب کے نہ یاں علم و فن

io

یہ تو لیا تو نے سن اے اتفاق
اب کہوں کچھ اور جو گزرے نہ شاق
تجھ سے سوا مجھ میں ہے سچ اس کو جان
جلوہ گر انصاف الٰہی کی شان

تو جو کسی قوم کا بنتا ہے یار
چاہتا ہے بگڑے نہ وہ زینہار
اس کو نہ پیش آئے کبھی روزِ بد
بات رہے اس کی بنی تا ابد

حصے میں اُس کے رہے عز و شرف
رشک سے قومیں تکیں اس کی طرف
آئے نہ اقبال کو اس کے زوال
دوست رہیں شاد ، عدو پائے مال

تیرا تو یہ خاصہ ٹھہرا مگر

عادتِ حق کی نہیں تجھ کو خبر
آج کسی کو جو چڑھاتا ہے وہ
دوسرے دن اس کو گراتا ہے وہ

جزر ہے دریا میں پس از مد ضرور
عزت و دولت کی ہے اک حد ضرور
ختم جب اقبال کا ہوتا ہے دور
سارے بگڑ جاتے ہیں قوموں کے طور

خصلتیں اُن کی نہیں رہتیں درست
فرض ادا کرنے میں رہتے ہیں سست
بھول کے بھی وہ نہیں لاتے بجا
بندوں کے حق اور حقوقِ خدا

ملتی ہے ہر چند کہ مہلت انہیں
پر کبھی ہوتی نہیں جرأت اُنہیں
جب نہیں غفلت کا اُترتا خمار
ہوش میں آتے نہیں وہ زینہار

کرتے سزا سے نہیں پھر درگزر
کار گزارانِ قضا و قدر
لیتے ہیں چھین اُن سے حکومت کبھی
کرتے ہیں سلب اُن کی لیاقت کبھی

علم کبھی دیتے ہیں ان کا مٹا
دیتے ہیں دولت کبھی ان کی لٹا
اس پہ بھی ہوتے نہیں جب ہوشیار
بھیجتے ہیں قحط و وبا بار بار
کوڑے یہ کھا کھا کے گئے گر سنبھل

سر سے بلا قوم کے جاتی ہے ٹل
ورنہ مجھے کرتے ہیں مامور واں
تاکہ کروں قدرتِ باری عیاں
الحذر اس وقت سے اے اتفاق
آن کے جب کہتی ہوں میں الفراق
آ گئے اُس قوم کے بس دن برے
حق نے کیا جس پہ مسلط مجھے
کوہ کو کرتی ہوں پر کاہ میں
شیروں کو کر دیتی ہوں روبارہ میں
قدر و بہا قوم کی لیتی ہوں چھین
کوڑی کے کر دیتی ہوں میں تین تین
کرتے نہیں غیر اُنہیں آ کے پست
پاتے ہیں وہ اپنے ہی ہاتھوں شکست
دیتے ہیں دھیان ان کا بد اندیش چھوڑ
آپ ہی مر جاتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ
آگ پہ گویا کہ ہوں بارود میں
قوموں کو کر دیتی ہوں نابود میں
ہو گیا جس ملک میں یاں میرا راج
قحط و وبا کی نہیں واں احتیاج
قحط و وبا کرتے ہیں جانیں تلف
کھوتی ہوں میں قوم کا عزو شرف
دیتے ہیں وہ قوم کی گنتی گھٹا
کرتی ہوں میں قوم کو بالکل فنا
حکم یہی ہے مجھے اے اتفاق

ڈالتی ہوں اس لیے ان میں نفاق

ہے مری تحقیر خلافِ ادب
میں ہوں فرستادہ درگاہِ رب

io

سلسلہ تقریر کا جب بڑھ گیا
پھوٹ کو یہ غیب سے آئی صدا

ڈال دیے تو نے دلوں میں شگاف
کب تلک اے پھوٹ یہ لاف و گزاف

حد سے سوا بڑھ گئی تو ، شرم شرم!
جھوٹ میں اور اتنا غلو ، شرم شرم!

چیز حقیقت میں کوئی تو نہیں
تجھ میں حقیقت کی کہیں بو نہیں

چیز وہی چیز حقیقت میں ہے
تعبیہ جو خلق کی فطرت میں ہے

فطرت انساں کے ہے جو کچھ خلاف
ہیچ ہے وہ اس میں نہیں اختلاف

طبع بشر میں ہے ودیعت وفاق
واں نہیں مطبوع بجز اتفاق

روم ہوں یا ترک ، عجم یا عرب
مہر و محبت پہ ہیں مجبول سب

ایک کو ہے ایک کی جانب جھکاؤ
ایک سے ہے ایک کے دل کو لگاؤ

ہوتی کچھ اے پھوٹ اگر تیری اصل
متحد انسان کی ہوتی نہ نسل

تو وہ ہے سر چشمہ نہیں جس میں آب
تیری نمائش ہے برنگ سراب

ایسے بہت کرتی ہیں جلوے عیاں
آدم خاکی کی غلط فہمیاں

جیسے کہ بے اصل خبر گاہ گاہ
ملک کرا دیتی ہے دم میں تباہ

تجھ سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر بگاڑ
رائی کے ہو جاتے ہیں بن کر پہاڑ

ہے یہ نمائش تری اے خود نما
شعبدہ اک وہم غلط کار کا

سیکڑوں گھر جہل نے گھالے ہیں یاں
پردے بہت عقلوں پہ ڈالے ہیں یاں

جہل کا چھایا ہے اندھیرا جہاں
ملک کو ظلمت نے ہے گھیرا جہاں

ٹھیک نہیں سوجھتی واں کئی چیز
نفع و ضرر میں نہیں ہوتی تمیز

قوم کی تعریف نہیں جانتے
اپنی حقیقت نہیں پہچانتے

کر نہیں سکتے وہ حقایق میں غور
کہتے ہیں جڑ اور ہے ٹہنی ہے اور

جانتے دریا کو ہیں اک شے جدا
قطروں سے کہتے ہیں کہ وہ ہے جدا

پر یہ عزیزوں کو نہیں سوجھتا
ہے انھی قطروں سے وہ دریا بنا

بس یہی انساں کی غلط کاریاں
دیتی ہیں پہنچا اسے اکثر زیاں

ہوتا ہے بیٹھا ہوا جس شاخ پر
تولنے لگتا ہے اُسی پر تبر

چلنے کو جس راہ میں ہوتا ہے وہ
کانٹے اُسی راہ میں بوتا ہے وہ

پینے کا جو اس کے ہے جاں بخش جام
زہر ملاتا ہے اُسی میں وہ خام

حق کبھی ہونے نہیں دیتیں عیاں
جہل کی چھائی ہوئی تاریکیاں

ہوتی ہے پر ختم شب تار جب
پھیلتے ہیں علم کے انوار جب

شے نہیں رہتی کوئی پیش نظر
نورِ حقائق کے سوا جلوہ گر

سچ نظر آتا ہے سچ اور جھوٹ جھوٹ
تفرقہ رہتا ہے نہ رہتی ہے پھوٹ

وہم دوئی دل میں سماتا نہیں
اپنے سوا کچھ نظر آتا نہیں

بھائیوں پر پہلے کیے تھے جو وار
اپنا بدن پاتے ہیں اس سے فگار

ان پہ چلائے تھے جو تیر و سناں
اپنے بدن پر ہیں اب اُن کے نشاں

اُن کے سمجھ کر جو بگاڑے تھے کام
کام نکلتے ہیں وہ اپنے تمام

علم ہو جس قوم کا یاں راہبر
برکتیں اللہ کی اس قوم پر

جانتے ہیں وہ برکات وفاق
اُن پہ ہیں روشن خطرات نفاق

فرق نہیں اُن کے زن و مرد میں
قوم کی طاقت ہے ہر اک فرد میں

رتبہ یہ ایکے نے ہے ان کو دیا
لاکھوں کروڑوں پہ ہیں فرماں روا

زور سے ہیں ان کے زبردست زیر
لومڑیاں سامنے اُن کے ہیں شیر

io

اے کہ تری ذات ہے عالم پناہ
اسود و احمر کا ہے تو بادشاہ

جوڑنا ٹوٹوں کا ترے بات ہے
تیری صفت جامع اشتات ہے

منتج ادبار ہے جب تک نفاق
مثمر اقبال ہے جب تک وفاق

تلخ ہے جب تک ثمر اختلاف
ہے تر و تازہ شجر ائتلاف

بھیجیو نکبت نہ کسی قوم پر
رکھیو ہر اک قوم کو شیر و شکر

ٹوٹے نہ آفاق میں سنگت کوئی
ہو نہ پراگندہ جماعت کوئی

بندے سے ہو بندہ نہ کوئی جدا
بکھرے نہ شیرازہ کسی قوم کا

پھوٹ کسی قوم میں پڑ جائے جب
ایک سے ایک اُن میں بچھڑ جائے تب

ورنہ اگر ہو نہ ملاپ اُن کو راس
اور نہ ہو سر جوڑنے کی اُن کے آس

وہ جیے تو کیا جیے بے آبرو
جلد اُٹھا لے اُنہیں دنیا سے تو

پھوٹ ہو جس قوم میں وہ قوم کیا
حق میں ہے اُس قوم کے بہتر فنا

O دولت اور وقت کا مناظرہ

(1887ء)

ایک دن وقت نے دولت سے کہا
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا؟

تو ہے سرمایہ عزت ، یا میں؟
تو ہے انسان کی دولت ، یا میں؟

ہے زمانے میں بڑی بات تری
دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری

وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا
تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا

ہے عجب جس کو خدائی مانے
اُس کی تو خوبیوں میں شک جانے

سبز ہے گلشن دنیا مجھ سے
لیتے ہیں توشہ عقبیٰ مجھ سے

نام اقبال ہے آنے کا مرے
لقب ادبار ہے جانے کا مرے

مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشوونما
علم بھی ایک طفیلی ہے مرا

لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال
لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر
میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدر بشر

چند روز آ گئی میں جس کے کام
زندہ تا حشر رہا اُس کا نام

جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا
وہ سدا خوار و نگوں سار رہا

منہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں
اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں

چاہتے ہیں مجھے سب خورد و کلاں
پھرتے ہیں دھن میں مری پیر و جواں

گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو
کسی آغاز کا انجام نہ ہو

کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا
درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

ہیں رکھائی سے مری سب لرزاں
میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں

جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں
ہو اگر شیر تو روباہ کروں

الغرض ہے وہ مری شان عظیم
کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
میری عظمت نہیں باور تجھ کو

تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا
جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

وقت نے سن کے کہا اے دولت
شک نہیں اس میں ذرا اے دولت

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے ، مگر
اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر

تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجیے فرض تجھے گر چشمہ
تو ہوں اس چشمے کا میں سر چشمہ

میں ہوں یا تو ہے اساسِ امکاں
پہلے دریا ہے کہ مچھلی ، ناداں

تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے قرابہ ترا گر عطر آگیں
میں ہوں اُس عطر کی واللہ زمیں

ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
تو ہے گر مال تو میں راس المال

جن کے قبضے میں ہوں میں اے دولت
تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دست قدرت

لاکھ بار اُن سے اگر بھاگے تو
بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

اُن کی مٹھی میں ہے تو اے دولت
طائر رشتہ بہ پا کی صورت

نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود
جس کا نایاب ہے عالم میں وجود

کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر

ایک پل میری اگر دیجیے گنوا
لیجیے ہاتھ اس سے ہمیشہ کو اُٹھا

تو اگر اپنی لٹا دے ثروت
پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت

ہیں اسی واسطے جو اہل تمیز
میری ایک ایک پل اُن کو ہے عزیز

میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس
ہے مرا جاگتے سوتے انہیں پاس

جانتے ہیں حکما و عرفا
مجھ کو سرمایہ دین و دنیا

دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں
اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں

نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام
نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام
نہ انہیں دین کی دولت ہاتھ آئے
اور نہ دنیا کبھی اُن سے پتیائے
نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوٰۃ
نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکوٰۃ
نہ مدد اُن سے کچھ اپنی کی جائے
نہ خبر اُن سے کسی کی لی جائے
گن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت
ہے مگر تنگ مجالِ فرصت
بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو
بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو
اس میں ہے میرا سراسر نقصان
کہ ہے انمول مری اک اک آن

حقوقِ اولاد!

(1888ء)

(لاڈلا بیٹا)

لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا
جان ماں کی اور ایماں باپ کا
دیکھ اُسے ہوتے تھے دونوں باغ باغ
تھا وہی لے دے کے اُس گھر کا چراغ

بال بیکا اس کا ہوتا تھا اگر
دل کو رہ جاتے تھے دونوں تھام کر
ہر طرح اُس کی رضا مقصود تھی
جان تک اُس کے لیے موجود تھی
وقف تھی سب اُس پہ دولت اور مال
پر نہ تھا تعلیم کا اُس کی خیال
روک ٹوک اُس کی کسی نے کی نہ تھی
باپ نے جھڑکی تک اس کو دی نہ تھی
گھور سے واقف نہ تھا اُستاد کی
شکل دیکھی ہی نہ تھی جلاد کی
راہ سے مکتب کی کتراتا تھا وہ
نام سے پڑھنے کے گھبراتا تھا وہ
لکھنے پڑھنے کی نہ تھی ترغیب کچھ
گوشمالی تھی نہ تھی تادیب کچھ
تربیت کے بدلے لاڈ اور پیار تھا
لہو و بازی میں سدا سرشار تھا
کھیل میں کرتا تھا برباد آپ کو
اور کچھ پروا نہ تھی ماں باپ کو
جانتے تھے گھر میں ہے دولت بہت
لکھنے پڑھنے کی نہیں حاجت بہت
نوکری کرنی نہیں اس کو تلاش
ہے اسی کے واسطے ساری معاش
گو رہے بے علم اور نادان یہ
پر کسی صورت چڑھے پروان یہ
پیروی کی اک خیالِ خام کی
فکر دونوں نے نہ کی انجام کی

(اولاد کی باقاعدہ تربیت نہ کرنے کا انجام)

جب ہوا وہ ناز پروردہ جواں
رنگ لائیں اُن کی بے پروائیاں

آ پڑا اُس کا وہی آخر کو رنگ
لاڈلے بیٹوں کا جو ہوتا ہے ڈھنگ

سامنا ماں باپ کا کرنے لگا
ہم سری کا اُن کی دم بھرنے لگا

حق تو اُن کے اُس سے کیا ہوتے ادا
اور ناراض اُن کو وہ رکھنے لگا

تھیں ادائیں اس کی اکثر ناپسند
کارگر اُس کو ملامت تھی نہ پند

جہل و نادانی کی تھیں طغیانیاں
رات دن کرتا تھا نا فرمانیاں

اس کو صحبت تھی تو تھی اغیار سے
اُس کی ملت تھی تو تھی انفار سے

شہر میں آوارہ کہلاتا تھا وہ
چوک میں پاتا تھا جب پاتا تھا وہ

پند سے ناصح کی نفرت تھی اُسے
سائے سے اچھوں کے وحشت تھی اُسے

گھر میں آ اک اک سے لڑ جاتا تھا وہ
باتوں باتوں میں بگڑ جاتا تھا وہ

نفس پر اپنے نہ کر سکتا تھا جبر
نام کو اس میں تحمل تھا نہ صبر

دل پہ قابو زینہار اس کو نہ تھا
اور زباں پر اختیار اس کو نہ تھا

جو وہ کرتا تھا اُسے بھرتے تھے سب
اس سے چھوٹے اور بڑے ڈرتے تھے سب

اصل میں کچھ بد نہ تھی اس کی سرشت
کر دیے تھے جہل نے اطوار زشت

گو نہ مطلق آدمیت اس میں تھی
پر جھلکتی قابلیت اُس میں تھی

بد چلن تھا پر نہ تھی طینت بُری
فطرت اچھی تھی ، مگر عادت بُری

چڑھ رہا تھا اس پہ بد صحبت کا رنگ
لگ رہا تھا روشن آئینے کو زنگ

ذات میں اس کی شرارت تھی نہ شر
ہو گیا تھا بد ، بدوں میں بیٹھ کر

(باپ کی نصیحت)

جب گئی حالت بگڑ حد سے سوا
آ گیا دم ناک میں ماں باپ کا

باپ نے اک روز گھر میں بیٹھ کر
یوں کہا بیٹے سے اے جانِ پدر!

یاد ہیں وہ دن بھی تم کو یا نہیں
جب کہ یہ رعنائیاں تم میں نہ تھیں
جب خبر اپنی نہ تھی کچھ آپ کو
جانتے تھے تم نہ ماں اور باپ کو
پاسباں تھے آپ کے ماں باپ جب
گوشت کا اک لوتھڑا تھے آپ جب
ہل نہ تم سکتے تھے بے امداد غیر
تھے نہ یہ اُڑنے کے پر، چلنے کے پیر
ہاتھ اور بازو، یہ سب بے کار تھے
سخت بے بس تھے اور تم لاچار تھے
آنکھ سے چیپڑ چھڑا سکتے نہ تھے
منہ سے مکھی تک اُڑا سکتے نہ تھے
آگ پانی میں نہ تھی تم کو تمیز
تھا تمھیں زہر اور امرت ایک چیز
رات دن یکساں سراسر تھا تمھیں
دھوپ اور سایہ برابر تھا تمھیں
بھوک میں بے چین ہو جاتے تھے، پر
اپنی بے چینی سے تھے تم بے خبر
پیاس لگتی تھی تو روتے تھے سدا
مانگنا پانی مگر آتا نہ تھا
کھا لیا جو کچھ دیا تم کو کھلا
پی لیا جو کچھ دیا تم کو پلا
تلخ و شیریں میں نہ تھا کچھ امتیاز
اس سے رغبت تھی نہ اُس سے احتراز

یہ زباں زوری کہیں اصلا نہ تھی
تھی زباں منہ میں مگر گویا نہ تھی

سب کو رو رو کر جگاتے تھے ، مگر
اپنے رونے کی نہ تھی تم کو خبر

تھی نہ اپنے نفع و نقصاں کی سمجھ
درد کی سدھ تھی نہ درماں کی سمجھ

دیتے تھے بہر شفا دارو اگر
سر پہ رو رو تم اُٹھا لیتے تھے گھر

گرمی اور سردی میں جب کپڑے تمھیں
ہم پہناتے تھے تو کرتے تھے ضدیں

کیچڑ اور گارے سے نفرت کچھ نہ تھی
اور نجاست سے کراہت کچھ نہ تھی

واں اگر ہوتا نہ دم ماں باپ کا
کون رکھوالا تھا اُس دم آپ کا

دل کا کہہ سکتے نہ تھے تم مدعا
بھوک کا رونا ہے یا ہے پیاس کا

بھوکے یا پیاسے اگر ہوتے تھے تم
کچھ نہ کہتے تھے مگر روتے تھے تم

ہم سمجھ لیتے تھے لیکن مدعا
بھوک کا رونا ہے یا ہے پیاس کا

پیاس میں مضطر جو پاتے تھے تمھیں
بن کہے پانی پلاتے تھے تمھیں

بھوک میں گر دیکھتے تھے بے قرار
دودھ تھے تم کو پلاتے بار بار

روپ تھے معلوم سارے آپ کے
سب سمجھتے تھے اشارے آپ کے

تم کو کچھ تکلیف ہوتی تھی اگر
خود بخود تھی دل کو ہو جاتی خبر

چین ہو جاتا تھا سارا برطرف
پھرتے تھے بے تاب دوڑے ہر طرف

حالتیں سب تھے تمہاری جانتے
آپ کے تیور تھے ہم پہچانتے

ہوتے تھے بیمار ، دور از حال ، جب
رات دن سہتی تھی ماں رنج و تعب

بارہا آنکھوں میں کٹ جاتی تھی رات
اک بلا آتی تھی جب آتی تھی رات

ڈرتے تھے تم غیر عورت سے سدا
ماں کی گودی سے نہ ہوتے تھے جدا

اوپری صورت سے تھے تم بھاگتے
دودھ ہرگز غیر کا پیتے نہ تھے

پر کبھی تم سے دریغ اس کو نہ تھی
گو تمہارے کام آتی جان بھی

آج بیماری سے فرصت تھی نہ کل
آج چیچک ، کل تھا پسلی کا خلل

کرتے تھے سیانوں کی جا جا منتیں
مانتے تھے نت ہزاروں منتیں

ناز اٹھاتے تھے طبیبوں کے سدا
ڈھونڈتے پھرتے تھے شربت اور دوا

عامل اور سیانوں نے جو مانگا دیا
منہ نہ پیسے کا کبھی ہم نے کیا

سخت بیماری کو جب پاتے تھے ہم
فکر کے مارے گھلے جاتے تھے ہم

رات اور دن ماں الگ تھی بے قرار
باپ پھرتا تھا الگ زار و نزار

اللہ آمیں کر کے ہم لیتے تھے نام
کرتے تھے دم تم پہ سورے صبح و شام

آنکھ پر آتا تھا گر میل آپ کے
دم پہ بن جاتی تھی ماں اور باپ کے

چاہتے تھے تم کو خوش آٹھوں پہر
تم بسورے اور بنی یاں جان پر

آپ کی خاطر اُٹھائے دکھ پہ دکھ
دس برس تک ایک دن پایا نہ سکھ

ہم پہ گزریں کیسی کیسی سختیاں
گزریں دشمن پر نہ ایسی سختیاں

آئے گی خدمت ہماری یاد جب
ہو گے تم خود صاحب اولاد جب

کی چھٹی ہم نے تمہاری جس طرح
کی ہو شاید ہی کسی نے اس طرح

مونڈن اور ختنہ کیا کس دھوم سے
شہر کو کھانا دیا کس دھوم سے

ہو چکی جب رسم بسم اللہ کی
رائے تھی اس وقت ایک اک کی یہی

تم کو مکتب میں بٹھانا چاہیے
پڑھنے لکھنے پر لگانا چاہیے

پر نہ مانا دل نے اپنے زینہار
ڈالتے اس عمر میں تم پر یہ بار

ایک دو بار امتحاں کے طور پر
تم کو مکتب میں جو دیکھا بھیج کر

سارا دن بے کل تمھاری ماں رہی
اور پڑی تم میں ہماری جاں رہی

پھر تمہارا ہم نے جب دیکھا یہ حال
تم کو ہے جانے سے مکتب کے ملال

جاتے ہو جب بے مزا ہوتے ہو تم
گھڑیوں ضد کرتے ہو اور روتے ہو تم

جلد مکتب سے اُٹھا ہم نے لیا
آپ کے دل پر نہ میل آنے دیا

دل میں سمجھا ہو نہ جب بچے کو شوق
لطف اُسے پڑھنے میں آئے اور نہ ذوق

بھیجنا مکتب میں ہے اس کو ستم
باز آئے ایسے پڑھوانے سے ہم

اپنی رُت پر آپ بڑھ چڑھ لو گے تم
وقت جب آئے گا خود پڑھ لو گے تم

دوستوں نے ہم کو سمجھایا بہت
اپنے بیگانوں نے ہلسایا بہت

کھیل کی جب لگ گئی بچے کو چاٹ
ہو گیا جی پڑھنے لکھنے سے اُچاٹ

کارگر ہو اس کو پند اور قید کیا
اس کے پڑھنے کی ہے پھر اُمید کیا

یوں سنورنے کا نہیں زنہار یہ
حق میں ہے زہر اس کے لاڈ اور پیار یہ

پیار سے سمجھے تو یوں سمجھاؤ تم
ورنہ اُٹھتے بیٹھتے دھمکاؤ تم

وقت یہ اغماض کرنے کا نہیں
اب کا بگڑا پھر سنورنے کا نہیں

کہتے تھے اپنے پرائے سب یہی
آتی تھی آواز روز و شب یہی

تم کو لیکن ہم نے جھڑکی تک نہ دی
جبر کرنے کو کبھی چاہا نہ جی

سن تمہارا جب زیادہ کچھ ہوا
پھر پڑھانے کا ارادہ کچھ ہوا

اک معلم رکھا اور اک خوش نویس
یاد ہو گی تم کو ان دونوں کی فیس

ایک کو پانچ ایک کو ملتے تھے دس
یہ رہے نوکر برابر دو برس

اپنے اپنے فن میں تھے ہشیار یہ
پر رہے دونوں سدا بے کار یہ

گرچہ تھی تاکید دونوں کی شدید
پر نہ دی تم نے کبھی ان کو رسید

تم کو کب فرصت تھی کود اور پھاند سے
بھاگتے تھے تم نوشت اور خواند سے

مفت کی تنخواہ وہ پاتے رہے
نام کو ہر روز یاں آتے رہے
تم نے آخر جب نہ کچھ پڑھ کر دیا
دے کے کچھ ، دونوں کو رخصت کر دیا
ہم نے یہ سمجھا کہ کوشش ہے فضول
ساری تدبیریں ہیں اپنی بے اصول
لکھنا اور پڑھنا ہے سب تقدیر کا
تنگ ہے یاں قافیہ تدبیر کا
جب ہوئے فضل الٰہی سے جواں
سر پہ شادی کا چڑھا بارِ گراں
منگنیاں ہوتی ہیں اکثر قوم میں
بیاہ ہوتے ہیں برابر قوم میں
کچھ بہت درکار زیور ہے نہ نقد
ہوتے اک شربت کے پیالے پر ہیں عقد
گر کفایت سوچتے کچھ خرچ میں
بیاہ دیتے بس یونہی ہم بھی تمہیں
اپنے دل میں پر یہی ہم نے کہا
ایک بیٹا اور وہ بھی لاڈلا
گو تمام املاک بک جائے مگر
خرچ کیجیے بیاہ میں دل کھول کر
کی اگر یاں بھی کفایت پر نگاہ
اور ہم کو کون سے کرنے ہیں بیاہ
وقت یہ آتے نہیں پھر بار بار
کل خزاں ہے آج اگر یاں ہے بہار

ہے فراغت اور عسرت ساتھ ساتھ
کر لیں کچھ ہم بھی کہ اب چلتا ہے ہاتھ

ٹھان کر یہ جی میں دی شادی رچا
اپنے سے جو ہو سکا سب کچھ کیا

گر نہ یاد اپنا رہا تم کو بیاہ
شہر کے چھوٹے بڑے ہیں سب گواہ

رات دن جلسہ تھا ناچ اور رنگ کا
غلغلہ تھا ڈھولک اور مردنگ کا

دیکھنے آتی تھی خلقت جھوم جھوم
دور تک اس بیاہ کی پہنچی تھی دھوم

دور سب کے دل سے رنج و غم رہا
بیس دن تک یاں یہی عالم رہا

جانتے ہیں قوم کے برنا و پیر
آج تک دیتے ہیں سب اس کی نظیر

کی نہ دینے میں کفایت پر نظر
جس کو دینا تھا دیا دل کھول کر

اگلی اور پچھلی ، پرانی اور نئی
شہر کی املاک ساری بک گئی

قرضہ تھا نقدی کا باقی جس قدر
گو ہوئی اس سے سبک دوشی مگر

رہن تھے جو گاؤں شادی میں کیے
آج تک بے چین ہوں اُن کے لیے

ہے بہت اُن کے چھٹانے کا خیال
پر بظاہر اُن کا چھٹنا ہے محال

اب بہت نازک ہے حالت باپ کی
پہنچی یہ نوبت بدولت آپ کی

مال اور جاں سے زیادہ کوئی چیز
آدمی کو یاں نہیں ہوتی عزیز

جان سے بھی ہم رہے خدمت گزار
مال بھی ہم نے کیا تم پر نثار

تم نے جو چاہا کھلایا وہ تمھیں
تم نے جو مانگا پہنایا وہ تمھیں

گھوڑے چڑھنے کے لیے تم کو دیے
رکھے خدمت گار خدمت کے لیے

شوق جو اچھا برا تم نے کیا
ہم نے بھی تائید کی اس کی سدا

خوب تم نے قدر کی ماں باپ کی
خوب خدمت کی ہماری داد دی

تھا نتیجہ جاں فشانی کا یہی؟
تھا صلہ سوزِ نہانی کا یہی؟

باپ کا تم کو ادب اصلا نہیں
ماں کی خدمت کی تمھیں پروا نہیں

گھر میں دو دو دن نہیں آتے ہو تم
آتے ہو اک اک سے لڑ جاتے ہو تم

لوگ شاکی ہیں تمھارے جا بجا
خود برا کہہ کہہ کے سنتے ہو برا

ہیں تمھارے سارے اوباشوں کے ڈھنگ
تم سے خوردوں اور بزرگوں کو ہے ننگ

ملنے والے ہیں تمہارے بادہ خوار
اور جواری ہیں تمہارے دوست دار

مرغ ہم نے بھی لڑائے ہیں بہت
اور کبوتر بھی اُڑائے ہیں بہت

پر ہمارا حال تم جیسا نہ تھا
خبط تھا ہم کو بھی پر ایسا نہ تھا

اپنے سب کاموں کو جب بھگتا لیا
دو گھڑی اس میں بھی دل بہلا لیا

تم تو دنیا اور دیں سب چھوڑ کر
ہو انہی دھندوں میں غرق آٹھوں پہر

ہے غرض ایسی ہی جو ہے تم کو دھت
فکر دنیا ہے نہ فکر آخرت

ہم پہ سب ہنستے ہیں اشراف اور رذیل
کر دیا تم نے بھی ہم کو اب ذلیل

کر چکا تھا قرض پہلے ہی زبوں
اور تم نے کر دیا عزت کا خوں

منہ نہیں ہوتا کسی کے رو بہ رو
خاک میں تم نے ملا دی آبرو

بہتر اپنا یاں سے اُٹھ جانا ہے اب
رہ گیا پھر کیا ، گئی عزت ہی جب

باپ کا تم جانتے ہو اپنے حال
قرض میں جکڑا ہوا ہے بال بال

ہاتھ میں زر ہے نہ بازو میں ہے زور
مار کر فکروں نے کر ڈالا ہے بھور

کام کی باقی نہیں اپنے میں تاب
مدتوں سے دے چکی ہمت جواب

گور میں لٹکائے بیٹھے پاؤں ہیں
جا کے اب بن میں بساتے گاؤں ہیں

آپ میں ہوتا اگر کچھ حوصلا
آدمیت کا تھا اب یہ مقتضا

سر پہ لیتے اپنے گھر کا بوجھ تک
باپ کو فکروں سے کر دیتے سبک

ہم رہے جیسے فدا تم پر مدام
تم بڑھاپے میں ہمارے آتے کام

ہم رہے اب تک تمہارے سربراہ
اب ہمارے بنتے تم پشت و پناہ

ہم بھی یاں سکھ پاتے کچھ اولاد کا
نام چلتا دیکھتے اجداد کا

پر خدا کو تھا یہی منظور آہ
ہوتے وارث کے ہو گھر اپنا تباہ

جب کریں دنیا سے آہنگ سفر
ہم بھرا گھر جائیں ویراں چھوڑ کر

خیر اب ہم کو تو یاں رہنا ہے کم
کوئی دن کے اور ہیں مہماں ہم

پر تمھیں ہے کاٹنی اک عمر یاں
ہو ابھی فضلِ الٰہی سے جواں

اب بھی اپنی حرکتوں سے باز آؤ
ڈھیل پر بازیِ دوراں کی نہ جاؤ

بس گئیں حد سے گزر رسوائیاں
کب تلک آخر یہ بے پروائیاں

ناز و نعمت کا زمانہ ہو چکا
خوابِ غفلت کا زمانہ ہو چکا

گردشِ گردوں ہے ہر دم گھات میں
شاطرِ دوراں ہے فکرِ مات میں

ہاتھ سے جا کر نہیں آتا ہے وقت
دیکھو بھائی ہاتھ سے جاتا ہے وقت

گر رہے اب بھی یوں ہی تم نا درست
خود زمانہ تم کو کر دے گا درست

گردشیں دیں گی نکال ایک ایک بل
ٹھوکریں کھا کھا کے جاؤ گے سنبھل

پھر سنبھلنا واں یہ کس کام آئے گا
جب سنبھلنے سے نہ سنبھلا جائے گا

ہو گی اُڑنے کی ہوس تم کو مگر
ہوں گے اُڑنے کے نہ اس دم بال و پر

عقل ہو گی پر نہ ہو گا اقتدار
عزم ہو گا پر نہ ہو گا اختیار

جب کہ گیتی رنگ یہ دکھلائے گی
تب ملامت باپ کی یاد آئے گی

(بیٹے کا جواب)

باپ یہ سب کر چکا تقریر جب
سر جھکا کر از رہِ شرم و ادب

عرض کی بیٹے نے ارشاد آپ کا
قبلہ عالم ! سراسر ہے بجا

باپ کی اور والدہ کی شفقتیں
آخری دم تک نہ بھولیں گی ہمیں

حق ہیں سب سینے میں مضمر آپ کے
نقش ہیں احسان دل پر آپ کے

میری جو دل جوئیاں کیں آپ نے
وہ نہ کی ہوں گی کسی ماں باپ نے

اچھے سے اچھا کھلایا آپ نے
اچھے سے اچھا پہنایا آپ نے

جان و دل ہم پر فدا کرتے رہے
ناز برداری سدا کرتے رہے

ہے بڑے افسوس کا لیکن مقام
شفقتیں کچھ آپ کی آئیں نہ کام

وہ محبت اور نوازش آپ کی
حق میں اپنے زہر قاتل ہو گئی

خدمت عالی میں ، گستاخی معاف
عرض کر سکتا نہیں میں صاف صاف

پر جہاں ہو بات کہنے کا محل
واں نہیں خاموش رہنے کا محل

گو کہ ہوں میں سربسر تقصیر وار
مجھ سے ہے نوعِ بشر کو ننگ و عار

دھوم ہے میری بدی کی جا بجا
عیب ہے مجھ سے بزرگوں کو لگا

کو بکو آوارہ صبح و شام ہوں
شہر میں رسوا ہوں اور بدنام ہوں

بے ہنر مجھ سے نہیں ہوتے کہیں
پر مری تقصیر کچھ اس میں نہیں

اُٹھے ہم جیسے اُٹھایا آپ نے
بن گئے جیسے بنایا آپ نے

کہتے ہیں 'اخبارؔ' میں آیا ہے یہ
مخبرِ صادق نے فرمایا ہے یہ

اصل فطرت میں ہیں سب بچے رشید
غیب سے آتے ہیں سب بن کر سعید

پھر اسی رستے پہ پڑ جاتے ہیں وہ
رُخ جدھر ماں باپ کا پاتے ہیں وہ

آئے تھے ہم جستجو میں راہ کی
تھی فقط درکار ہم کو رہبری

آپ نے جو راہ دی ہم کو بتا
ہم نے لی وہ راہ بے چون و چرا

آپ کے انعام اور احسان سب
یوں اگر کہیے تو لوں میں مان سب

پر اگر انصاف کچھ فرمائیں آپ
اس طرح مجھ کو نہ پھر شرمائیں آپ

ذکر بچپن کا جو فرماتے ہیں آپ
اپنے احسانوں سے شرماتے ہیں آپ

ہاں مقرر مامتا ماں باپ کی
حق میں بچوں کے ہے اک نعمت بڑی

گر نہ ہو ماں باپ کو اُن کا خیال
پرورش پانا ہو بچوں کا محال

پر نہیں دخل اس میں کچھ انسان کا
اس میں ہے ماں باپ کا احسان کیا

جان دے پانی اگر کھیتی میں ڈال
یا وہ کر دے خشک پودوں کو نہال

اس میں پانی کا نہیں کچھ اختیار
ہے یہ خاصیت عطائے کردگار

کچھ نہیں تخصیص یاں انسان کی
ہے یہی خصلت ہر اک حیوان کی

جانور بھی جو نہیں رکھتے تمیز
سب کو بچے اپنے ہوتے ہیں عزیز

بھوک میں لیتے ہیں سب اُن کی خبر
پیاس میں کرتے ہیں سب حلق ان کا تر

زد میں جب دشمن کی پاتے ہیں انہیں
زد سے دشمن کی بچاتے ہیں انہیں

آنکھ سے اوجھل وہ ہو جاتے ہیں جب
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہر سو مضطرب

ہے غرض اُلفت وہی حیوان کو
لاگ جو بچوں سے ہے انسان کو
دی ہے آگ اک دل میں قدرت نے لگا
جس سے دل بس میں نہیں ماں باپ کا
جب کہ قابو میں نہیں رہتا ہے دل
مانتے ہیں دل کی جو کہتا ہے دل
فکر میں گھلنا سدا اولاد کے
جھیلنے دکھ برملا اولاد کے
کچھ خوشی ماں باپ کے دل کی نہیں
پر کریں کیا، مانتا دل ہی نہیں
وہ تو کرتے لاکھ بار اُن سے گریز
کیا کریں ، ہے آتما کی آنچ تیز
اُس خدا نے ، ذات ہے جس کی حکیم
جس کی حکمت اور حکومت ہے قدیم
ہوش خوردوں کو نہیں جب تک دیا
ان کا ضامن ہے بزرگوں کو کیا
تاکہ بے ہوشی میں لیں اُن کی خبر
چوکسی اُن کی کریں آٹھوں پہر
ہوں اگر بھوکے تو کچھ اُن کو کھلائیں
ہوں اگر پیاسے تو کچھ اُن کو پلائیں
جاگتے سوتے ہوں اُن کے پاسباں
بیٹھتے اُٹھتے ہوں اُن پر جاں فشاں
ان کو بے کل دیکھ کر ہوں بے قرار
اُن کی بیماری میں ہوں تیمار دار

بے بسی کے دن نکلواتا ہے یوں
اپنے مدہوشوں کو پلواتا ہے یوں

ہر بشر کو دی ہے مہر اولاد کی
اس طرح دنیا ہے یہ آباد کی

گر نہ ہو یہ مامتا انسان میں
خانماں ویراں ہو سب اک آن میں

اس سے بچ سکتا کوئی انساں نہیں
اس میں کچھ اولاد پر احساں نہیں

جب کہ دُکھتا ہے کوئی عضو بدن
سارے ہو جاتے ہیں بے کل مرد و زن

کرتے ہیں تدبیر ، ہو سکتی ہے جو
درد کی تکلیف کھو سکتی ہے جو

درد کی جب تک کسک جاتی نہیں
کچھ کیے بن ان کو بن آتی نہیں

ہے یہی بالکل مثال اولاد کی
کیوں کہ ہے جزوِ بدن اولاد بھی

کل سے ان کی کل سدا پاتے ہیں دل
دکھ سے اُن کے سب کے دکھ جاتے ہیں دل

پیاس میں بچوں کو روتا دیکھ کر
کیا کریں پانی نہ دیں ان کو اگر

بھوک میں جب روئیں بچے زار زار
چھوڑ دیں کس طرح ان کو بے قرار

ان پہ گر سختی گزرتی ہے ذرا
ان سے یاں دو چند ہوتی ہے سوا

ان کا خوش جس بات سے ہوتا ہے جی
حصر ہے اس بات پر اُن کی خوشی

اُن کی کلفت ہے بلا ان کے لیے
اُن کی فرحت ہے غذا ان کے لیے

طبع انساں کا ہے یہ جب اقتضا
کیا کرے گر ہو نہ بچوں پر فدا

اپنی راحت خوش نہیں آتی کسے
اپنی آسائش نہیں بھاتی کسے

جب کہ مصرف دودھ کا کوئی نہ پائیں
کیوں نہ مائیں اپنے بچوں کو پلائیں

ان کو بن بچوں کے نیند آئے نہ جب
کیوں نہ چھاتی سے لگا کر سوئیں سب

کس طرح غافل ہوں پھر اولاد سے
جب نہ بن دیکھے ہو چین اولاد کے

کہتے ہیں بچوں کو ہم کرتے ہیں پیار
اور دل کو اپنے دیتے ہیں قرار

ظاہراً اُن کی خوشی کرتے ہیں یہ
اور ٹھنڈا اپنا جی کرتے ہیں یہ

مار پر ہاتھ اُن کی اُٹھتا ہے اگر
دل کو رہتا ہے قلق دو دو پہر

اس لیے رکھتے ہیں اُن کو پیار سے
کیوں کہ دل دکھتا ہے اُن کی مار سے

پیار اُنہیں کرتے ہیں سب اپنے لیے
ان کا دم بھرتے ہیں سب اپنے لیے

ایک شفقت میں ہے دُہری منفعت
پرورش اُن کی اور اپنی مصلحت

چین پر اُن کے بھی ہو شاید نظر
ان سے چین اپنا مقدم ہے مگر

بھول کر بھی نام وہ ان کا نہ لے
پر طبیعت چین یاں لینے بھی دے

شفقتیں ایسی ہی سمجھیں آپ سب
کرتے ہیں بچوں پہ جو ماں باپ سب

اب رہی شادی ، چھٹی اور بیاہ کی
رسم مونڈن اور بسم اللہ کی

گو ہے یاں دم مارنا بے غیرتی
ناسپاسی اور کافر نعمتی

بات لیکن بے کہے بنتی نہیں
خواہ نفریں کیجیے خواہ آفریں

شادیوں میں آپ نے جو کچھ کیا
میری تقریبوں میں جو جو کچھ دیا

تھا وہ سب کچھ اپنی عزت کے لیے
نیک نامی اور شہرت کے لیے

تھا بہانا یہ کہ ہے عقدِ پسر
تھی مگر اپنی نمائش پر نظر

ہر طرف مدح و ثنا تھی آپ کی
ہر زباں پر واہ وا تھی آپ کی

چپ تھے سارے خردہ گیر اور نکتہ چیں
سب یہ کہتے تھے کہ حضرت آفریں!

دوست ہی کرتے نہ تھے بس واہ وا
دشمنوں نے بھی لیے تھے سر جھکا

معترف بیگانے اور اپنے تھے سب
تھا جہاں چرچا یہی تھا روز و شب

تھا ہمارا کام ، اور نام آپ کا
بلکہ تھا سب نام اور کام آپ کا

یاں نہ ہم کو دھیان تک شادی کا تھا
اور نہ ارماں گھر کی آبادی کا تھا

بیاہ یا شادی کا جب سنتے تھے نام
تھا ہمیں ایک اک کا منہ تکنے سے کام

ہم کو تھا شادی سے ایسا ہی لگاؤ
بیاہ کا ہو جیسے اک گڈے کو چاؤ

آپ کے دل میں تھے کچھ ارماں بھرے
بیاہ اُٹھا کر وہ ہمارے سر دھرے

مفت ہم شرمندہ احساں ہوئے
اور پورے آپ کے ارماں ہوئے

گھر میں جو نقدی تھی یا اسباب تھا
یا سہارا تھا کچھ اک جائیداد کا

کی نہ حضرت نے نظر انجام پر
کر دیا قربان سب اک نام پر

آپ کی تو نبھ گئی عزت کے ساتھ
سو سے بہتر عیش اور عشرت کے ساتھ

پر ہماری کس طرح ہو گی بسر
گھر میں دولت ہے نہ ہاتھوں میں ہنر

ہے ہمیں اب آفتوں کا سامنا
ہو گیا عزت کا مشکل تھامنا

کر دیا خوں زور و زر کا آپ نے
گھاٹ کا رکھا نہ گھر کا آپ نے

آپ کو ہوتا اگر منظور یہ
کاہشیں ہم سے رہیں سب دور یہ

جورِ گردوں سے نہ ہوں پامال ہم
بعد حضرت کے رہیں خوش حال ہم

شادیوں میں رائیگاں کھوتے نہ مال
اپنی شہرت کا نہ کرتے کچھ خیال

کھولتے ہم پر نہ در افلاس کے
چھوڑ جاتے کچھ ہمارے واسطے

ہم پہ احساں آپ یاں کرتے اگر
علم کی دولت سے کرتے بہرہ ور

کھول کر تعلیم میں دل کرتے خرچ
ہوتا کچھ ہوتا اگر کاموں میں حرج

علم کا تھا ہم کو بے شک شوق کم
کانپتے تھے نام سے پڑھنے کے ہم

بے خبر تقدیر کی گھاتوں سے تھے
بھاگتے ہم کام کی باتوں سے تھے

تھے نصیحت سے بزرگوں کی نفور
رہتے تھے سائے سے ان کے دور دور

پاس عزت کا نہ ڈر ذلت کا تھا
پردہ آنکھوں پر پڑا غفلت کا تھا

تھے مگر ہر طرح بس میں آپ کے
حکم سے باہر نہ تھے ماں باپ کے

ہم سے سرزد جب خطا ہوتی کوئی
یا کہ حرکت نا سزا ہوتی کوئی

گو کہ دل کڑھتا سزا سے آپ کا
دل پہ کرتے جبر، پر دیتے سزا

آپ کی خفگی کا ڈر ہوتا اگر
تربیت کا کچھ نہ کچھ ہوتا اثر

گر وطن میں تربیت آساں نہ تھی
کچھ جدائی خارج از امکاں نہ تھی

سوچتے انجام کی بد بختیاں
کرتے فرقت کی گوارا سختیاں

بھیج دیتے گھر سے باہر چند روز
لیتے دھر چھاتی پہ پتھر چند روز

مصلحت پر کرتے الفت کو فدا
کچھ دنوں اپنے سے کر دیتے جدا

یاد سے اپنی بھلا دیتے ہمیں
پر کسی قابل بنا دیتے ہمیں

گر جدائی آپ کو آتی نہ راس
دل ہماری یاد میں رہتا اداس

دردِ فرقت سے نہ کچھ گھبراتے آپ
دل بہلتا جس طرح بہلاتے آپ

شادیوں میں خرچ جو اٹھا فضول
ہم کو آخر کیا ہوا اس سے حصول

تربیت میں اپنی وہ اٹھتا اگر
ہم نہ ہوتے خوار شاید اس قدر

گھر میں کچھ باقی نہ رہتا اپنے جب
چار سو پاتے کھلی راہِ طلب

ہاتھ میں ہوتا اگر کچھ بھی ہنر
رہتے عزت سے نکل جاتے جدھر

اپنے حق جتنے بتائے آپ نے
ہم پہ جو احساں جتائے آپ نے

یوں تو ہیں وہ قابل تسلیم سب
کیوں کہ ہے ہم کو یہی حکمِ ادب

کرتے ہیں جب دل میں لیکن غور ہم
اپنا حصہ ان میں کچھ پاتے ہیں کم

یاد ہیں سب ہم کو احساں آپ کے
کچھ امیدیں تھیں ، کچھ ارماں آپ کے

اپنی خوشیاں کرتے تھے پوری مگر
تھی مصالح پر ہماری ، کم نظر

ایسے احسانوں سے ہو دل شاد کیا
ہم بزرگوں کو کریں گے یاد کیا

(بیٹے کی ندامت)

باپ سے جوشِ جوانی میں پسر
باتیں یہ کہتے تو کہہ گزرا مگر

کہہ کے جی میں اپنے شرمایا بہت
جرأتِ بے جا سے پچھتایا بہت

گو دیے الزام سب اپنے مٹا
پر نہ مٹ سکتا تھا حق ماں باپ کا

دے رہا تھا باپ کو زک صاف صاف
کہہ رہا تھا دل مگر اس کے خلاف

دعوے احساں سے سبک دوشی کے تھے
پر دبی جاتی تھی گردن بوجھ سے

گو زباں بس میں نہ تھی نادان کی
پر گلے میں تھی کمند احسان کی

کر کے عذرِ شوخ چشمی باپ سے
گر پڑا قدموں پہ آ کر باپ کے

دل جو اُمڈا دیر تک روتا رہا
متصل اشکوں سے منہ دھوتا رہا

(باپ کی دوبارہ نصیحت)

گو ہوئی تھی باپ کو خفت کمال
پر یہ دیکھا اُس نے جب بیٹے کا حال

جلد قدموں پر سے سر اس کا اٹھا
اپنی چھاتی سے لیا اُس کو لگا

پھر کہا بیٹے سے اے لختِ جگر!
کیوں ہوئی تم کو ندامت اس قدر

تم نے جو الزام ہیں مجھ کو دیے
اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو گی مجھے

شکر ہے اتنی تو ہے تم کو خبر
باپ نے رکھا ہے تم کو بے ہنر

سب برے تم سے سلوک اس نے کیے
جو بھلائی کی ، وہ کی اپنے لیے

باپ تو کہتا ہی تھا تم کو برا
تم نے کر دی باپ کی ثابت خطا

چاہیے اس کے سوا کیا باپ کو
باپ کے تم رہنما پیری میں ہو

پر مری جاں ہم تو ہیں پا در رکاب
آنے والی ہے اجل سر پر شتاب

فی الحقیقت گر ہوئی ہم سے خطا
حاصل اب اس کے جتانے سے ہے کیا

عمرِ رفتہ پھر ملے جب باپ کو
اس نصیحت پر عمل تب ہو تو ہو

جب کہیں بیٹا ہو پیدا دوسرا
عمر بھی خالق کرے اس کو عطا

اور رہے سر پر سلامت باپ بھی
بات بھی بگڑی نہ ہو پھر باپ کی

تب نصیحت ہو تمہاری سود مند
ہو سکے تب باپ اس پر کاربند

جب کہ یہ ممکن نہیں اے جانِ جاں
ہے ہمیں الزام دینا رائیگاں

سرزنش کا وقت ہی جب ہو چکا
سرزنش اب تم نے کی ہم کو تو کیا

رُت ہماری تو گئی ساری گزر
ہو ابھی تم جوہرِ قابل مگر

غلطیاں سب باپ کی ہو جانتے
اپنے نیک و بد کو ہو پہچانتے

راہ پر چاہو تو آ سکتے ہو تم
ہم نے جو کھویا ہے پا سکتے ہو تم

ہو گئی پا لغز جو کچھ باپ سے
ہے تلافی اس کی ممکن آپ سے

تربیت بے جا کریں ہم ، یا بجا
تربیت ماں باپ کی ہے چیز کیا

نوجوانی کا نشہ چڑھتا ہے جب
سب دھری رہتی ہے تعلیم اور ادب

ہاں مگر جو عقل خود رکھتے ہیں یاں
ٹھیک رہتے ہیں وہی ہو کر جواں

ہر کوئی بیج اپنا خود بوتا ہے خوب
کام اپنا آپ ہی ہوتا ہے خوب

پہلے اپنا سوچ لو انجام تم
دیتے رہنا پھر ہمیں الزام تم

ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے ، مگر
اب تو تم عاقل ہو خود جاؤ سنور

اب بھی گر حالت نہ بدلی آپ کی
آپ کی بھی پھر مثل ہو گی وہی

باپ نے بیٹے کو نالائق کہا
بیٹا نالائق ہی سچ مچ بن گیا

تا کہ کہنا باپ کا جھوٹا نہ ہو
نسبت نالائقی بے جا نہ ہو

ہے پسندیدہ اطاعت باپ کی
پر نہ ایسی جیسی اس لڑکے نے کی

ہے اگر بیٹا ! اطاعت اس کا نام
ایسی نا واجب اطاعت کو سلام

@ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

ہے لیاقت جن میں کچھ قدرِ قلیل
اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل

ان کو ایسوں سے نہیں ملنا روا
جو لیاقت رکھتے ہیں ان سے سوا

اونٹ اگر سمجھے بڑا اپنے تئیں
دیکھنا لازم پہاڑ اس کو نہیں

سر میں ہے جگنو کے یہ سودا اگر
شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر

چاہیے دن کو نہ نکلے زینہار
ورنہ ہو گا اپنے جی میں شرم سار

باب نہم

حقوقِ زنان
اور ہمدردی نسواں کی نظمیں

مناجات بیوہ

(1884ء) [1]

اے سب سے اول اور آخر
جہاں تہاں حاضر اور ناظر

اے سب داناؤں سے دانا
سارے تواناؤں سے توانا

اے بالا ہر بالا تر سے
چاند سے سورج سے امبر سے

اے سمجھے بوجھے بن سوجھے
جانے پہچانے بن بوجھے

سب سے انوکھے سب سے نرالے
آنکھ سے اوجھل دل کے اُجالے

اے اندھوں کی آنکھ کے تارے
اے لنگڑے لولوں کے سہارے

ناتیوں سے چھوٹوں کے ناتی
ساتھیوں سے بچھڑوں کے ساتھی

ناؤ جہاں کی کھینے والے
دکھ میں تسلی دینے والے

---

[1] شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں: ''مناجات بیوہ 1886ء یا 1887ء کی تصنیف ہے'' (تذکرہ حالی ص:99) لیکن ''حالی کا ذہنی ارتقا'' (ص:94) اور ''حالی بحیثیت شاعر'' (ص:86) میں اس نظم کا سن تصنیف 1884ء درج ہے۔ (ا ص)

جب ، اب ، تب تجھ سا نہیں کوئی
تجھ سے ہیں سب تجھ سا نہیں کوئی

جوت ہے تیری جل اور تھل میں
باس ہے تیری پھول اور پھل میں

ہر دل میں ہے تیرا بسیرا
تو پاس اور گھر دور ہے تیرا

راہ تری دشوار اور سکڑی
نام ترا رہگیر کی لکڑی

تو ہے ٹھکانا مسکینوں کا
تو ہے سہارا غمگینوں کا

تو ہے اکیلوں کا رکھوالا
تو ہے اندھیرے گھر کا اُجالا

لاگو ا؎ اچھے اور برے کا
خواہاں کھوٹے اور کھرے کا

بید نراسے بیماروں کا
گاہک مندے بازاروں کا

سوچ میں دل بہلانے والا
بپتا میں یاد آنے والا

io

ا؎ لاگو: (1) دشمن یا درپے رہنے والا۔ ((2 ساتھی، لگاؤ رکھنے والا، آرزومند۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

اے بے وارث گھروں کے وارث
بے بازو بے پروں کے وارث
بے آسوں کی آس ہے تو ہی
جاگتے سوتے پاس ہے تو ہی
بس والے ہیں یا بے بس ہیں
تو نہیں جن کا وہ بے کس ہیں
ساتھی جن کا دھیان ہے تیرا
دسرایت کی واں نہیں پروا
دل میں ہے جن کے تیری بڑائی
گنتے ہیں وہ پربت کو رائی
بے کس کا غم خوار ہے تو ہی
بری بنی کا یار ہے تو ہی
دکھیا ، دکھی ، یتیم اور بیوہ
تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا
تو ہی ڈبوئے تو ہی ترائے
تو ہی یہ بیڑے پار لگائے
تو ہی مرض دے تو ہی دوا دے
تو ہی دوا دارو میں شفا دے
تو ہی پلائے زہر کے پیالے
تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے
تو ہی دلوں میں آگ لگائے
تو ہی دلوں کی لگی بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے
مارے مار کے پھر چمکارے
پیار کا تیرے پوچھنا کیا ہے
مار میں بھی اک تیری مزا ہے

اے رحمت اور ہیبت والے
شفقت اور دباغت والے

اے انکل اور دھیان سے باہر
جان سے اور پہچان سے باہر

عقل سے کوئی پا نہیں سکتا
بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا

ایک کو تو نے شاد کیا ہے
ایک کے دل کو داغ دیا ہے

اُس سے نہ تیرا پیار کچھ ایسا
اس سے نہ تو بے زار کچھ ایسا

ہر دم تیری آن نئی ہے
جب دیکھو تب شان نئی ہے

یاں پچھوا ہے واں پروا ہے
گھر گھر تیرا حکم نیا ہے

پھول کہیں کمہلائے ہوئے ہیں
اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں

کھیتی ایک کی ہے لہراتی
ایک کا ہر دم خون سکھاتی

ایک پڑے ہیں دھن کو ڈبوئے
ایک ہیں گھوڑے بیچ کے سوئے

ایک نے جب سے ہوش سنبھالا
رنج سے اُس کو پڑا نہ پالا

ایک نے اس جنجال میں آ کر
چین نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر

مینہ کہیں دولت کا ہے برستا
ہے کوئی پانی تک کو ترستا

ایک کو مرنے تک نہیں دیتے
ایک اُکتا گیا لیٹے لیٹے

حال غرض دنیا کا یہی ہے
غم پہلے اور بعد خوشی ہے

رنج کا ہے دنیا کے گلہ کیا
تحفہ یہی لے دے کے ہے یاں کا

یاں نہیں بنتی رنج سہے بن
رنج نہیں سب ایک سے لیکن

ایک سے یاں رنج ایک ہے بالا
ایک سے ہے درد ایک نرالا

گھاؤ ہے گو ناسور کی صورت
پر اسے کیا ناسور سے نسبت

تپ وہی دق کی شکل ہے لیکن
دق نہیں رہتی جان لیے بن

دق ہو وہ یا ناسور ہو، کچھ ہو
دے نہ جواب اُمید کسی کو

روز کا غم کیونکر سہے کوئی
آس نہ جب باقی رہے کوئی

تو ہی کر انصاف اے مرے مولا
کون ہے جو بے آس ہے جیتا

گو کہ بہت بندے ہیں پُر ارماں
کم ہیں مگر ، مایوس ہیں جو یاں

خواہ دکھی ہے خواہ سکھی ہے
جو ہے اک اُمید اُس کو بندھی ہے

کھیتیاں جن کی کھڑی ہیں سوکھی
آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینہ کی

گھاٹا جن کو اساڑھی میں ہے
ساوَنی کی اُمید انہیں ہے

ڈوب چکی ہے جن کی اگیتی
دیتی ہے ڈھارس اُن کو پچھیتی

ایک ہے اس اُمید پہ جیتا
اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا

ایک کو جو اولاد ملی ہے
اس کو اُمنگ اب شادیوں کی ہے

رنج ہے یا قسمت میں خوشی ہے
کچھ ہے مگر اک آس بندھی ہے

غم نہیں اُن کو ، گو غمگیں ہیں
جو دل نا اُمید نہیں ہیں

کال میں کچھ سختی نہیں ایسی
کال میں ہے جب آس سمیں[1] کی

سہل ہے موجوں سے چھٹکارا
جب کہ نظر آتا ہے کنارا

---

[1] یہ لفظ عام تلفظ کے مطابق باندھا گیا ہے۔ اصلا سے (سنسکرت، ہندی) اردو میں سے، سما، سماں، کئی صورتوں میں مستعمل ہے۔ مختلف معانی میں آتا ہے: (1) وقت، موسم۔ (2) کیفیت، حالت۔ (3) خوش حالی کا زمانہ، بہتات وفراوانی کا موسم۔ یہاں آخری معنی مراد ہیں۔ (ا ص)

پر نہیں اُٹھ سکتی وہ مصیبت
آئے گی جس کے بعد نہ راحت

شاد ہو اس رہگیر کا کیا دل
مر کے کٹے گی جس کی منزل

اُن اُجڑوں کو کل پڑے کیوں کر
گھر نہ بسے گا جن کا جنم بھر

اُن بچھڑوں کا کیا ہے ٹھکانا
جن کو نہ ملنے دے گا زمانا

اب یہ بلا ٹلتی نہیں ٹالی
مجھ پہ ہے جو تقدیر نے ڈالی

آئیں بہت دنیا میں بہاریں
عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں

پڑے بہت باغوں میں جھولے
ڈھاک بہت جنگل میں پھولے

گئیں اور آئیں چاندنی راتیں
برسیں کھلیں بہت برساتیں

پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی
وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی

آس ہی کا یاں نام ہے دنیا
جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا

ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ
جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ

رونا ان بن باسیوں کا ہے
دیس نکالا جن کو ملا ہے

حکم سے تیرے پر نہیں چارا
کڑوی میٹھی سب ہے گوارا

زور ہے کیا پتے کا ہوا پر
چاہے جدھر لے جائے اُڑا کر

تنکا اک اور سات سمندر
جائے کہاں موجوں سے نکل کر

قسمت ہی میں جب تھی جدائی
پھر ٹلتی کس طرح یہ آئی

آج کی بگڑی ہو تو بنے بھی
ازل کی بگڑی خاک بنے گی

تو جو چاہے وہ نہیں ٹلتا
بندے کا یاں بس نہیں چلتا

مارے اور نہ دے تو رونے
تھپکے اور نہ دے تو سونے

ٹھہرے بن آتی ہے نہ بھاگے
تیری زبردستی کے آگے

تجھ سے کہیں گر بھاگنا چاہیں
بند ہیں چاروں کھونٹ کی راہیں

تو مارے اور خواہ نوازے
پڑی ہوں میں تیرے دروازے

تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں
تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں

ماں ہی سدا بچے کو مارے
اور بچہ ماں ماں ہی پکارے

اے مرے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری
دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن
جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری
میکے اور سسرال پہ بھاری
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں
دنیا سے بے زار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے
منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
دکھ دل کا کچھ کہہ نہیں سکتی
اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتی
تجھ پہ ہے روشن سب دکھ دل کا
تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے
لینے کے یاں پڑ گئے دینے
خوشی میں بھی سکھ پاس نہ آیا
غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے
ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
کیسا تھا یہ بیاہ نناواں
جونہی پڑا اُس کا پرچھاواں

چین سے رہنے دیا نہ جی کو
کر دیا ملیا میٹ خوشی کو

رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک
اور روؤں تو روؤں کہاں تک

ہنس ہنس دل بہلاؤں کیوں کر
اوسوں پیاس بجھاؤں کیوں کر

ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا
ایک نہ ہنستا بھلا نہ روتا

لیٹیے گر سونے کے بہانے
پائنتی کل ہے اور نہ سرہانے

جاگیے تو بھی بن نہیں پڑتی
جاگنے کی آخر کوئی حد بھی

اب کل ہم کو پکڑے گی مر کر
گور ہے سونی سیج سے بہتر

بات سے نفرت ، کام سے وحشت
ٹوٹی آس اور بجھی طبیعت

آبادی جنگل کا نمونا
دنیا سونی اور گھر سونا

دن بھیانک اور رات ڈرانی
یوں گزری ساری یہ جوانی

بہنیں اور بہنیلیاں میری
ساتھ کی تھیں جو کھیلیاں میری

مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے
خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھ سے

جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ
جب گئیں بے کل ہو کے گئیں وہ

کوئی نہیں دل کا بہلاوا
آ نہیں چکتا میرا بلاوا

آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا
کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا

تھک گئی میں دکھ سہتے سہتے
تھم گئے آنسو بہتے بہتے

آگ کھلی دل کی نہ کسی پر
گھل گئی جان اندر ہی اندر

دیکھ کے چپ جانا نہ کسی نے
جان کو پھونکا دل کی لگی نے

دبی تھی بھوبھل میں چنگاری
لی نہ کسی نے خبر ہماری

قوم میں وہ خوشیاں بیاہوں کی
شہر میں وہ دھومیں ساہوں کی

آئے دن تیوہاروں کا آنا
اور سب کا تیوہار منانا

وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں
وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں

وہ گرمی کی چاندنی راتیں
وہ ارمان بھری برساتیں

کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں
خیر ، کٹیں جس طور سے کاٹیں

چاؤ کے اور خوشیوں کے سمیں سب
آتے ہیں خوش ، کل جان کو ہو جب

رنج میں ہیں سامان خوشی کے
اور جلانے والے جی کے

گھر برکھا اور پیا بدیسی
آئیو برکھا کہیں نہ ایسی

دن یہ جوانی کے کٹے ایسے
باغ میں پنچھی قید ہو جیسے

رُت گئی ساری سر ٹکراتے
اُڑ نہ سکے پر ہوتے ساتے

ہو گی کسی نے کچھ کل پائی
مجھے تو شادی راس نہ آئی

آس بندھی لیکن نہ ملا کچھ
پھول آیا اور پھل نہ لگا کچھ

رہ گیا دے کر چاند دکھائی
چاند ہوا پر عید نہ آئی

رت بدلی پر ہوئی نہ برکھا
بادل گرجا اور نہ برسا

پھل کی خاطر برچھی کھائی
پھل نہ ملا اور جان گنوائی

ریت میں ذرے دیکھ چمکتے
دوڑ پڑی میں جھیل سمجھ کے

چاروں کھونٹ نظر دوڑائی
پر پانی کی بوند نہ پائی

اے دین اور دنیا کے مالک
راجا اور پرجا کے مالک

بے پر اور پردار کے والی
اے سارے سنسار کے والی

پورب ، پچھم ، دکھن ، اتر
بخشش تیری عام ہے گھر گھر

پیاؤ لگی ہے سب کے لیے یاں
خواہ ہوں ہندو خواہ مسلماں

ہو نہ اگر قسمت نے کمی کی
کی نہیں بندی تو نے کسی کی

چیونٹا ، کیڑا ، مچھر ، بھنگا
کچھوا ، مینڈک ، سیپ اور گھونگا

سارے پنچھی اور پکھیرو
مور ، پپیہا ، سارس ، پیرو

بھیڑ اور بکری ، شیر اور چیتے
تیرے جلائے سب ہیں جیتے

سب پہ کھلا ہے در رحمت کا
برس رہا ہے مینہ نعمت کا

خاک سے تو نے بیج اُگائے
پھر پودے پروان چڑھائے

سیپ کو بخشی تو نے دولت
اور بخشا مکھی کو امرت

لکڑی میں پھل تو نے لگائے
اور کوڑے پر پھول کھلائے

ہیرا بخشا کان کو تو نے
مشک دیا حیوان کو تو نے
جگنو کو بجلی کی چمک دی
ذرے کو کندن کی دمک دی

دین سے تیری اے مرے مولا
سب ہیں نہال ادنیٰ اور اعلیٰ
عام ہے سب پر تیری رحمت
ہیں محروم مگر بد قسمت

پیڑ ہوں چھوٹے یا کہ بڑے یاں
فیض ہوا کا سب پہ ہے یکساں
پھلتے ہیں جو ہیں پھلنے والے
جلتے ہیں جو ہیں جلنے والے

جب اپنی ہی زمیں ہو کلر
پھر الزام نہیں کچھ مینہ پر
سب کو ترے انعام تھے شامل
میں ہی نہ تھی انعام کے قابل

گر کچھ آتا بانٹ میں میری
سب کچھ تھا سرکار میں میری
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں
نون کو ترسی میں سانبھر میں

راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی
سدا برت سے چلی ہوں بھوکی
پہروں سوچتی ہوں یہ جی میں
آئی تھی کیوں اس نگری میں؟

ہونے سے میرے فائدہ کیا تھا؟
کس لیے پیدا مجھ کو کیا تھا؟

آن کے آخر میں نے لیا کیا؟
مجھ کو مری قسمت نے دیا کیا؟

نین دیے اور کچھ نہ دکھایا
دانت دیے اور کچھ نہ چکھایا

جنڈڑی [1] دی اور خوشی نہ بخشی
دل بخشا ، دل لگی نہ بخشی

رہی اکیلی بھری سبھا میں
پیاسی رہی بھری گنگا میں

چین سے جاگی اور نہ سوئی
میں نہ ہنسی جی بھر کے نہ روئی

آ کے خوشی سی چیز نہ پائی
جیسی آئی ویسی نہ آئی

کھایا تو کچھ مزا نہ آیا
سوئی تو کچھ چین نہ پایا

پھول ہمیشہ آنکھ میں کھٹکے
اور پھل سدا گلے میں اٹکے

ہو نہ سکی کچھ دل سے عبادت
اور نہ جمی کاموں پہ طبیعت

کام سنوارا کوئی نہ یاں کا
اور نہ کیا دھندا کوئی واں کا

کام آیا یاں کوئی نہ میرے
اور نہ میں کام آئی کسی کے

---

[1] جنڈڑی: جان کی تصغیر بالتحقیر ،عورتوں کا محاورہ (بحوالہ نور اللغات) ۔عوامی بولی میں زندگی سے بگڑ کر "جنڈڑی" ہو

گیا۔

قسمت نے جب سے منہ موڑا
آدمیوں کا ہو گیا توڑا

باپ اور بھائی ، چچا بھتیجے
سب رکھتی ہوں تیرے کرم سے

پر نہیں پاتی ایک بھی ایسا
جس کو ہو میری جان کی پروا

ناتیوں میں شفقت نہیں پاتی
اپنوں میں اپنایت نہیں پاتی

گھر ہے یہ اک حیرت کا نمونا
سو گھر والے اور گھر سونا

جس نے خدا کا خوف کیا کچھ
آ کے کبھی یاں پوچھ لیا کچھ

سو یہ خوشی کا دل کی ہے سودا
زور کسی پر اب نہیں اپنا

اس میں شکایت کیا ہے پرائی
اپنی ہی قسمت کی ہے برائی

چین گر اپنی بانٹ میں آتا
کیوں تو عورت ذات بناتا

کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے
کیوں ہوتے اوروں کے حوالے

آٹھ پہر کیوں دکھ یہ اُٹھاتے
جیتے ہی جی کیوں مر جاتے

دکھ میں نہیں یاں کوئی کسی کا
باپ نہ ماں ، بھائی نہ بھتیجا

سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی
''سکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی''

io

تیرے سوا اے رحم کے بانی
کون سنے یہ رام کہانی

ایک کہانی ہو تو کہوں میں
ایک مصیبت ہو تو سہوں میں

حال نہ ہو دشمن کا ایسا
میرا نازک حال ہے جیسا

کوئی نہیں لاگو اب میرا
باپ نہ بھائی ، ساس نہ سسرا

آنکھ میں ایک اک کے ہوں کھٹکتی
پر اپنے بس مر نہیں سکتی

ماں اور باپ عزیز اور پیارے
بے کل ہیں جینے سے ہمارے

روکے پلک نم کر نہیں سکتی
ہنس کے غلط غم کر نہیں سکتی

روئیے تو سب روتے ہیں گھر کے
رونے نہیں دیتے جی بھر کے

ہنسیے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو
کیونکہ الٰہی کاٹیے غم کو

گر سسرال میں جاتی ہوں میں
نحس قدم کہلاتی ہوں میں

میکے میں جس وقت ہوں آتی
رو رو کر ہوں سب کو رُلاتی

جب سے یہ دن قسمت نے دکھائے

تکتے ہیں جو ہیں اپنے پرائے

میرا سدا ہنسنا اور رونا
بیٹھنا ، اُٹھنا ، جاگنا ، سونا

سوچ میں میرے سارا گھر ہے
میرے چلن پر سب کی نظر ہے

آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی
پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی

جانتی ہوں نازک ہے زمانا
بات ہے اک یاں عیب لگانا

موتی کی سی آب ہے عزت
جا کے نہیں آتی پھر حرمت

مہندی میں نے لگانی چھوڑی
پٹی میں نے جمانی چھوڑی

کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی
عطر نہیں میں بھول کے ملتی

سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی
بال نہیں برسوں گندھواتی

دو دو چاند نہیں سر دھوتی
اٹھواروں کنگھی نہیں ہوتی

کان میں پتے ہاتھ میں کنگن
پہن چکی سب جب تھی سہاگن

پہنچیوں کا ارمان نہیں اب
چوڑیوں کا کچھ دھیان نہیں اب

اُڑ گئیں دل کی سب وہ ترنگیں

چاؤ رہے باقی نہ اُمنگیں

آپ کو یاں تک میں نے مٹایا
پر دنیا کو صبر نہ آیا

وہم نے ہے ایک ایک کو گھیرا
جب دیکھو تب ذکر ہے میرا

کھینچ چکا ہے میرا مقدر
داغ بدی کا میری جبیں پر

مل جاؤں گر خاک میں بھی میں
بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی میں

سچ اگلے لوگوں نے کہا ہے
''بد اچھا بدنام برا ہے''

جینے سے گھبرا گئی ہوں میں
اس دم سے تنگ آ گئی ہوں میں

یوں نہ بری اس جان پہ بنتی
ماں مجھ کو اے کاش نہ جنتی

رہتے ہم انجان بلا سے
دنیا مجھ سے ، میں دنیا سے

اے بے آسروں کے رکھویا!
اے ڈوبے بیڑوں کے کھویا!

کیجیو میری کشتی بانی
آ پہنچا ہے ڈباؤ پانی

اب تیرے گی ترائی تیری
ڈوبی ناؤ ، دہائی تیری

io

اے امبر کے چمکتے تارو!
اے گھر کے در اور دیوارو!

اے جانی پہچانی راتو!
تنہائی کی ڈرانی راتو!

اے نیک اور بد کے دربانو!
دیکھتی آنکھو ! سنتے کانو!

ایک دن اس گندی دنیا سے
جانا ہے مالک کے آگے

بوجھ ہیں واں سب تلنے والے
پترے سب کے کھلنے والے

جب واں پوچھ ہو تیری میری
تم سب دیجو گواہی میری

میں نیکی کا دم نہیں بھرتی
پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی

کیونکہ خطا سے بچ سکتا ہے
جس نے کچا دودھ پیا ہے

خواہ ولی ہو خواہ رشی ہو
اس سے رہائی نہیں کسی کو

گنوں اگر میں اپنی خطائیں
ہے یہ یقیں گنتی میں نہ آئیں

پر یہ خدا سے ڈر کے ہوں کہتی
منہ پہ یہ آئے بن نہیں رہتی

خواہ بری تھی خواہ بھلی میں
بات سے اپنی نہیں ٹلی میں

پڑی تھی جس بے دید کے پالے
ہوئی تھی جس بیری کے حوالے

نام پہ دھونی اس کے رما کر
آن کو رکھا جان گنوا کر

ساتھ نہ قوم اور دیس کا چھوڑا
اور نہ خدا کے عہد کو توڑا

آئے اگر دنیا کو نہ باور
اب مجھے کچھ دنیا کا نہیں ڈر

میرا نگہباں اور رکھوالا
سب سے بڑا ہے جاننے والا

io

اے ایمان کے رکھنے والے
اے نیت کے پرکھنے والے

میں نہیں رکھتی کام کسی سے
چاہتی ہوں انصاف تجھی سے

حکم پہ چلتی تیرے اگر میں
چین سے کرتی عمر بسر میں

مانتی گر میں عقل کا کہنا
مجھ کو نہ پڑتا رنج یہ سہنا

کچھ نہ عدالت کا تھا ڈراوا
اور نہ مذہب کا اٹکاوا

ہے دستور یہی دنیا کا
آپ سے اچھا نام خدا کا
لیکن ہٹ پیاروں کی یہی تھی
مرضی غم خواروں کی یہی تھی
اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے
قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
ہو نہ کسی سے ہم کو ندامت
ناک رہے کنبے کی سلامت
جان کسی کی جائے تو جائے
آن میں اپنی فرق نہ آئے
دم پہ بنے جو اس کو سہوں میں
لوٹتی انگاروں پہ رہوں میں
درد نہ وہ دل کا کہیں ظاہر
چپکے ہی چپکے کام ہو آخر
مر مٹوں اور کچھ منہ پہ نہ لاؤں
جل بجھوں اور اُف کرنے نہ پاؤں
گھٹ گھٹ کر دم اپنا گنوا دوں
جل جل کر آپے اُسے کو بجھا دو
تجھ پہ ہے روشن اے مرے مولا
وقت یہ کیسا مجھ پہ پڑا تھا
بیڑا تھا منجدھار میں میرا
چار طرف چھایا تھا اندھیرا
تھاہ تھی پانی کی نہ کنارا
تیرے سوا تھا کچھ نہ سہارا
شرم ادھر دنیا کی مجھے تھی

فکر اُدھر عقبیٰ کی مجھے تھی

ا۔ آپا: اپنی ذات، اپنے آپ کو (آپا تجنا یا آپا بسرانا: اپنے آپ کو قربان کر دینا، خود فراموشی)

روکتے تھے حملے مجھے دل کے
تھا مجھے جینا خاک میں مل کے

نفس سے تھی دن رات لڑائی
دور تھی نیکی پاس برائی

جان تھی میری آن کی دشمن
آن تھی میری جان کی دشمن

آن سنبھالے جان تھی جاتی
جان بچاتے آن تھی جاتی

طے کرنے تھے سات سمندر
حکم یہ تھا ہاں پاؤں نہ ہوں تر

کوئلا چاروں کھونٹ تھا پھیلا
حکم یہ تھا پلا [1] نہ ہو میلا

پیاس تھی لو تھی اور تھی کھرسا [2]
اور دریا سے گزرنا پیاسا

دھوپ کی تھی پالے پہ چڑھائی
آگ اور گندھک کی تھی لڑائی

درد اپنا کس سے کہوں کیا تھا
آ کے پہاڑ اک مجھ پہ گرا تھا

نفس سے ڈر تھا مجھ کو بدی کا
اس لیے ہر دم تھی یہ تمنا

مر جاؤں یا زندہ رہوں میں
تجھ سے مگر شرمندہ نہ ہوں میں

جان بلا سے جائے تو جائے
پر کہیں دینی بات نہ آئے

۱؎ پلا یا پلو: کنارا یا سرا
۲؎ کھرسا: تپش، گرم موسم، خشک سالی

کی نہ کسی نے میری خوشی کو
میں نے کیا نا خوش نہ کسی کو

بات کسی کی میں نے نہ ڈالی
اپنے ہی دم پر سب کی بلا لی

جان نہ سمجھا جان کو اپنی
دیا نہ جانے آن کو اپنی

قول پہ اپنے جمی رہی میں
ہوئی نہ ڈانواں ڈول کبھی میں

دل تھاما آپے کو سنبھالا
سانس تلک منہ سے نہ نکالا

اور نہ اگر کرتی میں ایسا
کیوں کر کرتی اور کرتی کیا

بن نہیں آتی دیس سے بھاگے
کچھ نہیں چلتی دیس کے آگے

کہہ گئی سچ اک راج کماری
"لا چاری پر پیت ہے بھاری"

io

اے اچھے اور برے کے بھیدی
کھوٹے اور کھرے کے بھیدی

چھپی ڈھکی کے کھولنے والے
بری بھلی کے تولنے والے

بھید داوں کے جاننے والے
پاپ اور پن کے چھاننے والے

عیب اور گن سب تجھ پہ ہیں روشن
پاپ اور پن سب تجھ پہ ہیں روشن

عیب نہ اپنا تجھ کو جتانا
ہے دائی سے پیٹ چھپانا

میں نہیں آخر پاک بدی سے
بنی ہوں پانی اور مٹی سے

تو نے بنایا تھا مجھے جیسا
چاہیے تھا ہونا مجھے ویسا

بس ہمیں جتنا تو نے دیا ہے
اُس سے سوا قدرت ہمیں کیا ہے

کان اور آنکھیں ہاتھ اور بازو
جن جن پر تھا یاں مجھے قابو

سب کو بدی سے میں نے بچایا
سب کو خودی سے میں نے مٹایا

اُٹھتے بیٹھتے روکا سب کو
سوتے جاگتے ٹوکا سب کو

ہاتھ کو ہلنے دیا نہ بے جا
پاؤں کو چلنے دیا نہ ٹیڑھا

آنکھ کو اُٹھنے دیا نہ اتنا
جس سے کہ پیدا ہو کوئی فتنہ

کان کو رکھا دور بلا سے
اوپری آوازوں کی ہوا سے

روک کے یوں اور تھام کے آپا
میں نے یہ کاٹا اپنا رنڈاپا

ایک نہ سنبھلا میرا سنبھالا
تھا بے تاب جو اندر والا

حال کروں میں دل کا بیاں کیا
حال ہے دل کا تجھ سے نہاں کیا

دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی
مچھلی تھی اک اس میں تڑپتی

جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی
اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی

گو دم بھر اس دل کی لگی نے
ٹھنڈا پانی دیا نہ پینے

تو ہے مگر اس بات کا دانا
میں نے کہا دل کا نہیں مانا

زور تھا میرا دل پہ جہاں تک
میں نے سنبھالا دل کو وہاں تک

تھامنا دل کا کام تھا میرا
اور تھمانا کام تھا تیرا

پکڑے اگر تو دل کی خطا پر
میں راضی ہوں تیری رضا پر

رکھ تکلیف میں یا راحت میں
ڈال جہنم یا جنت میں

اب نہ مجھے جنت کی تمنا
اور نہ خطرہ کچھ دوزخ کا

آئے گی جنت راس کب اس کو
جلنے میں جس کی عمر کٹی ہو

ڈر دوزخ کا پھر اُسے کیا ہو
جس نے رنڈاپا جھیل لیا ہو

پر تجھ سے اک عرض ہے میری
رد نہ ہو گر درگاہ میں تیری

جو قسمت نے مجھ کو دکھایا
خوش نا خوش سب میں نے اُٹھایا

مجھ نا چیز کی ہے کیا طاقت
جو منہ پر کچھ لاؤں شکایت

عمر بہت سی کاٹ چکی ہوں
یہ دن بھی کٹ جائیں گے جوں توں

اپنے لیے کچھ کہہ نہیں سکتی
پر یہ کہے بن رہ نہیں سکتی

میں ہی اکیلی نہیں ہوں دکھیا
پڑی ہے لاکھوں پر یہی بپتا

بس کے بہت یاں اُجڑ گئے گھر
بن کے ہزاروں بگڑ گئے گھر

جلیں کروڑوں اسی لپٹ میں
پدموں پھنکیں اسی مرگھٹ میں

بالیاں ایک اک ذات کی لاکھوں
بیاہیاں ایک اک رات کی لاکھوں

ہو گئیں آخر اسی الم میں
کاٹ گئیں عمریں اسی غم میں

سیکڑوں بے چاری مظلومیں
بھولی ، نادانیں ، معصومیں

بیاہ سے انجان اور منگنی سے
بنے سے واقف اور نہ بنی سے

ماؤں سے جو منہ دھلواتی تھیں
رو رو مانگ کے جو کھاتی تھیں

تھپک تھپک تھے جن کو سلاتے
گھڑک گھڑک تھے جن کو کھلاتے

جن کو نہ شادی کی تھی تمنا
اور نہ منگنی کا تھا تقاضا

جن کو نہ آپے کی تھی خبر کچھ
اور نہ رنڈاپے کی تھی خبر کچھ

بھلی سے واقف تھیں نہ بری سے
بد سے مطلب تھا نہ بدی سے

رخصت چالے اور چوتھی کو
کھیل تماشا جانتی تھیں جو

ہوش جنہیں تھا رات نہ دن کا
گڑیوں کا سا بیاہ تھا جن کا

دو دو دن رہ رہ کے سہاگن
جنم جنم کو ہوئیں بروگن

دولہا نے جانا نہ دلہن کو
دلہن نے پہچانا نہ سجن کو

دل نہ طبیعت ، شوق نہ چاہت
مفت لگا لی بیاہ کی تہمت

شرط سے پہلے بازی ہاری
بیاہ ہوا اور رہیں کنواری

766

سیلانی جب باغ میں آئے
پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے

پھول کھلے جس وقت چمن میں
جا سوئے سیلانی بن میں

پیت نہ تھی جب پایا پیتم
جب ہوئی پیت گنوایا پیتم

ہوش سے پہلے ہوئی میں بیوہ
کب پہنچے گا پار یہ کھیوا

خیر سے بچپن کا ہے رنڈاپا
دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا

عمر ہے منزل تک پہنچانی
کاٹنی ہے بھرپور جوانی

شام کے مردے کا ہے یہ رونا
ساری رات نہیں اب سونا

آئی نہیں دنیا میں الٰہی
ایسی کسی بیڑے پہ تباہی

آئیں بلکتی گئیں سسکتی
رہیں ترستی اور پھڑکتی

کوئی نہیں جو غور کرے اب
نبض پہ ان کی ہاتھ دھرے اب

دکھ اُن کا آئے اور پوچھے
روگ اُن کا سمجھے اور بوجھے

چوٹ نہ جن کے دل پہ لگی ہو
وہ کیا جانیں دل کی لگی کو

بے دردوں سے پڑا ہے پالا
تو ہی اب ان کا ہے رکھوالا

اپنی بیتی ہے یہ کہانی
اب یہ دھان رہے بن پانی

io

اے غم خوار ہر اک بے کس کے
حامی ہر عاجز بے بس کے

ہے اپنے عاجز بندوں پر
پیار ترا ماں باپ سے بڑھ کر

جس نے تنگی میں تجھ کو پکارا
سامنے تیرے ہاتھ پسارا

پھرا نہ خالی اس چوکھٹ سے
گیا نہ پیاسا اس پنگھٹ سے

کس کو زمانے نے ہے ستایا
تو نہیں جس کے آڑے آیا

اُجڑے کھیڑے تو نے بسائے
ڈوبے بیڑے تو نے ترائے

مظلوموں کی داد کو پہنچا
قیدیوں کی فریاد کو پہنچا

بنجر ملک آباد کرائے
اور بردے آزاد کرائے

عام تری رحمت جب ٹھہری
دور ہے پھر رحمت سے تیری

داد ہر اک مظلوم کی دے تو
اور رانڈوں کی خبر نہ لے تو

عورت ذات کا تنہا جینا

ہر دم خونِ جگر کا پینا
گھر بسنے کی آس نہ رہنی
ساری عمر جدائی سہنی
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے
بپتا ہے جو کہی نہ جائے
قدر اس کی یا تو پہچانے
یا جس پر گزری ہو وہ جانے

io

اے خاوند خداوندوں کے
مالک خاوند اور بندوں کے
واسطہ اپنی خاوندی کا
صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجو
کسی کو بے وارث مت کیجو
کیجو جو کچھ تیری خوشی ہو
رانڈ مگر کیجو نہ کسی کو
مسند تکیہ عزت حرمت
نوکر چاکر دولت حشمت
چاندی سونا نقدی غلا
گہنا پاتا ٹوم اور چھلا
سائیں بن جو چیز ہے گھر میں
خاک ہے سب عورت کی نظر میں
دل کی خوشی اک آس پہ تھی سب
سو وہ ہزاروں کوس گئی اب

پھول کچھ اب کانٹوں سے نہیں کم
جنت بھی ہو تو ہے جہنم

باغ نظر میں اس کی خزاں ہے
آنکھ میں تاریک اس کی جہاں ہے

عیش ہے اس کے واسطے ماتم
عید ہے اس کے حق میں محرم

جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا
کر اسے تو پیوند زمیں کا

یا عورت کو پہلے بلا لے
یا دونوں کو ساتھ اُٹھا لے

یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی
جس سے گئی ہے پریت یہاں کی

جس سے ہوئے دل سیکڑوں بسمل
جس نے ہزاروں کو دیے گھائل

جس نے کلیجے آگ میں بھونے
جس نے بھرے گھر کر دیے سونے

خوف دلوں سے کھو دیا جس نے
شرم سے دے دے دھو دیے جس نے

قوم کی جس بن آن ہے جاتی
دیس کی جس پر جان ہے جاتی

جس نے کیے دل رحم سے خالی
ریت ہے جو دنیا سے نرالی

قوم سے تو یہ ریت چھڑا دے
بندیوں کی بیڑی یہ تڑا دے

سہل اور مشکل تجھ کو ہے یکساں
ہم کو ہے مشکل تجھ کو ہے آساں
رنج اور دکھ قبضے میں ہے تیرے
چین اور سکھ قبضے میں ہے تیرے
ہلتے ہیں پتے تیرے ہلائے
کھلتے ہیں غنچے تیرے کھلائے
مٹھی میں ہیں تیری ہوائیں
قابو میں ہیں تیرے گھٹائیں
تجھ سے ہے دریاؤں کی روانی
تیرے بہائے بہتے ہیں پانی
جھیل ، سمندر ، پربت ، رائی
کہنے میں ہے سب تیرے خدائی
ناتا ، رشتہ ، نسبت ، شادی
سوگ ، رنڈاپا ، قید ، آزادی
قوم کی ریتیں ، دیس کی رسمیں
کیا ہے وہ جو تیرے نہیں بس میں
کام کوئی مشکل نہیں تجھ کو
ایک یہ کیا ، گر تیری خوشی ہو
سوت لگے پتھر سے نکلنے
ناؤ لگے ریتی میں چلنے

io

اے عزت اور عظمت والے
رحمت اور عدالت والے
دکھڑا تجھ سے کہنا دل کا

766

اک بشریت کا ہے تقاضا

دل پہ ہے جب برچھی کوئی چلتی
آہ کلیجے سے ہے نکلتی

جب کوئی دکھ یاد آ جاتا ہے
جی بے ساختہ بھر آتا ہے

ورنہ ہے اس دنیا میں دھرا کیا
خواب کا سا اک ہے یہ تماشا

دکھ سے ہے یاں کے گھبرانا کیا
سکھ پہ ہے یاں کے اترانا کیا

عیش کی یاں مہلت ہے نہ غم کی
سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی

آنی جانی چیز ہیں خوشیاں
چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں

منگنی ، بیاہ ، برات اور رخصت
میل ملاپ ، سہاگ اور سنگت

ہیں دو دن کے سب بہلاوے
آگے چل کر ہیں پچھتاوے

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا

بجلی جیسی چمک ہے اس کی
پل دو پل کی جھلک ہے اس کی

پانی کا سا ہے یہ بچارا
جگنو کا سا ہے چمکارا

آج ہے یاں جنگل میں منگل

کل سنسان پڑا ہے جنگل

آج ہے میلا ہر دم دونا
اور کل گاؤں پڑا ہے سونا

آج ہے رہنے کی تیاری
اور کل ہے چلنے کی باری

آج ہے پانا کل ہے کھونا
آج ہے ہنسنا کل ہے رونا

کبھی ہے بادھا کبھی ہے گھاٹا
کبھی جوار اور کبھی ہے بھاٹا

ہار کبھی اور جیت کبھی ہے
اس نگری کی ریت یہی ہے

ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا
ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا

خوشی میں غم یاں ملا ہوا ہے
امرت میں بس گھلا ہوا ہے

سیر کو جو اس باغ میں آئیں
دیکھ کے پھل کو ہاتھ لگائیں

یاں ہر پھل اندرائن کا ہے
دیکھنے سے چکھنے میں برا ہے

عیش جنہوں نے سدا اڑائے
وہ بھی ہیں آخر کو پچھتائے

رہے ہیں گر کر چڑھے ہیں جو یاں
گھٹے ہیں آخر بڑھے ہیں جو یاں

جو بیاہے وہ ہیں پچھتاتے

766

بن بیاہے ہیں بیاہ مناتے

اس پھل کا ہے یہی پریکھا
جو نہیں چکھا وہی ہے میٹھا

خوش نہ ہوں خوشیوں کے متوالے
ہیں یہ نشے سب اُترنے والے

غم کی گھٹا آتی ہے گرجتی
گھڑی میں یاں گھڑیال ہے بجتی

رہگیروں کا بندھا ہے تانتا
ایک آتا ہے ایک ہے جاتا

جو آئے ہیں اُن کو ہے جانا
جو گئے اُن کو پھر نہیں آنا

خواہ ہوں رانڈ اور خواہ سہاگن
موت ہے سب کی جان کی دُشمن

ایک ہے گو آج ایک سے بہتر
مر گئیں جب دونوں ہیں برابر

اور کوئی گر انصاف سے دیکھے
مر کے اُسے نسبت نہیں اس سے

عیش گئی وہ چھوڑ کے یاں کے
قید گئی یہ کاٹ کے یاں سے

اس کو پڑی کل اس کی گئی کل
یہ گئی ہلکی وہ گئی بوجھل

اس کا دل اس دنیا سے اُٹھانا
ہے ناخن سے گوشت چھٹانا

جان یہ آساں دیتی ہے ایسے

بو ہے نکلتی پھول سے جیسے

غم ہو غرض یا عیش ہو کچھ ہو
ہے ہمیں جانا چھوڑ کے سب کو

تیرے سوا یاں اے مرے مولا!
کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا

پڑی تھی سونی جب یہ نگریا
تیری ہی تھی یاں کھڑی اٹریا

پھر یہ نگریا اُجڑ کے ساری
تیری ہی رہ جائے گی اٹاری

تھا نہ کچھ آگے تیرے سوا یاں
اور رہے گا کچھ نہ سدا یاں

یاں کوئی دن دکھ پایا تو کیا
اور کوئی دم سکھ پایا تو کیا

اب نہ مجھے کچھ رنج کی پروا
اور نہ آسائش کی تمنا

چاہتی ہوں اک تیری محبت
اور نہیں رکھتی کوئی حاجت

گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے
تیرے سوا جو سب کو بھلا دے

آئے کسی کا دھیان نہ جی میں
کوئی رہے ارمان نہ جی میں

فکر ہو اچھی کی نہ بری کی
تیرے سوا دھن ہو نہ کسی کی

کوئی جگہ اس دل میں نہ پائے

یاد کوئی بھولے سے نہ آئے

سینہ یہ تجھ سے بھرا ہوا سارا
میت سمائے اس میں نہ پیارا

دل نے بہت یاں مجھ کو ستایا
موت کا برسوں مزا چکھایا

خواب میں دیکھ اک سوانگ نرالا
آگ میں جیتے جی مجھے ڈالا

میرا اور اپنا چین گنوایا
آپ جلا اور مجھ کو جلایا

اُٹھ نہیں سکتے مجھ سے اب اک دم
یہ دنیا کے ناشدنی غم

دل میں لگن بس اپنی لگا دے
سارے غم اپنے غم میں کھپا دے

غیر کے رشتے توڑ دے سارے
دل کے پھپھولے پھوڑ دے سارے

جب مجھے تنہا کیا ہے پیدا
تو مجھے بندھوا کر نہ کسی کا

واں سے اکیلی آئی ہوں جیسی
ویسی ہی یاں سے جاؤں اکیلی

ساتھ کوئی غم لے کے نہ جاؤں
تیرے سوا کھو دوں جسے پاؤں

دل نہ پھرے دنیا میں بھٹکا
کوئی رہے کانٹا نہ کھٹکتا

جی سے نشان پیاروں کا مٹا دوں

پیار کے منہ کو آگ لگا دوں

تو ہی ہو دل میں تو ہی زباں پر

مار کے جاؤں لات جہاں پر

پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر

خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

چپ کی داد

(1905ء)[1]

اے ماؤ ، بہنو ، بیٹیو ، دنیا کی زینت تم سے ہے

ملکوں کی بستی ہو تمھی ، قوموں کی عزت تم سے ہے

تم گھر کی ہو شہزادیاں ، شہروں کی ہو آبادیاں

غمگیں دلوں کی شادیاں ، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

تم ہو تو غربت ہے وطن ، تم بن ہے ویرانہ چمن

ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو ، عفت کی تم تدبیر ہو

ہو دین کی تم پاسباں ، ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا ، طینت میں ہے مہر و وفا

گھٹی میں ہے صبر و رضا ، انساں عبارت تم سے ہے

مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کب کا کھو

دنیا میں اے ستونتیو! لے دے کے اب ست تم سے ہے

مونس ہو خاوندوں کی تم ، غم خوار فرزندوں کی تم

تم بن ہے گھر ویران سب ، گھر بھر کی برکت تم سے ہے

---

[1] ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اس نظم کا سنہ تصنیف 1906ء متعین کیا ہے (حالی کا ذہنی ارتقا، ص:213)۔ ڈاکٹر

شجاعت علی بھی اس رائے سے متفق ہیں (حالی بحیثیت شاعر ص:91)۔ مولانا حالی آخر دسمبر 1905ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے تھے۔ جہاں وسط جون 1906ء تک قیام فرما رہے۔ اسی دوران میں انہوں نے مہاراجہ سر کشن پرشاد کے زیر صدارت ایک بہت بڑے جلسے میں یہ نظم سنائی تھی۔ فاضل محققین کے قیاس کی بنیاد غالباً یہی واقعہ ہے۔ مرتب نے بھی "ترجمہ حالی" کے تحت (مشمولہ کلیات جلد اول) میں اسی رائے کا اعادہ کیا ہے لیکن حیدر آباد کے جلسے میں نظم خوانی سن تصنیف کے بارے میں کوئی قطعی دلیل نہیں۔ درحقیقت یہ نظم سفر حیدر آباد سے قبل لکھی جا چکی تھی اور رسالہ "خاتون" (علی گڑھ) کے شمارہ بابت ماہ دسمبر 1905ء میں شائع ہوئی تھی، پھر فروری 1906ء کے مخزن میں رسالہ "خاتون" سے منقول ہوئی۔ (اص)

تم آس ہو بیمار کی ، ڈھارس ہو تم بے کار کی
دولت ہو تم نادار کی ، عسرت میں عشرت تم سے ہے
آتی ہو اکثر بے طلب دنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنی گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

io

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار باپوں کی رہیں ، ماؤں کی تابعدار تم
دن بھر پکانا ریندھنا ، سینا ، پرونا ، ٹانکنا
بیٹھیں نہ گھر پر باپ کے خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اٹھ اٹھ کے لی
بچہ کوئی سوتے میں رویا اور ہوئیں بیدار تم
سسرال میں پہنچیں تو واں اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ہر دم یہاں نا خوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر ، سسرے کا دل میلا نہ ہو

آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم
پالا بروں سے گر پڑے، بدخو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو، گو دل میں ہو بے زار تم
غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر

io

شادی کے بعد ایک ایک کو تھی آرزو اولاد کی
تم پھنس گئیں جنجال میں خالق نے جب اولاد دی
دردوں کے دکھ تم نے سہے، جاپے[1] کی جھیلیں سختیاں
جب موت کا چکھا مزا تب تم کو یہ دولت ملی
میکے میں اور سسرال میں سب کے ہوئے دل باغ باغ
گھر میں اُجالا تو ہوا پر تم پہ پتّا پڑ گئی
کھانا پہننا اوڑھنا اپنا گئیں سب بھول تم
بچوں کے دھندے میں تمہیں اپنی نہ کچھ سدھ بدھ رہی
تب تک بھی سمجھو خیر تھی جب تک بھلے چنگے تھے سب
پر سامنا آفت کا تھا گر ہو گیا ماندہ کوئی
سولی پہ دن کٹنے لگے راتوں کی نیندیں اڑ گئیں
اک اک برس کی ہو گئی اک ایک پل اک اک گھڑی
بچوں کی سیوا میں تمہیں گزرے ہیں جیسے دس برس
قدر اس کی جانے گا وہی دم پر ہو جس کے یوں بنی
کی ہے مہم جو تم نے سر، مردوں کو اس کی کیا خبر
جانے پرائی پیڑ وہ جس کی بوائی ہو پھٹی[2]
تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا

آخر یہ اے دکھیاریو خدمت تمہارے سر پڑی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

io

ا۔ جاپا: زچگی۔
۲۔ بوائی پھٹنا: ایڑی پھٹنے یا ایڑی میں خراش پڑنے کی تکلیف۔ ضرب المثل: جس کی پھٹی نہ ہو بوائی، کیا جانے پیڑ پرائی۔

لیتیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر چھٹپن میں یاں
خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہو جاتا جہاں
یہ گوشت کا اک لوتھڑا پروان چڑھتا کس طرح
چھاتی سے لپٹائے نہ ہر دم رکھتی گر بچے کو ماں
وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ اور پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دنیا میں نورِ حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرارِ زمین و آسماں
وہ شاہِ کشور گیر اسکندر کہ جس کی دھاک سے
تھے بید کی مانند لرزاں تاج دارانِ جہاں
وہ فخرِ شاہانِ عجم کسریٰ کہ جس کے عدل کی
مشرق سے تا مغرب زبانوں پر ہے جاری داستاں
کیا پھول پھل یہ سب انہی کمزور پودوں کے نہ تھے
سینچا تھا ماؤں نے جنہیں خونِ جگر سے اپنے یاں
کیا صوفیانِ با صفا ، کیا عارفانِ با خدا
کیا اولیا کیا انبیا ، کیا غوث کیا قطبِ زماں
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے

وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

io

افسوس ! دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
اکثر تمہارے قتل پر قوموں نے باندھی ہے کمر
دیں تاکہ تم کو یک قلم خود لوحِ ہستی سے مٹا
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا مگر کوئی نہ جز ذاتِ خدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاہی گئیں اس وقت تم ، جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانو اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
گزری اُمید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ
بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائیگاں
کیں تم نے جانیں تک فدا کہلائیں پھر بھی بے وفا
گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یاں
پر جو فرشتے سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یاں

io

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے گزر
زیبا ہے گر کہیے تمہیں فخرِ بنی نوعِ بشر
جو سنگ دل سفاک پیاسے تھے تمہارے خون کے
اُن کی تو ہیں بے رحمیاں مشہور عالم میں مگر

تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ
شوہر ہوں اس میں یا پدر ، یا ہوں برادر یا پسر
الفت تمہاری کر گئی گھر دل میں جس بے دید کے
وہ بد گماں تم سے رہا اے بد نصیبوں عمر بھر
گو نیک مرد اکثر تمہارے نام کے عاشق رہے
پر نیک ہوں یا بد ، رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گم نام دنیا میں رہو
ہو تم کو دنیا کی ، نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سر بسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہو گا ان حق تلفیوں کا واں جواب

io

گزرے تھے جگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں
تھا منحرف تم سے فلک ، برگشتہ تھی تم سے زمیں
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں
یاں تک تمہاری ہجو کے گائے گئے دنیا میں راگ
تم کو بھی دنیا کی کہن کا آ گیا آخر یقیں
علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہو گئیں مایوس تم
سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہ تھیں

جو ذلتیں لازم ہیں دنیا میں جہالت کے لیے
وہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں
سمجھا نہ تم کو ایک دن مردوں نے قابل بات کے
تم بے وفا کہلائیں لیکن لونڈیاں بن کر رہیں
آخر تمہاری چپ دلوں میں اہل دل کے چبھ گئی
سچ ہے کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
بارے زمانہ نیند کے ماروں کو لایا ہوش میں
آیا تمہارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں

io

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
انصاف نے دھندلی سی اک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر حل ہر اک مشکل یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سدا سچائی کی
پر فتح جب پائی ہے سچائی نے آخر پائی ہے
اے بے زبانوں کی زبانو ، بے بسوں کے بازوؤ
تعلیم نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے
یہ مرحلہ آیا ہے تم سے پہلے جن قوموں کو پیش
منزل پہ گاڑی ان کی استقلال نے پہنچائی ہے
ہے رائی بھی پربت اگر دل میں نہیں عزمِ درست
پر ٹھان لی جب جی میں پھر پربت بھی ہو تو رائی ہے
یہ جیت بھی کیا کم ہے خود حق ہے تمہاری پشت پر
جو حق پہ منہ آیا ہے آخر اس نے منہ کی کھائی ہے
جو حق کے جانب دار ہیں بس اُن کے بیڑے پار ہیں
بھوپال کی جانب سے یہ ہاتف کی آواز آئی ہے

ہے جو مہم در پیش دستِ غیب ہے اس میں نہاں
تائیدِ حق کا ہے نشاں امدادِ سلطانِ جہاں [1]

io

---

[1] مراد نواب سلطان جہاں بیگم، والیہ ریاست بھوپال جو تحریک۔ تعلیم نسواں کی سب سے بڑی سرپرست تھیں اور بھوپال کے باہر بھی خواتین کی اصلاح و تعلیم پر توجہ فرماتی رہیں۔ نظم کے آخری بند میں شاعر نے اُن دشواریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام مخالفت کی وجہ سے اس تحریک کے علم برداروں کی راہ میں حائل تھیں۔ بالآخر ڈاکٹر شیخ عبداللہ اور اُن کے رفقا کی کوششوں سے علی گڑھ میں ایک گرلز ہائی سکول قائم ہوا۔ 1905ء میں اس تحریک کی اشاعت کی غرض سے رسالہ ''خاتون'' (علی گڑھ) جاری کیا گیا۔ 1906ء میں نواب سلطان جہاں بیگم کی مالی امداد سے مسلمان طالبات کے لیے ایک بورڈنگ ہاؤس بھی تعمیر ہو گیا۔ (ا ص)

باب دہم

قومی اور ملی نظمیں

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا

رباعی

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا [1] دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد [2] ہے ہر جزر [3] کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

۱۔ ابھرنا: پستی سے نکلنا۔ ۲۔ مد: چڑھاؤ۔ترقی ۳۔ جزر: اتار۔تنزل

1

مسدس

مد و جزر اسلام

کسی نے یہ بقراط[1] سے جا کے پوچھا مرض تیرے نزدیک مہلک[2] ہیں کیا کیا
کہا "دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان[3] سمجھیں

سبب یا علامت گر اُن کو سمجھائیں تو تشخیص[4] میں سو نکالیں خطائیں
دوا اور پرہیز سے جی چرائیں یونہیں رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں
طبیبوں سے ہرگز نہ مانوس ہوں وہ
یہاں تک کہ جینے سے مایوس ہوں وہ"

یہی حال دنیا میں اُس قوم کا ہے بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دُور اور طوفاں بپا ہے گماں[5] ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہلِ کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہلِ کشتی

گھٹا سر پہ ادبار[6] کی چھا رہی ہے فلاکت[7] سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست[8] پس و پیش منڈلا رہی ہے چپ و راست[9] سے یہ صدا آ رہی ہے

۱۔ بقراط حکیم تھا جو شام کے شہر حمص میں رہتا تھا۔ یہ حکیم سکندر اعظم سے سو سال قبل گزرا ہے۔ عربی زبان میں سب سے پہلے اسی کی طبی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔

۲۔ مہلک: مار ڈالنے والا۔
۳۔ ہذیان: بے ہودہ اور بے کار باتیں۔
۴۔ تشخیص: بیماری کی شناخت۔
۵۔ گماں: امکان، خدشہ۔
۶۔ ادبار: نحوست، مفلسی۔
۷۔ فلاکت: مفلسی، ناداری۔

۸۔ پس وپیش: آگے پیچھے۔ ۹۔ چپ وراست: بائیں دائیں۔

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

پر اُس قوم غافل کی غفلت وہی ہے تنزل [۱] پہ اپنے قناعت [۲] وہی ہے
ملے خاک میں پر رعونت [۳] وہی ہے ہوئی صبح اور خواب راحت وہی ہے
نہ افسوس اُنہیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

بہائم [۴] کی اور اُن کی حالت ہے یکساں کہ جس حال میں ہیں اُسی میں ہیں شاداں [۵]
نہ ذلت سے نفرت نہ عزت کا ارماں نہ دوزخ سے ترساں [۶] نہ جنت کے خواہاں
لیا عقل و دیں سے نہ کچھ کام انہوں نے
کیا دینِ برحق کو بدنام انہوں نے

وہ دیں جس نے اعدا [۷] کو اخواں بنایا وحوش [۸] اور بہائم کو انساں بنایا
درندوں کو غم خوارِ دَوراں بنایا گڈریوں کو عالم کا سلطاں بنایا
وہ خطہ جو تھا ایک ڈھوروں [۹] کا گلہ
گراں [۱۰] کر دیا اُس کا عالم سے پلہ

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا جہاں سے الگ اک جزیرہ [۱۱] نما تھا
زمانے سے پیوند جس کا جدا تھا نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا

۱۔ تنزل: پستی۔ ۲۔ قناعت: اپنی حالت پر راضی رہنا۔
۳۔ رعونت: غرور۔ ۴۔ بہائم: جانور۔
۵۔ شاداں: خوش، مسرور۔ ۶۔ ترساں: خوف زدہ۔
۷۔ قرآن کی اُس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ تم دشمن تھے تو خدا نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور تم اُس

کے فضل سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے۔
۸۔ وحوش: حیوانات۔ ۹۔ ڈھوروں: مویشیوں۔
۱۰۔ گراں کردیا: وزنی کردیا۔ ۱۱۔ جزیرہ: خشکی کا وہ خطہ جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف خشکی ہو۔

۱۔ تمدن کا اُس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا
نہ آب و ہوا ایسی تھی روح پرور ۲۔ کہ قابل ہی پیدا ہوں خود جس سے جوہر
نہ کچھ ایسے سامان تھے واں میسر کنول جس سے کھل جائیں دل کے سراسر
نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی
فقط آب باراں ۳۔ پہ تھی زندگانی
زمیں سنگلاخ ۴۔ اور ہوا آتش افشاں ۵۔ لوؤں کی لپٹ بادِ ۶۔ صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں ۷۔
نہ کھیتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اُس کی یہ تھی
نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی خدا کی زمیں بن سر بسر تھی
پہاڑ اور صحرا ۸۔ میں ڈیرہ تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا
کہیں آگ پجتی ۹۔ تھی واں بے محابا ۱۰۔ کہیں تھا کواکب پرستی ۱۱۔ کا چرچا
بہت سے تھے تثلیث ۱۲۔ پر دل سے شیدا بتوں کا عمل سو بسو ۱۳۔ جا بجا تھا

۱۔ تمدن: تہذیب۔ ۲۔ روح پرور: روح کو ترقی دینے والی۔
۳۔ آبِ باراں: بارش کا پانی۔ ۴۔ سنگلاخ: پتھریلی۔

۵۔ آتش افشاں: آگ بکھیرنے والی۔
۶۔ بادِصرصر: آندھی کی تیز ہوا۔
۷۔ خارِمغیلاں: ببول کے کانٹے۔
۸۔ ڈیرہ: خیمہ، سکونت، قیام۔
۹۔ آگ پجتی: آگ کا پوجنا۔
۱۰۔ بےمحابا: بےخوف۔
۱۱۔ کواکب: تارے۔
۱۲۔ تثلیث: تین خداؤں کو ماننا، عیسائیت۔
۱۳۔ سوبسو: ہر طرف۔

کرشموں کا راہب [۱] کے تھا صید [۲] کوئی
طلسموں [۳] میں کاہن [۴] کے تھا قید کوئی

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا [۵] خدا کا　　خلیل [۶] ایک معمار تھا جس [۷] بنا کا
[۸] ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا　　کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدیٰ کا [۹]

وہ [۱۰] تیرتھ تھا اک بُت پرستوں کا گویا
جہاں نامِ حق کا نہ تھا کوئی جویا

قبیلے قبیلے کا اک بت جدا تھا　　کسی کا ہبل [۱۱] تھا کسی کا صفا [۱۱] تھا
یہ عزا [۱۱] پہ وہ نائلے [۱۱] پر فدا تھا　　اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا

نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور
اندھیرا تھا فاران [۱۲] کی چوٹیوں پر

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ　　ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ　　نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ [۱۳]

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے [۱۴]

۱۔ راہب: عیسائی زاہد، تارک الدنیا۔
۲۔ صید: شکار۔
۳۔ طلسموں: جادوگری، ساحری
۴۔ کاہن: فال دیکھنے والا، جادوگر۔ زمانہ جاہلیت میں عرب میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ صائبین آگ اور ستاروں کی پوجا کرتے، عیسائی تثلیث کے قائل اور قریش بتوں کی پرستش کرتے تھے۔
۵۔ سب سے پہلا گھر سے مراد خانہ کعبہ ہے جو بیت المقدس سے ایک ہزار سال قبل اور ولادت عیسیٰ g سے دو

ہزار سال قبل تعمیر ہو چکا تھا۔
۶۔ خلیل: سے مراد حضرت ابراہیم ؑ ہیں۔ ۷۔ بنا: عمارت۔
۸۔ ازل: ابتدا۔ ۹۔ چشمہ ہدیٰ: ہدایت کا چشمہ۔
۱۰۔ تیرتھ: ہندوؤں کی زیارت گاہیں۔ ۱۱۔ ہبل، صفا، عزا اور نائلے بتوں کے نام ہیں۔
۱۲۔ فاران: مکہ کا پہاڑ۔ ۱۳۔ تازیانہ: کوڑا۔
۱۴۔ بے باک: نڈر۔

نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اَڑ بیٹھتے تھے
تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا [۱]
تو اُس سے بھڑک اُٹھتا تھا ملک سارا

صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی وہ بکر [۲] اور تغلب کی باہم لڑائی
تھی اک آگ ہر سُو عرب میں لگائی قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک اُن کی جہالت کا تھا وہ

کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا [۳] لبِ جُو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا
یونہیں روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یونہیں چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

عرب میں لقب حرب واحس [۴] ہے جس کا [۵] اسی طرح اک اور خوں ریز بیدا
بہا خون کا ہر طرف جس میں دریا رہا ایک مدت تک آپس میں برپا
سبب اس کا لکھا ہے یہ اصمعی نے
کہ گھوڑ دوڑ میں مبند کی تھی کسی نے

۱۔ شرارا: شعلہ۔
۲۔ بنی بکر اور بنی تغلب دو قبیلوں کی لڑائی بہت مدت تک ہوتی رہی جس میں ستر (70) ہزار افراد مارے گئے۔

ان دونوں قبیلوں کی جنگ کی وجہ صرف ایک معمولی سا واقعہ تھا جہاں ایک عورت نے اونٹ کو کھیت میں مارا، اونٹ کے مالک نے اُس عورت کی چھاتی زخمی کر دی۔

۱۳۔ لبِ جُو: نہر کا کنارہ۔

۱۴۔ یہ بند بعض مسدس کے نسخوں میں نہیں۔ اصمعی جو دورِ جاہلیت کے قصوں کا راوی ہے لکھتا ہے واحس ایک تیز رفتار گھوڑا تھا جو گھوڑ دوڑ میں آگے بڑھ رہا تھا کہ کسی شخص نے اُسے ڈرا دیا اس پر 568 عیسوی سے اسلام کے نزول تک لڑائیاں ہوتی رہیں اور قبیلے کے قبیلے کٹ مر گئے۔

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دُختر   تو خوفِ شماتت [۱] سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور [۲]   کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اُس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جُوا اُن کی دن رات کی دل لگی تھی   شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
[۳] تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی   غرض ہر طرح اُن کی حالت بُری تھی
بہت اس طرح اُن کو گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

یکا یک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت   بڑھا جانبِ بوقبیس [۴] ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا [۵] نے کی وہ ودیعت   چلے آئے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ [۶] سے ہویدا
دعائے خلیل [۷] اور نویدِ مسیحا [۸]

ہوئے محو [۹] عالم سے آثارِ ظلمت   کہ طالع [۱۰] ہوا ماہِ بُرجِ سعادت [۱۱]
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت   کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت

۱۔ شماتت: بے عزتی، ذلت۔
۲۔ تیور: اخلاق
۳۔ تعیش: عیش پسندی۔
۴۔ بوقبیس: پہاڑ جس کے نیچے مکہ آباد ہے۔
۵۔ مکہ کی سنگلاخ زمین۔
۶۔ آمنہ بنت وہب حضور a کی ماں تھیں۔
۷۔ خلیل: سیدنا ابراہیم g۔

۸۔ نویدِ مسیحا: حضرت عیسیٰ g کی خوشخبری۔ یہاں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں حضور a نے فرمایا ہے کہ میں اپنے دادا سیّدنا ابراہیم g کی دعا اور اپنے بھائی عیسیٰ g کی بشارت ہوں۔ حضرت عیسیٰ g نے انجیل یوحنا کے سولھویں باب میں اپنی امت کو بشارت دی تھی کہ میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام فارقلیط (یعنی احمد) ہو گا۔

۹۔ محو: غائب ہونا۔

۱۰۔ طالع: طلوع ہونا۔

۱۱۔ بُرجِ سعادت: مقامِ عزت۔

۱۔ پہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا ۲۔ سے

وہ نبیوں میں رحمت ۳۔ لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ۴۔ ضعیفوں کا ماویٰ ۵۔
یتیموں کا والی ۶۔ غلاموں کا مولیٰ ۷۔

خطا کار سے درگزر کرنے والا — بد ۸۔ اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد ۹۔ کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و ۱۰۔ شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ۱۱۔ ساتھ لایا

مسِ ۱۲۔ خام کو جس نے کندن ۱۳۔ بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں ۱۴۔ سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمی — نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اُس کے جوہر تھے اصلی — ہوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی

۱۔ چالیسویں سال: یہاں بعثت مراد ہے جو چالیسویں سال ہوئی۔

۲۔ مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ ہے جس کے غارِ حرا میں حضور a ذکر و فکر کرتے تھے اور سب سے

پہلے وحی وہیں نازل ہوئی۔
۳۔ یہاں آیت قرآن کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے آپ (a) تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔
۴۔ ملجا: پناہ گاہ۔ ۵۔ ماویٰ: ٹھکانہ۔
۶۔ والی: سرپرست۔ ۷۔ مولیٰ: آقا۔
۸۔ بداندیش: براسوچنے والا۔ ۹۔ مفاسد: فسادات۔
۱۰۔ شیر و شکر: محبت اور اتحاد۔ ۱۱۔ نسخۂ کیمیا: قرآن مجید کا استعارہ ہے۔
۱۲۔ مسِ خام: کچا تانبا۔ ۱۳۔ کندن: خالص سونا۔
۱۴۔ قرنوں: صدیوں۔

یہ تھا ثبت [۱] علم قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا [۲] اک نظر میں

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسب فرمان [۳] داور سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر [۴]
یہ فرمایا سب سے کہ "اے آل غالب [۵]
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب" [۶]

کہا سب نے "قول آج تک کوئی تیرا کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا"
کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا؟
کہ فوجِ گراں [۷] پشت کوہِ صفا [۸] پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات [۹] پا کر"

کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے"
کہا "گر مری بات یہ دل نشیں ہے تو سن لو خلاف اس میں اصلاً نہیں ہے
کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنے والا"

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی [۱۰] عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غُل یہ پیغامِ حق سے

کہ گونج اُٹھے دشت وجبل ۱۱؎ نامِ حق سے

۱؎ ثبت علم قضاوقدر: تقدیرِ الٰہی میں لکھا جاچکا ہے۔ ۲؎ طلا: سونا۔
۳؎ حسب فرمان: حکم کے مطابق۔ ۴؎ کوہ صفا: مکہ کی پہاڑی۔
۵؎ آل غالب: غالب رسول اللہ ﷺ کے دادا کا نام ہے جو عدنان سے گیارہ پشت نیچے ہیں۔
۶؎ کاذب: جھوٹا۔ ۷؎ فوج گراں: بڑی طاقت ور فوج۔
۸؎ پشتِ کوہِ صفا: کوہ صفا کے پیچھے۔ ۹؎ گھات پانا: موقع پانا۔
۱۰؎ صوتِ ہادی: رہنما کی آواز۔ ۱۱؎ دشت وجبل: دشت اور پہاڑ۔

سبق پھر شریعت کا اُن کو پڑھایا حقیقت کا گُر اُن کو ایک ایک بتایا
زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا

کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیے ایک پردہ اُٹھا کر

کسی کو ازل ۱؎ کا نہ تھا یاد پیماں ۲؎ بھلائے تھے بندوں نے مالک کے فرماں
زمانے میں تھا دور صہبائے بطلاں ۳؎ مئے حق ۴؎ سے محرم ۵؎ نہ تھی بزمِ دوراں

اچھوتا تھا توحید کا جام اب تک
خُمِ معرفت ۶؎ کا تھا منھ خام ۷؎ اب تک

نہ واقف تھے انساں قضا اور جزا ۸؎ سے نہ آگاہ تھے مبدا و منتہا ۹؎ سے
لگائی تھی ایک اک نے لو ماسوا ۱۰؎ سے پڑے تھے بہت دور بندے خدا سے

یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا
یہ راعی ۱۱؎ نے للکار کر جب پکارا

کہ "ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اُسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق اُسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

لگاؤ تو لَو اُس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اُس کے آگے جھکاؤ

اُسی پر ہمیشہ بھروسا کرو تم اُسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم

اُسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم اُسی کی طلب میں مرو جب مرو تم

۱۔ ازل: ابتدا۔ ۲۔ پیماں: وعدہ۔
۳۔ صہبائے بطلان: باطل کی شراب۔ ۴۔ مئے حق: حق کی شراب۔
۵۔ محرم: واقف وآ گاہ۔ ۶۔ خُم معرفت: معرفت کی صراحی۔
۷۔ منھ خام: منہ بند تھا۔ ۸۔ قضا اور جزا: تقدیر اور ثواب۔
۹۔ مبدا و منتہا: ابتدا اور انتہا۔ ۱۰۔ ماسوا: اللہ کے علاوہ۔
۱۱۔ راعی: چرواہا۔

۱۔ ہے شرکت سے اُس کی خدائی
نہیں اُس کے آگے کسی کو بڑائی

خرد ۲۔ اور ادراک ۳۔ رنجور ۴۔ ہیں واں مہ و مہر ۵۔ ادنیٰ سے مزدور ہیں واں
جہاندار ۶۔ مغلوب و مقہور ۷۔ ہیں واں نبی اور صدیق ۸۔ مجبور ہیں واں

نہ پرستش ہے رہبان و احبار ۹۔ کی واں
نہ پروا ہے ابرار و احرار ۱۰۔ کی واں

تم اوروں کی مانند دھوکا نہ کھانا کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا

سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ ۱۱۔
اسی طرح ہوں میں بھی ایک اُس کا بندہ

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی ۱۲۔

اسی طرح دل اُن کا ایک اک سے توڑا ہر اک قبلہ کج ۱۳۔ سے منھ اُن کا موڑا
کہیں ماسوی کا علاقہ نہ چھوڑا خداوند سے رشتہ بندوں کا جوڑا

۱۔ : پاک، بری۔ ۲۔ خرد: عقل۔

۳۔ ادراک: محسوسات۔ ۴۔ رنجور: رنجیدہ۔

۵۔ مہ و مہر: چاند سورج۔ ۶۔ جہاندار: حکمران۔

۷۔ مغلوب و مقہور: شکست خوردہ اور زیر طاقت ہیں۔ ۸۔ صدیق: دوست۔

۹۔ رہبان و احبار: عیسائیوں کے درویش اور یہودیوں کے علما۔

۱۰۔ ابرار و احرار: نیک بندے اور آزاد بندے۔

۱۱۔ سرفگندہ: سر جھکائے ہوئے۔

۱۲۔ ایلچی: سفیر۔

۱۳۔ قبلہ کج: ٹیڑھے قبلے سے۔

کبھی کے جو پھرتے تھے مالک سے بھاگے
دیے سر اُن کے مالک کے آگے

پتا اصلِ مقصود ۱؎ کا پا گیا جب نشاں گنجِ دولت ۲؎ کا ہاتھ آ گیا جب
محبت سے دل اُن کو گرما گیا جب سماں اُن پہ توحید کا چھا گیا جب
سکھائے معیشت ۳؎ کے آداب اُن کو
پڑھائے تمدن کے سب باب ۴؎ اُن کو

جتائی انھیں وقت کی قدر و قیمت دلائی انھیں کام کی حرص و رغبت
کہا چھوڑ دیں گے سب آخر رفاقت ہو فرزند و زن اس میں یا مال و دولت
نہ چھوڑے گا پر ساتھ ہرگز تمہارا
بھلائی میں جو وقت تم نے گزارا

غنیمت ہے صحت علالت ۵؎ سے پہلے فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
جوانی بڑھاپے کی زحمت سے پہلے اقامت مسافر کی رحلت ۶؎ سے پہلے
فقیری سے پہلے غنیمت ہے دولت
جو کرنا ہے کر لو کہ تھوڑی ہے مہلت

یہ کہہ کر کیا علم پر اُن کو شیدا ۷؎ کہ "ہیں دُور رحمت سے سب اہلِ دنیا
مگر دھیان ہے جن کو ہر دم خدا کا ہے تعلیم کا یا سدا جن میں چرچا

انہیں کے لیے یاں ہے نعمت خدا کی
انہیں پر ہے واں جا کے رحمت خدا کی"

۱۔ اصل مقصود: اصلی مقصد۔ ۲۔ گنجِ دولت: دولت کا خزانہ۔
۳۔ معیشت: معاشرت۔ ۴۔ باب: درس۔
۵۔ علالت: بیماری۔ ۶۔ رحلت: موت۔
یہاں حالی نے تیسرے بند میں حضورa کی حدیث کو نظم کیا ہے۔
۷۔ شیدا: عاشق۔

سکھائی انہیں نوعِ[1] انساں پہ شفقت کہا "ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسائے سے رکھتے ہیں وہ شب و روز پہنچاتے ہیں اُس کو راحت
وہ جو حق سے اپنے لیے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لیے چاہتے ہیں

خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر پڑے غم کا سایہ نہ اُس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر"

ڈرایا سے اُن کو یہ کہہ کر کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر وہ "ساتھی ہمارا نہ ہم اُس کے یاور
نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرہ[2]
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

بچایا برائی سے اُن کو یہ کہہ کر کہ "طاعت سے ترکِ معاصی[3] ہے بہتر
تورّع[4] کا ہے ذات میں جن کی جوہر نہ ہوں گے کبھی عابد اُن کے برابر
کرو ذکر اہلِ ورع[5] کا جہاں تم
نہ لو عابدوں کا کبھی نام واں تم"

غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی کہ ''بازو سے اپنی کرو تم کمائی
خبر تاکہ لو اُس سے اپنی پرائی نہ کرنی پڑے تم کو دَر دَر گدائی
طلب سے ہے دنیا کی گریاں یہ نیت
تو چمکو گے واں ماہِ کامل کی صورت''

ا۔ نوعِ انساں: انسان جماعت۔ ۲۔ بہرہ: فایدہ۔
۳۔ ترکِ معاصی: گناہوں سے دوری۔ ۴۔ تورع: پرہیزگاری۔
۵۔ اہلِ ورع: پرہیزگار۔

امیروں کو تنبیہ کی اس طرح پر کہ ''ہیں تم میں جو اغنیا [۱] اور تونگر
اگر اپنے طبقے میں ہوں سب سے بہتر بنی نوع کے ہوں مددگار و یاور
نہ کرتے ہوں بے مشورت کام ہرگز
اُٹھاتے نہ ہوں بے دھڑک کام ہرگز
تو مُردوں سے آسودہ تر ہے وہ طبقہ زمانہ مبارک ملے جس کو ایسا
پہ جب اہلِ دولت ہوں اشرار [۲] دنیا نہ ہو عیش میں جن کو اوروں کی پروا
نہیں اُس زمانے میں کچھ خیر و برکت
اقامت سے بہتر ہے اُس وقت رحلت''
دیے پھیر دل اُن کے مکر و ریا سے بھرا اُن کے سینے کو صدق [۳] صفا سے
بچایا انہیں کذب [۴] سے افترا [۵] سے کیا سرخ رو خلق سے اور خدا سے
رہا قولِ حق میں نہ کچھ باک [۶] اُن کو
بس اک شوب [۷] میں کر دیا پاک اُن کو
کہیں حفظِ [۸] صحت کے آئیں سکھائے سفر کے کہیں شوق اُن کو دلائے
مفاد ان کو سوداگری کے سُجھائے اُصول اُن کو فرماندہی [۹] کے بتائے
نشاں راہ و منزل کا ایک اک دکھایا
بنی نوع کا اُن کو رہبر بنایا

ہوئی ایسی عادت پہ تعلیم غالب — کہ باطل کے شیدا ہوئے حق کے طالب
مناقب سے [10] بدلے گئے سب مثالب — ہوئے روح سے بہرہ ور اُن کے قالب [12]
[11]

---

[1] اغنیا: ثروت مند، امیر۔
[2] اشرار: بدمعاش، شریر۔
[3] صدق وصفا: سچے اور پاکیزہ۔
[4] کذب: جھوٹ۔
[5] افترا: بہتان۔
[6] باک: خوف، شک۔
[7] شوب: دھلائی۔
[8] حفظِ صحت: صحت کی حفاظت۔
[9] فرماندہی: حکومت کرنا۔
[10] مناقب: تعریفیں۔
[11] مثالب: عیب۔
[12] قالب: بدن۔

جسے راج رد کر چکے تھے وہ پتھر
ہوا جا کے آخر کو قائم سرے پر

جب امت کو سب مل چکی حق کی نعمت — ادا کر چکی فرض اپنا رسالت
رہی حق پہ باقی نہ بندوں کی حجت — نبی نے کیا خلق سے قصدِ رحلت

تو اسلام کی وارث اک قوم چھوڑی
کہ دنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

سب اسلام کے حکم بردار بندے — سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبی کے وفادار بندے — یتیموں کے رانڈوں کے غم خوار بندے

رہِ کفر و باطل سے بے زار سارے
نشے میں مئے حق [1] کے سرشار سارے

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے — کہانت [2] کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکامِ دیں پر جھکا دینے والے — خدا کے لیے گھر لٹا دینے والے

ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

اگر اختلاف اُن میں باہم دگر تھا — تو بالکل مدار [3] اُس کا اخلاص [4] پر تھا

جھگڑتے تھے لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا خلاف آشتی سے خوش آیندہ[5] تر تھا
یہ تھی موج پہلی اُس آزادگی کی
ہرا جس سے ہونے کو تھا باغ گیتی[6]

۱؎ مئے حق: حق کی شراب۔
۲؎ کہانت: جن اور شیاطین کے ذریعہ سے لوگوں کو غیب کی خبریں دینی یا جانوروں کی آواز سے شگون لینا۔ جاہلیت میں اور ابتدائے اسلام میں کاہن لوگ عرب میں بہت تھے مگر اسلام نے ان کو کالعدم کر دیا۔
۳؎ مدار: محور۔ ۴؎ اخلاص: خلوص۔
۵؎ خوش آیندتر: خوش تر۔ ۶؎ باغ گیتی: دنیا کا باغ۔

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت[1] نہ پوشش[2] سے مقصود تھی زیب و زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت
لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

خلیفہ تھے اُمت کے ایسے نگہباں ہو گلے کا جیسے نگہبان چوپاں[3]
سمجھتے تھے[3] ذمی و مسلم کو یکساں نہ تھا عبد و حر[3] میں تفاوت نمایاں
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی
زمانے میں ماجائی[4] بہنیں ہو جیسی

رہ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ اُن کی فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ[5] اُن کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ اُن کی شریعت کے قبضے میں تھی باگ اُن کی
جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ
جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ

کفایت جہاں چاہیے واں کفایت سخاوت جہاں چاہیے واں سخاوت
جچی اور تلی دشمنی اور محبت نہ بے وجہ الفت نہ بے وجہ نفرت
جھکا حق سے جو جھک گئے اُس سے وہ بھی

رکا حق سے جو رُک گئے اس سے وہ بھی

ترقی کا جس دم خیال اُن کو آیا   اک اندھیر تھا رُبع [6] مسکوں میں چھایا
ہر اک قوم پر تھا تنزل کا سایہ   بلندی سے تھا جس نے سب کو گرایا

ا۔ کلفت: زحمت۔
۲۔ پوشش: کپڑے۔
۳۔ چوپان: چرواہا۔
۴۔ ماجائی: سگی ماں کی طرح۔
۵۔ لاگ: محبت۔
۶۔ ربع مسکوں: ایک چوتھائی خشکی کا حصہ جس پر لوگ بستے ہیں، مراد دنیا۔

وہ نیشن [1] جو ہیں آج گردوں [2] کے تارے
دھند لکے میں پستی کے پنہاں تھے سارے

نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں [3] کا   نہ یہ بخت و اقبال نصرانیوں [4] کا
پرا گندہ [5] دفتر تھا یونانیوں کا   پریشاں تھا شیرازہ [6] ساسانیوں [7] کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا
چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا

ادھر ہند میں ہر طرف تھا اندھیرا   کہ تھا گیان [8] گن کا لدا یاں سے ڈیرا
ادھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا   کہ دل سب نے کیش و کنش سے [9] تھا پھیرا
نہ بھگوان کا دھیان تھا گیانیوں [10] میں
نہ یزداں [11] پرستی تھی یزدانیوں [12] میں

ہوا ہر طرف موج زن تھی بلا کی   گلوں پر چھری چل رہی تھی جفا کی
عقوبت [13] کی حد تھی نہ پرسش خطا کی   پڑی لٹ رہی تھی ودیعت [14] خدا کی
زمیں پر تھا ابرِ ستم کا دڑیڑا [15]
تباہی میں تھا نوع انساں کا بیڑا

وہ قومیں جو ہیں آج غم خوار انساں — درندوں کی اور اُن کی طینت [16] تھی یکساں
جہاں عدل کے آج جاری ہیں فرماں — بہت دور پہنچا تھا واں ظلم و طغیاں

[1] نیشن: قوم — [2] گردوں: فلک، آسمان۔
[3] عبرانیوں: یہودیوں۔ — [4] نصرانیوں: عیسائیوں۔
[5] پراگندہ: منتشر — [6] شیرازہ: کتاب کی پشت کا کپڑا۔
[7] ساسانیوں۔ ساسان پسرِ دارا۔ اس کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ہیں وہ ساسانی کہلاتے ہیں۔
[8] گیان گن: علم و ہنر۔ — [9] کیش و کنش: مذہب و کردار۔
[10] گیانیوں: عالموں۔ — [11] یزداں: خدا۔
[12] یزدانیوں: مجوسیوں۔ — [13] عقوبت: عذاب، سزا۔
[14] ودیعت: امانت۔ — [15] وڑیزا: بارش۔
[16] طینت: فطرت۔

بنے آج جو گلہ باں [1] ہیں ہمارے
وہ تھے بھیڑیے، آدمی خور [2] سارے

ہنر کا جہاں گرم بازار ہے اب — جہاں عقل و دانش کا بیوپار [3] ہے اب
جہاں ابر رحمت گہر بار [4] ہے اب — جہاں ہُن [5] برستا لگاتار ہے اب

تمدن کا پیدا نہ تھا واں نشاں تک
سمندر کی آئی نہ تھی موج واں تک

نہ رستہ ترقی کا کوئی کھلا تھا — نہ زینہ بلندی پہ کوئی لگا تھا
وہ صحرا انہیں قطع کرنا پڑا تھا — جہاں نقش پا تھا نہ شورِ درا [6] تھا

جو ہیں کان میں حق کی آواز آئی
لگا کرنے خود اُن کا دل رہنمائی

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی — پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اُس کی پہنچی — جو ٹیگس [7] پہ گرجی تو گنگا پہ برسی

رہے اُس سے محروم آبی نہ خاکی

ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

کیا [8] نے جہاں میں اُجالا   ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا   ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا

۱۔ گلہ باں: رہنما، چرواہا۔
۲۔ آدمی خور: آدمی کو کھانے والا۔
۳۔ بیوار: لین دین، بیوپار۔
۴۔ گہربار: جواہر نچھاور کرنے والا۔
۵۔ ہن: سونے کا سکہ۔
۶۔ شوردرا: گھنٹی کی آواز جو قافلہ کے جانوروں کے گردن میں ڈالتے ہیں۔
۷۔ ٹیگس: اسپین کا دریا۔
۸۔ : مکہ کے رہنے والے (ام القریٰ یعنی مکہ)۔

زمانے میں پھیلائی توحید مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آواز حق حق

ہوا غلغلہ نیکیوں کا بدوں میں   پڑی کھل بلی کفر کی سرحدوں میں
ہوئی آتش افسردہ آتشکدوں میں   لگی خاک سی اُڑنی سب معبدوں میں

ہوا کعبہ آباد سب گھر اُجڑ کر
جمے ایک جا سارے دنگل بچھڑ [1] کر

لیے علم و فن ان سے نصرانیوں [2] نے   کیا کسب اخلاق رُوحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں [3] نے   کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں [4] نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریخ چھوڑا

ارسطو [5] کے مردہ فنوں کو جلایا   فلاطون [6] کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر قریے [7] کو یوناں بنایا   مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا

کیا برطرف پردہ چشم جہاں سے

جگایا زمانے کو خوابِ [۸] گراں سے

ہر اک میکدے سے بھرا جا کے ساغر ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہوکر

گرے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیغمبر a

کہ ''حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو

جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو''

ا۔ دنگل: لڑنے کی جگہ۔ ۲۔ نصرانیوں: عیسائیوں۔

۳۔ صفاہانیوں: اصفہان ایران کے لوگ۔ ۴۔ یزدانیوں: مجوسیوں۔ (آگ پوجنے والے)

۵۔ ارسطو یونان کا فلاسفر اور حکیم تھا۔ وہ افلاطون کا شاگرد جو 362 سال قبل از مسیح 63 سال کی عمر میں مرا۔ وہ سکندر کا استاد بھی رہا ہے۔

۶۔ افلاطون یونانی تھا اور سقراط کا شاگرد تھا۔ اس نے اکیاسی برس عمر پائی۔

۷۔ قریہ: گاؤں۔ ۸۔ خوابِ گراں: گہری نیند۔

ہر اک علم کے فن کے جویا [۱] ہوئے وہ ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ

فلاحت [۲] میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوئے وہ

ہر اک ملک میں اُن کی پھیلی عمارت

ہر اک قوم نے اُن سے سیکھی تجارت

کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں مہیا کیے سب کے راحت کے ساماں

خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں انہیں کر دیا رشکِ صحنِ گلستاں

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے

یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں [۳] دو طرفہ برابر درختوں کا سایہ

نشاں جا بجا میل و فرسخ کے برپا سرِ رہ کنوئیں اور سرائیں [۴] مہیا

انہیں کے ہیں سب نے یہ چربے [۵] اُتارے

اُسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے

سدا اُن کو مرغوب سیر و سفر تھا ہر اک براعظم میں اُن کا گزر تھا
تمام اُن کا چھانا ہوا بحر و بر تھا جو لنکا میں ڈیرا تو بربر[6] میں گھر تھا
وہ گنتے تھے یکساں وطن اور سفر کو
گھر اپنا سمجھتے تھے ہر دشت و در[7] کو

۱۔ جویا ہونا: تلاش کرنا۔ ۲۔ فلاحت: کھیتی باڑی۔
دوسرے بند کے آخری شعر میں حالیؔ نے حضور a کی حدیث نظم کی ہے۔ (حکمت مسلمان کی گم شدہ شے ہے پس جہاں کہیں اس کو پائے تو وہی اس کا مستحق ہے)
۳۔ مصفا: صاف ستھرا۔ ۴۔ سرائیں۔ مسافر خانے۔
۵۔ چربے: نقلیں، نقشے۔ ۶۔ بربر: صحرا افریقہ کا شمالی شہر۔
۷۔ دشت و در: صحرا اور وادی۔
شیر شاہ سوری کے دورِ حکومت میں جو عمدہ سڑک بنوائی گئی تھی حالیؔ اس کا خاکہ پیش کر رہے ہیں۔ جہاں ہر سات میل پر مسافر خانہ، سڑک کے دو جانب بلند سایہ دار درخت، مسجدیں، غسل خانے اور باغات بنائے گئے تھے۔

جہاں کو ہے یاد اُن کی رفتار اب تک کہ نقشِ قدم ہیں نمودار اب تک
ملایا[1] میں ہیں اُن کے آثار اب تک انہیں رو رہا ہے ملیبار[2] اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات اُن کے ازبر[3]
نشان ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر[4]

نہیں اس طبق[5] پر کوئی بر اعظم نہ ہوں جس میں اُن کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم[6] بناؤں[7] سے ہیں اُن کی معمور[8] عالم
سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا[9]
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے اُن کا

وہ سنگیں محل اور وہ اُن کی صفائی جمی جن کے کھنڈروں پہ ہے آج کائی
وہ مرقد کہ گنبد تھے جن کے طلائی وہ معبد جہاں جلوہ گر تھی خدائی
زمانے نے گو ان کی برکت اُٹھالی
نہیں کوئی ویرانہ پر اُن سے خالی

ہوا اندلس ۱۰؎ اُن سے گلزار یکسر — جہاں اُن کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر — یہ ہے بیتِ حمرا ۱۱؎ کی گو بازیاں پر

۱؎ ملایا: جزیرہ نما ہندو چین کا جنوبی حصہ۔
۲؎ ملیبار: ہندوستان کا جنوب مغربی ساحل (مالابار)
۳؎ ازبر: زبانی یاد رہنا۔
۴؎ جبرالٹر: یہ جبل الطارق ہے جسے عبدالرحمان کے غلام طارق نے اندلس کی مہم پر فتح کیا تھا۔
۵؎ طبق: زمین کا کرہ۔
۶؎ دیلم: ایران شمالی کا پہاڑی حصہ۔
۷؎ بناؤں: عمارتوں۔
۸؎ معمور: بھرپور۔
۹؎ کوہ بیضا: اندلس کا پہاڑ جس کی چوٹی برف سے سفید رہتی ہے۔
۱۰؎ اندلس: اسپین جہاں سات سو برس عیسائی قوم مسلمانوں کے تحت رہی۔
۱۱؎ بیت حمرا: اندلس کا خوبصورت شاہی محل آج بھی محفوظ ہے۔

کہ تھے آلِ عدنان ۱؎ سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمین پر نشانی

ہویدا ۲؎ ہے غرناطہ ۳؎ سے شوکت اُن کی — عیاں ہے بلنسیہ ۴؎ سے قدرت اُن کی
بطلیوس ۵؎ کو یاد ہے عظمت اُن کی — ٹپکتی ہے قادس ۶؎ میں سرحسرت اُن کی

نصیب اُن کا اشبیلیہ ۷؎ میں ہے سوتا
شب و روز ہے قرطبہ ۸؎ اُن کو روتا

کوئی قرطبے کے کھنڈر جا کے دیکھے — مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے — خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ ۹؎ جہاں تھا — تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس میں عباسیوں ۱۰؎ کا نشاں تھا — عراق عرب جس سے رشکِ جناں ۱۱؎ تھا

۱۔ آلِ عدنان: خلفائے اندلس بنی امیہ سے تھے جو آلِ عدنان تھے۔
۲۔ ہویدا: ظاہر۔
۳۔ غرناطہ: گراناڈا اسپین کا علاقہ جس کو عرب غرناطہ کہتے ہیں۔
۴۔ بلنسیہ: اندلس کے مشرق میں خوبصورت شہر ہے جو باغوں اور نہروں سے بھرا ہے۔
۵۔ بطلیوس: قرطبہ اندلس کے شمال مغرب کا شہر جس میں شاہوں نے عالی شان عمارتیں بنوائیں۔
۶۔ قادس: انگریزی میں اس کو کیڈس کہتے ہیں یہ ایک چھوٹا خوبصورت جزیرہ ہے۔
۷۔ اشبیلیہ: اندلس کا پائے تخت تھا۔
۸۔ قرطبہ: اس کو کورڈوبا کہتے ہیں یہاں دنیا کی قدیم اور عظیم ترین مسجد ہے جسے گرجا بنادیا گیا ہے لیکن ابھی ایک آدھ محراب باقی ہے۔ علامہ نے قرطبہ کے کھنڈر جاکے دیکھے اور ایک شاہکار نظم قرطبہ لکھی۔
۹۔ بلادِ جہاں: دنیا کے شہر۔
۱۰۔ عباسیوں: بنی عباس (مسلمان خلیفے)
۱۱۔ جناں: جنت

اُڑا لے گئی بادِ پندار [۱] جس کو
بہا لے گئی سیلِ تاتار [۲] جس کو

سنے گوشِ عبرت سے گر جا کے انساں تو واں ذرہ ذرہ یہ کرتا ہے اعلاں
کہ تھا جن دنوں مہر [۳] اسلام تاباں [۴] ہوا یاں کی تھی زندگی بخش دوراں

پڑی خاکِ ایتھنز [۵] میں جاں یہیں سے
ہوا زندہ پھر نام یوناں یہیں سے

وہ لقمان [۶] و سقراط کے در مکنوں [۷] وہ اسرار بقراط و درس فلاطوں
ارسطو کی تعلیم سولن [۸] کے قانوں پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں

یہیں آ کے مہرِ سکوت اُن کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا [۹] سے بو اُن کی پھوٹی

یہ تھا علم پرواں توجہ کا عالم کہ ہو جیسے مجروح [۱۰] جویائے مرہم [۱۱]
کسی طرح پیاس اُن کی ہوتی نہ تھی کم بجھاتا تھا آگ اُن کی باراں نہ شبنم

[۱۲] حریمِ خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

۱۔ پندار: غرور۔
۲۔ سیلِ تاتار: تاتاریوں کے لشکر۔
۳۔ مہر: سورج
۴۔ تاباں: چمکتا ہوا
۵۔ ایتھنز: یونان کا شہر۔
۶۔ لقمان: یونان کا حکیم جو چھے سو سال از مسیح زندگی بسر کرتا تھا اسے لامذہبی کے جرم میں پہاڑ سے نیچے گرا کر قتل کیا گیا۔ اس کی کہانیاں جو عرب میں امثال لقمان کے نام سے مشہور ہیں جس کے بارے میں یورپ کے مورخ لکھتے ہیں کہ انھی کہانیوں نے یورپ وحشی کو مہذب بنایا۔
۷۔ درِمکنون: یکتا موتی۔ ۸۔ سولن: ایتھنز یونان کا رہنے والا تھا جو قانون داں تھا۔
۹۔ رعنا: زیبا۔ ۱۰۔ مجروح: زخمی
۱۱۔ جویائے مرہم: مرہم کے طلب گار۔ ۱۲۔ حریمِ خلافت: سلطنت خلافت۔

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن[۱] پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غروب روشن
نوشتوں[۲] سے ہیں جن کے اب تک مزین کتب خانہ پیرس و روم و لندن
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

وہ سنجار[۳] کا اور کوفے کا میداں فراہم ہوئے جس میں [۴] دوراں
کُرے کی مساحت کے پھیلائے ساماں ہوئی جزو سے قدر کُل کی نمایاں
زمانہ وہاں آج تک نوحہ گر ہے
کہ عباسیوں کی سبھا[۵] وہ کدھر ہے

سمرقند[۶] سے اندلس تک سراسر انہیں کی رصد گاہیں[۷] تھیں جلوہ گستر[۸]
سوادِ مراغہ[۹] میں اور قاسیوں[۱۰] پر زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

مورخ ہیں جو آج تحقیق والے [11]کے ہیں جن کے آئیں نرالے
جنھوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے زمیں کے طبق سر بسر چھان ڈالے

عرب ہی نے دل اُن کے جا کر ابھارے
عرب ہی سے وہ بھرنے سیکھے ترارے [12]

ا۔ لمعہ افگن: شعلے بکھیرنے والے۔ ۲۔ نوشتوں: مکتوب، کتابیں۔
۳۔ سنجار: مابین دجلہ اور فرات ایک قدیم شہر۔ ۴۔ : فاصلے ناپنے والے انجینئر۔
۵۔ سبھا: محفل ۶۔ سمرقند: ترکمانستان کا ایک تاریخی شہر۔
۷۔ رصدگاہیں: لیبارٹریز جو علوم نجوم اور افلاک شناسی میں مدد دیتی ہیں۔
۸۔ جلوہ گستر: نمایاں۔
۹۔ مراغہ: آذربائیجان ایران کے پہاڑ پر ہلاکو خان کے حکم سے نصیر الدین طوسی کی سرپرستی میں رصدگاہ بنوائیں گئی۔
۱۰۔ دمشق کے شمال میں پہاڑ پر مامون رشید نے رصدگاہ بنوائی تھی جسے قاسیوں کے پہاڑ پر تکمیل کیا گیا۔
۱۱۔ : جستجو کرنا۔ ۱۲۔ ترارے: جست، چستی۔

اندھیرا تواریخ پر چھا رہا تھا ستارہ روایت کا گہنا [1] رہا تھا
درایت [2] کے سورج پہ ابر آ رہا تھا شہادت کا میدان دُھندلا رہا تھا

سرِ رہ چراغ اک عرب نے جلایا
ہر اک قافلے کا نشاں جس سے پایا

گروہ ایک جویا [3] تھا علم نبی کا لگایا پتہ جس نے ہر مفتری [4] کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ [5] کذب خفی [6] کا کیا قافیہ [7] تنگ ہر مدعی [8] کا

کیے جرح و تعدیل [9] کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں [10]

اسی دُھن میں آساں کیا ہر سفر کو اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازنِ علم دیں [11] جس بشر کو لیا اُس سے جا کر خبر اور اثر [12] کو

پھر آپ اُس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزہ اُس کا چکھ کر

کیا فاش [۱۳] راوی میں جو عیب پایا — مناقب [۱۴] کو چھانا مثالب [۱۵] کو تایا
مشائخ میں جو قبح [۱۶] نکلا جتایا — ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع [۱۷] ہر مقدس کا توڑا
نہ مُلّا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

۱۔ گہنا: گہن لگنا، تاریک ہونا۔
۲۔ درایت: دانائی۔
۳۔ جویا: جستجو کرنے والا۔
۴۔ مفتری: حدیثیں گھڑنے والا۔
۵۔ رخنہ: شگاف۔
۶۔ کذبِ مخفی: چھپا ہوا جھوٹ۔
۷۔ قافیہ تنگ کرنا: بحث و مباحثہ کرنا۔
۸۔ : دعویٰ کرنے والا۔
۹۔ جرح و تعدیل: بحث اور دلیل۔
۱۰۔ افسوں: فسانہ گری۔
۱۱۔ خازنِ علمِ دیں: علم دین کا خزانچی۔
۱۲۔ خبر اور اثر: حدیث کی قسمیں۔
۱۳۔ فاش: اعلان۔
۱۴۔ مناقب: خوبیاں۔
۱۵۔ مثالب: عیوب۔
۱۶۔ قبح: عیب۔
۱۷۔ طلسم ورع: تقویٰ کا ڈھونگ۔

رجال [۱] اور اسانید [۲] کے جو ہیں دفتر — گواہ اُن کی آزادگی کے ہیں یکسر [۳]
نہ تھا اُن کا احساں یہ اک اہلِ دیں پر — وہ تھے اس میں ہر قوم و ملت کے رہبر
[۴] لبرٹی میں جو آج فائق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل [۵] بنے ہیں وہ کب سے

فصاحت کے دفتر تھے سب گاؤ خوردہ [۶] — بلاغت کے رستے تھے سب ناسپردہ [۷]
اُدھر روم کی شمع انشا [۸] تھی مردہ — اِدھر آتش پارسی [۹] تھی فسردہ
یکا یک جو برق آ کے چمکی عرب کی
کھلی کی کھلی رہ گئی آنکھ سب کی

عرب کی جو دیکھی وہ آتش زبانی — سنی برمحل اُن کی شیوا بیانی [۱۰]
وہ اشعار کی دل میں ریشہ دوانی [۱۱] — وہ خطبوں کی مانند دریا روانی

وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے
تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے

سلیقہ کسی کو نہ تھا مدح و ذم [12] کا — نہ ڈھب یاد تھا شرح شادی و غم کا
نہ اندازِ تلقین [13] وعظ و حکم کا — خزانہ تھا مدفون زباں اور قلم کا

نواسنجیاں [14] اُن سے سیکھیں یہ سب نے
زباں کھول دی سب کی نُطقِ عرب [15] نے

۱؎ رجال: سے مراد علم رجال ہے جس میں عالموں اور حدیث کے راویوں کا مفصل حال بیان کیا گیا ہے۔
۲؎ اسانید: علم حدیث ہے۔ — ۳؎ یکسر: ناگہاں۔
۴؎ لبرٹی: آزادی۔ — ۵؎ لبرل: آزاد۔
۶؎ گاؤخوردہ: نابود، ختم شدہ۔ — ۷؎ ناسپردہ: نادریافت۔
۸؎ انشا: بیان تحریر۔ — ۹؎ آتش پارسی: فارسی شاعری
۱۰؎ شیوابیانی: حسن گفتار۔ — ۱۱؎ ریشہ دوانی: دل میں جڑیں کرنے والی۔
۱۲؎ مدح وذم: تعریف اور مذمت۔ — ۱۳؎ تلقین: تعلیم، نصیحت۔
۱۴؎ نواسنجیاں: آواز کو پرکھنے اور تولنے کا عمل۔ — ۱۵؎ نطق: گفتگو، لہجہ۔

زمانے میں پھیلی طب ان کی بدولت — ہوئی بہرہ ور [1] جس سے ہر قوم و ملت
نہ صرف ایک مشرق میں تھی اُن کی شہرت — مسلم تھی مغرب تک ان کی حذاقت [2]

[3] سلر نو میں جو ایک نامی مطب تھا
وہ مغرب میں عطار مشک عرب تھا

ابوبکر رازی [4] علی ابن عیسیٰ [5] — حکیم گرامی حسین ابن سینا [6]
حنین [7] ابن اسحاق قسیس دانا — ضیا ابن بیطار [8] راس الاطبا

انہیں کے ہیں مشرق میں سب نام لیوا
انہیں سے ہوا پار مغرب کا کھیوا [9]

غرض فن ہیں جو مایہ [10] دین و دولت — طبیعی ، الٰہی ، ریاضی و حکمت

878

طب اور کیمیا ہندسہ اور   سیاست، تجارت، عمارت، فلاحت [11]

لگاؤ گے کھوج اُن کا جا کر جہاں تم
نشاں اُن کے قدموں کے پاؤ گے واں تم

ہوا گو کہ پامال بستاں [12] عرب کا   مگر اک جہاں ہے غزل خواں عرب کا
ہرا کر گیا سب کو باراں عرب کا   سپید و سیہ پر ہے احساں عرب کا

۱۔ بہرہ ور: فائدہ مند۔   ۲۔ حذاقت: مہارت۔

۳۔ سلرنو: اٹلی کے شہر میں مسلمانوں کا ایک مشہور طبی مدرسہ تھا جہاں تمام یورپ سے لوگ طب سیکھنے کے لیے آتے تھے۔

۴۔ ابوبکر رازی طبیب پہلے شہر رے پھر بغداد میں علاج کیا۔ تصنیفات 213 ہیں۔ 320 ہجری میں انتقال کیا۔

۵۔ علی ابن عیسیٰ بہت بڑے حکیم تھے۔

۶۔ بوعلی سینا کا قانون صدہا سال مدرسوں میں پڑھایا گیا۔ 58 برس کی عمر میں انتقال ہوا اور ہمدان میں مدفون ہیں۔ کئی جلدوں میں قانون 'شفا'، کتاب الانصاف اور لسان العرب کئی جلدوں میں ہے۔

۷۔ عباسیہ دور کا مشہور عیسائی طبیب حنین ابن اسحاق تھا۔

۸۔ ضیا نباتات کا عظیم عالم تھا۔ 646 ہجری میں وفات پائی۔

۹۔ کھیوا: ناؤ۔   ۱۰۔ مایہ: ثروت۔

۱۱۔ فلاحت: درخت لگانے کا علم۔   ۱۲۔ بستاں: چمن۔

وہ قومیں جو ہیں آج سرتاج سب کی
کنوڈی [1] رہیں گی ہمیشہ عرب کی

رہے جب تک ارکانِ اسلام برپا   چلن اہلِ دیں کا رہا سیدھا سادا
رہا میل [2] سے شہد صافی   رہی کھوٹ سے سیم [3] خالص

نہ تھا کوئی اسلام کا مردِ میداں
علم ایک تھا شش جہت میں دُرَ فشاں [4]

پہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا [5] کا   گیا چھوٹ سر رشتہ [6] دینِ ہدیٰ کا
رہا سر پہ باقی نہ سایہ ہُما [7] کا   تو پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا

کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

برے اُن پہ وقت آ کے پڑنے لگے اب — وہ دنیا میں بس کر اُجڑنے لگے اب
بھرے اُن کے میلے بچھڑنے لگے اب — بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب

ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر
گھٹا کھل گئی سارے عالَم پہ چھا کر

نہ ثروت رہی ان کی قائم نہ عزت — گئے چھوڑ ساتھ ان کا اقبال و دولت
ہوئے علم وفن اُن سے ایک ایک رخصت — مٹی خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت[۸]

ا۔ کنوڈی: شرمندہ احسان۔ ۲۔ میل: کچرا۔
۳۔ سیم: چاندی۔ ۴۔ دُرفشاں: موتی پھیلانے والا۔
یورپ کے نامور مورخ شل اڈو، دگیں، ہنری لوئس، ہیلی سڈیلو وغیرہ اس بات کے معترف ہیں کہ ان کے علم وفضل کا سرچشمہ عرب تھا۔
۵۔ چشمہ صفا: اخلاص کا چشمہ۔
۶۔ سررشتہ: ڈوری۔
۷۔ ہما: ایک فرضی پرندہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا سایا جس پر پڑتا ہے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔
۸۔ نوبت بہ نوبت: یکے بعد دیگرے، ایک ایک کرکے۔

رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

ملے کوئی ٹیلا اگر ایسا اونچا — کہ آتی ہو واں سے نظر ساری دنیا
چڑھے اُس پہ پھر اک خرد مند[۱] دانا — کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا

تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ
کہ عالَم کو زیر و زبر[۲] پائے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن واں — بہت تازہ تر صورتِ باغِ رضواں[۳]

بہت اُن سے کمتر، پہ سرسبز وخنداں [۴] بہت خشک اور بے طراوت [۵] مگر واں
نہیں لائے گو برگ و بار اُن کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار اُن کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اُجڑا سراسر جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ [۶] جس کے جلانے کے قابل

حکومت نے تم سے کیا گر کنارا [۷] تو اس میں نہ تھا کچھ تمہارا اجارا [۸]
زمانے کی گردش سے ہے کس کو چارا کبھی یاں سکندر کبھی یاں ہے دارا
نہیں بادشاہی کچھ آخر خدائی
جو ہے آج اپنی تو کل ہے پرائی

۱۔ خردمند: عقل مند۔ ۲۔ زیروزبر: نیچے اور اوپر، درہم برہم۔
۳۔ رضواں: جنت۔ ۴۔ خنداں: ہنستا ہوا۔
۵۔ بےطراوت: بغیر تازگی کے۔ ۶۔ روکھ: درخت۔
۷۔ کنارا کرنا: علاحدگی کرنا۔ ۸۔ اجارا: بس اور ارادہ۔

ہوئی مقتضی [۱] جب کہ حکمت خدا کی کہ تعلیم جاری ہو خیر الوریٰ [۲] کی
پڑے دھوم عالم میں دینِ ہدیٰ [۳] کی تو عالم کی تم کو حکومت عطا کی
کہ پھیلاؤ دنیا میں حکمِ شریعت
کرو ختم بندوں پہ مالک کی حجت

ادا کر چکی جب حق اپنا حکومت رہی اب نہ اسلام کی اُس کو حاجت
مگر حیف اے فخرِ آدم کی امت ہوئی آدمیت بھی ساتھ اُس کے رخصت
حکومت تھی گویا کہ اک جھول [۴] تم پر

کہ اُڑتے ہی اُس کے نکل آئے جوہر

جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں ۵؎ جہاں آ کے دیتا ہے رو اَبرِ نیساں ۶؎
تردّد سے جو اور ہوتا ہے ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

وہ دینِ حجازی کا بے باک بیڑا نشاں جس کا اقصائے عالم ۷؎ میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا نہ عُمان ۸؎ میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا

کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آ کر

اگر کان دھر کر سنیں اہل عبرت تو سیلون سے تابہ کشمیر و
زمیں روکھ بن پھول پھل ریت پربت یہ فریاد سب کر رہے ہیں بہ حسرت

کہ کل فخر تھا جن سے اہل جہاں کو
لگا اُن سے عیب آج ہندوستاں کو

۱؎ مقتضی: آمادہ ہوئی۔ ۲؎ تعلیم خیرالوریٰ: پیغمبر e کی تعلیم، اسلام کی تعلیم۔
۳؎ دینِ ہدیٰ: دینِ اسلام۔ ۴؎ جھول: ڈھیلا پن۔
۵؎ باراں: بارش۔ ۶؎ اَبرِ نیساں: وہ ابر جس کے قطروں سے موتی بنتے ہیں۔
۷؎ اقصائے عالم: اطرافِ عالم۔ ۸؎ سیلون: سری لنکا۔

زمانے میں ہیں ایسی قومیں بہت سی نہیں جن میں تخصیص ۱؎ فرماندہی ۲؎ کی
پر آفت کہیں ایسی آئی نہ ہو گی کہ گھر گھر پہ یاں چھا گئی آ کے پستی

چکور اور شہباز سب اوج ۳؎ پر ہیں
مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

وہ ملت کہ گردوں ۴؎ پہ جس کا قدم تھا ہر ایک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق ۵؎ میں محترم تھا وہ اُمت لقب جس کا خیرالامم تھا

نشاں اُس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں

کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

وگرنہ ہماری رگوں میں لہو میں ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں طبیعت میں فطرت میں عادت میں خُو میں

نہیں کوئی ذرہ نجابت [6] کا باقی
اگر ہو کسی میں تو ہے اتفاقی

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نامِ آبا [7] کو ہم سے گہن [8] ہے ہمارا قدم ننگِ اہلِ وطن ہے

بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ قوموں میں عزت، نہ جلسوں میں وقعت نہ اپنوں سے الفت، نہ غیروں سے ملت [9]
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت [10] خیالوں میں پستی، کمالوں سے نفرت

---

[1] تخصیص: خصوصیت۔ [2] فرماندہی: حکمرانی۔
[3] اوج: بلندی۔ [4] گردوں: آسمان۔
[5] آفاق: افق کی جمع، جہاں آسمان وزمین ملتے دکھائی دیتے ہیں مراد ساری دنیا۔
[6] نجابت: پاکیزگی۔ [7] آبا: اجداد۔
[8] گہن لگنا: بدنامی ہونا۔ [9] وقعت: عزت۔
[10] نخوت: غرور۔

عداوت نہاں، دوستی آشکارا
غرض کی تواضع [1] غرض کی مدارا [2]

نہ اہلِ حکومت کے ہمراز ہیں ہم نہ درباریوں میں سرفراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایانِ اعزاز ہیں ہم نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم

نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں

نے کی ہے بری گت ہماری بہت دور پہنچی ہے نکبت [3] ہماری
گئی گذری دنیا سے عزت ہماری نہیں کچھ ابھرنے کی صورت ہماری

پڑے ہیں اک امید کے ہم سہارے
توقع پہ جنت کی جیتے ہیں سارے

سیاحت [4] کی گوں ہیں نہ مردِ سفر ہیں خدا کی خدائی سے ہم بے خبر ہیں
یہ دیواریں گھر کی جو پیشِ نظر ہیں یہی اپنے نزدیک بشر ہیں

ہیں تالاب میں مچھلیاں کچھ فراہم
وہی اُن کی دنیا وہی اُن کا عالم

بہشت اور اِرَم [5] سلسبیل [6] اور کوثر [7] پہاڑ اور جنگل ، جزیرے سمندر
اسی طرح کے اور بھی نام اکثر کتابوں میں پڑھتے رہے ہیں برابر

پہ جب تک نہ دیکھیں کہیں کس یقین پر
کہ یہ آسماں پر ہیں یا ہیں زمیں پر

وہ بے مول پونجی کہ ہے اصل دولت وہ شائستہ ملکوں کا گنجِ سعادت
وہ آسودہ [8] قوموں کا راس [9] وہ دولت کہ ہے وقت جس سے عبارت

۱۔ تواضع: خوشامد۔ ۲۔ مدارا۔ خلوص۔
۳۔ نکبت: بدبختی۔ ۴۔ سیاحت: مسافرت۔
۵۔ ارم: زمین پر بنائی گئی جنت۔ ۶۔ سلسبیل: جنت کی نہر۔
۷۔ کوثر: سے مراد حوضِ کوثر ہے۔ ۸۔ آسودہ: خوش حال۔
۹۔ راس البضاعت: پونجی، اصلی مال۔

نہیں اُس کی وقعت نظر میں ہماری
یونہیں مفت جاتی ہے بربادی ساری

اگر ہم سے مانگے کوئی ایک پیسا تو ہو گا کم و بیش بار اُس کا دینا
مگر ہاں وہ سرمایہ دین و دنیا کہ ایک ایک لمحہ ہے انمول جس کا

نہیں کرتے [1] اُڑانے میں اُس کے
بہت ہم سخی ہیں لٹانے میں اُس کے

اگر سانس دن رات کے سب گنیں ہم — تو نکلیں گے انفاس ایسے بہت کم
کہ ہو جن میں کل کے لیے کچھ فراہم — یونہیں گزرے جاتے ہیں دن رات پیہم
نہیں کوئی گویا خبردار ہم میں
کہ یہ سانس آخر ہیں اب کوئی دم میں

گڈریے کا وہ حکم بردار کتا — کہ بھیڑوں کی ہر دم ہے رکھوالی کرتا
جو ریوڑ [۲] میں ہوتا ہے پتے کا کھڑکا — تو وہ شیر کی طرح پھرتا ہے بپھرا
جو انصاف کیجئے تو ہے ہم سے بہتر
کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر

وہ قومیں کہ سب راہ طے کر چکی ہیں — ذخیرے ہر اک جنس کے بھر چکی ہیں
ہر ایک بوجھ بار اپنے سر دھر چکی ہیں — ہوئی تب ہیں زندہ کہ جب مر چکی ہیں
اسی طرح راہِ طلب میں ہیں پویا [۳]
بہت دور ابھی اُن کو جانا ہے گویا

کسی وقت جی بھر کے سوتے نہیں وہ — کبھی سیر محنت سے ہوتے نہیں وہ
بضاعت [۴] کو اپنی ڈبوتے نہیں وہ — کوئی لحہ بے کار کھوتے نہیں وہ
نہ چلنے سے تھکتے نہ اکتاتے ہیں وہ
بہت بڑھ گئے اور بڑھے جاتے ہیں وہ

۱۔ :کمینگی، کنجوسی۔ ۲۔ ریوڑ: گلہ۔
۳۔ پویا: جستجو کرنا۔ ۴۔ بضاعت: کمائی۔

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں — جمادات کی طرح بارِ زمیں ہیں
جہاں میں ہیں ایسے کہ گویا نہیں ہیں — زمانے سے کچھ ایسے فارغ نشیں ہیں
کہ گویا ضروری تھا جو کام کرنا
وہ سب کر چکے، ایک باقی ہے مرنا

یہاں اور ہیں جتنی قومیں گرامی — خود اقبال ہے آج اُن کا سلامی

تجارت میں ممتاز دولت میں نامی   زمانے کی ساتھی ترقی کی حامی
نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

دکاں اُن کی ہے اور بازار اُن کا   بنج[1] اُن کا ہے اور بہوار[2] اُن کا
زمانے میں پھیلا ہے بیوپار اُن کا   ہے پیرو جوان برسرکار اُن کا
مدار[3] اہلکاری کا ہے اب انہیں پر
انہیں کے ہیں آفس انہیں کے ہیں دفتر

معزز ہیں ہر ایک دربار میں وہ   گرامی[4] ہیں ہر ایک سرکار میں وہ
نہ رسوا ہیں عادت میں اطوار میں وہ   نہ بدنام گفتار و کردار میں وہ
نہ پیشے سے حرفے سے انکار اُن کو
نہ محنت مشقت سے کچھ عار[5] اُن کو

جو گرتے ہیں گر کر سنبھل جاتے ہیں وہ   پڑے زد[6] تو بچ کر نکل جاتے ہیں وہ
ہر اک سانچے میں جا کے ڈھل جاتے ہیں وہ   جہاں رنگ بدلا بدل جاتے ہیں وہ
ہر اک وقت کا مقتضی[7] جانتے ہیں
زمانے کے تیور وہ پہچانتے ہیں

---

[1] بنج: تجارت۔   [2] بہوار: لین دین، معاملات۔
[3] مدار: بھروسہ۔   [4] گرامی: محترم۔
[5] عار: دشمنی۔   [6] زد: مار۔
[7] مقتضی: تقاضا۔

مگر ہے ہماری نظر اتنی اونچی   کہ یکساں ہے سب واں بلندی و پستی
نہیں اب تک اصلاً خبر ہم کو یہ بھی   کہ ہے کون مردار کتیا ترقی
جدھر کھول کر آنکھ ہم دیکھتے ہیں
زمانے کو اپنے سے کم دیکھتے ہیں

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارہ   کہ ہے آشتی[1] میں مری یاں گزارا

نہیں پیروی جن کو میری گوارا مجھے اُن سے کرنا پڑے گا کنارا

سدا ایک ہی رُخ نہیں ناؤ چلتی

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

چمن میں ہوا آ چکی ہے خزاں کی پھری ہے نظر دیر سے باغباں کی

صدا اور ہے بلبلِ نغمہ خواں کی کوئی دم میں رحلت ہے اب گلستاں کی

تباہی کے خواب آ رہے ہیں نظر سب

مصیبت کی ہے آنے والی سحر اب

فلاکت [2] جسے کہیے اُم الجرائم [3] نہیں رہتے ایماں پہ دل جس سے قائم

بناتی ہے انسان کو جو بہائم [4] مصلّی ہیں دل جمع جس سے نہ صائم

وہ یوں اہلِ اسلام پر چھا رہی ہے

کہ مسلم کی گویا نشانی یہی ہے

کہیں مکر کے گُر سکھاتی ہے ہم کو کہیں جھوٹ کی لَو لگاتی ہے ہم کو

خیانت کی چالیں سجھاتی ہے ہم کو خوشامد کی گھاتیں بتاتی ہیں ہم کو

فسوں جب یہ پاتی نہیں کارگر وہ

تو کرتی ہے آخر کو دریوزہ [5] گر وہ

---

[1] آشتی: صلح۔ [2] فلاکت: افلاس۔

[3] اُمّ الجرائم: جرموں کی ماں (جڑ)۔ [4] بہائم: جانور۔

[5] دریوزہ گر: بھیک مانگنے والا۔

یہاں جتنی قومیں ہمارے سوا ہیں ہزار اُن میں خوش ہیں تو دو بے نوا [1] ہیں

یہاں لاکھ میں دو اگر اغنیا [2] ہیں تو سو نیم بسمل ہیں باقی گدا ہیں

ذرا کام غیرت کو فرمائیں گر ہم

تو سمجھیں کہ ہیں مبتذل [3] کس قدر ہم

بگاڑے ہیں گردش نے جو خاندانی نہیں جانتے بس کہ روٹی کمانی

دلوں میں ہے یہ یک قلم سب نے ٹھانی   کہ کیجیے بسر مانگ کر زندگانی

جہاں قدر دانوں کا ہیں کھوج پاتے

پہنچتے ہیں واں مانگتے اور کھاتے

کہیں باپ دادا کا ہیں نام لیتے   کہیں روشناسی [۴] سے ہیں کام لیتے

کہیں جھوٹے وعدوں پہ ہیں دام لیتے   یونہیں ہیں وہ دے دے کے دم دام لیتے

بزرگوں کے نازاں ہیں جس نام پر وہ

اُسے بیچتے پھرتے ہیں در بدر وہ

یہ ہیں ڈھنگ اُن تازہ آفت زدوں کے   بہت کم زمانہ ہوا جن کو بگڑے

ابھی ایک عالم ہے آگاہ جن سے   کہ ہیں کس کے بیٹے وہ اور کس کے پوتے

جنہیں دیس پردیس سب جانتے ہیں

حسب اور نسب جن کا پہچانتے ہیں

مگر مٹ چکا جن کا نام و نشاں ہے   پرانی ہوئی جن کی اب داستاں ہے

فسانوں میں قصوں میں جن کا بیاں ہے   بہت نسل پر تنگ اُن کی جہاں ہے

نہیں ان کی قدر اور پرسش کہیں اب

انہیں بھیک تک کوئی دیتا نہیں اب

بہت آگ چلموں کی سلگانے والے   بہت گھانس کی گٹھریاں لانے والے

بہت در بدر مانگ کر کھانے والے   بہت فاقے کر کر کے مر جانے والے

۱۔ بے نوا: بد بخت۔   ۲۔ اغنیا: امیر ثروت مند۔

۳۔ مبتذل: ذلیل۔   ۴۔ روشناسی: صورت دکھانا، نسب بتانا۔

جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں وہ جوہر

تو نکلیں گے نسل ملوک [۱] اُن میں اکثر

انہیں کے بزرگ ایک دن حکمراں تھے   انہیں کے پرستار [۲] پیر و جواں تھے

یہی مامن [۳] عاجز و ناتواں تھے   یہی مرجع [۴] دیلم و اصفہاں تھے

یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی

انہیں کے گھروں میں تھی صاحبقرانی [5]

یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے ۔۔۔ کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنیے افلاس میں مبتلا ہے ۔۔۔ جسے دیکھیے مفلس و بے نوا [6] ہے
نہیں کوئی اُن میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

نہیں مانگنے کا طریق [7] ایک ہی یاں ۔۔۔ گدائی کی ہیں صورتیں نت نئی یاں
نہیں حصر [8] کنگلوں پہ گدیہ گری یاں ۔۔۔ کوئی دے تو منگتوں کی ہے کیا کمی یاں
بہت ہاتھ پھیلائے زیر ردا [9] ہیں
چھپے اُجلے کپڑوں میں اکثر گدا ہیں

بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی ۔۔۔ بہت بن کے خود سید خاندانی
بہت سیکھ کر نوحہ و سوز خوانی ۔۔۔ بہت مدح میں کر کے رنگیں بیانی
بہت آستانوں [10] کے خدام بن کر
پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں دَر دَر

---

[1] نسلِ ملوک: بادشاہوں کی اولاد۔ ۔۔۔ [2] پرستار: چاہنے والے۔
[3] مامن: امن کی جگہ، پناہ گاہ۔ ۔۔۔ [4] مرجع: شخصیت جس سے رجوع کیا جائے۔
[5] صاحب قرانی: وہ بادشاہ جس کی ولادت کے وقت زہرہ و مشتری ایک برج میں ہوں۔ کامران بادشاہ۔
[6] بے نوا: فقیر، بے سروسامان۔ ۔۔۔ [7] طریق: طریقہ۔
[8] حصر: محدود۔ ۔۔۔ [9] زیر ردا: چادر کے نیچے۔
[10] آستانوں: درگاہوں۔

مشقت کو محنت کو جو عار [1] سمجھیں ۔۔۔ ہنر اور پیشے کو جو خوار [2] سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں ۔۔۔ [3] فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

کریں نوکری بھی ، تو بے عزتی کی ۔۔۔ جو روٹی کمائیں ، تو بے حرمتی کی

کہیں پائیں خدمت، تو بے عزتی کی قسم کھایئے اُن کی خوش قسمتی کی

امیروں کے بنتے ہیں جب یہ مصاحب [4]
تو جاتے ہیں ہو کر حمیت [5] سے تائب [6]

کہیں اُن کی صحبت میں گانا بجانا کہیں مسخرہ بن کے ہنسنا ہنسانا
کہیں پھبتیاں [7] کہہ کے انعام پانا کہیں چھیڑ کر گالیاں سب سے کھانا

یہ کام اور بھی کرتے ہیں پر نہ ایسے
مسلمان بھائی سے بن آئیں جیسے

امیروں کا عالم نہ پوچھو کہ کیا ہے خمیر اُن کا اور اُن کی طینت [8] جدا ہے
سزا وار ہے اُن کو جو نا سزا ہے روا ہے انہیں سب کو جو نا روا ہے

شریعت ہوئی ہے نکو نام [9] اُن سے
بہت فخر کرتا ہے اسلام اُن سے

ہر اک بول پر اُن کے مجلس فدا ہے ہر اک بات پر واں درست اور بجا ہے
نہ گفتار میں اُن کی کوئی خطا ہے نہ کردار اُن کا کوئی نا سزا [10] ہے

۱۔ عار: بے کار۔ ۲۔ خوار: ذلیل۔
۳۔ فرنگی: انگریز۔ ۴۔ مصاحب: ساتھی۔
۵۔ حمیت: غیرت۔ ۶۔ تائب: خالی، چھوڑ کر۔
۷۔ پھبتیاں: ظریف، چست فقرے۔ ۸۔ طینت: فطرت۔
۹۔ نکونام: نیک نام۔ ۱۰۔ ناسزا: ناروا، بے ہودہ۔

وہ جو کچھ کہ ہیں کہہ سکے کون اُن کو
بنایا ندیموں [1] نے فرعون اُن کو

وہ دولت کہ ہے مایہ دین و دنیا وہ دولت کہ ہے توشہ راہِ عقبیٰ [2]
سلیماں نے کی جس کی حق سے تمنا بڑھا جس سے آفاق [3] میں نامِ کسریٰ [4]

کیا جس نے حاتم [5] کو مشہور دوراں [6]

کیا جس نے یوسف کو مسجودِ اخواں[7]

ملا ہے یہ فخر اُس کو اُن کی بدولت کہ سمجھی گئی ہے وہ اصل شقاوت[8]
کہیں ہے وہ سرمایہ جہل و غفلت کہیں نشہ بادہ کبر[9] و نخوت
جہاں کے لیے جو کہ آبِ بقا[10] ہے
وہ اس قوم کے حق میں سمّی ہوا[11] ہے

اِدھر مال و دولت نے یاں منھ دکھایا اُدھر ساتھ ساتھ اُس کے ادبار[12] آیا
پڑا آ کے جس گھر پہ ثروت کا سایہ عمل واں سے برکت نے اپنا اُٹھایا
نہیں راس یاں چار پیسے کسی کو
مبارک نہیں جیسے پر چیونٹی کو

سمجھتے ہیں سب عیب جن عادتوں کو بہائم[13] سے نسبت ہے جن سیرتوں کو
چھپاتے ہیں اوباش[14] جن خصلتوں کو نہیں کرتے اجلاف[15] جن حرکتوں کو

۱۔ ندیموں: مصاحبوں، ساتھیوں۔
۲۔ راہِ عقبیٰ: آخرت کا راستہ۔
۳۔ آفاق: آسمان۔
۴۔ کسریٰ: ایران کے قدیم بادشاہ۔
۵۔ حاتم: حاتم طائی۔
۶۔ دوراں: دنیا۔
۷۔ مسجودِ اخواں: جس کو بھائی سجدہ کریں۔
۸۔ شقاوت: ظلم و جبر، بدبختی۔
۹۔ کبر و نخوت: غرور اور تکبر۔
۱۰۔ آبِ بقا: آبِ حیات۔
۱۱۔ سمّی: زہریلی۔
۱۲۔ ادبار: نحوست۔
۱۳۔ بہائم: جانور۔
۱۴۔ اوباش: ذلیل، بدمعاش۔
۱۵۔ اجلاف: کمینے لوگ۔

وہ یاں اہلِ دولت کو ہیں شیرِ مادر
نہ خوفِ خدا ہے نہ شرمِ پیمبر a

طبیعت اگر لہو بازی[1] پہ آئی تو دولت بہت سی اسی میں لٹائی
جو کی حضرتِ عشق نے رہ نمائی تو کر دی بھرے گھر کی دم میں صفائی
پھر آخر لگے مانگنے اور کھانے

یونہیں مٹ گئے یاں ہزاروں گھرانے

نہ آغاز پر اپنے غور اُن کو اصلا نہ انجام کا اپنے کچھ اُن کو کھٹکا
نہ فکر اُن کو اولاد کی تربیت کا نہ کچھ ذلتِ قوم کی اُن کو پروا
نہ حق کوئی دنیا پہ اُن کا نہ دیں پر
خدا کو وہ کیا منھ دکھائیں گے جا کر

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر تو ہوتے ہیں مسخ [۲] اُن میں پہلے تونگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر نہ عقل اُن کی ہادی نہ دیں اُن کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا نہ مفلوک [۳] کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس [۴] میں خودی سے گزرنا تعیش [۵] میں جینا نمایش پہ مرنا
سدا خوابِ غفلت میں بے ہوش رہنا
دمِ نزع تک خود فراموش رہنا

پریشاں اگر قحط سے اک جہاں ہے تو بے فکر ہیں کیوں کہ گھر میں سماں ہے
اگر باغِ امت میں فصلِ خزاں ہے تو خوش ہیں کہ اپنا چمن گل فشاں [۶] ہے

۱۔ لہو بازی: کھیل کود۔ ۲۔ مسخ: نابود۔
۳۔ مفلوک: مفلس۔ ۴۔ ہوا و ہوس: خود پرستی، عیاشی۔
۵۔ تعیش: عیش کرنا۔ ۶۔ گل فشاں: پھولوں سے بھرا۔

بنی نوعِ انساں کا حق اُن پہ کیا ہے
وہ اک نوع نوعِ بشر سے جدا ہے

کہاں بندگانِ ذلیل اور کہاں وہ بسر کرتے ہیں بے غم قوت ناں [۱] وہ
پہنتے نہیں جز سمور [۲] و کتاں وہ مکاں رکھتے ہیں رشکِ خلد و جناں وہ
نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر

نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر

کمر بستہ ہیں لوگ خدمت میں اُن کی گل و لالہ رہتے ہیں صحبت میں اُن کی
نفاست بھری ہے طبیعت میں ان کی نزاکت سو داخل ہے عادت میں اُن کی

دواؤں میں مشک اُن کی اُٹھتا ہے ڈھیروں
وہ پوشاک میں عطر ملتے ہیں سیروں

یہ ہو سکتے ہیں اُن کے ہم جنس [۳] کیوں کر نہیں چین جن کو زمانے سے دم بھر
سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر

پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی
جو تدبیر الٹی تو تقدیر کھوٹی

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ [۴] کا کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا خلائق [۵] سے ہے جس کو رشتہ [۶] ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

۱۔ قوت نان: روٹی خوراک۔
۲۔ سمور: لومڑی کی کھال۔
۳۔ ہم جنس: ساتھی، برابر۔
۴۔ کتابِ ہدیٰ: قرآن مجید۔
۵۔ خلایق: مخلوق خدا۔
۶۔ رشتہ ولا: محبت کا رشتہ۔

عمل جن کا تھا اس کلامِ متیں [۱] پر وہ سرسبز ہیں آج روئے زمیں پر
تفوق [۲] ہے اُن کو کہین و مہیں [۳] پر مدار آدمیت کا ہے اب انہیں پر

شریعت کے جو ہم نے پیمان [۴] توڑے
وہ لے جا کے سب اہلِ مغرب نے جوڑے

سمجھتے ہیں گمراہ جن کو مسلماں نہیں جن کو عقبےٰ میں اُمیدِ غُفراں [۵]

نہ حصے میں فردوس جن کے نہ رضواں ۔ نہ تقدیر میں حُور جن کے نہ غلماں

پس از مرگ دوزخ ٹھکانا ہے جن کا

حمیم آب و زقوم [6] کھانا ہے جن کا

وہ ملک اور ملت پہ اپنی فدا ہیں ۔ سب آپس میں ایک اک کے حاجت روا [7] ہیں

اولوالعلم [8] ہیں اُن میں یا اغنیا ہیں ۔ طلب گار بہبودِ خلقِ خدا ہیں

یہ [9] تمغہ تھا گویا کہ حصہ انہیں کا

کہ حب الوطن ہے نشاں مومنیں کا

امیروں کی دولت غریبوں کی ہمت ۔ ادیبوں کی انشا [10]، حکیموں کی حکمت

فصیحوں کے خطبے شجاعوں کی جرأت ۔ سپاہی کے ہتھیار شاہوں کی طاقت

دلوں کی امیدیں ، اُمنگوں کی خوشیاں

سب اہل وطن اور وطن پر ہیں قرباں

عروج اُن کا جو تم عیاں دیکھتے ہو ۔ جہاں میں انہیں کامراں [11] دیکھتے ہو

مطیع اُن کا سارا جہاں دیکھتے ہو ۔ اُنہیں برتر از آسماں دیکھتے ہو

۱۔ کلام متین: قرآن مجید۔ ۲۔ تفوق: فوقیت۔

۳۔ کہین و مہین: چھوٹا بڑا۔ ۴۔ فرمان: عہد، وعدہ۔

۵۔ امید غفراں: امید مغفرت۔

۶۔ حمیم آب و زقوم: حمیم گرم پانی جو دوزخیوں کو پلایا جائے گا اور زقوم تھوہر جو ان کو کھلایا جائے گا۔

۷۔ حاجت روا: ضرورت پورا کرنے والا۔ ۸۔ اولوالعلم: علما۔

۹۔ تمغہ: میڈل۔ ۱۰۔ انشا: تحریر۔

۱۱۔ کامراں: کامیاب۔

یہ ثمرے [1] ہیں اُن کی جواں مردیوں کے

نتیجے ہیں آپس کی ہمدردیوں کے

غنی ہم میں ہیں جو کہ اربابِ ہمت ۔ ہے عالم میں جن کی سخاوت

اگر ہے مشائخ [2] سے اُن کو عقیدت — تو ہے پیر زادوں پہ وقف اُن کی دولت

نکمے ہیں دن رات واں عیش کرتے

پہ نوکر ہیں جتنے وہ بھوکے ہیں مرتے

عمل واعظوں کے اگر قول پر ہے — تو بخشش کی امید بے صرف زر [3] ہے

نماز اور روزے کی عادت اگر ہے — تو روزِ حساب اُن کو پھر کس کا ڈر ہے

اگر شہر میں کوئی مسجد بنا دی

تو فردوس میں نیو [4] اپنی جمادی

عمارت کی بنیاد ایسی اُٹھائی — نہ نکلے کہیں ملک میں جس کا ثانی

تماشوں میں ثروت بڑوں کی اُڑائی — نمائش میں دولت خدا کی لٹائی

چھٹی بیاہ میں کرنے لاکھوں کے ساماں

یہ ہیں اُن کے ارماں یہ ہیں اُن کی خوشیاں

مگر دینِ برحق کا بوسیدہ ایواں — تزلزل میں مدت سے ہیں جس کے ارکاں

زمانے میں ہے جو کوئی دن کا مہماں — نہ پائیں گے ڈھونڈا جسے پھر مسلماں

عزیزوں نے اُس سے توجہ اُٹھا لی

عمارت کا ہے اُس کے اللہ والی

پڑی ہیں سب اُجڑی ہوئی خانقاہیں — وہ درویش و سلطاں کی اُمید گاہیں

کھلی تھیں جہاں علمِ باطن کی راہیں — فرشتوں کی پڑتی تھیں جن پر نگاہیں

۱۔ ثمرے: پھل۔ — ۲۔ مشائخ: اولیا، شیوخ۔
۳۔ بے صرف زر: سونا خرچ کیے بغیر۔ — ۴۔ نیو: بنیاد۔

کہاں ہیں وہ جذبِ الٰہی [1] کے پھندے

کہاں ہیں وہ اللہ کے پاک بندے

وہ علمِ شریعت کے ماہر کدھر ہیں — وہ اخبارِ دیں کے — کدھر ہیں

اُصولی کدھر ہیں کدھر ہیں کہاں ہیں کدھر ہیں

وہ مجلس جو کل سر بسر تھی چراغاں
چراغ اب کہیں ٹمٹماتا نہیں واں

مدارس وہ تعلیمِ دیں کے کہاں ہیں مراحل وہ علم و یقیں کے کہاں ہیں
وہ ارکان شرعِ متیں کے کہاں ہیں وہ وارث رسول امیں کے کہاں ہیں

رہا کوئی امت کا ملجا[2] نہ ماویٰ[3]
نہ قاضی نہ مفتی نہ صوفی نہ ملّا

کہاں ہیں وہ دینی کتابوں کے دفتر کہاں ہیں وہ علمِ الٰہی کے منظر
چلی ایسی اس بزم میں بادِ صرصر[4] بجھیں مشعلیں نورِ حق کی سراسر

رہا کوئی ساماں نہ مجلس میں باقی
صراحی نہ طنبور[5] نہ ساقی

بہت لوگ بن کر ہوا خواہِ[6] امت سفیہوں[7] سے منوا کے اپنی فضیلت
سدا گاؤں در گاؤں نوبت بہ نوبت پڑے پھرتے ہیں کرتے تحصیلِ[8] دولت

یہ ٹھہرے ہیں اسلام کے رہنما اب
لقب ان کا ہے وارث انبیا اب

ا۔ جذبِ الٰہی: عرفان اور تصوف کے عمل۔
۲۔ ملجا: پناہ کی جگہ۔
۳۔ ماویٰ: ٹھکانہ۔
۴۔ بادِ صرصر: آندھی۔
۵۔ طنبور: ایک قسم کا ستار۔
۶۔ ہوا خواہ: طرف دار۔
۷۔ سفیہوں: کمینوں۔
۸۔ تحصیل: حاصل کرنا۔

بہت لوگ پیروں کیا اولاد بن کر نہیں ذات والا میں کچھ جن کے جوہر
بڑا فخر ہے جن کو لے دے کے اس پر کہ تھے ان کے اسلاف[1] مقبولِ داور

کرشمے ہیں جا جا کے جھوٹے دکھاتے

مریدوں کو ہیں لوٹتے اور کھاتے

یہ ہیں جادہ پیمائے راہِ طریقت [2] مقام ان کا ہے ماورائے شریعت [3]
انہیں پر ہے ختم آج کشف و کرامت [4] انہیں کے ہے قبضے میں بندوں کی قسمت

یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب
یہی ہیں جنید [5] اور یہی بایزید اب [6]

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی جگر جس سے شق ہوں وہ تحریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی مسلمان بھائی کی تکفیر [7] کرنی

یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

کوئی مسئلہ پوچھنے اُن سے جائے تو گردن پہ بار گراں لے کے آئے
اگر بدنصیبی سے شک اس میں لائے تو قطعی [8] خطاب اہل دوزخ کا پائے

اگر اعتراض اُس کی نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دشوار واں سے

کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پھلاتے کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں منھ پہ لاتے
کبھی خوک [9] اور سگ [10] ہیں اُس کو بناتے کبھی مارنے کو عصا ہیں اُٹھاتے

۱۔ اسلاف: اجداد۔
۲۔ راہِ طریقت: راہِ تصوف (صوفی)۔
۳۔ ماورائے شریعت: شریعت سے جدا۔
۴۔ کشف و کرامات: کمال اور معجزے۔
۵۔ جنید: جنید بغدادی تیسری صدی کے صوفی تھے۔
۶۔ بایزید: بایزید بسطامی تیسری صدی کے صوفی تھے۔
۷۔ تکفیر: کافر قرار دینا۔
۸۔ قطعی: قطعاً۔
۹۔ خوک: خنزیر، سور۔
۱۰۔ سگ: کتا۔

ستوں چشم بد دُور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلق رسول امیں کے

جو چاہے کہ خوش اُن سے مل کر ہو انساں   تو ہے شرط وہ قوم کا ہو مسلماں
نشاں سجدے کا ہو جبیں پر نمایاں   تَشَرُّع [1] میں اُس کے نہ ہو کوئی نقصاں
لبیں [2] بڑھ رہی ہوں نہ ڈاڑھی چڑھی ہو
ازار اپنی حد سے نہ آگے بڑھی ہو

عقائد میں حضرت کا ہمداستاں ہو   ہر اک اصل میں فرع [3] میں ہم زباں ہو
حریفوں سے اُن کے بہت بدگماں ہو   مریدوں کا اُن کے بڑا مدح خواں ہو
گر ایسا نہیں ہے تو مردود دیں ہے
بزرگوں سے ملنے کے قابل نہیں ہے

شریعت کے احکام تھے وہ گوارا   کہ شیدا تھے اُن پر یہود اور نصاریٰ
گواہ اُن کی نرمی کا قرآں ہی سارا   خود اَلدِّیْنُ یُسْرٌ [4] نبی نے پکارا
مگر یاں کیا ایسا دشوار اُن کو
کہ مومن سمجھنے لگے بار ان کو

نہ کی اُن کی اخلاق میں رہنمائی   نہ باطن میں کی اُن کے پیدا صفائی
پہ احکام ظاہر کی لے یہ بڑھائی   کہ ہوتی نہیں اُن سے دم بھر رہائی
وہ دیں جو کہ چشمہ تھا خُلق نکو [5] کا
کیا قُلَّتین [6] اُس کو غسل و وضو کا

---

[1] تشرع: شریعت پہ عمل کرنا۔
[2] لبیں: ہونٹ کے اوپر کے مونچھ کے بال۔
[3] فرع: ثانوی۔
[4] اَلدِّیْنُ یُسْرٌ: دین میں آسانیاں ہیں۔
[5] خلق نکو: نیک اخلاق۔
[6] قلتین: پانی جو حوض یا برتن میں ہو جس کی پاکیزگی کے بارے میں اسلام کے فرقوں میں تضاد ہے۔

سدا اہلِ تحقیق سے دل میں بل ہے حدیثوں پہ چلنے میں دیں کا خلل ہے
فتاووں [1] پہ بالکل مدارِ عمل ہے ہر اک رائے قرآں کا نعم البدل [2] ہے

کتاب اور سنت کا ہے نام باقی
خدا اور نبی سے نہیں کام باقی

جہاں مختلف ہوں روایات باہم کبھی ہوں نہ سیدھی روایت سے خوش ہم
جسے عقل رکھے نہ ہرگز مسلّم اُسے ہر روایت سے سمجھیں مقدم

سب اس میں گرفتار چھوٹے بڑے ہیں
سمجھ پر ہماری یہ پتھر پڑے ہیں

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر کواکب [3] میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں ہوا جلوہ [4] گر حق زمین و زماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم و گماں میں وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں

ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

---

[1] فتاووں: فتوے۔ [2] نعم البدل: اچھا بدلہ جو کسی شے کے بدل میں حاصل ہو۔
[3] کواکب: ستارے۔ [4] جلوہ گر: نمایاں۔

تعصب کہ ہے دشمن نوع انساں　　بھرے گھر کیے سیکڑوں جس نے ویراں
ہوئی بزم نمرود [۱] جس سے پریشاں　　کیا جس نے فرعون [۲] کو نذر طوفاں
گیا جوش میں بولہب [۳] جس کے کھویا
ابو جہل [۴] کا جس نے بیڑا ڈبویا

وہ یاں اک عجب بھیس میں جلوہ گر ہے　　چھپا جس کے پردے میں اُس کا ضرر ہے
بھرا زہر جس جام میں سر بسر ہے　　وہ آب بقا ہم کو آتا نظر ہے
تعصب کو اک جزو دیں سمجھے ہیں ہم
جہنم کو خلد بریں سمجھے ہیں ہم

ہمیں واعظوں نے یہ تعلیم دی ہے　　کہ جو کام دینی ہے یا دنیوی ہے
مخالف کی ریس [۵] اس میں کرنی بری ہے　　نشاں غیرت دین حق کا یہی ہے
نہ ٹھیک اُس کی ہرگز کوئی بات سمجھو
وہ دن کو کہے دن تو تم رات سمجھو

قدم گر رہِ راست پر اُس کا پاؤ　　تو تم سیدھے رستے سے کترا کے جاؤ
پڑیں اس میں جو دقتیں وہ اُٹھاؤ　　لگیں جس قدر ٹھوکریں اُس میں کھاؤ
جو نکلے جہاز اُس کا بچ کر بھنور سے
تو تم ڈال دو ناؤ اندر بھنور کے

اگر مسخ [۶] ہو جائے صورت تمہاری　　بہائم [۷] میں مل جائے سیرت تمہاری
بدل جائے بالکل طبیعت تمہاری　　سراسر بگڑ جائے حالت تمہاری
تو سمجھو کہ ہے حق کی اک شان یہ بھی
ہے اک جلوۂ نور ایمان یہ بھی

۱۔ نمرود: حضرت ابراہیمg کا مخالف۔
۲۔ فرعون: حضرت موسیٰg کا مخالف۔
۳۔ بولہب: حضورa ختمی مرتبت کا مخالف۔
۴۔ ابوجہل: رسولa خدا کا مخالف۔
۵۔ ریس: تائید تقلید۔
۶۔ مسخ: مٹ جانا۔
۷۔ بہائم: جانور۔

نہ اوضاع [1] میں تم سے نسبت کسی کو نہ اخلاق میں تم پہ سبقت [2] کسی کو
نہ حاصل یہ کھانوں میں لذت کسی کو نہ پیدا یہ پوشش یہ زینت کسی کو
تمہیں فضل ہر علم میں برملا [3] ہے
تمہاری جہالت میں بھی اک ادا ہے

کوئی چیز سمجھو نہ اپنی بری تم رہو بات کو اپنی کرتے بڑی تم
حمایت میں ہو جب کہ اسلام کی تم تو ہر ہر بدی اور گنہ سے بری [4] تم
بدی سے نہیں مومنوں کو مضرت [5]
تمہارے گنہ اور نہ اوروں کی طاعت

مخالف کا اپنے اگر نام لیجیے تو ذکر اُس کا ذلت سے خواری سے کیجیے
کبھی بھول کر طرح اس میں نہ دیجیے قیامت کو دیکھو گے اس کے نتیجے
گناہوں سے ہوتے ہو گویا [6]
مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرا

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت مقلد کرے نا مقلد پہ لعنت
رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دین خدا پر ہنسے سارا عالم

کرے کوئی اصلاح کا گر ارادہ تو شیطان سے اُس کو سمجھو زیادہ
جسے ایسے مفسد [7] سے ہے استفادہ رہ حق سے ہے برطرف اُس کا جادہ [8]
شریعت کو کرتے ہیں برباد دونوں
ہیں مردود شاگرد و استاد دونوں

---

[1] اوضاع: حالات۔ [2] سبقت: برتری۔
[3] برملا: سب کے سامنے۔ [4] بری: دور، پاک۔
[5] مضرت: نقصان۔ [6] : پاک۔
[7] مفسد: فساد کرنے والا۔ [8] جادہ: راستہ۔

وہ دیں جس نے الفت کی بنیاد ڈالی کیا طبعِ دوراں کو نفرت سے خالی
بنایا اجانب [1] کو جس نے موالی [2] ہر اک قوم کے دل سے نفرت نکالی
عرب اور حبش ترک تاجیک [3] و دیلم [4]
ہوئے سارے شیر و شکر مل کے باہم

تعصب نے اُس صاف چشمے کو آ کر کیا بغض کے خار و خس سے مکدر
بنے خصم جو تھے عزیز اور برادر نفاق اہلِ قبلہ میں پھیلا سراسر
نہیں دستیاب ایسے اب دس مسلماں
کہ ہو ایک کو دیکھ کر ایک شاداں

ہمارا یہ حق تھا کہ سب یار ہوتے مصیبت میں یاروں کے غم خوار ہوتے
سب ایک ایک کے باہم مددگار ہوتے عزیزوں کے غم میں دل افگار ہوتے
جب الفت میں یوں ہوتے ثابت قدم ہم
تو کہہ سکتے اپنے کو خیر الامم [5] ہم

اگر بھولتے ہم نہ قولِ پیغمبر a کہ "ہیں سب مسلمان باہم برادر"
برادر ہے جب تک برادر کا یاور معین اُس کا ہے خود خداوند داور
تو آتی نہ بیڑے پہ اپنے تباہی
فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

وہ گھر جس میں ہوں دل ملے سب کے باہم خوشی نا خوشی میں ہوں سب یار و ہمدم
اگر ایک خوش دل تو گھر سارا خرم [6] اگر ایک غمگیں تو دل سب کے پر غم
مبارک ہے اُس قصر [7] شاہنشی سے
جہاں ایک دل ہو مکدر کسی سے

---

[1] اجانب: غیر، دوسرے۔ [2] موالی: دوست۔
[3] تاجیک: تاجکستان کا باشندہ۔ [4] دیلم: شمالی ایران کے افراد۔
[5] خیر الامم: سب اُمتوں سے بہتر۔ [6] خرم: خوشحال۔
[7] قصر: محل۔

اگر ہو مدار [1] اس پہ تحقیق دیں کا — کہ ہے دین والوں کا برتاؤ کیسا؟
کھرا اُن کا بازار رہے یا کہ کھوٹا — ہے قول و قرار اُن کا جھوٹا کہ سچا
تو ایسے نمونے بہت شاذ [2] ہیں یاں
کہ اسلام پر جن سے قائم ہو برہاں [3]

مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے — کہ آلودہ اس خون میں ہر بشر ہے
نہ بھائی کو بھائی سے یاں درگزر ہے — نہ مُلّا کو صوفی کو اس سے حذر [4] ہے
اگر نشہ مئے [5] ہو غیبت میں پنہاں
تو ہشیار پائے نہ کوئی مسلماں

جنہیں چار پیسے کا مقدور ہے یاں — سمجھتے نہیں ہیں وہ انساں کو انساں
موافق نہیں جن سے ایام دوراں — نہیں دیکھ سکتے کسی کو وہ شاداں
نشے میں تکبر کے ہے چور کوئی
حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی

اگر مرجعِ خلق [6] ہے ایک بھائی — نہیں ظاہراً کوئی اُس میں برائی
بھلا جس کو کہتی ہے ساری خدائی — ہر اک دل میں عظمت ہے جس کی سمائی
تو پڑتی ہے اُس پر نگاہیں غضب کی
کھٹکتا ہے کانٹا سا آنکھوں میں سب کی

بگڑتا ہے جب قوم میں کوئی بن کر — ابھی بخت و اقبال تھے جن کے یاور
ابھی گردنیں جھکتی تھیں جس کے در پر — مگر کر دیا اب زمانے نے بے پر
تو ظاہر میں کڑھتے ہیں پر خوش ہیں جی میں
کہ ہمدرد بات آیا اک مفلسی میں

---

[1] مدار: تکیہ۔ [2] شاذ: کم۔
[3] برہاں: دلیل۔ [4] حذر: چھٹکارا۔
[5] نشہ مئے: شراب کا نشہ۔ [6] مرجعِ خلق: لوگوں کا رہنما مرکز۔

اگر اک جوان مرد ہمدرد انساں کرے قوم پر دل سے جان اپنی قرباں
تو خود قوم اُس پر لگائے یہ بہتاں[1] کہ ہے اُس کی کوئی غرض اس میں پنہاں
وگرنہ پڑی کیا کسی کو کسی کی
یہ چالیں سراسر ہیں خود مطلبی[2] کی
نکالے گر اُن کی بھلائی کی صورت تو ڈالیں جہاں تک بنے اُس میں کھنڈت[3]
سنیں کامیابی کی گر اُس کی شہرت تو دل سے تراشیں کوئی تازہ تہمت
منھ اپنا ہو گر دین و دنیا میں کالا
نہ ہو ایک بھائی کا پر بول بالا
اگر پاتے ہیں دو دلوں میں صفائی تو ہیں ڈالتے اُس میں طرح جدائی
ٹھنی دو گروہوں میں جس دم لڑائی تو گویا تمنا ہماری بر آئی
بس اس سے نہیں مشغلہ خوب کوئی
تماشا نہیں ایسا مرغوب[4] کوئی
تغلب[5] میں بد نیتی میں دغا[6] میں نمود اور بناوٹ فریب اور ریا[7] میں
سعایت[8] میں بہتان[9] میں افترا[10] کسی بزم بیگانہ و آشنا میں
میں
نہ پاؤ گے رسوا و بدنام ہم سے
بڑھے پھر نہ کیوں شانِ اسلام ہم سے
خوشامد میں ہم کو وہ قدرت ہے حاصل کہ انساں کو کرتے ہیں ہر طرح مائل
کہیں احمقوں کو بناتے ہیں عاقل کہیں ہوشیاروں کو کرتے ہیں غافل

۱۔ بہتاں: تہمت۔ ۲۔ خود مطلبی: خودخواہی۔
۳۔ کھنڈت: مزاحمت، خرابی۔ ۴۔ مرغوب: پسندیدہ۔

۵۔ تغلب: دھوکا۔ ۶۔ دغا: فریب۔
۷۔ ریا: مکاری۔ ۸۔ سعایت: چغل خوری۔
۹۔ بہتان: تہمت۔ ۱۰۔ افترا: جھوٹ باندھنا۔

کسی کو اُتارا کسی کو چڑھایا
یونہیں سیکڑوں کو اسامی [۱] بنایا

روایات [۲] پر حاشیہ اک چڑھانا قسم جھوٹے وعدوں پہ سو بار کھانا
اگر مدح کرنا تو حد سے بڑھانا مذمت پہ آنا تو طوفاں اُٹھانا

یہ ہے روز مرہ کا یاں اُن کے عنواں
فصاحت میں بے مثل ہیں جو مسلماں

اُسے جانتے ہیں بڑا اپنا دُشمن ہمارے کرے عیب جو ہم پہ روشن
نصیحت سے نفرت ہے ناصح سے اَن بَن سمجھتے ہیں ہم رہنماؤں کو رہزن [۳]

یہی عیب ہے سب کو کھویا ہے جس نے
ہمیں ناؤ بھر کر ڈبویا ہے جس نے

وہ عہد ہمایوں جو خیر القروں [۴] تھا خلافت کا جب تک کہ قائم ستوں تھا
نبوت کا سایہ ابھی رہنموں تھا سماں خیر و برکت کا ہر دم فزوں [۵] تھا

عدالت کے زیور سے تھے سب مزین
پھلا اور پھولا تھا احمد کا گلشن

سعادت بڑی اس زمانے کی یہ تھی کہ جھکتی تھی گردن نصیحت پہ سب کی
نہ کرتے تھے خود قولِ حق سے خاموشی نہ لگتی تھی حق کی انہیں بات کڑوی

غلاموں سے ہو جاتے تھے بند آقا
خلیفہ سے لڑتی تھی ایک ایک بڑھیا

نبی نے کہا تھا جنہیں فخر امت جنہیں خلد کی مل چکی تھی بشارت
مسلم تھی عالم میں جن کی عدالت رہا مفتخر [۶] جن سے تختِ خلافت

۱۔ اسامی: مالدار۔ ۲۔ روایات: سرگزشت، واقعات۔
۳۔ رہزن: ڈاکو۔ ۴۔ خیرالقروں: سب سے بہتر زمانہ۔
۵۔ فزوں: زیادہ۔ ۶۔ مفتخر: جس پر فخر کیا جا سکے۔

وہ پھرتے تھے راتوں کو چھپ چھپ کے در در
کہ شرمائیں اپنا کہیں عیب سن کر

مگر ہم کو ہیں دام و دد [۱] ہم سے بہتر — نہ ظاہر کہیں ہم میں خوبی نہ مضمر [۲]
نہ اقران [۳] و امثال میں ہم موقر [۴] — نہ اجداد و اسلاف کے ہم میں جوہر

نصیحت سے ایسا برا مانتے ہیں
کہ گویا ہم اپنے کو پہچانتے ہیں

نبوت نہ گر ختم ہوتی عرب پر — کوئی ہم پہ مبعوث ہوتا پیمبر
تو ہے جیسے مذکور قرآں کے اندر — ضلالت یہود اور نصاریٰ کی اکثر

یونہیں جو کتاب اس پیمبر پہ آتی
وہ گمراہیاں سب ہماری جتاتی

ہنر ہم میں جو ہیں وہ معلوم ہیں سب — علوم اور کمالات معدوم [۵] ہیں سب
چلن اور اطوار مذموم [۶] ہیں سب — فراغت سے دولت سے محروم ہیں سب

جہالت نہیں چھوڑتی ساتھ دم بھر
تعصب نہیں بڑھنے دیتا قدم بھر

وہ تقویم [۷] پارینہ یونانیوں کی — وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی
یقیں جس کو ٹھہرا چکا ہے نکمی — عمل نے جسے کر دیا آ کے ردی

اسے وحی سے سمجھے ہیں ہم زیادہ
کوئی بات اُس میں نہیں کم زیادہ

زبور اور توریت و انجیل و قرآں — بالاجماع [۸] ہیں قابل نسخ و نسیاں [۹]
مگر لکھ گئے جو اُصول اہل یوناں — نہیں نسخ و تبدیل کا اُن میں امکاں

۱۔ دام ودد: مویشی اور حیوانات۔ ۲۔ مضمر: پوشیدہ۔
۳۔ اقران وامثال: ہم عصر اور ہم عمر لوگ۔ ۴۔ موقر: عزت دار۔

۵۔ معدوم: خالی۔ ۶۔ مذموم: خراب۔
۷۔ تقویم پارینہ: قدیم جنتری۔ ۸۔ بالاجماع: سب کی نظر میں۔
۹۔ نسخ ونسیاں: غلط اور جھوٹ۔

نہیں مٹتے جب تک کہ آثار دنیا
مٹے گا کبھی کوئی شوشہ نہ اُن کا

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے   وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے   کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
دلوں پر ہیں نقش اہل یوناں کی رائیں
جو اب وحی اُترے تو ایماں نہ لائیں

اب اس فلسفے پر ہیں جو مرنے والے   شفا[۱]اور مجسطی [۲]کے دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پہ سر دھرنے والے   فلاطون کی اقتدا [۳] کرنے والے
وہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں

وہ جب کر چکے ختم تحصیل حکمت   بندھی سر پہ دستار علم و فضیلت
اگر رکھتے ہیں کچھ طبیعت میں جودت [۴]   تو ہے سب سے اُن کی بڑی یہ لیاقت
کہ گر دن کو وہ رات کہہ دیں زباں سے
تو منوا کے چھوڑیں اُسے اک جہاں سے

سوا اس کے جو آئے اُس کو پڑھا دیں   انہیں جو کچھ آتا ہے اُس کو بتا دیں
وہ سیکھے ہیں جو بولیاں سب سکھا دیں   میاں مٹھو اپنا سا اُس کو بنا دیں
یہ لے دے کے ہے علم کا اُن کے حاصل
اسی پر ہے فخر اُن کو بین الاماثل [۵]

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل   نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ [۶] چرانے کے قابل   نہ بازار میں بوجھ اُٹھانے کے قابل

۱؎ شفا: بوعلی سینا کی کتاب۔ ۲؎ مجسطی: حکیم بطلیموس کی کتاب علم ریاضی میں ہے۔
۳؎ اقتدا: تقلید۔ ۴؎ جودت: اچھائی۔
۵؎ بین الاماثل: ہم عصر لوگوں کے درمیان۔ ۶؎ ریوڑ: گلہ۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

جو پوچھو کہ حضرت نے جو کچھ پڑھا ہے — مراد آپ کی اس کے پڑھنے سے کیا ہے
مفاد ۱؎ اس میں دنیا کا یا دین کا ہے — نتیجہ کوئی یا کہ اس کے سوا ہے
تو مجذوب ۲؎ کی طرح سب کچھ بکیں گے
جواب اُس کا لیکن نہ کچھ دے سکیں گے

نہ حجت رسالت پہ لا سکتے ہیں وہ — نہ اسلام کا حق جتا سکتے ہیں وہ
نہ قرآں کی عظمت دکھا سکتے ہیں وہ — نہ حق کی حقیقت بتا سکتے ہیں وہ
دلیلیں ہیں سب آج بے کار اُن کی
نہیں چلتی توپوں میں تلوار اُن کی

پڑے اُس مشقت میں ہیں وہ سراپا — نتیجہ نہیں اُن کو معلوم جس کا
گئیں بھول آگے کی بھیڑیں جو بٹیا ۳؎ — اُسی راہ پر پڑ لیا سارا گلا
نہیں جانتے یہ کہ جاتے کدھر ہیں
گئے بھول رستہ وہ یا راہ پر ہیں

مثال اُن کی کوشش کی ہے صاف ایسی — کہ کھائی کہیں بندروں نے جو سردی
ادھر اور اُدھر دیر تک آگ ڈھونڈی — کہیں روشنی اُن کو پائی نہ اُس کی
مگر ایک جگنو چمکتا جو دیکھا
پتنگا اُسے آگ کا سب نے سمجھا

لیا جا کے تھام اور سب نے اُسی دم — کیا گھانس پھونس اُس پہ لا کر فراہم

لگے اُس کو سلگانے سب مل کے پیہم	یہ کچھ آگ سلگی نہ سردی ہوئی کم

۱۔ مفاد: فایدہ۔
۲۔ مجذوب: صوفی، درویش۔
۳۔ بٹیا: کھیتوں کا راستہ، پگ ڈنڈی۔

یونہیں رات ساری انہوں نے گنوائی
مگر اپنی محنت کی راحت نہ پائی

گزرتے تھے جو جانور اس طرف سے	جب اس کشمکش میں انہیں دیکھتے تھے
ملامت بہت سخت تھے اُن کو کرتے	کہ شرمائیں وہ زعم [۱] باطل سے اپنے
مگر اپنی کد [۲] سے نہ باز آتے تھے وہ
ملامت پہ اور اُلٹے غراتے تھے وہ

نہ سمجھے وہ جب تک ہوا دن نہ روشن	اسی طرح جو ہیں حقیقت کے دشمن
نہ جھاڑیں گے گردِ توہم [۳] سے دامن	پہ جب ہو گا نور سحر لمعہ [۴] افگن
بہت جلد ہو جائے گا آشکارا
کہ جگنو کو سمجھے تھے وہ اک شرارا

وہ طب جس پہ غش ہیں ہمارے اطبا	سمجھتے ہیں جس کو بیاض مسیحا
بتانے میں ہے بخل [۵] جس کے بہت سا	جسے عیب کی طرح کرتے ہیں اخفا [۶]
فقط چند نسخوں کا ہے وہ سفینہ
چلے آئے ہیں جو کہ سینہ بسینہ

نہ اُن کو نباتات سے آگہی [۷] ہے	نہ اصلا خبر معدنیات کی ہے
نہ تشریح کی لے کسی پر کھلی ہے	نہ علم طبیعی نہ کیمسٹری ہے
نہ پانی کا علم اور نہ علم ہوا ہے
مریضوں کا اُن کے نگہباں خدا ہے

۱۔ زعم: گمان۔ ۲۔ کد: رنج، سختی۔
۳۔ توہم: شک، گمان۔ ۴۔ لمعہ افگن: شعلہ ور۔
۵۔ بخل: کنجوسی۔ ۶۔ اخفا: چھپانا۔
۷۔ آگہی: واقفیت۔

نہ قانون میں اُن کے کوئی خطا ہے ۔۔۔ نہ مخزن [1] میں انگشت رکھنے کی جا ہے
سدیدی [2] میں لکھا ہے جو کچھ بجا ہے ۔۔۔ نفیسی [3] کے ہر قول پر جاں فدا ہے
سلف [4] لکھ گئے جو قیاس اور گماں سے
صحیفے ہیں اترے ہوئے آسماں سے

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر ۔۔۔ عفونت میں سنڈاس [5] سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ۔۔۔ ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے ۔۔۔ عبث [6] جھوٹ بکنا اگر نا روا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے ۔۔۔ مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

زمانے مین جتنے قلی [7] اور نفر ہیں ۔۔۔ کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور [8] ہیں
گویے امیروں کے نور نظر ہیں ۔۔۔ ڈفالی [9] بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں
مگر اس تپ دق [10] میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سقے [11] نہ ہوں جی سے جائیں گزر سب ۔۔۔ ہو میلا جہاں گم ہوں دھوبی اگر سب

بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب   جو ٹُھر ۱۲؎ جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب

۱؎ مخزن: پرانی طب کی کتاب۔   ۲؎ سدیدی: قدیم اطبا کی کتابیں۔
۳؎ نفیسی: قدیم طبی کتاب۔   ۴؎ سلف: اجداد۔
۵؎ سنڈاس: فضلہ۔   ۶؎ عبث: بے وجہ۔
۷؎ قلی: سامان اٹھانے والا۔   ۸؎ بہرہ ور: فایدہ مند۔
۹؎ ڈفالی: دف بجانے والا۔   ۱۰؎ تپ دق: دق کا بخار۔
۱۱؎ سقے: پانی بھرنے والا۔   ۱۲؎ ٹُھر جانا: کم ہو جانا۔

پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے خس کم ۱؎ جہاں پاک سارے

عرب جو تھے دنیا میں اس فن کے بانی   نہ تھا کوئی آفاق میں جن کا ثانی
زمانے نے جن کی فصاحت تھی مانی   مٹا دی عزیزوں نے اُن کی نشانی
سب اُن کے ہنر اور کمالات کھو کر
رہے شاعری کو بھی آخر ڈبو کر

ادب میں پڑی جان اُن کی زباں سے   چلا ۲؎ دین نے پائی اُن کے بیاں سے
سناں ۳؎ کے لیے کام انھوں نے لساں سے   زبانوں کے کوچے تھے بڑھ کر سناں سے
ہوئے اُن کے شعروں سے اخلاق صیقل ۴؎
پڑی اُن کے خطبوں سے دنیا میں ہل چل

خلف ۵؎ اُن کے یاں جو کہ جادو بیاں ہیں   فصاحت میں مقبول پیر و جواں ہیں
بلاغت میں مشہور ہندوستاں ہیں   وہ کچھ ہیں تو لے دے کے گوں ۶؎ یہاں ہیں
کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ ۷؎ اُن کی غزلیں مجالس میں گائیں

طوائف کو ازبر ۸؎ ہیں دیوان اُن کے   گویوں پہ بے حد ہیں احسان اُن کے

نکلتے ہیں تکیوں [9] میں ارمان اُن کے ثنا خواں ہیں ابلیس و شیطان اُن کے

کہ عقلوں پہ پردے دیے ڈال انہوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال اُنھوں نے

۱۔ خس کم: کچرا کم ہوگا۔ ۲۔ جلا: زندہ ہونا، زندگی۔
۳۔ سناں: نیزہ۔ ۴۔ صیقل: چمکانا۔
۵۔ خلف: اولاد۔ ۶۔ گوں: طرح۔
۷۔ بھانڈ: گویے۔ ۸۔ ازبر: زبانی۔
۹۔ تکیوں: درگاہوں کے مقام۔

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے تباہ اُن کی حالت بری اُن کی گت ہے
کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے

چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو [1] کا رسیا ہے کوئی

سدا گرم انفار [2] سے ان کی صحبت ہر اک رندو اوباش [3] سے اُن کی ملت
پڑھے لکھوں کے سائے سے اُن کو وحشت مدارس سے تعلیم سے اُن کو نفرت

کمینوں کے جرگے [4] میں عمریں گنوانی
اُنہیں گالیاں دینی اور آپ کھانی

نہ علمی مدارس میں ہیں اُن کو پاتے نہ شائستہ جلسوں میں ہیں آتے جاتے
پہ میلوں کی رونق ہیں جا کر بڑھاتے پڑے پھرتے ہیں دیکھتے اور دکھاتے

کتاب اور معلم سے پھرتے ہیں بھاگے
مگر ناچ گانے میں ہیں سب سے آگے

اگر کیجیے اُن پاک شہدوں کی گنتی ہوا جن کے پہلو سے بچ کر ہے چلتی
ملی خاک میں جن سے عزت بڑوں کی مٹی خاندانوں کی جس سے بزرگی

تو یہ جس قدر خانہ برباد ہوں گے

وہ سب ان شریفوں کی اولاد ہوں گے

ہوئی اُن کی بچپن میں یوں پاسبانی [۵] کہ قیدی کی جیسے کٹے زندگانی
لگی ہونے جب کچھ سمجھ بوجھ سیانی [۶] چڑھی بُھوت کی طرح سر پر جوانی
بس اب گھر میں دشوار تھمنا ہے اُن کا
اکھاڑوں میں تکیوں میں رمنا [۷] ہے اُن کا

۱۔ مدک چنڈو: نشہ آور چیزیں۔ ۲۔ انفار: لوگ۔
۳۔ اوباش: رذیل، بدمعاش۔ ۴۔ جرگے: آدمیوں کا ہجوم۔
۵۔ پاسبانی: حفاظت۔ ۶۔ سیانی: سمجھدار۔
۷۔ رمنا: بسیرا، اڈا۔

نشے میں مے عشق کے چور ہیں وہ صف فوج مژگاں [۱] میں محصور ہیں [۲] وہ
غم چشم و ابرو میں رنجور [۳] ہیں وہ بہت ہاتھ سے دل کے مجبور ہیں وہ
کریں کیا کہ ہے عشق طینت [۴] میں اُن کی
حرارت بھری ہے طبیعت میں اُن کی

اگر شش جہت [۵] میں کوئی دل رُبا ہے تو دل اُن کا نادیدہ [۶] اُس پر فدا ہے
اگر خواب میں کچھ نظر آ گیا ہے تو یاد اُس کی دن رات نام خدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد ہے یاں
جسے دیکھیے قیس و فرہاد ہے یاں

اگر ماں ہے دُکھیا تو اُن کی بلا سے اپاہج [۷] ہے باوا تو اُن کی بلا سے
جو ہے گھر میں فاقہ تو اُن کی بلا سے جو مرتا ہے کنبا تو اُن کی بلا سے
جنھوں نے لگائی ہو لو دل رُبا سے
غرض پھر انھیں کیا رہی ماسوا سے

نہ گالی سے دُشنام [۸] سے جی چُرائیں نہ جوتی سے پیزار [۹] سے ہچکچائیں
جو میلوں میں جائیں تو لچھن [۱۰] دکھائیں جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اُٹھائیں

لرزتے ہیں اوباش اُن کی ہنسی سے
گریزاں ۱۱؎ ہیں رند اُن کی ہمسائگی سے
سپوتوں ۱۲؎ کو اپنے اگر بیاہ دیجے تو بہوؤں کا بوجھ اپنی گردن پہ لیجے
جو بیٹی کے پیوند کی فکر کیجے تو بد راہ ہیں بھانجے اور بھتیجے

۱؎ مژگاں: پلکیں۔ ۲؎ محصور: قید۔
۳؎ رنجور: غم زدہ۔ ۴؎ طینت: طبیعت۔
۵؎ شش جہت: چھے سمت۔ ۶؎ نادیدہ: بغیر دیکھے۔
۷؎ اپاہج: معذور۔ ۸؎ دشنام: برا کہنا۔
۹؎ پیزار: کفش، جوتے۔ ۱۰؎ لچپن: بیہودگی۔
۱۱؎ گریزاں: فرار۔ ۱۲؎ سپوتوں: بیٹوں۔

یہی جھینکنا گو بہ گو گھر بہ گھر ہے
بہو کو ٹھکانا نہ بیٹی کو بر ہے
نہ مطلب نگاری کا ان کو سلیقہ نہ دربار داری کا ان کو سلیقہ
نہ امیدواری کا ان کو سلیقہ نہ خدمت گزاری کا ان کو سلیقہ
قلی یا نفر ہو تو کچھ کام آئے
مگر ان کو کس مد ۱؎ میں کوئی کھپائے
نہیں ملتی روٹی جنھیں پیٹ بھر کے وہ گزران کرتے ہیں سو عیب کر کے
جو ہیں اُن میں دو چار آسودہ گھر کے وہ دن رات خواہاں ہیں مرگ پدر کے
نمونے یہ اعیان و اشراف ۲؎ کے ہیں
سلف ان کے وہ تھے خلف اُن کے یہ ہیں
وہ اسلام کی پود ۳؎ شاید یہی ہے کہ جس کی طرف آنکھ سب کی لگی ہے
بہت جس سے آیندہ چشم بہی ہے بقا منحصر جس پہ اسلام کی ہے
یہی جان ڈالے گی باغ کہن میں؟

اسی سے بہار آئے گی اس چمن میں

یہی ہیں وہ نسلیں مبارک ہماری — کہ بخشیں گی جو دین کو اُستواری
کریں گی یہی قوم کی غمگساری — انہیں پر امیدیں ہیں موقوف ساری

یہی شمعِ اسلام روشن کریں گی
بڑوں کا یہی نام روشن کریں گی

خلف اُن کے الحق[4] اگر یاں یہی ہیں — سلف کے اگر فاتحہ خواں یہی ہیں
اگر یادگارِ عزیزاں یہی ہیں — اگر نسل اشراف و اعیاں یہی ہیں

۱۔ مد: زمرے، حصے۔ ۲۔ اعیان واشراف: امرا اور شرفا۔
۳۔ پود: نسل۔ ۴۔ الحق: حق کی قسم۔

تو یاد اس قدر ان کی رہ جائے گی یاں
کہ اک قوم رہتی تھی اس نام کی یاں

سمجھتے ہیں شائستہ جو آپ کو یاں — ہیں آزادیِ رائے پر جو کہ نازاں
چلن پر ہیں جو قوم کے اپنی خنداں[1] — مسلماں ہیں سب جن کے نزدیک ناداں

جو ڈھونڈو گے یاروں کے ہمدرد اُن میں
تو نکلیں گے تھوڑے جواں مرد اُن میں

نہ رنج اُن کے افلاس کا اُن کو اصلا — نہ فکر اُن کی تعلیم اور تربیت کا
نہ کوشش کی ہمت نہ دینے کو پیسا — اُڑانا مگر مفت ایک اک کا خاکا

کہیں اُن کی پوشاک[2] پر طعن کرنا
کہیں اُن کی خوراک کو نام دھرنا

عزیزوں کی جس بات میں عیب پانا — نشانہ اُسے پھبتیوں[3] کا بنانا
شماتت[4] سے دل بھائیوں کا دُکھانا — یگانوں کو بیگانہ بن کر چڑانا

نہ کچھ درد کی چوٹ اُن کے جگر میں

نہ قطرہ کوئی خون کا چشمِ تر میں

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے پڑا جس سے جوکھوں [5] میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے کوئی اُن میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں اُن پہ خندہ زناں [6] ہیں

کوئی اُن سے پوچھے کہ اے ہوش والو کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
بُرا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

۱۔ خنداں: ہنستے ہوئے۔ ۲۔ پوشاک: لباس۔
۳۔ پھبتیوں: مسخرے جملے۔ ۴۔ شماتت: شرم دلانا۔
۵۔ جوکھوں: خطروں۔ ۶۔ خندہ زناں: ہنسنے والے۔

بچو گے نہ تم اور ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

غرض عیب کیجیے بیاں اپنے کیا کیا کہ بگڑا ہوا یاں ہے آوے [1] کا آوا
فقیہہ اور جاہل ضعیف اور توانا تَاسُّف [2] کے قابل ہے احوال سب کا

مریض ایسے مایوس دنیا میں کم ہیں
بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں

کسی نے یہ اک مرد دانا سے پوچھا کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا "عقل جس سے ملے دین و دنیا" کہا "گر نہ ہو اُس سے انساں کو بہرہ"

کہا "پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے"

کہا "گر نہ ہو یہ بھی اس کو میسر" کہا "مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر"
کہا "دَر ہو یہ بھی اگر بند اُس پر" کہا "اُس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر"

وہ ننگِ بشر تا کہ ذلت سے چھوٹے

خلائق ۳؎ سب اُس کی نحوست سے چھوٹے

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو — مبادا ۴؎ کہ وہ ننگِ عالم تمہیں ہو
گر اسلام کی کچھ ۵؎ حمیت ہے تم کو — تو جلدی سے اُٹھو اور اپنی خبر لو
وگرنہ یہ قول آئے گا راست ۶؎ تم پر
کہ ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر

رہو گے یونہیں فارغ ۷؎ البال کب تک — نہ بدلو گے یہ چال اور ڈھال کب تک
رہے گی نئی پود پامال کب تک — نہ چھوڑو گے تم بھیڑیا چال کب تک

۱؎ آوے کا آوا: پورا خاندان۔ ۲؎ تاسف: افسوس۔
۳؎ خلائق۔ مخلوق۔ ۴؎ مبادا: ہرگز، ایسا نہ ہو۔
۵؎ حمیت: غیرت۔ ۶؎ راست: ٹھیک۔
۷؎ فارغ البال۔

بس اگلے فسانے فراموش ۱؎ کر دو
تعصب کے شعلے کو خاموش کر دو

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں — ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں — کہ راجا سے پرجا ۲؎ تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

نہ بد خواہ ہے دین و ایماں کا کوئی — نہ دشمن حدیث اور قرآن کا کوئی
نہ ناقص ۳؎ ہے ملت کے ارکاں کا کوئی — نہ مانع ۴؎ شریعت کے فرماں کا کوئی
نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑلے سے دو مسجدوں میں

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں — نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں — تو ہموار ہیں کسب دولت کی راہیں

نہ گھر میں غنیم [5] اور دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق [6] و رہزن [7] کا کھٹکا

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں شب و روز ہے ایمنی [8] قافلوں میں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر [9] کا
وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر [10] کا

۱۔ فراموش: بھول جاؤ۔ ۲۔ پرجا: عوام۔
۳۔ ناقص: ادھورا۔ ۴۔ مانع: روکنے والے۔
۵۔ غنیم: چور۔ ۶۔ قزاق: بحری ڈاکو۔
۷۔ رہزن: لٹیرا۔ ۸۔ ایمنی: امن۔
۹۔ سقر: دوزخ۔ ۱۰۔ سراسر ظفر: پوری فتح۔

پہنچتی ہیں ملکوں سے دم دم کی خبریں چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں
عیاں [1] ہیں ہر ایک بر اعظم کی خبریں کھلی ہیں زمانے پہ عالم کی خبریں
نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال رُوئے زمیں کا

کرو قدر اس امن و آزادگی کی کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی
ہر اک راہ رو کا زمانہ ہے ساتھی یہ ہر سو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے

بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں
بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں بہت سے نہ چلنے سے پچتا رہے ہیں
مگر اک تمہیں ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل

نہ بد خواہ سمجھو بس اب یاروں کو   لٹیرے نہ ٹھہراؤ تم رہبروں کو
دو الزام پیچھے نصیحت گروں کو   ٹٹولو ذرا پہلے اپنے گھروں کو

کہ خالی ہیں یا پُر ذخیرے تمہارے
بُرے ہیں کہ اچھے وتیرے تمہارے

امیروں کی تم سن چکے داستاں سب   چلن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب   بگڑنے کو بیٹھے ہیں تیار یاں سب

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکزِ ثقل [2] سے ہٹ چکا ہے

یہ جو کچھ ہوا ایک شمہ [3] ہے اس کا   کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانے نے اُونچے سے جس کو گرایا   وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا

---

[1] عیاں: ظاہر۔ [2] مرکزِ ثقل: قوتِ جاذبہ، زمین کی قوت کشش۔ [3] شمہ: ذرہ برابر۔

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

یہاں ہر ترقی کی غایت [1] یہی ہے   سر انجام ہر قوم و ملت یہی ہے
سدا سے زمانے کی عادت یہی ہے   طلسم [2] جہاں کی حقیقت یہی ہے

بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

کہاں ہیں وہ اَہرام [3] مصری کے بانی   کہاں ہیں وہ گردان [4] زابلستانی
گئے پیشدادی کدھر اور کیانی [5]   مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی

لگاؤ کہیں کھوج کلدانیوں [6] کا
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں [7] کا

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے   جہاں کی وراثت اُسی کو سزا ہے
سوا اُس کے انجام سب کا فنا ہے   نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے

مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی [۸] سب

io

۱۔ غایت: حقیقت۔
۲۔ طلسم: افسانہ، جادوگری۔
۳۔ اہرام مصری: پیرامڈس مصری مثلث نما مینار جو دریائے نیل سے پانچ میل کے فاصلے پر ہیں۔ دنیا کی قدیم ترین عمارت ہیں۔
۴۔ گروان زابلستانی سے مراد رستم کا خاندان ہے۔
۵۔ کیومرث کی اولاد میں جو گیارہ بادشاہ ہوئے وہ پیشدادی اور کیانی بادشاہوں کے مشہور بادشاہ۔
۶۔ خالد بابل والے۔
۷۔ اسفندیار کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ان کو ساسانی کہتے ہیں۔
۸۔ رفتنی: جانے والے۔

ضمیمہ 2

بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو — جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو — فسردہ [۱] دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تونے سر سبز کی ہیں

سفینہ پے نوح طوفاں میں تُو تھی — سکوں بخش یعقوب کنعاں میں تُو تھی
زلیخا کی غم خوار ہجراں میں تُو تھی — دل آرام یوسف کی زنداں میں تُو تھی

مصائب نے جب آن کر اُن کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تُو نے　　بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تُو نے
اکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تُو نے　　اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تُو نے

بہت تُو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی　　بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خُرد و کلاں[2] کی
تجھی پر ہے بنیاد نظمِ جہاں کی　　نہ ہو تو تو رونق نہ ہو اس دکاں کی

تگاپو[3] ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رَوا رَو[4] ہے ہر قافلہ میں تجھی سے

---

[1] فسردہ: مایوس۔　　[2] خُرد وکلاں: چھوٹے بڑے۔
[3] تگاپو: بھاگ دوڑ۔　　[4] روارو: حرکت، رفتار۔

کسانوں سے کلر[1] میں تو ہے بُواتی　　جہازوں کو گرداب میں ہے کھواتی
سکندر کو دارا پہ تو ہے چڑھاتی　　فریدوں[2] کو ضحاک[3] سے ہے لڑاتی

چلے سب جدھر تو نے مائل عناں[4] کی
نظر تیری سیٹی پہ ہے کارواں کی

نوازا بہت بے نواؤں کو تُو نے　　تونگر بنایا گداؤں کو تُو نے
دیا دست رس[5] ناروا‌ؤں کو تُو نے　　کیا بادشہ نا خداؤں کو تُو نے

سکندر کو شانِ کئی تُو نے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تُو نے بخشی

وہ رہ رو[6] نہیں رکھتے جو کوئی ساماں　　خورو زاد[7] سے جن کا خالی ہے داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں　　نہ محرم کوئی جو سنے دردِ پنہاں

ترے بل پہ خوش خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانہ ہیں اب کوئی پاتے

زمیں جوتنے کو جب اُٹھتا ہے جوتا — سمیں [8] کا گماں تک نہیں جب کہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہے جان کھوتا — مہینوں نہیں پاؤں پھیلا کے سوتا
اگر موج زن اُس کے دل میں نہ تو ہو
تو دنیا میں غل بھوک کا چار سو ہو

بنے اس سے بھی گر سوا اپنے دم پر — بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر
پہاڑ اک فزوں [9] اور ہو کوہِ غم پر — گزرنی ہے جو کچھ گزر جائے ہم پر

۱۔ کلر: سخت زمین جو قابلِ کاشت نہ ہو۔
۲۔ فریدوں: ضحاک کو ہلاک کر کے ایران کا بادشاہ ہوا۔
۳۔ ضحاک ایک قوی اور ظالم بادشاہ تھا۔
۴۔ عناں: مہار۔
۵۔ دست رس: مدد کا ہاتھ۔
۶۔ رہ رو: مسافر۔
۷۔ خورو زاد: خوراک سامان سفر۔
۸۔ سمیں: عمدہ موسم۔
۹۔ فزوں: اضافہ۔

نہیں فکر تو دل بڑھاتی ہے جب تک
دماغوں میں بو تیری آتی ہے جب تک

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں [1] ہے — عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے
جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے — تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے
مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا

نہیں قوم میں گرچہ کچھ جان باقی — نہ اُس میں وہ اسلام کی شان باقی
نہ وہ جاہ و حشمت کے سامان باقی — پر اس حال میں بھی ہے اک آن باقی
بگڑنے کا گو اُن کے وقت آ گیا ہے
مگر اس بگڑنے میں بھی اک ادا ہے

بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی — دلیری نہیں پر حمیت [2] ہے باقی

فقیری میں بھی بوئے ثروت ہے باقی　　تہی دست [3] ہیں پر مروت ہے باقی

مٹے پر بھی پندار [4] ہستی وہی ہے

مکاں گرم ہے آگ گو بجھ گئی ہے

سمجھتے ہیں عزت کو دولت سے بہتر　　فقیری کو ذلت کی شہرت سے بہتر

گلیم [5] قناعت کو ثروت سے بہتر　　انہیں موت ہے بارِ منّت سے بہتر

سر اُن کا نہیں دربدر جھکنے والا

وہ خود پست ہیں پر نگاہیں ہیں بالا

مشابہ ہے قوم اُس مریض جواں سے　　کیا ضعف نے جس کو مایوس جاں سے

نہ بستر سے حرکت نہ جنبش مکاں سے　　اجل کے ہیں آثار جس پر عیاں سے

۱۔ زبوں: پست۔　　۲۔ حمیت: شرم، غیرت۔

۳۔ تہی دست: خالی ہاتھ۔　　۴۔ پندار: غرور۔

۵۔ گلیم قناعت: قناعت کا کمبل یا لحاف۔

نظر آتے ہیں سب مرض جس کے مزمن [1]

نہیں کوئی مہلک مرض اُس کو لیکن

بجا ہیں حواس اُس کے اور ہوش قائم　　طبیعت میں میل خور و نوش [2] قائم

دماغ اور دل چشم اور گوش قائم　　جوانی کا پندار [3] اور جوش قائم

کرے کوئی اس کی اگر غور کامل

عجب کیا جو ہو جائے زندوں میں شامل

عیاں [4] سب پہ احوال بیمار کا ہے　　کہ تیل اُس میں جو کچھ تھا سب جل چکا ہے

موافق دوا ہی نہ کوئی غذا ہے　　ہُزالِ [5] بدن ہے زوالِ قویٰ ہے

مگر ہے ابھی یہ دیا ٹمٹماتا

بُجھا جو کہ ہے یاں نظر سب کو آتا

یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحط انساں　　نہیں قوم کے پر سب افراد یکساں

سفال و خزف [6] کے ہیں انبار گریاں جواہر کے ٹکڑے بھی ہیں ان میں پنہاں
چھپے سنگ ریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزہ زر [7] بھی ہیں کچھ
جو بےغم ہیں ان میں تو غم خوار بھی ہیں جو بے مہر [8] ہیں کچھ تو کچھ یار بھی ہیں
انہیں غافلوں میں خبردار بھی ہیں خرابات [9] میں چند ہشیار بھی ہیں
جماعت سے اپنی نرالے بھی ہیں یاں
نکموں میں کچھ کام والے بھی ہیں یاں

۱۔ مزمن: پرانا مرض۔ ۲۔ خور و نوش: کھانا پینا۔
۳۔ پندار: غرور، حوصلہ۔ ۴۔ عیاں: ظاہر۔
۵۔ نزار بدن: لاغر بدن۔ ۶۔ سفال و خزف: مٹی اور ٹھیکری۔
۷۔ ریزہ زر: سونے کے ذرات۔ ۸۔ بے مہر: بے محبت۔
۹۔ خرابات: شراب خانے۔

جو چاہیں پلٹ دیں یہی سب کی کایا [1] کہ ایک اک نے ملکوں کو ہے یاں جگایا
اکیلوں نے ہے قافلوں کو بچایا جہازوں کو ہے زورقوں [2] نے ترایا
یونہیں کام دنیا کا چلتا رہا ہے
دیے سے دیا یونہیں جلتا رہا ہے
یہ سچ ہے کہ ہیں بیشتر ہم میں ناداں نہیں جن کے دردِ کا درماں
جہاں میں ہیں جو ان کی عزت کے خواہاں انہیں سے وہ رہتے ہیں دست و گریباں
پہ ایسے بھی کچھ ہوتے جاتے ہیں پیدا
کہ جو خیر خواہوں پہ ہیں اپنے شیدا
کوئی خیر خواہی میں ہے ہمسر اُن کا کوئی دست و بازو سے ہے یاور اُن کا
کوئی ہے زباں سے ستائش [3] گر اُن کا بہت رکھتے ہیں نقشِ حُب [4] دل پر اُن کا
بہت اُن کے گن [5] سنتے ہیں چپکے چپکے

بہت سن کے سر دھنتے ہیں چپکے چپکے

بہت دن سے دریا کا پانی کھڑا تھا　　تموج[6] کا جس میں نہ ہرگز پتا تھا
تغیر سے یہ حال اُس کا ہوا تھا　　کہ مکروہ تھی بو تو کڑوا مزا تھا
ہوئی تھی یہ پانی سے زائل روانی
کہ مشکل سے کہہ سکتے تھے اُس کو پانی

پر اب اُس میں رو کچھ کچھ آنے لگی ہے　　کناروں کو اُس کے ہلانے لگی ہے
ہوا بلبلے کچھ اُٹھانے لگی ہے　　عفونت[7] وہ پانی سے جانے لگی ہے
اگر ہو نہ یہ انقلاب اتفاقی
تو دریا میں بس اک تموج ہے باقی

۱۔ کایا: قسمت۔　　۲۔ زورقوں: چھوٹی کشتیوں۔
۳۔ ستائش گر: تعریف کرنے والا۔　　۴۔ نقشِ حُب: محبت کا نقش۔
۵۔ اچھے اخلاق۔　　۶۔ تموج: لہروں کا حرکت میں آنا۔
۷۔ عفونت: سڑی بدبو۔

حوادث[1] نے اُن کو ڈرایا ہے کچھ کچھ　　مصائب[2] نے نیچا دکھایا ہے کچھ کچھ
ضرورت نے رستہ دکھایا ہے کچھ کچھ　　زمانے کے غسل نے جگایا ہے کچھ کچھ
ذرا دست و بازو ہلانے لگے ہیں
وہ سونے میں کچھ کلبلانے[3] لگے ہیں

راہ راست پر ہیں وہ کچھ آتے جاتے　　تَعلّی[4] سے ہیں اپنی شرماتے جاتے
تفاخر[5] سے ہیں اپنے پچتاتے جاتے　　سراغ[6] اپنا کچھ کچھ ہیں وہ پاتے جاتے
بزرگی کے دعووں سے پھرنے لگے ہیں
وہ خود اپنی نظروں سے گرنے لگے ہیں

نہیں گھاٹ پر گو ترقی کے آتے　　نئی بات سے ناک بھوں ہیں چڑھاتے
نئی روشنی سے ہیں آنکھیں چراتے　　مگر ساتھ ہی یہ بھی ہیں کہتے جاتے

کہ دنیا نہیں گرچہ رہنے کے قابل
پر اس طرح دنیا میں رہنا ہے مشکل

تنزل پہ وہ بات ملنے لگے ہیں — کچھ اس سوز سے جی پگھلنے لگے ہیں
دھوئیں کچھ دلوں سے نکلنے لگے ہیں — کچھ آرے سے سینوں پہ چلنے لگے ہیں
وہ غفلت کی راتیں گذرنے کو ہیں اب
نشے جو چڑھے تھے اُترنے کو ہیں اب

نہیں گرچہ کچھ درد اسلام اُن کو — نہ بہبودیِ قوم سے کام اُن کو
نہ کچھ فکر آغاز و انجام اُن کو — برابر ہے ہو صبح یا شام اُن کو
مگر قوم کی سن کے کوئی مصیبت
انہیں کچھ نہ کچھ آ ہی جاتی ہے رقّت [7]

---

[1] حوادث: حادثات زمانہ۔
[2] مصائب: درد کے واقعات۔
[3] کلبلانے لگے: بڑبڑانے لگے۔
[4] تعلّی: فخر کرنا۔
[5] تفاخر: فخر کرنا۔
[6] سراغ: پتا۔
[7] رقت: رونا دھونا۔

خصومت [1] سے ہیں اپنی گو خواریاں سب — نزاعوں [2] سے باہم کی ہیں ناتواں سب
خود آپس کی چوٹوں سے ہیں خستہ جاں [3] — پہ ہیں متفق اس پہ پیر و جواں سب
سب
کہ نا اتفاقی نے کھویا ہے ہم کو
اسی جزر و مد [4] نے ڈبویا ہے ہم کو

یہ مانا کہ کم ہم میں ہیں ایسے دانا — جنہوں نے حقیقت کو ہے اپنی چھانا
تنزل کو ہے ٹھیک اپنے جانا — کہ ہم ہیں کہاں اور کہاں ہے زمانہ
پہ اتنا زبانوں پہ ہے سب کے جاری
کہ حالت بری آج کل ہے ہماری

فرائض میں گو دین کے سب ہیں قاصر [5] نہ مشغول باطن نہ پابند ظاہر
مساجد سے غائب ملاہی [6] میں حاضر مگر ایسے فاسق ہیں اُن میں نہ فاجر
کہ مذہب پہ حملے ہیں جو ہر طرف سے
وہ دیکھ اُن کو ہٹ جائیں راہِ سلف سے

خود اپنی ہے گو قدر و قیمت گنوائی پہ بھولے نہیں ہیں بڑوں کی بڑائی
جو آپ اُن کی خوبی نہیں کوئی پائی تو ہیں خوبیوں پر انہیں کے فدائی
شرف گو کہ باقی نہیں اُن میں اب کچھ
مگر خواب میں دیکھ لیتے ہیں سب کچھ

ذرا پھر کے پیچھے وہ جب دیکھتے ہیں وہ اپنا حسب اور نسب دیکھتے ہیں
بزرگوں کا علم و ادب دیکھتے ہیں سرافرازی [7] جَدّ و اب دیکھتے ہیں
تو ہیں فخر سے وہ کبھی سر اٹھاتے
کبھی ہیں ندامت سے گردن جھکاتے

۱۔ خصومت: دشمنی۔ ۲۔ نزاعوں: جھگڑوں۔
۳۔ خستہ جاں: تھکے ماندے۔ ۴۔ جزر ومد: اتار چڑھاؤ۔
۵۔ قاصر: معذور۔ ۶۔ ملاہی: کھیل کود۔
۷۔ سرافرازی: سربلندی۔

اگر کچھ بھی باقی ہو یاروں میں ہمت تو اُن کا یہی افتخار اور ندامت
شگون [1] سعادت ہے اور فال دولت کہ آتی ہے کچھ اس سے بوئے حمیت [2]
وہ کھو بیٹھے آخر کمائی بڑوں کی
بھلا دی جنھوں نے بڑائی بڑوں کی

اسیری [3] میں جو گرم فریاد ہیں یاں وہی آشیاں کرتے آباد ہیں یاں
قفس سے وہی ہوتے آزاد ہیں یاں چمن کے جنہیں چہچہے یاد ہیں یاں
وہ شاید قفس ہی میں عمریں گنوائیں
گئیں بھول صحرا کی جن کو فضائیں

بلندی میں ہوں یا کہ پستی میں ہوں تم قوی ہوں کہ کمزور افزوں[4] ہوں یا کم
مُحقَّر[5] زمانے میں ہوں یا مُکرَّم موخر[6] ہوں اس بزم میں یا مُقدَّم[7]

عبا میں ہوں پوشیدہ یا شال میں ہوں
کسی رنگ میں ہوں کسی حال میں ہوں

اگر با خبر ہیں حقیقت سے اپنی تلف[8] کی ہوئی اگلی عظمت سے اپنی
بلندی و پستی کی نسبت سے اپنی گذشتہ اور آیندہ حالت سے اپنی

تو سمجھو کہ ہے پار کھیوا[9] ہمارا
نہیں دُور منجدھار[10] سے کچھ کنارا

الپ[11] ارسلاں سے یہ طغرل[12] نے پوچھا کہ قومیں ہیں دنیا میں جو جلوہ فرما
نشاں اُن کی اقبال مندی کے ہیں کیا کب اقبال مند اُن کو کہنا ہے زیبا

۱۔ شگون سعادت: خوش بختی کا موقع۔ ۲۔ بوئے حمیت: شرم وحیا۔ ۳۔ اسیری: قیدی۔
۴۔ افزوں: زیادہ۔ ۵۔ مُحقَّر: ذلیل۔ ۶۔ موخر: آخری۔
۷۔ مقدم: اوّل۔ ۸۔ تلف: ضائع ہونا۔ ۹۔ کھیوا: بیڑا۔
۱۰۔ منجدھار: طوفان۔
۱۱۔ الپ ارسلان: سلجوقیوں کا دوسرا بادشاہ تھا۔
۱۲۔ طغرل ارسلان کا چچا تھا جس کے بعد ارسلان بادشاہ بنا۔

کہا ملک و دولت ہو ہاتھ اُن کے جب تک
جہاں ہو کمر بستہ ساتھ اُن کے جب تک

جہاں جائیں وہ سرخ رو ہو کے آئیں ظفر ہم عناں[1] ہو جدھر باگ اُٹھائیں
نہ بگڑیں کبھی کام جو وہ بنائیں نہ اُکھڑیں قدم جس جگہ وہ جمائیں

کریں مَس[2] کو گر مَس تو وہ کیمیا ہو
اگر خاک میں ہات ڈالیں طلا ہو

ولی عہد کی جب کہ باتیں سنیں یہ   ہنسا سن کے فرزانہ [3] دور بیں یہ
کہا جانِ عم [4] گپ ہے گو دلنشیں یہ   مگر شرط اقبال ہرگز نہیں یہ

حوادث [5] سے بن گزارا نہیں یاں
بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں

بہم ہے کچھ گاہ برہم ہے محفل   کٹھن ہے کبھی گاہ آساں ہے منزل
زمانے کی گردش سے بچنا ہے مشکل   نہ محفوظ ہیں اس سے مدبر [6] نہ مقبل

بہت یکہ تازوں [7] کو یاں گرتے دیکھا
صدا شہسواروں کو یاں گرتے دیکھا

جہاں سود ہے یاں وہیں ہے زیاں [8] بھی   جہاں روشنی ہے وہیں ہے دھواں بھی
سقر [9] بھی ہے یہ خاک داں اور جناں [10]   بہاریں بھی ہیں اس چمن میں خزاں بھی

نکھرتے ہیں جو یاں وہ گدلاتے بھی ہیں
چمکتے ہیں جو یاں وہ گہناتے [11] بھی ہیں

۱۔ ہم عناں: ہم رکاب۔
۲۔ مس: تانبا۔
۳۔ فرزانہ دور بیں: عقل مند دور اندیش۔
۴۔ جانِ عم: چچا کی جان۔
۵۔ حوادث: روزانہ کے حالات۔
۶۔ مدبر و مقبل: بدبخت اور خوش بخت۔
۷۔ یکہ تازوں: شہسواروں۔
۸۔ زیاں: نقصان۔
۹۔ سقر: دوزخ۔
۱۰۔ جناں: جنت۔
۱۱۔ گہناتے: گہن میں آجاتے ہیں۔

ضعیف اور قوی ارمنی اور عراقی   چکھاتا ہے دُردِ قدح [1] سب کو ساقی
پہ اقبال کی ہے رمق [2] جن میں باقی   یہ سب تلخیاں اُن کی ہیں اتفاقی

بلاؤں میں گھر کر نکل جاتے ہیں وہ
ذرا ڈگمگا کر سنبھل جاتے ہیں وہ

نہیں ہوتے نیرنگِ گردوں [3] سے حیراں ہر اک درد کا ڈھونڈ لیتے ہیں درماں
اٹھاتے نہیں کچھ حوادث سے نقصاں وہ چونک اٹھتے ہیں دیکھ خوابِ پریشاں

بھڑکتے ہیں افسردہ ہو کر سوا وہ
پھبکتے [4] ہیں پژمردہ ہو کر سوا وہ

پگھلتے ہیں سانچے میں ڈھلنے کی خاطر لگاتے ہیں غوطہ اچھلنے کی خاطر
ٹھہرتے ہیں دم لے کے چلنے کی خاطر وہ کھاتے ہیں ٹھوکر سنبھلنے کی خاطر

سبب کو مرض سے سمجھتے ہیں پہلے
الجھتے ہیں پیچھے سلجھتے ہیں پہلے

ضرورت نہیں یہ کہ فرماں [5] روا ہوں رعیت [6] ہوں وہ خواہ کشور کشا [7] ہوں
سپاہی ہوں تاجر ہوں یا ناخدا ہوں وہ کچھ ہوں پہ اپنے سے واقف ذرا ہوں

کہ ہم کیا ہیں اور کون ہیں اور کہاں ہیں
گھٹے یا بڑھے ہیں سبک [8] یا گراں ہیں

جب آئی انہیں ہوش کچھ وقت کھو کر رہیں بیٹھ قسمت کو اپنی نہ رو کر
کریں کوششیں سب بہم ایک ہو کر رہیں داغ ذلت کا دامن سے دھو کر

1۔ دُرد قدح: ساغر کی بچی شراب، تلچھٹ۔ 2۔ رمق: تھوڑی چیز۔
3۔ نیرنگِ گردوں: زمانے کی نیرنگی۔ 4۔ پھبکتے: تازہ ہوتے ہیں۔
5۔ فرماں رواں: حکمراں۔ 6۔ رعیت: رعایا۔
7۔ کشور کشا: حکومت پھیلانے والے۔ 8۔ سبک یا گراں: ہلکے یا وزنی۔

نہ ہو تابِ پرواز [1] گر آسماں تک
تو واں تک اُڑیں ہو رسائی [2] جہاں تک

پڑا ہے وہی وقت اب ہم پہ آ کر کہ اُٹھے ہیں سوتے بہت دن چڑھا کر
سواروں نے کی راہ طے باگ اُٹھا کر گئے قافلے ٹھہر منزل پہ جا کر

گر افتاں وخیزاں [3] سدھارے بھی اب ہم
تو پہنچے بھلا جا کے منزل پہ کب ہم
مگر بیٹھ رہنے سے چلنا ہے بہتر   کہ ہے اہل ہمت کا اللہ یاور
جو ٹھنڈک میں چلنا نہ آیا میسر   تو پہنچیں گے ہم دھوپ کھا کھا کے سر پر
یہ تکلیف و راحت ہے سب اتفاقی
چلو اب بھی ہے وقت چلنے کا باقی
ہوا کچھ وہی جس نے یاں کچھ کیا ہے   لیا جس نے پھل بیج بو کر لیا ہے
کرو کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا [4] ہے   مثل ہے کہ کرنے کی سب بدیا [5] ہے
یونہیں وقت سو سو کے جو ہیں گنواتے
وہ خرگوش کچھوؤں سے ہیں زک [6] اُٹھاتے
یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری   جہاں دیکھیے فیض اسی کا ہے جاری
یہی ہے کلیدِ [7] درِ فضلِ باری   اسی پر ہے موقوف عزت تمہاری
اسی سے ہے قوموں کی یاں آبرو سب
اسی پر ہیں مغرور میں اور تو سب

[1] تابِ پرواز: اُڑنے کی طاقت۔
[2] رسائی: پہنچ۔
[3] افتاں وخیزاں: گرتے پڑتے۔
[4] کیمیا: وہ فرضی عمل جس سے سستی دھاتیں سونا میں تبدیل کی جاسکتی ہیں۔
[5] بدیا: ہنر، بزرگی۔
[6] زک: نقصان، شکست۔
[7] کلید: کنجی۔

گلستاں میں جوبن [1] گل و یاسمن کا   سماں زلفِ سنبل کی تاب و شکن [2] کا
قدِ دل رُبا [3] سرو اور نارون کا   رُخِ جاں فزا [4] لالہ و نسترن کا
غریبوں کی محنت کی ہے رنگ و بو سب
کمیروں [5] کے خوں سے ہیں یہ تازہ رو سب

ہلاتے نہ اگلے اگر دست و بازو جہاں عطرِ حکمت سے ہوتا نہ خوشبو
نہ اخلاق کی وضع ہوتی ترازو نہ حق پھیلتا رُبعِ مسکوں [۶] میں ہر سو
حقائق یہ سب غیر معلوم رہتے
خدائی کیا اسرار مکتوم [۷] رہتے

ستارہ شریعت کا تاباں نہ ہوتا اثر علمِ دیں کا نمایاں نہ ہوتا
جدا کفر سے نُورِ ایماں نہ ہوتا مساجد میں یوں وردِ قرآں نہ ہوتا
خدا کی ثنا معبدوں میں نہ ہوتی
اذاں جا بجا مسجدوں میں نہ ہوتی

نہیں ملتی کوشش سے دنیا ہی تنہا کہ ارکانِ دیں بھی اسی پر ہیں برپا
جنہیں ہو نہ دنیائے فانی کی پروا کریں آخرت کا ہی وہ کاش سودا
نہیں ہلتے دنیا کی خاطر اگر تم
تو لو دینِ حق کی ہی اُٹھ کر خبر تم

بنی نوع میں دو طرح کے ہیں انساں تفاوت [۸] ہے حالت میں جن کی نمایاں
کچھ اُن میں ہیں راحت طلب اور تن آساں [۹] بدن کے نگہبان بستر کے دربان

---

[۱] جوبن: چڑھتی جوانی، حسن۔
[۲] تاب وشکن: چمک اور حلقے۔
[۳] دل رُبا: دل چرانے والا۔
[۴] جاں فزا: روح کو طراوت دینے والا۔
[۵] کمیروں: وہ مزدور جو کسان کے ساتھ کام کرتا ہے۔
[۶] ربعِ مسکون: دنیا کی ایک چوتھائی خشکی جس پر انسانوں کی آبادی ہے۔
[۷] مکتوم: پوشیدہ۔ [۸] تفاوت: فرق۔ [۹] تن آساں: کاہل۔

نہ محنت پہ مائل نہ قدرت کے قائل
سمجھتے ہیں تنکے کو رستے میں حائل

اگر ہیں تونگر تو بے کار ہیں سب — اپاہج[1] ہیں روگی[2] ہیں بیمار ہیں سب
تعیش[3] کے ہاتھوں سے لاچار ہیں سب — تن آسانیوں میں گرفتار ہیں سب
برابر ہے یاں اُن کا ہونا نہ ہونا
نہ کچھ جاگنا اُن کا بہتر نہ سونا

اگر ہیں تہی دست اور بے نوا وہ — تو محنت سے ہیں جی چراتے سدا وہ
نصیبوں کا کرتے ہیں اکثر گلا وہ — ہلاتے نہیں کچھ مگر دست و پا وہ
اگر بھیک مل جائے قسمت سے اُن کو
تو سو بار بہتر ہے محنت سے اُن کو

نہ جو بے نوا ہیں نہ ہیں کچھ تونگر — وہ ہیں ڈھور[4] کی طرح قانع[5] اسی پر
کہ کھانے کو ملتا رہے پیٹ بھر کر — نہیں بڑھتے بس اس سے آگے قدم بھر
ہوئے زیور آدمیت سے عاری[6]
معطل[7] ہوئیں قوتیں ان کی ساری

نہ ہمت کہ محنت کی سختی اُٹھائیں — نہ جرأت کہ خطروں کے میداں میں آئیں
نہ غیرت کہ ذلت سے پہلو بچائیں — نہ عبرت کہ دنیا کی سمجھیں ادائیں
نہ کل فکر تھا یہ کہ ہیں اس کے پھل کیا
نہ ہے آج پروا کہ ہوتا ہے کل کیا

نہیں کرتے کھیتی میں وہ جاں فشانی[8] — نہ ہل جوتتے ہیں نہ دیتے ہیں پانی
پہ جب یاس[9] کرتی ہے دل پر گرانی — تو کہتے ہیں حق کی ہے نا مہربانی

۱۔ اپاہج: معذور۔ ۲۔ روگی: بیمار۔ ۳۔ تعیش: عیاشی کرنا۔
۴۔ ڈھور: جانور جن سے وزن اٹھانے کا کام لیا جاتا ہے۔
۵۔ قانع: مطمئن۔ ۶۔ عاری: خالی۔ ۷۔ معطل: ختم۔
۸۔ جاں فشانی: جاں لگا کر محنت کرنا۔ ۹۔ یاس: ناامیدی۔

نہیں لیتے کچھ کام تدبیر سے وہ
سدا لڑتے رہتے ہیں تقدیر سے وہ

کبھی" کہتے ہیں ہیچ[1] ہیں سب یہ ساماں کہ خود زندگی ہے کوئی دن کی مہماں
دھرے سب یہ رہ جائیں گے کاخ[2] و ایواں نہ باقی رہے گی حکومت نہ فرماں

ترقی اگر ہم نے کی بھی تو پھر کیا
یہ بازی اگر جیت لی بھی تو پھر کیا

یہ سرگرم کوشش میں جو روز و شب ہیں اُٹھاتے سدا بار رنج و تعب[3] ہیں
ترقی کے میداں میں سبقت[4] طلب ہیں نمائش پہ دنیا کی بھولے یہ سب ہیں

نہیں ان کو کچھ اپنی محنت سے لہنا
بناتے ہیں وہ گھر نہیں جس میں رہنا"

کبھی کرتے ہیں عقلِ انساں پہ نفریں[5] کہ با وصف کوتاہ بینی[6] ہے خود میں
وہ تدبیریں اس طرح کرتی ہے تلقیں[7] کہ گویا کھلا اس پہ ہے سرِّ تکویں[8]

مگر سب خیالات ہیں خام اُس کے
ادھورے ہیں جتنے ہیں یاں کام اُس کے

نہ اسباب راحت کی اُس کو خبر کچھ نہ آثار دولت کی اُس کو خبر کچھ
نہ عزت نہ ذلت کی اُس کو خبر کچھ نہ کلفت[9] نہ راحت کی اُس کو خبر کچھ

نہ آگاہ اس سے کہ ہستی[10] ہے شے کیا
نہ واقف کہ مقصودِ ہستی سے ہے کیا

۱۔ ہیچ: بے کار، کچھ نہیں۔
۲۔ کاخ: محل۔
۳۔ تعب: رنج، دُکھ۔
۴۔ سبقت: پہل کرنا۔
۵۔ نفریں: ملامت۔
۶۔ کوتاہ بینی: کم نظری۔
۷۔ تلقین: یقین کرنا۔
۸۔ سرِّ تکوین: پیدائش کا بھید۔
۹۔ کلفت: زحمت۔
۱۰۔ ہستی: زندگی۔

کبھی کہتے ہیں زہر ہے مال و دولت اُٹھاتے ہیں جس کے لیے رنج و محنت
اسی سے گناہوں کی ہوتی ہے رغبت [1] اسی سے دماغوں میں آتی ہے نخوت [2]
یہی حق سے کرتی ہے بندوں کو غافل
ہوئے ہیں عذاب اس سے قوموں پہ نازل

کبھی کہتے ہیں سعی و کوشش [3] سے حاصل کہ مقسوم [4] بن کوششیں سب ہیں باطل
نہیں ہوتی کوشش سے تقدیر زائل برابر ہیں یاں محنتی اور کاہل
ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی

نکموں کے ہیں سب یہ دلکش ترانے سلانے کو قسمت کے رنگیں فسانے
اسی طرح کے کر کے حیلے بہانے نہیں چاہتے دست و بازو ہلانے
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

سنی تم نے یہ جس جماعت کی حالت تنزل کی بنیاد ہے یہ جماعت
بگڑتی ہیں قومیں اسی کی بدولت ہوا اس کی ہے مفسد [5] ملک و ملت
کیا صور و صیدا [6] کو برباد اسی نے
بگاڑا دمشق اور بغداد اسی نے

جہاں ہے زمیں پر نحوست ہے ان کی جدھر ہے زمانے میں نکبت [7] ہے ان کی
مصیبت کا پیغام کثرت ہے ان کی تباہی کا لشکر جماعت ہے ان کی

---

[1] رغبت: کشش۔ [2] نخوت: غرور۔
[3] سعی: کوششیں۔ [4] مقسوم: قسمت کا لکھا۔
[5] مفسد: فسادی۔
[6] صور صیدا: صور شام کا ایک قدیم شہر تھا جس میں یونان کے فلاسفر زندگی بسر کرتے تھے۔ صیدا دمشق کے قریب ایک قدیم شہر تھا جس میں کئی مضبوط قلعے تھے۔
[7] نکبت: افلاس۔

وجود ان کا اصل البلیات [1] ہے یاں
خدا کا غضب ان کی بہتات [2] ہے یاں

سب ایسے تن آسان و بے کار و کاہل — تمدن کے حق میں ہیں زہر ہلاہل [3]
نہیں ان سے کچھ نوعِ انساں [4] کو حاصل — نہیں ان کی صحبت کہ ہے سمِّ قاتل [5]

یہ جب پھیلتے ہیں سمٹتی ہے دولت
یہ جوں جوں کہ بڑھتے ہیں گھٹتی ہے دولت

جہاں بڑھ گئی ان کی تعداد حد سے — ہوئی قوم محسوب [6] سب دام [7] و دد سے
رہا اُس کو بہرہ [8] نہ حق کی مدد سے — وہ اب بچ نہیں سکتی نکبت کی زد سے

بچو ایسے شوموں [9] کی پرچھائیوں سے
ڈرو ایسے چپ چاپ یغمائیوں [10] سے

مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے — شرف [11] جس سے نوعِ بشر کو ملا ہے
سب اس بزم میں جن کا نور و ضیا [12] ہے — سب اس باغ کی جن سے نشو و نما ہے

ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر

نہ راحت طلب ہیں نہ مہلت طلب وہ — لگے رہتے ہیں کام میں روز و شب وہ
نہیں لیتے دم ایک دم بے سبب وہ — بہت جاگ لیتے ہیں سوتے ہیں تب وہ

وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا
کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا

---

[1] اصل البلیات: رنج اور دکھ کی جڑ۔ [2] بہتات: زیادہ۔
[3] زہر ہلاہل: بہت خطرناک زہر۔ [4] نوعِ انسان: انسانی نسل۔
[5] سمِّ قاتل: زہر قاتل۔ [6] محسوب: حساب کرتے ہیں۔
[7] دام و دد: مویشی اور جانور۔ [8] بہرہ: فائدہ۔
[9] شوموں: منحوسوں۔ [10] یغمائیوں: لٹیروں۔
[11] شرف: عزت، مقام۔ [12] ضیا: روشنی۔

چنیں[1] گر نہ وہ ہوں کھنڈر کاخ و ایواں بنیں گر نہ وہ شاہ و کشور ہو عریاں
جو بوئیں نہ وہ تو ہوں جاں دار بے جاں جو چھانٹیں نہ وہ تو ہوں جنگل گلستاں

یہ چلتی ہے گاڑی اُنہیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل[2] ہوں سارے

کھپاتے ہیں کوشش میں تاب وتواں[3] کو گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں[4] کو
سمجھتے نہیں اس میں جان اپنی جاں کو وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو

بس اس طرح جینا عبادت ہے اُن کی
اور اس دُھن میں مرنا شہادت ہے اُن کی

مشقت میں عمر اُن کی کٹتی ہے ساری نہیں آتی آرام کی اُن کے باری
سدا بھاگ دَوڑ اُن کی رہتی ہے جاری نہ آندھی میں عاجز[5] نہ مینھ میں ہیں عاری[6]

نہ لُو جیٹھ[7] کی دم تڑاتی ہے اُن کا
نہ ٹھر[8] ماہ کی جی چھڑاتی ہے اُن کا

نہ احباب کی تیغِ احساں کے گھائل نہ بیٹے سے طالب نہ بھائی سے سائل
نہ دُکھ درد میں سوئے آرام مائل نہ دریا و کوہ اُن کے رستے میں حائل

سُنے ہوں کبھی رستم و سام[9] جیسے
غیور اب بھی لاکھوں ہیں گمنام[10] ویسے

کسی کو یہ دُھن ہے کہ جو کچھ کمائیں کھلائیں کچھ اوروں کو کچھ آپ کھائیں
کسی کو یہ کد[11] ہے کہ جھیلیں بلائیں پہ احساں کسی کا نہ ہرگز اُٹھائیں

---

[1] چنیں: اس طرح۔ [2] بےکل: بےقرار، بےسکون۔
[3] تاب وتواں: ہمت اور توانائی۔ [4] رواں: روح، جان۔
[5] عاجز: بےکار۔ [6] عاری: خالی۔
[7] جیٹھ: گرمی کا مہینہ۔ [8] ٹھر ماہ: سردی کا مہینہ۔

۹؎ رستم و سام: ایران کے پہلوان۔ ۱۰؎ غیور: غیرت مند۔
۱۱؎ کد: دکھ، ارادہ۔

کوئی محو ہے فکر فرزند و زن میں
کوئی چور ہے حُبِّ اہلِ وطن میں

جو مصروف ہے کاشتکاری میں کوئی — تو مشغول دوکان داری میں کوئی
عزیزوں کی ہے غم گساری میں کوئی — ضعیفوں کی خدمت گذاری میں کوئی
یہ ہے اپنی راحت کے سامان کرتا
وہ کنبے پہ ہے جان قربان کرتا

کوئی اس تگ و دو[۱] میں رہتا ہے ہر دم — کہ دولت جہاں تک ہو کیجیے فراہم
رہیں جیتے جی تاکہ خود شاد و خرم[۲] — مریں جب تو دل پر نہ لے جائیں یہ غم
کہ بعد اپنے کھائیں گے فرزند وزن کیا
لباس اُن کا اور اپنا ہو گا کفن کیا

بہت دل میں اپنے یہ رکھتے ہیں ارماں — کہ کر جائیں یاں کوئی کارِ نمایاں
وہ ہوں تاکہ جب چشمِ عالم سے پنہاں — تو ذکرِ جمیل[۳] ان کا باقی رہے یاں
یہی طالبِ شہرت و نام لاکھوں
بناتے ہیں جمہور[۴] کے کام لاکھوں

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے — نشاں جن سے قائم ہیں صدق وصفا[۵] کے
نہ شہرت کے خواہاں نہ طالب ثنا کے — نمائش سے بے زار دُشمن ریا[۶] کے
ریاضت سب اُن کی خدا کے لیے ہے
مشقت سب اُس کی رضا کے لیے ہے

کوئی اُن میں ہے حق کی طاعت پہ مفتوں — کوئی نام حق کی اشاعت پہ مفتوں[۷]
کوئی زہد و صبر و قناعت پہ مفتوں — کوئی پند و وعظ و جماعت پہ مفتوں

ا۔ تگ ودو: دوڑ دھوپ۔ ۲۔ شاد وخرم: خوش اور خوش حال۔
۳۔ ذکرِ جمیل: خوبصورت ذکر۔ ۴۔ جمہور: عوام۔
۵۔ صدق وصفا: سچائی اور مروت۔ ۶۔ ریا: ریا کاری۔
۷۔ مفتوں: فاتح، حاصل کیا ہوا۔

کوئی موج سے آپ کو ہے بچاتا
کوئی ناؤ ہے ڈوبتوں کی تراتا

بہت نوعِ انساں کے غم خوار و یاور ہوا خواہِ ملت بہ اندیش[۱] کشور
شدائد[۲] کے دریائے خوں میں شناور[۳] جہاں کی پُر آشوب[۴] کشتی کے لنگر
ہر اک قوم کی ہست و بود[۵] اُن سے ہے یاں
سب اس انجمن کی نمود[۶] اُن سے ہے یاں

کسی پر ہو سختی صعوبت[۷] ہے اُن پر کسی کو ہو غم رنج وکلفت[۸] ہے اُن پر
کہیں ہو فلاکت[۹] مصیبت ہے اُن پر کہیں آئے آفت قیامت ہے اُن پر
کسی پر چلیں تیر آماج[۱۰] یہ ہیں
لٹے کوئی رہ گیر[۱۱] تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے یہ پیماں کو میخوں[۱۲] سے ہیں جڑنے والے
یہ فوج حوادث سے ہیں لڑنے والے یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے
امنڈتا[۱۳] ہے رکنے سے اور ان کا دریا
جنوں سے زیادہ ہے کچھ ان کا سودا[۱۴]

جماتے ہیں جب پاؤں ہٹتے نہیں یہ بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب پھر سمٹتے نہیں یہ جہاں بڑھ گئے بڑھ کے گھٹتے نہیں یہ

ا۔ بہ اندیش کشور: ملک کی سوچنے والے۔ ۲۔ شدائد: شدید۔
۳۔ شناور: پیراک۔ ۴۔ پرآشوب: طوفانی۔
۵۔ ہست وبود: موجودگی۔ ۶۔ نمود: ترقی۔

۷۔ صعوبت: تکلیف۔ ۸۔ کلفت: سختی۔
۹۔ فلاکت: مفلسی، غربت۔ ۱۰۔ آماج: نشانہ۔
۱۱۔ رہ گیر: مسافر۔ ۱۲۔ مخوں: کیلوں۔
۱۳۔ امنڈنا: بڑھنا۔ ۱۴۔ سودا: دماغی خلل، دماغ کا حال۔

مہم [۱] بن کیے سر نہیں بیٹھتے یہ
جب اُٹھتے ہیں اٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جو ان کو قوت ۔۔۔ سمائی ہے اُس کی بہت دل میں عظمت
نہیں پھیرتی اُن کا منھ کوئی زحمت ۔۔۔ نہیں کرتی زیر اُن کو کوئی صعوبت

بھروسے پہ اپنے دل دست و پا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار اُن کو ۔۔۔ ہر اک راہ ملتی ہے ہموار اُن کو
گلستاں ہے صحرائے پُر خار اُن کو ۔۔۔ برابر ہے میدان و کہسار اُن کو

نہیں حائل اُن کے کوئی رہ گذر میں
سمندر ہے پایاب [۲] اُن کی نظر میں

اسی طرح یاں اہلِ ہمت ہیں جتنے ۔۔۔ کمر بستہ ہیں کام پر اپنے اپنے
جہاں کی ہے سب دھوم دھام اُن کے دم سے ۔۔۔ فقیر اور غنی سب طفیلی [۳] ہیں اُن کے

بغیر اُن کے بے ساز و ساماں تھی مجلس
نہ ہوتے اگر یہ تو ویراں تھی مجلس

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انہیں سے ۔۔۔ زمانے کا ہے گرم بازار انہیں سے
ملے ہیں سعادت [۴] کے آثار انہیں سے ۔۔۔ کھلے ہیں خدائی کے اسرار انہیں سے

انہیں پر ہے کچھ فخر گر ہے کسی کو
انہیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو

انہیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت ۔۔۔ انہیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت

انہیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت انہیں کی ہے سب ربع مسکوں[۵] میں برکت

ا۔ مہم: معرکہ۔ ۲۔ پایاب: اتھلا پانی، پانی جس میں گہرائی نہ ہو۔
۳۔ طفیلی: صدقے میں۔ ۴۔ سعادت: خوش بختی۔
۵۔ ربع مسکون: ایک چوتھائی خشکی جہاں انسان بستے ہیں۔

دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی[ا] خلافت خدا کی

انہیں کا اُجالا ہے ہر رہ گذر میں انہیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں
انہیں کا ظہور ہے سب خشک و تر میں انہیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں

انہیں سے ہے رتبہ یہ آدم نے پایا
کہ سر اُس سے روحانیوں[۲] نے جھکایا

ہر اک ملک میں خیر و برکت ہے ان سے ہر اک قوم کی شان و شوکت ہے ان سے
نجابت[۳] ہے ان سے شرافت ہے ان سے شرف ان سے فخر ان سے عزت ہے ان سے

جفاکش بنو گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا ہے بھید ذلت میں پنہاں

مشقت کی ذلت جنہوں نے اُٹھائی جہاں میں ملی اُن کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی فضیلت نہ عزت نہ فرماں[۴] روائی

نہال[۵] اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

حکومت ملی اُن کو صَفّار[۶] تھے جو امامت کو پہونچے وہ قَصّار[۷] تھے جو
وہ قطبِ زماں[۸] ٹھہرے عطّار[۹] تھے جو بنے مرجعِ خلق تجّار[۱۰] تھے جو

ا۔ پھبتی: جچتی۔
۲۔ روحانیوں: فرشتوں، ملائک۔
۳۔ نجابت: پاکیزگی۔

۴۔ فرماں روائی: حکومت۔
۵۔ نہال: پودا۔
۶۔ صفار: تانبے کے برتن بنانے والا، خراسان میں 30 برس صفاریوں کی حکومت رہی۔
۷۔ قصار: دھوبی۔
۸۔ قطب زماں: زمانے کے مرکز۔
۹۔ عطار: عطر فروش۔
۱۰۔ نجار: بڑھئی۔

اولوالفضل [۱] یاں اُٹھے سرّاج [۲] کتنے
ابوالوقت ہو گذرے حلّاج [۳] کتنے

نہ بو نصر [۴] تھا نوع میں ہم سے بالا ۔۔۔ نہ تھا بو علی [۵] کچھ جہاں سے نرالا
طبیعت کو بچپن سے محنت میں ڈالا ۔۔۔ ہوئے اس لیے صاحب قدر والا
اگر فکر کسب ہنر تم کو بھی ہو
تمہیں پھر ابو نصر اور بو علی ہو

بڑا ظلم اپنے پہ تم نے کیا ہے ۔۔۔ کہ عزت کی یاں جس ستوں پر بنا [۶] ہے
ترقی کی منزل کا جو رہنما ہے ۔۔۔ تنزل کی کشتی کا جو ناخدا ہے
قوی پشت تھیں جس سے پشتیں تمہاری
ہوئی دست بردار [۷] قوم اُس سے ساری

ہنر ہے نہ تم میں فضیلت ہے باقی ۔۔۔ نہ علم و ادب ہے نہ حکمت ہے باقی
نہ منطق ہے باقی نہ ہیئت ہے باقی ۔۔۔ اگر ہے تو کچھ قابلیت ہے باقی
اندھیرا نہ چھا جائے اس گھر میں دیکھو
پھر اُکسا [۸] دو اس ٹمٹماتے دیے کو

بہت ہم میں اور تم میں جوہر [۹] ہیں مخفی [۱۰] ۔۔۔ خبر کچھ نہ ہم کو نہ تم کو ہے جن کی
اگر جیتے جی کچھ نہ ان کی خبر لی ۔۔۔ تو ہو جائیں گے مل کے مٹی میں مٹی
یہ جوہر ہیں ہم میں امانت خدا کی

مبادا [11] تلف ہو ودیعت [12] خدا کی

۱۔ اولوالفضل: فضل وکمال حاصل کرنے والے۔ ۲۔ سراج: زین بنانے والا۔
۳۔ حلاج: روئی دھننے والا۔ ۴۔ ابونصر فارابی معلم ثانی، ساٹھ کتابوں کا مصنف۔
۵۔ بوعلی: بوعلی سینا۔ ۶۔ بنا: عمارت۔
۷۔ دست بردار: ہاتھ اٹھانے والا، بے تعلق کرنے والا۔ ۸۔ اکسانا: چھیڑنا۔
۹۔ جوہر: قابلیت۔ ۱۰۔ مخفی: پوشیدہ۔
۱۱۔ مبادا: ایسا نہ ہو۔ ۱۲۔ ودیعت: امانت۔

یہی نوجواں پھرتے آزاد جو ہیں کمینوں کی صحبت میں برباد جو ہیں
شریفوں کی کہلاتے اولاد جو ہیں مگر ننگ [1] آبا و اجداد جو ہیں
اگر نقد فرصت [2] نہ یوں مفت کھوتے
یہی فخر آبا و اجداد ہوتے

یہی جو کہ پھرتے ہیں بے علم و جاہل بہت ان میں ہیں جن کے جوہر ہیں قابل
رذائل [3] میں پنہاں ہیں ان کے فضائل انہیں ناقصوں میں ہیں پوشیدہ کامل
نہ ہوتے اگر مائل لہو [4] و بازی
ہزاروں انہیں میں تھے طوسی [5] و رازی

یہی قوم ہے جس میں قحط آدمی کا جہاں شور ہے ہر طرف ناکسی [6] کا
نہیں جہل میں جس کے حصہ کسی کا کبھی علم و فن پر تھا قبضہ اسی کا
وہ تھیں برکتیں سعی و کوشش کی ساری
وہی خوں ہے ورنہ رگوں میں ہماری

حکومت سے مایوس تم ہو چکے ہو زر و مال سے ہات تم دھو چکے ہو
دلیری کو ڈھک کے منہ رو چکے ہو بزرگی بزرگوں کی سب کھو چکے ہو
مدار [7] اب فقط علم پر ہے شرف کا
کہ باقی ہے ترکہ یہی اک سلف کا

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سب یاں　　کہ ہے علم سرمایہ فخر انساں
عرب اور عجم ہند اور مصر و یوناں　　رہا اتفاق اس پہ قوموں کا یکساں
یہ دعویٰ تھا جس پہ حجت نہ تھی کچھ
کھلی اُس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ

۱۔ ننگ: ذلت۔　　۲۔ نقدفرصت: فرصت کی پونجی۔
۳۔ رذائل: ذلت آمیز کام۔　　۴۔ لہو و بازی: کھیل تماشا۔
۵۔ طوسی ورازی: قدیم اسلامی علما۔　　۶۔ ناکسی: قحط الرجال۔
۷۔ مدار: بھروسہ۔

جواہر تھا اک سب کی نظروں میں بھاری　　پرکھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری　　نہ تھیں طاقتیں اُس کی معلوم ساری
یہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ ہے علم میں زورِ دستِ الٰہی

کیا کوہساروں کو مسمار [۱] اس نے　　بنایا سمندر کو بازار اس نے
زمینوں کو منوایا دوّار [۲] اس نے　　ثوابت [۳] کو ٹھہرایا سیّار اس نے
لیا بھاپ سے کام لشکر کشی کا
دیا پتلیوں کو سکت [۴] آدمی کا

یہ پتھر کا ایندھن ہے جلوانے والا　　جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا
صداؤں کو سانچے میں ڈھلوانے والا　　زمیں کے خزانے اُگلوانے والا
یہی برق کو نامہ بر [۵] ہے بناتا
یہی آدمی کو ہے بے پر اُڑاتا

تمدن کے ایواں کا معمار ہے یہ　　ترقی کے لشکر کا سالار ہے یہ
کہیں دستکاروں کا اوزار [۶] ہے یہ　　کہیں جنگجویوں کا ہتھیار ہے یہ
دکھایا ہے نیچا دلیروں کو اس نے

بنایا ہے روباہ [7] شیروں کو اس نے

اسی کی ہے اب چار سو حکمرانی | کیے اس نے زیر ارمنی [8] اور یمانی
ہوئے رام دیوان [9] ماژندرانی | گئے زابلی [10] بھول سب پہلوانی

ا۔ مسمار: نابود، بے نشان۔
۲۔ دوّار: گردش کرنے والا۔
۳۔ ثوابت: ستارے جو حرکت نہیں کرتے۔
۴۔ سکت: طاقت۔
۵۔ نامہ بر: خط لے جانے والا۔
۶۔ اوزار: آلات۔
۷۔ روباہ: لومڑی۔
۸۔ ارمنی و یمانی: ارمنستان اور یمن کے باشندے۔
۹۔ دیوانِ ماژندرانی: ایران ماژندارن کے قدیم پہلوان۔
۱۰۔ زابلی: زابل جہاں سے رستم کا تعلق تھا۔

ہوا اس کی طاقت سے تسخیر [1] عالم
پڑے سامنے اس کے چرکس [2] نہ دیلم

یہ لاکھوں پہ ہے سیکڑوں کو چڑھاتا | سواروں کو پیادوں سے ہے زک [3] دلاتا
جہازوں سے ہے زورقوں [4] کو بھڑاتا | حصاروں [5] کو ہے چٹکیوں میں اُڑاتا
ہوا کوئی حربوں [6] سے اس کے نہ سر بر [7]
نہ ٹھہری زرہ [8] اس کے آگے نہ بکتر [9]

جنھوں نے بنایا اُسے اپنا یاور | ہر اک راہ میں اُس کو ٹھہرایا رہبر
یہ قول آج کل صادق آتا ہے اُن پر | کہ اک نوع ہے نوع انساں سے برتر
الگ سب سے کام اُن کے اور طور ہیں کچھ
اگر سب ہیں انساں تو وہ اور ہیں کچھ

بہت اُن کو معجز نما جانتے ہیں | بہت دیوتا اُن کو گردانتے ہیں
پہ جو ٹھیک اُن کو پہچانتے ہیں | وہ اتنا مقرر [10] انہیں مانتے ہیں
کہ دنیا نے جو کی تھی اب تک کمائی
وہ سب جزو کل اُن کے حصے میں آئی

کیا علم نے اُن کو ہر فن میں یکتا | نہ ہمسر رہا کوئی اُن کا نہ ہمتا

ہر اک چیز اُن کی ہر اک کام اُن کا   سمجھ بوجھ سے ہے زمانے کی بالا

صنائع [11] کو سب اُن کے تکتے ہیں ایسے

عجائب میں قدرت کے حیراں ہوں جیسے

---

[1] تسخیر عالم: عالم کو فتح کرنا۔

[2] چرکس نہ دیلم: چرکس چرکیا کے باشندے، دیلم کاسپین دریا جو شمالی ایران میں روس میں شامل ہے قدیم شہر ہے۔

[3] زک: شکست۔

[4] زورقوں: چھوٹی کشتیاں۔

[5] حصار: زورقوں۔

[6] حرب: جنگ وجدل۔

[7] سربر: فاتح۔

[8] زرہ: لوہے کا لباس حفاظت کے لیے۔

[9] بکتر: لوہے کی کڑیوں کا پرہن

[10] متقرر: قیمت والے۔

[11] صنائع: صنعتیں۔

دیے علم نے کھول اُن پر خزانے   چھپے اور ظاہر نئے اور پرانے

بتائے انہیں غیب کے مال خانے   دکھائے فتوحات کے سب ٹھکانے

ہوا جیسے چھائی ہے سب بحر و بر پر

وہ یوں چھا گئے خاور اور باختر [1] پر

یہ سچ ہے کہ ہے اصل تعلیم دولت   رہی ہے سدا پشت حکمت حکومت

ہوئی سلطنت جن کی دنیا سے رخصت   نہ علم ان میں باقی رہا اور نہ حکمت

نہ یونان محکوم ہو کر رہا کچھ

نہ ایران تاج اپنا کھو کر رہا کچھ

یہ اک خارکش صبر و ہمت میں کامل   یہ کہتا تھا محنت سے گھٹتا تھا جب دل

کہ جن سختیوں کا اٹھانا ہے مشکل   وہی ہیں کچھ اے دل اُٹھانے کے قابل

حلال آدمی کو ہے کھانا نہ پینا

نہ ہو ایک جب تک لہو اور پسینا

نہیں سہل گر صید [2] کا ہات آنا   تو لازم ہے گھوڑوں کو سرپٹ بھگانا

نہ بیٹھو جو ہے بوجھ بھاری اُٹھانا ذرا تیز ہانکو جو ہے دُور جانا
زمانہ اگر ہم سے زور آزما ہے
تو وقت اے عزیزو یہی زور کا ہے

کرو یاد اپنے بزرگوں کی حالت شدائد [3] میں جو ہارتے تھے نہ ہمت
اُٹھاتے تھے برسوں سفر کی مشقت غریبی میں کرتے تھے کسبِ فضیلت
جہاں کھوج پاتے تھے علم و ہنر کا
نکل گھر سے لیتے تھے رستہ اُدھر کا

---

[1] خاور اور باختر: سورج اور افق۔
[2] صید: شکار کیا ہوا جانور۔
[3] شدائد: مصیبتیں۔

عراقین [1] و شامات [2] و خوارزم [3] و جہاں جنسِ تعلیم سنتے تھے ارزاں [5] توراں [4]
وہیں پے سپر [6] کر کے کوہ و بیاباں پہنچتے تھے طلاب [7] افتاں و خیزاں [8]
جہاں تک عمل دینِ اسلام کا تھا
ہر اک راہ میں ان کا تانتا [9] بندھا تھا

نظامیہ [10] نوریہ [11] مستنصریہ [12] نفیسیہ [13] ستیہ [14] اور صاحبیہ [15]
رواحیہ [16] عزیہ [17] اور قاہریہ [18] عزیزیہ [19] زینبیہ [20] اور ناصریہ [21]

---

[1] عراقین: عرب عراق اور عجم عراق جو ایران کا پہاڑی سلسلہ ہے۔
[2] شام کے مختلف حصوں کو شامات کہتے ہیں۔
[3] خوارزم: خراسان کے شمال میں بحیرۂ خوارزم یعنی جھیل یورال کا حصہ جس پر کئی سلاطین نے حکومت کی اور چنگیز خان نے اس حکومت کا خاتمہ کیا۔ اب یہ علاقہ روس کے تحت ہے۔
[4] توران: دریائے سندھ سے جھیل یورال تک کا علاقہ۔ اب یہ حصہ روس اور دوسری سلطنتوں میں شامل ہے۔
[5] ارزاں: سستا۔
[6] پے سپر: طے کر کے۔
[7] طلاب: مذہبی طالب علم۔

۸۔ افتاں وخیزاں: گرتے پڑتے۔
۹۔ تانتا: سلسلہ۔
۱۰۔ نظامیہ: اسلامی مدرسے جو نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان نے بنوائے۔ پانچ مدرسے ہرات، نیشاپور، اصفہان، بصرہ اور بغداد میں تھے۔
۱۱۔ نوریہ: اسلامی مدرسہ موصل میں نور الدین ارسلان موصل نے بنوایا۔
۱۲۔ مستنصر: مستنصر باللہ عباسی کا اسلامی مدرسہ بغداد میں۔
۱۳۔ نفیسہ: اسلامی مدرسہ، بانی کا نام نامعلوم۔
۱۴۔ ستیہ: دمشق میں صلاح الدین ایوبی کی بیٹی خاتون کا بنوایا ہوا اسلامی مدرسہ۔
۱۵۔ صاحبیہ: اسلامی مدرسہ قاہرہ میں صاحبیہ وزیر صفی الدین کا بنوایا ہوا۔
۱۶۔ رواحیہ: اسلامی مدرسہ دمشق میں ابوالقاسم کا بنوایا ہوا۔
۱۷۔ عزیہ: اسلامی مدرسہ بیت المقدس، بانی کا نام معلوم نہیں۔
۱۸۔ قاہریہ: اسلامی مدرسہ موصل میں، بانی کا نام معلوم نہیں۔
۱۹۔ عزیزیہ: اسلامی مدرسہ بغداد میں، بانی کا نام نامعلوم۔
۲۰۔ زینبیہ: اسلامی مدرسہ دمشق میں، بانی کا نام نامعلوم۔
۲۱۔ ناصریہ: اسلامی مدرسہ ناصر الملک کا بنوایا ہوا قبرص میں۔

یہ کالج تھے مرکز سب آفاقیوں کے
حجازی و کردی [۱] و قپچاقیوں [۲] کے

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے　　جہاں تک ہو کام آپ اپنے سنوارے
خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے　　کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے
اڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو گر آپ ہانکو

بہت خوان [۳] بے اشتہا [۴] تم نے کھائے　　بہت بوجھ بندھ بندھ کے تم نے اُٹھائے
بہت آس پر ساز کی راگ گائے　　بہت عارضی تم نے جلوے دکھائے
بس اب اپنی گردن پہ رکھو جوا [۵] تم
کرو حاجتیں آپ اپنی روا تم

تمہیں اپنی مشکل کو آساں کرو گے　　تمہیں درد کا اپنے درماں کرو گے

تمہیں اپنی منزل کا ساماں کرو گے   کرو گے تمہیں کچھ اگر یاں کرو گے

چھپا دست ہمت میں زور قضا [۶] ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

سراسر ہو گو سلطنت فیض گستر [۷]   رعیت [۸] کی خود تربیت میں ہو یاور
مگر کوئی حالت نہیں اس سے بدتر   کہ ہر بوجھ ہو قوم کا سلطنت پر

ا۔ کردی: کردستان کے باشندے جن کا ہیرو صلاح الدین ایوبی تھا جس نے بیت المقدس فتح کیا۔
۲۔ قپچاقیوں: تاتاری قوم جو بحیرۂ چین کے شمال میں رہتے ہیں۔
۳۔ خوان: کھانے کے دستر خوان۔
۴۔ بے اشتہا: بغیر بھوک۔
۵۔ جوا: وہ لکڑی جو بنڈی میں بیل کی گردن پر رکھی جاتی ہے۔
۶۔ قضا: تقدیر۔
۷۔ گستر: پھیلا ہوا۔
۸۔ رعیت: رعایا۔

ہو اس طرح ہاتوں میں اُس کے رعیت
کہ قبضے میں غسال کے جیسے میت

وہی گر تجارت کے اُس کو بجھائے   وہی صنعت اور حرفت اُس کو بتائے
وہی کاشتکاری کے آئیں [ا] سکھائے   وہی اُس کو لکھوائے وہ ہی پڑھائے

ملا جس رعیّت کو ایسا سہارا
کیا آدمیت نے اس سے کنارا

یہی سلطنت کی ہے کافی اعانت [۲]   کہ ہو ملک میں امن اُس کی بدولت
نفوس [۳] اور اموال کی ہو حفاظت   حکومت میں ہو اعتدال [۴] اور عدالت

نہ توڑا رعیت پہ بے جا ہو کوئی
نہ قانون چھٹ کار فرما ہو کوئی

جہاں ہو یہ انداز فرماں روائی [۵]   رعیت کی ہے واں نپٹ [۶] بے حیائی

کہ ہر کام میں آس ڈھونڈے پرائی — کرے آپ اپنی نہ مشکل کشائی
کھڑا ہو سہارے اک اڑوار [7] کے گھر
ہٹی وہ جہاں آ رہے یہ زمیں پر

گیا اب وہ دل تنگیوں کا زمانہ — کہ اپنوں کا حصہ تھا پڑھنا پڑھانا
برہمن کا پہنے اگر شدر بانا [8] — تو اُس پر نہیں کوئی اب تازیانہ
ہوئے برطرف سب نشیب و فراز [9] اب
سفید و سیہ میں نہیں امتیاز اب

۱۔ آئین: قانون۔
۲۔ اعانت: مدد، امداد۔
۳۔ نفوس: عوام، لوگ۔
۴۔ اعتدال: میانہ روی، برابری۔
۵۔ فرماں روائی: حکومت، حکمرانی۔
۶۔ نپٹ: تمام۔
۷۔ اڑوار: لکڑی جو چھت کے نیچے لگاتے ہیں۔
۸۔ بانا: کپڑے۔
۹۔ نشیب و فراز: نیچے اور اوپر۔

بس اب وقت کا حکم ناطق [1] یہی ہے — کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے
یہی آج کل اصل فرماندہی ہے — اسی میں چھپا سر [2] شاہنشہی ہے
ملی ہے یہ طاقت اسی کیمیا کو
کہ کرتی ہے یہ ایک شاہ و گدا کو

سکھاتی ہے محکوم کو یہ اطاعت — سجھاتی ہے حاکم کو راہِ عدالت
دلوں سے مٹاتی ہے نقشِ عداوت — جہاں سے اُٹھاتی ہے رسمِ بغاوت
یہی ہے رعیت کو حق دار کرتی
یہی ہے کہ و مہ کو ہموار کرتی

سنی ہے غریبوں کی فریاد اسی نے — کیا ہے غلامی کو برباد اسی نے
ریپبلک [3] کی ڈالی ہے بنیاد اسی نے — بنایا ہے پبلک [4] کو آزاد اسی نے
مقید بھی کرتی ہے یہ اور رہا بھی

بناتی ہے آزاد بھی با وفا بھی

تجارت نے رونق ہے یہ اس سے پائی　　کہ ہیچ اس کے آگے ہے فرماں روائی
فلاحت [5] کی یہ منزلت ہے بڑھائی　　کہ فلاح کرتے ہیں معجز نمائی
ترقی یہ صنعت کو دی ہے بلا کی
کہ ہوتی ہے معلوم قدرت خدا کی

یہ نا اتفاقی ہے قوموں سے کھوتی　　یہ قومی محبت کا ہے بیج بوتی
یہ آپس کے کینے دلوں سے ہے دھوتی　　یہ دانے ہے سب ایک لڑ میں پروتی
یہ نقطوں پہ خط کی طرح ہے گزرتی
کروڑوں دلوں کو ہے یہ ایک کرتی

۱۔ ناطق: بولتا۔　　۲۔ سر: رمز۔
۳۔ ریپبلک: جمہور۔　　۴۔ پبلک: عوام۔
۵۔ فلاحت: درخت اگانے کی صنعت۔

جہاں یہ نہیں واں نہ قوم اور نہ ملت　　نہ ملکی حمایت نہ قومی [1]
جُدا سب کے رنج اور جُدا سب کی راحت　　الگ سب کی ذلت الگ سب کی عزت
خبر واں نہیں یہ کہ ہے قوم شے کیا
چھپا سِرِّ حق اس تعلق میں ہے کیا

جنھوں نے کہ تعلیم کی قدر و قیمت　　نہ جانی مسلط ہوئی اُن پہ ذلت
ملوک [2] اور سلاطیں نے کھوئی حکومت　　گھرانوں پہ چھائی امیروں کے نکبت [3]
رہے خاندانی نہ عزت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل

نہ چلتے ہیں واں کام کاریگروں کے　　نہ برکت ہے پیشے میں پیشہ وروں کے
بگڑنے لگے کھیل سوداگروں کے　　ہوئے بند دروازے اکثر گھروں کے

کماتے تھے دولت جو دن رات بیٹھے
وہ ہیں اب دھرے ہات پر ہات بیٹھے

ہنر اور فن واں ہیں سب گھٹتے جاتے — ہنر مند ہیں روز و شب گھٹتے جاتے
ادیبوں کے فضل و ادب گھٹتے جاتے — طبیب اور اُن کے مطب گھٹتے جاتے

ہوئے پست سب فلسفی اور مناظر
نہ ناظم ہیں سر سبز اُن کے نہ ناثر [4]

اگر اک پہننے کو ٹوپی بنائیں — تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں — تو مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں

ہر اک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ
مکینکس کی رو میں تاراج ہیں وہ

۱۔ حمیت: شرم وحیا۔ ۲۔ ملوک: حکمراں۔
۳۔ نکبت: نحوست۔ ۴۔ ناثر: نثر لکھنے والا۔

نہ پاس اُن کے چادر نہ بستر ہے گھر کا — نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا — صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا

کنول مجلسوں میں قلم دفتروں میں
اثاثہ ہے سب عاریت [1] کا گھروں میں

جو مغرب سے آئے نہ مال تجارت — تو مر جائیں بھوکے وہاں اہل حرفت [2]
ہو تجار پر بند راہِ معیشت — دکانوں میں ڈھونڈی نہ پائے بضاعت [3]

پرائے سہارے ہیں بیو پار واں سب
طفیلی ہیں سیٹھ اور واں سب

یہ ہیں ترک تعلیم کی سب سزائیں — وہ کاش اب بھی غفلت سے باز اپنی آئیں
مبادا رہِ عافیت پھر نہ پائیں — کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں

ہوا بڑھتی جاتی سرِ رہ گذر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

لیے فردِ بخشیِ دوراں کھڑا ہے — ہر اک فوج کا جائزہ لے رہا ہے
جنہیں ماہر اور کرتبی دیکھتا ہے — انہیں بخشتا تیغ و طبل و لوا[4] ہے
پہ ہیں بے ہنر یک قلم چھٹتے جاتے
رسالوں[5] سے نام اُن کے ہیں کٹتے جاتے

بس اب علم و فن کے وہ پھیلاؤ ساماں — کہ نسلیں تمہاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہ ترقی ہو آساں — امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں[6]
کوئی اُن میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتی دین و ملت کو تھامے

۱۔ عاریت: مانگا ہوا۔ ۲۔ اہلِ حرفت: اہلِ ہنر اور انڈسٹری۔
۳۔ بضاعت: دولت، کمائی۔ ۴۔ لوا: جھنڈا۔
۵۔ رسالوں: فوجی دستے۔ ۶۔ تاباں: چمک دار۔

بنے قوم کھانے کمانے کے قابل — زمانے میں ہو منھ دکھانے کے قابل
تمدن کی مجلس میں آنے کے قابل — خطاب آدمیت کا پانے کے قابل
سمجھنے لگیں اپنے سب نیک و بد وہ
لگیں کرنے آپ اپنی اپنی مدد وہ

کرو قدر اُن کی ہنر جن میں پاؤ — ترقی کی اور اُن کی رغبت[1] دلاؤ
دل اور حوصلے ان کے مل کر بڑھاؤ — ستوں اس کھنڈر گھر کے ایسے بناؤ
کوئی قوم کی جن سے خدمت بن آئے
بٹھائیں انہیں سر پہ اپنے پرائے

کرو گے اگر ایسے لوگوں کی عزّت — تو پاؤ گے اپنے میں تم اک جماعت
بڑھائے گی جو قوم کی شان و شوکت — گھرانوں میں پھیلائے گی خیر و برکت

878

مدد جس قدر تم سے وہ آج لے گی
عوض [2] تم کو کل اُس کا دہ چند [3] دے گی

ترقی کے یوناں کے اسباب کیا تھے ہنر پر جہاں پیر و برنا [4] فدا تھے
تمدن کے میداں میں زور آزما تھے وطن کی محبت میں یکسر فنا تھے

مقاصد بڑے اور ارادے تھے عالی
نہ تھا اس سے چھوٹا بڑا کوئی خالی

سبب کچھ نہ تھا اس کا جز قدر دانی کہ ہوتے تھے جو علم و حکمت کے بانی
ترقی میں کرتے تھے جو جاں فشانی حیات اُن کو ملتی تھی واں جاودانی [5]

وطن جیتے جی اُن پہ قرباں تھا سارا
پس از مرگ پجتے [6] تھے وہ آشکارا

۱۔ رغبت: علاقہ۔ ۲۔ عوض: بدلے۔
۳۔ دہ چند: دس برابر۔ ۴۔ پیر و برنا: بوڑھے اور جوان۔
۵۔ جاودانی: ہمیشہ زندہ رہنا۔ ۶۔ پجتے: پرستش کیے جانا۔

اسی گُر نے تھا جوش سب کو دلایا کہ تھا اک جزیرے نے رتبہ یہ پایا
اسی شوق نے تھا دلوں کو بڑھایا اسی نے تھا یوناں کو یوناں بنایا

اس امید پر کوششیں تھیں یہ ساری
کہ ہر قوم کے دل میں عظمت ہماری

جنھیں ملک میں اپنی رکھنی ہو وقعت [1] جنہیں سلطنت کی ہو مطلوب قربت
جنہیں تھامنی ہو گھرانے کی عزت جنہیں دین کی ہو نہ منظور ذلت

جنہیں نسل و اولاد ہو اپنی پیاری
انہیں فرض ہے قوم کی غم گساری [2]

بہت دل ہیں نرم ان دنوں ہوتے جاتے کہ حالت پہ ہیں قوم کی اُنڈے آتے
تنزل پہ ہیں اُس کے آنسو بہاتے نہیں آپ کچھ کر کے لیکن دکھاتے

خبر بھی ہے دل اُن کے جلتے ہیں کس پر
وہ ہیں آپ ہی ہات ملتے ہیں جس پر

رئیسوں کی جاگیر داروں کی دولت　　فقیہوں کی دانشوروں کی فضیلت
بزرگوں کی اور واعظوں کی نصیحت　　ادیبوں کی اور شاعروں کی فصاحت

جچے تب کچھ آنکھوں میں اہلِ وطن کے
جو کام آئے بہبود [۳] میں انجمن کے

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت　　جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت
رہی ہے نہ ہرگز رہے گی سلامت　　نہ شخصی بزرگی نہ شخصی حکومت

وہی شاخ پھولے گی یاں اور پھلے گی
ہری ہو گی جڑ اس گلستاں میں جس کی

---

[۱] وقعت: عزت، قیمت۔
[۲] غم گساری: غم منانا، غم میں شریک ہونا۔
[۳] بہبود: بھلائی۔

ذخیرہ ہے جب چیونٹا کوئی پاتا　　تو بھاگا جماعت میں ہے اپنی آتا
انہیں ساتھ لے لے کے ہے یاں سے جاتا　　فتوح [۱] اپنی ایک ایک کو ہے دکھاتا

سدا اُن کے ہیں اس طرح کام چلتے
کمائی سے ایک ایک کی لاکھوں ہیں پلتے

جب اک چیونٹا جس میں دانش نہ حکمت　　بنی نوع کی اپنے برلائے حاجت
معیشت سے ایک اک کو بخشے فراغت　　کرے اُن پہ وقف اپنی ساری غنیمت [۲]

تو اس سے زیادہ ہے بے غیرتی کیا
کہ ہو آدمی کو نہ پاس آدمی کا

غضب ہے کہ جو نوع ہو سب سے برتر　　گنے آپ کو جو کہ عالم کا سرور
فرشتوں سے جو سمجھے اپنے کو بڑھ کر　　خدا کا بنے جو کہ دنیا میں مظہر

نہ ہو مردی کا نشاں اُس میں اتنا
مسلم ہے مٹی کے کیڑوں میں جتنا

الٰہی بحق رسول تہامی [3] ہر ایک فرد انساں کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی برابر تھے مکی و زنگی [4] و شامی
شریروں کو ساتھ اپنے جس نے نباہا
بروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا

طفیل اس کا اور اُس کی عترت [5] کا یا رب پکڑ ہات جلد اُس کی امت کا یا رب
اک ابر اُس پہ بھیج اپنی رحمت کا یا رب غبار اس سے جو دھو دے ذلت کا یا رب
کہ ملت کو ہے ننگ ہستی سے اُس کی
ہوا پست اسلام پستی سے اس کی

۱۔ فتوح: آمدنی۔ ۲۔ غنیمت: لوٹا ہوا مال۔
۳۔ تہامی: مدنی۔ ۴۔ زنگی: زنگبار کا رہنے والا۔ حبشی
۵۔ عترت: اولاد۔

بچا اُن کو اس تنگنائے بلا [1] سے کہ رستہ ہو گم رہ رو [2] و رہنما سے
نہ اُمید یاری ہو یار آشنا سے نہ چشم اعانت ہو دست و عصا سے
چپ و راست چھائی ہوئی ظلمتیں ہوں
دلوں میں اُمیدوں کی جا حسرتیں ہوں

انہیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دے
کہیں گاہِ [3] بازیِ دوراں دکھا دے جو ہونا ہے کل آج اُن کو سجھا دے
چھتیں پاٹ لیں [4] تا کہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

io

۱۔ تنگنائے بلا: بلاؤں کا گھیراؤ۔
۲۔ رہ رو: راستہ چلنے والا۔
۳۔ کمیں گاہ: شکارگاہ۔
۴۔ پاٹ لیں: ڈھک لیں، بنالیں۔

3 عرض حال

بہ جناب سرور کائنات علیہ افضل الصلوات واکمل التحیات

اے خاصۂ خاصان [1] رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء [2] ہے
جس دین کے مدعو [3] تھے کبھی سیزر و کسری [4]

خود آج وہ مہمان سرائے [5] فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو دین کو تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اُس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جو تفرقے [6] اقوام کے آیا تھا مٹانے
اُس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

جس دین نے غیروں کے تھے دل آ کے ملائے
اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جو دین کہ ہمدرد بنی نوع بشر [7] تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اُس میں بپا ہے

---

[1] خاصہ خاصان: خاصوں میں خاص۔
[2] غریب الغربا: غریبوں میں غریب۔
[3] مدعو: دعوت دی گئی۔
[4] سیزر و کسریٰ: روم اور ایران کے شہنشاہ۔
[5] مہمان سرائے: مسافر خانے۔
[6] تفرقے: پھوٹ۔
[7] بنی نوع بشر: انسانی نسل۔

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر [1] غنا بھی
اُس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی
وہ عرضہ [2] تیغِ جہلا و سفہا [3] ہے

جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب [4]
اب معترض اُس دین پہ ہر ہرزہ درا [5] ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمہ صافی
دین داروں میں پر آب [6] ہے باقی نہ صفا [7]

ہے

عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی
منعم[8] ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے

یاں راگ ہے دن رات تو واں رنگ شب و روز
یہ مجلس اعیان[9] ہے وہ بزم شرفا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے
ایک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا[10] ہے

ہے دین کی دولت سے بہا علم سے رونق
بے دولت و علم اُس میں نہ رونق نہ بہا ہے

۱۔ اکسیر: دوا، مجرب نسخہ۔ ۲۔ عرضہ: ڈھال۔
۳۔ سفہا: کمینے۔ ۴۔ مغلوب: شکست خوردہ۔
۵۔ ہرزہ درا: بے ہودہ، نامعقول۔ ۶۔ آب: چمک۔
۷۔ صفا: پاکیزگی، صفائی۔ ۸۔ منعم: مال دار، انعام کرنے والا۔
۹۔ اعیان: سرمایہ دار۔ ۱۰۔ بے برگ و نوا: بے کار، بے قیمت۔

شاہد ہے اگر دین تو علم اُس کا ہے زیور
زیور ہے اگر علم تو مال اُس کی جلا ہے

جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت
اُس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا[1] ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

جس قصر کا تھا سر بفلک گنبدِ اقبال
ادبار [2] کی اب گونج رہی اُس میں صدا ہے

بیڑا تھا نہ جو بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہے اب چلتی خلاف اُس کے ہوا ہے

وہ روشنی بام [3] و درِ کشورِ اسلام
یاد آج تلک جس کی زمانے کو ضیا ہے

روشن نظر آتا نہیں واں کوئی چراغ آج
بجھنے کو ہے اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہے

عشرت کدے آباد تھے جس قوم کے ہر سو
اُس قوم کا ایک ایک گھر اب بزمِ عزا ہے

چاؤش [4] تھے للکارتے جن رہ گذروں میں
دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے

---

[1] بنا: بنیاد۔ [2] ادبار: نحوست، پستی۔
[3] بام: چھت۔ [4] چاؤش: نگہبان۔

وہ قوم کہ آفاق [1] میں جو سر بفلک تھی
وہ یاد میں اسلاف [2] کی اب رُو بقضا [3] ہے

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم [4] کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتا ہے

کھوج اُن کے کمالات کا لگتا ہے اب اتنا
گم دشت میں اک قافلہ بے طبل و درا [5] ہے

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکم قضا[6] ہے

تھی آس تو تھا خوف بھی ہمراہ رجا[7] کے
اب خوف ہے مدت سے دلوں میں نہ رجا ہے

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہے

دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہے کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہے

کی زیب بدن سب نے ہی پوشاک کتاں کی
اور برف میں ڈوبی ہوئی کشور کی ہوا ہے

درکار ہیں یاں معرکے میں جوشن وخفتاں[8]
اور دوش پہ یاروں کے وہی کہنہ ردا ہے

۱۔ آفاق: افلاک۔ ۲۔ اسلاف: اجداد۔
۳۔ روبقفا: پیچھے کی طرف۔ ۴۔ حکم: حکمت۔
۵۔ درا: گھنٹی۔ ۶۔ قضا: تقدیر۔
۷۔ رجا: ترقی۔ ۸۔ جوش وخفتاں: زرہ اور خفتان وہ کرتا جو زرہ کے نیچے پہنا جاتا ہے۔

دریائے پر آشوب ہے اک راہ میں حائل
اور بیٹھ کے گھرناؤ[1] پہ یاں قصد شنا ہے

ملتی نہیں اک بوند بھی پانی کی جہاں مفت
واں قافلہ سب گھر سے تہی دست چلا ہے

یاں نکلے ہیں سودے کو درم لے کے پرانے

اور سکہ رواں شہر میں مدت سے نیا ہے

فریاد ہے اے کشتیِ اُمت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

اے چشمہ رحمت بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمِّیْ
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک اُن سے کیا ہے

صدمہ دُرِ دنداں [2] کو ترے جن سے کہ پہنچا
کی اُن کے لیے تو نے بھلائی کی دعا ہے

کی تو نے خطا عفو ہے اُن کینہ کشوں [3] کی
کھانے میں جنھوں نے کہ تجھے زہر دیا ہے

سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحُّم
ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہے

جو بے ادبی کرتے تھے اشعار میں تیری
منقول [4] انھیں سے تری پھر مدح و ثنا ہے

برتاؤ ترے جب کہ یہ اعدا سے ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ اُمید سوا ہے

۱۔ گھرناؤ: چھوٹی ناؤ۔ ۲۔ دُرِ دنداں: دانتوں کے گوہر۔
۳۔ کینہ کشوں: کمینوں۔ ۴۔ منقول: لکھی ہوئی۔

کر حق سے دعا اُمت مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

4 شکوۂ ہند

(1888ء)

1

رخصت اے ہندوستان! اے بوستان بے خزاں!

رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہمان

آج گو شکووں سے ہیں لبریز ہم اے خاکِ ہند

ہیں مگر احسان اگلے تیرے سب خاطر نشان

تو نے بیگانوں کی خاطر کی یگانوں سے سوا

میہمان تھے پر بنایا تو نے ہم کو میزباں

تیرے باغوں کی فضاؤں نے دے دل سے بھلا

شعب بوان [1] و سمرقند و دمشق و اصفہاں

یاد کچھ جیحوں رہا ہم کو، نہ دجلہ اور فرات

تیرے گنگا جل نے جب سے تر کیے کام و زباں

تیری کاشی کی کشش نے کر دیے ہم سے جدا

یثرب و بطحٰی و صنعا و زبید و نہرواں

---

[1] شعب بوان: نواحِ شیراز میں ایک وسیع قطعۂ زمین جو نہایت خوش منظر تفریح گاہ تھا۔ اسی طرح سمرقند کے قریب ''صغد'' کی سیرگاہ، دمشق کے قریب نزہت گاہ ''غوطہ'' اور نواحِ بصرہ میں ''نہر ابلہ'' کی سیرگاہ بھی بہت مشہور

تھی۔ یہ چاروں سیر گاہیں ''چار بہشت'' کہی جاتی تھیں۔

تیرے ذوقِ نیشکر نے کر دیے سب دل سے محو
بصرہ و طائف کے نارستان اور خرماستان

فصلِ گل میں دیکھ کر جوبن مہابن کا ترے
مرو اور شیراز کے بھولے چمن اور گلستاں

تیرے سرجیون پہاڑوں نے دیا جی سے اُتار
نہر رکنی اور گلگشت مصلیٰ کا سماں [1]

دعوتیں بھولیں سمرقندی و شیرازی تمام
اس قدر الوانِ نعمت کے لگائے تو نے خواں

نقش ہیں دل پر ہمارے سب مداراتیں تری
ہم نہ بھولیں گے کبھی دن تیرے اور راتیں تری

2

تھی ہماری قوم و ملت، رسم و عادت سب جدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا

بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ
تجھ سے ہم تھے اجنبی، اور ہم سے تو ناآشنا

ہم میں اے ہندوستان! گو بوے جنسیت نہ تھی
تو نے لیکن اپنی آنکھوں پر لیا ہم کو بٹھا

تو نے سونپی مہر دولت ہم کو اور طبل و نشاں
تو نے بخشے قصر و ایواں ہم کو اور بستان سرا

تو نے ثروت دی، حکومت دی، ریاست دی ہمیں
شکر کس کس مہربانی کا کریں تیری ادا

نبھ سکیں لیکن نہ آخر تک یہ خاطر داریاں
جو دیا تھا تو نے وہ آخر کو سب رکھوا لیا

---

[1] خواجہ حافظ کے مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلیٰ را (اص)

خیر، اپنے مال کا تو ہر طرح تھا اختیار
جس سے چاہا لے لیا اور جس کو چاہا دے دیا

کھینچ لیں اپنی اُسی دم اُٹھ کے گدی سے زباں
بھول کر بھی گر زباں پر اس کا آ جائے گلا

پر گلہ یہ ہے کہ جو کچھ اپنا ہم لائے تھے ساتھ
وہ بھی تو نے ہم سے لے کر کر دیا بالکل گدا

آدمیت کے تھے جوہر جو ہماری ذات میں
خاک میں آخر دیے اے ہند سب تو نے ملا

یاد ہوگا تجھ کو یاں آئے تھے ہم کس شان سے
تجھ کو سوگند اپنے ست جگ کی بتا ایمان سے

3

ترکمانی صولت اور مغلی جلادت ہم میں تھی
عزمِ کُردی ہم میں تھا، بدوی حمیت ہم میں تھی

ہاشمی آداب و عباسی فضائل ہم میں تھے
نطق اعرابی و عدنانی فصاحت ہم میں تھی

ضربِ کراری و حربِ خالدی رکھتے تھے ہم
سطوتِ حمزی و فاروقی جلالت ہم میں تھی

عرقِ غیرت تھی دلیل اپنی شرافت کی، نہ مال
جھینپتی ہے جس سے دولت وہ شرافت کی، نہ مال

آج خاور تھا مقام اپنا توکل تھا باختر
عیش و عشرت کی نہ فرصت تھی نہ عادت ہم میں تھی

ننگ تھا ہم کو مشقت سے نہ مزدوری سے عار

جو بزرگی تھی مشقت کی بدولت ہم میں تھی

ہم شتربانی سے پہنچے تھے جہاں بانی تلک
اس لیے باقی شتربانوں کی خصلت ہم میں تھی

جونشاں اقبال مندی کے ہیں وہ سب ہم میں تھے
حبِّ دینی ہم میں تھا، قومی مودّت ہم میں تھی

گھر ہمارے اور ہم سب وقف مہمانوں پہ تھے
یثربی مہمان نوازی و ضیافت ہم میں تھی

پھوٹ سے واقف نہ تھے ہم تری اے
ہندوستاں
احمدی اخلاق و اسلام اخوت ہم میں تھی

چھین لی سب ہم سے یاں شان عرب آن عجم
تو نے اے غارت گرِ اقوام و اکال الامم

4

آئے تھے اے ہند یاں ایسے ہی ہم زار ونزار؟
ہے عرب کو جن سے ننگ اور ہے عجم کو جن سے عار

ہم انہی اسلاف کے معلوم ہوتے ہیں خلف؟
جن کی تھی محکوم نسلِ رستم و اسفندیار

ہم انہی باپوں کے بیٹے تجھ کو آتے ہیں نظر؟
جن کی جولاں گاہ تھی تاتار سے تازنجبار

ہیں ابھی اے آریاورت اُن سواروں کے سپوت
جن کی دوڑوں سے ہیں واقف تیرے دشت
کہسار

ہم سدا سے خاکسار ایسے ہی تھے اے خاک

ہند؟

اڑتی پھرتی تھی زمانے میں یہی مشتِ غبار؟

تھیں یہی شکلیں ہماری؟ تھا یہی رنگ اور روپ؟

تھی یہی سیرت ہماری؟ تھا یہی اپنا شعار؟

گر سلف دیکھیں ہمارے زندہ ہو کر اب ہمیں

آئے نسبت اور قرابت سے ہماری اُن کو عار

سیرتیں تو نے بدل دیں، مسخ کر دیں صورتیں

آبرو تو نے ڈبو دی، کھو دیا تو نے وقار

کر دیا شیروں کو تو نے گوسفند اے خاکِ ہند

جو شکار افگن تھے آ کر ہو گئے یاں خود شکار

نکبتیں یہ سب جبھی سے ہم کو آتی تھیں نظر

آئے تھے یاں جب کہ اپنا چھوڑ کر ملک و دیار

تھا یقیں ہم کو کہ شامت رفتہ رفتہ آئے گی

ہم کو تو اے خاکِ ہند آخر یونہی کھا جائے گی

5

دیکھتے ہیں اب وہی آنکھوں سے صبح و شام ہم

جو مداراتوں کا سمجھے تھے تری انجام ہم

توڑ ڈالے جلد تو نے عہد اور پیمان سب

بے وفا سنتے تھے سچ اے ہند تیرا نام ہم

''دیر تک رہتا ہے جو انساں نہیں رہتا عزیز''

سنتے ہیں دیوار و در سے تیرے یہ پیغام ہم

عیب جو دنیا میں ہیں وہ ہم پہ تھپ جاتے ہیں سب

کیا زمانے میں ہمیشہ یونہی تھے بدنام ہم؟

سب کو ہو جاتا ہے ناکامی کا پہلے ہی یقیں
اٹھتے ہیں کرنے کو جب ہمت کا کوئی کام ہم
تو نے دیکھا تھا کبھی اسلامیوں کا حال یہ؟
کیا عرب سے لے کر نکلے تھے یہی اسلام ہم؟
بس، زیادہ پیسنے سے اپنے کیا حاصل تجھے
پس چکے اے آسیاے گردشِ ایام ہم
شکوہ قسمت کا ہے جو یاں کھینچ کر لائی ہمیں
تجھ کو اے ہندوستاں کس منہ سے دیں الزام ہم
پھر گئی سرحد سے تیری فوج یوناں جس طرح
کاش پھر جاتے یونہی در سے ترے ناکام ہم
رہتے قانع اپنی محنت اور مزدوری پہ کاش
آ کے یاں پاتے نہ ذوقِ راحت و آرام ہم
دشمن اپنا ہو گیا سودائے مال و جاہ حیف!
حرص نے طمع کی شیروں کو کیا روباہ حیف!
وہ مسلمانوں کی ہر بازی میں سبقت کیا ہوئی؟
وہ حجازی غیرت اور ملکی حمیت کیا ہوئی؟
ہم مسلمانوں سے ہے اے ہند ننگ اسلام کو
تھا لقب خیر الامم جس کا وہ امت کیا ہوئی؟
جی کسی کی عزت افزائی سے خوش ہوتا نہیں
دل گواہی جس پہ دیتا تھا وہ عزت کیا ہوئی؟
دین و دولت، علم و دانش، ہم میں کچھ باقی نہیں
حق نے پوری کی تھی جو ہم پر، وہ نعمت کیا ہوئی [1]

ملک و مال و سلطنت اک آنی جانی چیز تھی
جو ہمیشہ رہنے والی تھی وہ دولت کیا ہوئی؟

ا؎ سورۃ المائدہ کی ایک آیۃ کے اس ٹکڑے کی طرف اشارہ ہے:الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی (۵:۳)(آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی)

قریہ قریہ تیرے علم و فضل سے معمور تھا
اب وہ اے اسلام تیری خیر و برکت کیا ہوئی؟

جس نے مغرب کو کیا مشرق وہ سورج کیا ہوا ا؎
جس سے گھر گھر بن گیا یوناں وہ حکمت کیا ہوئی؟

کوہ و دریا جن کے ہوتے تھے نہ ہرگز سدِّ راہ
وہ ارادے کیا ہوئے اور وہ عزیمت کیا ہوئی؟

کوئی مشکل ہم کو میداں سے ہٹا سکتی نہ تھی
وہ ثبات اور پائیداری اور وہ ہمت کیا ہوئی؟

ہو گی اے ہندوستان! آمد ہماری تجھ کو یاد
وہ مسلمانوں کی ہیئت اور وہ صورت کیا ہوئی؟

وہ بر و دوش اور وہ سینے پہلوانی کیا ہوئے؟
وہ قد و بالا، وہ چہرے ارغوانی کیا ہوئے؟

6

جب تک اے ہندوستاں ہندی نہ کہلاتے تھے
ہم
کچھ ادائیں آپ میں سب سے جدا پاتے تھے
ہم

اپنی خود کرتے تھے عزت گر نہ کرتا تھا کوئی

سر پر اک فرعون کے آگے نہ نہوڑاتے تھے ہم

حاجتیں ہوتی تھیں جو اپنی روا کرتے تھے آپ
ہاتھ آگے میر و سلطاں کے نہ پھیلاتے تھے ہم

تھے اُسے نعمائے سلطانی سے بہتر جانتے
اپنی محنت سے اگر نانِ جویں کھاتے تھے ہم

ا۔ یہاں تین صنعتوں (تضاد، ایہام، مراعات النظیر) کا برجستہ استعمال، استعارے (سورج) کی خیال افروزی اور پورے مصرعے کی معنویت و بلاغت قابل توجہ ہے۔

تھے نہ کرگس اور زغن کی طرح ہم مردار خوار
تھا وہی قوت اپنا جو خود مار کر لاتے تھے ہم

تھی اولوالعزمی و ہمت اپنی مفتاحِ ظفر
چار سو راہیں معیشت کی کھلی پاتے تھے ہم

جب کبھی، جس کام کی خاطر، جدھر منہ اٹھ گیا
پھر پلٹ کر واں سے خالی ہاتھ کم آتے تھے ہم

جی چراتے تھے نہ مکروہاتِ عالم سے کبھی
اور خلافِ چرخِ دوراں سے نہ گھبراتے تھے ہم

اسپ تازی کی طرح تھی قوم تازی بھی غیور
جب کوئی بڑھتا تھا ہم سے تلملا جاتے تھے ہم

ہے حمیت کو ہماری اک زمانہ جانتا
سرد ہو جاتے تھے سب جس وقت گرماتے تھے
ہم

حال اپنا سخت عبرت ناک تو نے کر دیا
آگ تھے اے ہند ہم کو خاک تو نے کر دیا[1]

7

کھا کے نعمت دل ہمارا شادماں ہوتا نہ تھا

ساتھ دستر خوان پر گر میہماں ہوتا نہ تھا
کرتے تھے مہماں ہمارے ماحضر پر اکتفا
تنگ دل مہماں سے کوئی میزباں ہوتا نہ تھا
ہم کو پہنچی تھی خلیل اللہ سے خواں گستری
عسرت اور تنگی میں بھی طے اپنا خواں ہوتا نہ تھا
رکھتے تھے بچوں کو بھوکا اپنے مہماں کے لیے
خرچ سے گھر کے سوا کھانا جہاں ہوتا نہ تھا

ا۔ اس مصرعے میں میر کا فیضان نمایاں ہے:
آگے تھے ابتدائے عشق میں ہم　　　اب ہوئے خاک انتہا یہ ہے!

تھا مسافر کے لیے ایک ایک گھر مہماں سرا
ہم کو کچھ غربت میں فکرِ آب و ناں ہوتا نہ تھا
میہمانوں کو تھے اپنے گھر کی برکت جانتے
ٹھہرنا مہماں کا برسوں تک گراں ہوتا نہ تھا
جانتے تھے ہم کہ ہے اُس پر خدا نا مہرباں
جو کہ ہمسائے پہ اپنے مہرباں ہوتا نہ تھا
ہم ہر اک آفت میں ہمسایوں کی رہتے تھے سپر
دشمنوں سے اپنے اُن کو خوفِ جاں ہوتا نہ تھا
چپکے چپکے حاجتیں کرتے تھے سب اُن کی روا
فقر و فاقہ اُن کا خلقت پر عیاں ہوتا نہ تھا
پیٹ بھر لیں اپنا اور ہمسایہ فاقے سے رہے
اتفاق آگے یہ اے ہندوستاں ہوتا نہ تھا
یوں نہ ہم جنسوں سے کرتی تھیں یہ آنکھیں چوریاں
تو نے اپنی سی سکھا دیں ہم کو تنہا خوریاں

8

جس سے کرتے تھے محبت، بے ریا کرتے تھے
ہم
جس سے ہوتی تھی شکایت، برملا کرتے تھے ہم

شکوہ ہوتا تھا تو اکثر منہ پہ کہہ دیتے تھے ہم
شکر کرتے تھے تو غیبت میں سوا کرتے تھے ہم

دوست بن جاتے تھے جس کے اس سے کرتے تھے
نباہ
عہد کرتے تھے تو عہدوں کو وفا کرتے تھے ہم

جن کے ہو جاتے تھے ساتھی اُن کا ہم دیتے تھے
ساتھ
رنج و راحت میں شریک اُن کے رہا کرتے تھے
ہم

کرتے تھے عسرت میں اُن کے واسطے فکر معاش
اُن کی بیماری میں تدبیر اور دوا کرتے تھے ہم

کام میں یاروں کے اپنے کام سب دیتے تھے
چھوڑ
اس میں روزے اور نمازیں تک قضا کرتے تھے
ہم

یار کوئی مر کے اپنے سے بچھڑ جاتا تھا جب
یار کی اولاد پر جانیں فدا کرتے تھے ہم

سنتے تھے اپنے بڑوں کا جن سے پیار اور اتحاد
اُن کی نسلوں سے وہی رسمیں ادا کرتے تھے ہم

دشمنوں کی زَد میں دیتے تھے نہ آنے ہم کو دوست
ٹوک دیتے تھے ہمیں، جب کچھ خطا کرتے تھے
ہم

آج وہ کام آئے اپنے کل ہم اُن کے آئے کام
بارہا باہم سلوک ایسا کیا کرتے تھے ہم

تو نے اے ہندوستاں کھودیں کہاں وہ یاریاں
یاریاں ہم میں رہیں باقی نہ وہ غم خواریاں

9

تیرے سایے سے رہے اے ہند جب تک دور
ہم
اپنی یک رنگی رہی ضرب المثل بین الامم

مل گیا جو ہم میں آ کر پھر نہ تھے ہم پوچھتے
روم ہے یا ترک، ارمن ہے، عرب ہے یا عجم

ملتِ بیضا نے قوموں کی مٹا دی تھی تمیز
تھے بلال و جعفر و سلماں برابر محترم

ایک رنگت میں اخوت کی تھے سب رنگے ہوئے
اسود و احمر تھے جو اسالم کے زیر علم

زنگی و خوارزمی و تاتاری و ماژندری
ایک دسترخوان پر کھاتے تھے سب مل کر بہم

گو سدا آپس میں لڑتے اور جھگڑتے تھے مگر
وقت جب پڑتا تھا آ کر ایک ہو جاتے تھے ہم

فرق رکھا تھا کہہ و مہہ میں نہ کچھ اسلام نے
تھے برابر نفقہ و کسوت میں آقا اور خدم

حق خلیفہ کا نہ تھا اس میں رعیت سے سوا
جمع بیت المال میں ہوتی تھی جو آ کر رقم

ٹوک دیتا تھا سرِ دربار بڑھ کر اک غلام
گر کہیں بے راہ اٹھ جاتا تھا حاکم کا قدم

شوکتِ دیں کے سوا، شوکت نہ تھی کوئی پسند
ملک جم، لے کر نہ پاس آتا تھا اپنے کسریٰ جم

0

راست بازی میں ہماری لوگ دیتے تھے نظیر
فرد تھے پاسِ سخن میں قوم کے برنا و پیر

دوست دشمن کو ہمارے قول پر تھا اعتماد
دے چکے جب ہم زباں، پھر تھی وہ پتھر کی لکیر

تھے ثقہ بھی ہم میں، بد اطوار بھی، اوباش بھی
تھا سخن کا اپنے لیکن پاس سب کو ناگزیر

کوئی بدعہدی سے بڑھ کر تھا نہ عیب اُن کے لیے
حق جنہیں کرتا تھا ہم میں وارثِ تاج و سریر

جیسے رہ زن اور لٹیرے تھے ہمارے راست باز
رہ نماؤں میں نہیں پاتے ہم آج ان کی نظیر

دل میں کچھ ہے اور زباں پر کچھ، یہ خاصیت نہ تھی
خاک میں اس سرزمیں کی جس سے تھا اپنا خمیر

جنگ تھی تو برملا تھی، صلح تھی تو بے ریا
ہم کو زہر آتا نہ تھا دینا بنا کر جامِ شیر

منہ سے جو کہہ بیٹھتے تھے کر دکھاتے تھے وہی
ہے گرج کر پھر برستا جس طرح ابر مطیر

چھاؤں میں ہم جا کے تلواروں کی کہہ آتے تھے

حق

غالب آتا تھا نہ ہم پر خوفِ سلطان و امیر
پر بنایا جب سے ہم نے ملجا و ماویٰ تجھے
راست بازی ہوگئی اے ہند ہم سے گوشہ گیر
کر دیے تو نے تمام اسلام کے ارکان سست
ہو گئے بودے ہمارے عہد اور پیمان سست

!

شرق سے تا غرب جب عالم میں تھا قحط الرجال
تھی ہماری قوم میں ارزانیٔ اہلِ کمال
علم و حکمت نے ہماری آن کر لی تھی پناہ
روم اور یونان پر جب چھا گیا جہل و ضلال
جاہلوں کا تھا ہماری قوم میں گھاٹا یونہی
جیسے اب لکھے پڑھے ملتے ہیں ہم میں خال خال
منع استدلال یا توجیہ یا تحقیقِ حق
تھی یہی اکثر ہماری مجلسوں میں قیل و قال
ترک میں وحشت رہی تھی اور نہ جہل اعراب میں
دینِ بیضا نے دیا تھا آ کے کانٹا سا نکال
علم بھی جاتا تھا، جاتے تھے جہاں ہم، ساتھ ساتھ
علم نے اسلام سے باندھا تھا پیمانِ وصال
سیم و زر کم چھوڑ کر جاتے تھے ہم میراث میں
تھی کتاب اپنی بضاعت اور ادب تھا اپنا مال
خلق کرتی تھی ہماری ریس رسم و راہ میں
کر دیا تھا علم نے سب کے لیے ہم کو مثال

آج جس علم و ہنر سے ہے چراغاں بزمِ دہر
ہم نے بنیاد اس کی دی تھی بیش تر دنیا میں ڈال

تھی ہماری دولت، اے ہندوستاں! فضل و ہنر
آ گیا تیری بدولت اپنی دولت کو زوال

ہم کو ہر جوہر سے یوں بالکل معرا کر دیا
تو نے اے آب و ہوائے ہند یہ کیا کر دیا؟

@

ہم نے یہ مانا کہ جب گلشن میں ہو فصلِ خزاں
بے محل ہے چھیڑنی واں عہدِ گل کی داستاں

ہو خلف پر ابر جب چھایا ہوا ادبار کا
پھر سلف کی شان و شوکت کیجیے کس منہ سے

بیاں

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیوں کر کوئی
بھول جائے رات کا سب صبح ہوتے ہی سماں

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گزری بہت
اٹھ رہا ہے گل سے شمعِ بزم کے اب تک دھواں

کہہ رہے ہیں نقشِ پائے رہرواں، اے خاکِ ہند
یاں سے گزرا ہے ابھی اک با تجمل کارواں

گو یقیں ہے رفتہ رفتہ یادِ ایامِ سلف
دل سے چھوڑے گی مٹا کر گردشِ دورِ زماں

بھول جائیں گے کہ تھے کن ڈالیوں کے ہم ثمر
ٹوٹ کر آئے کہاں سے اور پکے جا کر کہاں؟

پر زمانے میں رہیں گے تاقیامت یادگار

جو کیے برتاؤ تو نے ہم سے اے ہندوستاں!

ماجرا ہو گا ہمارا عبرت اوروں کے لیے
چیت جائیں گے بہت سن کر ہماری داستاں

سانپ سے جس طرح رہتا ہے سپیرا دور دور
حکمراں تیرے یونہی تجھ سے رہیں گے برکراں

برکتیں یاں چھوڑ کر ہم اپنی جائیں گے بہت
ہم نہ ہوں گے پر نصیحت ہم سے پائیں گے
بہت

io

بابِ یاز دہم

تعلیمی اور اصلاحی نظمیں

1 مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ ا؎

(1880ء)

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا

تا کہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا

یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا

گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا

سرخ رو آفاق میں وہ رہ نما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

io

ا؎ ''غالباً یہ ترکیب بند مولانا حالی نے علی گڑھ ہی میں پیش کیا تھا، جب کہ وہ علی گڑھ دوبارہ (1880ء میں) تشریف لے گئے تھے۔'' (حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ 70)

ہم نے ان عالی بناؤں سے کیا اکثر سوال
آشکارا جن سے ان کے بانیوں کا ہے جلال

شان و شوکت کی تمہاری دھوم ہے آفاق میں
دور سے آ آ کے تم کو دیکھتے ہیں باکمال

قوم کو اس شان و شوکت سے تمہاری کیا ملا
دو جواب اس کا اگر رکھتے ہو یارائے مقال

سرنگوں ہو کر وہ سب بولیں زبانِ حال سے
ہو سکا ہم سے نہ کچھ، الانفعال الانفعال

بانیوں نے تھا بنایا اس لیے گویا ہمیں
ہم کو جب دیکھیں خلف اسلام کو رویا کریں

io

شوق سے اس نے بنایا مقبرہ اک شان دار
اور چھوڑا اس نے اک ایوانِ عالی یادگار

ایک نے دنیا کے پودے باغ میں اپنے لگائے
ایک نے چھوڑے دفینے سیم و زر کے بے شمار

اک محبِ قوم نے اپنے مبارک ہاتھ سے
قوم کی تعلیم کی بنیاد ڈالی استوار

ہو گی عالم میں کہو سرسبز یہ پچھلی مراد
یا وہ اگلوں کی امیدیں لائیں گی کچھ برگ و بار

چشمہ سرجیون ہے جو بہتا رہے گا یاں وہی
سب اُتر جائیں گی چڑھ چڑھ ندیاں برسات کی

io

دور سے اُمید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے
ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے [1]

قوم کے پیر و جواں سب ہو گئے تھے مردہ دل
درد مندی جوش میں چند اہلِ دل کو لائی ہے

پاؤ گے تاریخ میں ہرگز نہ تم اس کی مثال
سلطنت نے قوم کی جو یاں مدد فرمائی ہے

غیر قوموں نے بھی کی ہے شرطِ ہمدردی ادا
یہ بنا چلتی ہوا تک کو بھی دل سے بھائی ہے

آؤ ہم بھی اے عزیزو مغتنم سمجھیں اسے
اک ضروری کام اپنا کم سے کم سمجھیں اسے

io

یہ مبارک گھر، نزولِ خیر و برکت ہے جہاں
جس کی پیشانی سے ظاہر ہیں سعادت کے نشاں

یہ نہالِ تازہ جس کو اک زمینِ شور میں
خرّم و سرسبز کرنا چاہتے ہیں باغباں

یہ مسیحائی علاج اس دردِ بے درماں کا ہے
لادوا ٹھہرا چکے جس کو اطبائے زماں

یہ نمونہ اس عزیزِ مصر کا جس نے سم
جن کے ہاتھوں سے سہے، دی قحط میں ان کو اماں

عہد و پیماں اے عزیزو! تم سے کچھ لینے کو ہے
قوم کو پھر برکتیں بے انتہا دینے کو ہے

io

---

[1] ''بہت ممکن ہے کہ اس ڈوبتی کشتی کی تشبیہ سے سرسید نے وہ تصویر نواب مختار الملک مرحوم کے لیے بنوائی وہ جس کا ذکر 'حیات جاوید' میں آیا ہے۔'' (حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ 73)

879

آ رہی ہے اس مکاں کے گوشے گوشے سے صدا
قوم اگر سمجھے تو ہوں میں قوم کا حاجت روا

ہے کوئی اکسیر دنیا میں تو ہوں اکسیر میں
اور اصلِ کیمیا کچھ ہے، تو میں ہوں کیمیا

ہاتھ آ جاتا سکندر کو اگر میرا سراغ
چھوڑ دیتا جستجوے چشمۂ آبِ بقا

میرے جو حامی ہیں اُن کی یوں پھلیں گی
کوششیں
ایک دانے سے ہوں خوشے جس طرح بے انتہا

ہے عبث گر قوم نے بے وقت پہچانا مجھے
برکتیں اُن پر جنھوں نے وقت پر جانا مجھے

io

اُن سے کہہ دو قوم میں ہیں جو کہ عالی خانداں
یا جنھیں جاگیر و منصب پر ہے نازِ بے کراں

کیا لیے بیٹھے ہو فخرِ منصب و جاگیر کو
منصب و جاگیر ہیں سب کوئی دن کے میہماں

تم نہیں رتبے میں بڑھ کر تغلق و تیمور سے
تنگ ہے آج ان کی نسلوں پر زمین و آسماں

چھوڑ جاؤ واسطے اولاد کے کوئی سپر
ورنہ وار اپنا کرے گی گردشِ دورِ زماں

آؤ باندھو عہد مجھ سے اور میرا ساتھ دو
میرا سودا نقد ہے، اس ہاتھ لو اس ہاتھ دو

io

میں تمہیں پستی سے پہنچاؤں گا تا اوجِ کمال
میں تمہیں دیکھوں گا جب گرتا ہوا، لوں گا سنبھال

میں بناؤں گا تمہارے کام سب بگڑے ہوئے
میں سُجھاؤں گا زمانے کی تمہیں سب چال ڈھال

جو کریں گے آج میری دست و بازو سے مدد
میں سدا کرتا رہوں گا اُن کی نسلوں کو نہال

قوم کا حامی ہوں اور اسلام کا یاور ہوں میں
چاہو دارالکفر سمجھو مجھ کو یا دارالضلال

میں دکھا دوں گا کہ جو دشمن تھے میرے نام کے
تھے حقیقت میں وہ دشمن قوم اور اسلام کے

io

ملک میں عزت سے رہنا میں سکھاؤں گا تمہیں
سلطنت کا معتمد بنا بتاؤں گا تمہیں

قابلیت تم میں بڑھنے کی ہے دیکھوں کس قدر
بڑھ سکو گے جس قدر اتنا بڑھاؤں گا تمہیں

تب یہ سمجھو گے کہ ہم سوتے تھے کب کے بے خبر
دفعتاً جب خوابِ غفلت سے جگاؤں گا تمہیں

یاد ہو گا تم کو وہ کھویا ہوا اپنا خطاب
پھر مخاطب ''خیر اُمت'' کا بناؤں گا تمہیں

مجھ کو دیکھو گر مرے دعووں میں ہو کچھ اشتباہ
روزِ روشن آپ اپنی روشنی پر ہے گواہ

io

بارک اللہ، اے ریاضِ علم اے عین الحیات
ہے ہمارے بخت و دولت کی عناں اب تیرے
ہات

ہو تو ہو اب روشنی تیری دلیلِ کارواں
چار سو کالی گھٹا چھائی ہے اور کالی ہے رات

قوم سے تو بھی یونہی جہل اور تعصب کو مٹا
جس طرح دینِ حنیفی سے مٹے لات و
منات

چھوڑ جائیں گے جہاں میں جو کہ تجھ جیسے نشاں
چھوڑ جائیں گے وہی کچھ باقیات الصالحات

ایک باہمت جماعت جب سے تیرے ساتھ
ہے
ہم سمجھتے ہیں ترے سر پر خدا کا ہاتھ ہے

io

تو سدا آباد رہ اے قوم کی اُمیدگاہ
اے یگانوں اور بے گانوں کے یکساں خیرخواہ

دیکھتے ہیں غیر حیرت اور تعجب سے تجھے
قوم نے اب بھی اگر سمجھا نہ تجھ کو آہ آہ!

اپنے حامی آپ پیدا کر کہ کوہ سربلند
اپنی پونجی سے ہے آپ اپنے لیے پشتِ پناہ

خیر کی اُمید رکھنی ہے عبث اس قوم سے

آپ کو جس نے کیا ہو اپنے ہاتھوں سے تباہ
چارہ آخر کچھ نہیں حالی بجز صبر و سکون
کرو عا اب "اہد قومی انہم لا یعلمون" [1]

[1] حدیث نبوی۔ ترجمہ: (اے خدا) میری قوم (کے لوگوں) کو ہدایت کر کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے۔ (ا ص)

2 ننگِ خدمت

یادِ ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں
دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں
گلِ خودرو سے بسا تھا چمنِ کون و مکاں
چار سو حسنِ خداداد کا سکہ تھا رواں
وضعِ عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خطِ قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک

طفلِ معصوم کی مانند تھا یہ عالمِ پیر
تھے ہم اک صنعتِ بے چون و چرا کی تصویر
ملکِ فطرت میں نہ تھی سلطنتِ نفسِ شریر
طبع نے مملکتِ روح نہ کی تھی تسخیر
خوابِ غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

مال و دولت کی ہوس میں نہ گرفتار تھے ہم
نہ بلندی کے، نہ رفعت کے طلب گار تھے ہم
آپ ہی اپنے ہر اک رنج میں غم خوار تھے ہم
مددِ غیر سے اصلا نہ خبردار تھے ہم

جو سبق آئے تھے اُستادِ ازل سے لے کر
وہ ہر منزل و ہر راہ میں تھا یاں رہبر

اصل سے دور بہت ہونے نہ پائے تھے ابھی
دیس سے چھوٹ کے پردیس میں آئے تھے
ابھی
دن جدائی کے نصیبوں نے دکھائے تھے ابھی
ڈال سے توڑ کے بازار میں لائے تھے ابھی

عرصہ گزرا تھا مسافر کو نہ غربت میں بہت
جی لگا تھا نہ ابھی غیروں کی صحبت میں بہت

صاف آئینۂ دل میں نظر آتا تھا کوئی
رو بہ رو جس کے جگہ دل میں نہ پاتا تھا کوئی
جی وہ جی تھا کہ نہ جس جی کو لبھاتا تھا کوئی
آنکھ وہ آنکھ تھی جس میں نہ سماتا تھا کوئی

روح تھی بادۂ دوشینہ سے اپنی بدمست
تھا ترقی پہ ابھی نشۂ صہبائے الست

اس قدر عمرِ دو روزہ پہ نہ مغرور تھے ہم
عیش و عشرت کے طلسموں سے بہت دور تھے ہم
کسی محنت سے، مشقت سے نہ معذور تھے ہم
آپ ہی راج تھے اور آپ ہی مزدور تھے ہم

تھے غلام آپ ہی اور آپ ہی آقا اپنے

خود ہی بیمار تھے اور خود ہی مسیحا اپنے

خود نمائی و خود آرائی کا کچھ دھیان نہ تھا
کبر و پندار کا جاری کہیں فرمان نہ تھا
گھر میں سامان نہ تھا، در پہ نگہبان نہ تھا
جی میں فرعونِ زماں بننے کا ارمان نہ تھا

آ کے دنیا میں بہت پاؤں نہ پھیلاتے تھے
اک مسافر کی طرح رہ کے چلے جاتے تھے

خاک کو نرم بچھونوں سے سوا جانتے تھے
روکھ کی چھاؤں کو ہم ظلِ ہما جانتے تھے
مل گیا جو اُسے انعامِ خدا جانتے تھے
نہ برا جانتے تھے اور نہ بھلا جانتے تھے

طاعتِ نفسِ فرومایہ سے آزاد تھے ہم
ساگ اور پات پہ گزران تھی اور شاد تھے ہم

تھی سفر میں نہ سواری کی ضرورت زنہار
طے انہی قدموں سے کرتے تھے ہر اک راہ گزار
کھانے پینے کو نہ تھے ظرفِ بلوریں درکار
انہی ہاتھوں پہ خور و نوش کا تھا اپنے مدار

شرم آتی تھی نہ ہل جوت کے کھانے سے ہمیں
عیب لگتا تھا نہ کچھ ڈھور چرانے سے ہمیں

تھک کے محنت سے جو ہم بھوک میں کھاتے تھے طعام
دیتے تھے کلۂ بریاں کا مزا گندمِ خام
دست و بازو کی بدولت تھا ہمیں عیش مدام
خوب کٹتے تھے مشقت میں ہمارے ایام

پیٹ کے مارے کہیں سر نہ جھکاتے ہم تھے
آبرو نفس کی خاطر نہ گنواتے ہم تھے

کرنے پڑتے تھے ضیافت میں نہ بے جا ساماں
نانِ جو کھاتے تھے خوش ہو کے ہمارے مہماں
تھا بناوٹ کا پتا اور نہ تکلف کا نشاں
ایک قانون کے پابند تھے دل اور زباں
طبل ظاہر کی نمائش کے نہ بجتے تھے وہاں
جو برستے تھے زیادہ، نہ گرجتے تھے وہاں

آمدِ موسمِ گل میں تھا عجب لطف ہوا
آندھیوں نے کیے انجام کو طوفاں برپا
چشمہ نزدیک تھا منبع سے تو تھا عینِ صفا
جتنا بڑھتا گیا، ہوتا گیا پانی گدلا
مٹتے مٹتے اثرِ صدق و صفا کچھ نہ رہا
آخری دور میں تلچھٹ کے سوا کچھ نہ رہا

اے جہاں اے روشیں تازہ بدلنے والے
نت نئی چال، نئی ڈھال سے چلنے والے
موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنے والے
روز اک سانگ اے نیا بھر کے نکلنے والے
آج کچھ اور ہے، کل اور تھی کچھ شان تری
ایک سے ایک نہیں ملتی کہیں آن تری

اک زمانہ تھا کہ ہم وزن تھے سب خورد و کلاں
لہلہاتی تھی بنی نوع کی کھیتی یکساں
ایک اسلوب پہ تھی گردشِ پرکارِ زماں
شہر و ویرانہ و آباد میں تھا ایک سماں

قدر و قیمت میں نہ تھا فرق کسی کا اصلا
کوئی پلہ تھا ترازو کا نہ اونچا نیچا

ایک سے ایک نہ کم تھا نہ زیادہ سرِ مو
سب تھے ہم ایک ترائی کے درختِ خودرو
حاجتیں لے کے کسی در پہ گئے تھے نہ کبھو
نہ زمیں بوس کی عادت تھی نہ تسلیم کی خُو

دستِ قدرت کے سوا سر پہ کوئی ہات نہ تھا
ایک قبلہ تھا، کوئی قبلۂ حاجات نہ تھا

ا۔ مطابق مجموعۂ نظم حالی، طبع اول (ص 44) اصل لفظ سوانگ (بہ ضم واؤ) ہے۔ یہاں عام تلفظ کے مطابق لکھا گیا ہے۔

ناگہاں جور و تغلب ا۔ کا اک اٹھا طوفاں
جس کے صدمے سے ہوئی زیر و زبر نظمِ جہاں
اقویا ہاتھ ضعیفوں پہ لگے کرنے رواں
بکریوں کو نہ رہی بھیڑیوں سے جاے اماں

تیز دنداں ہوئے جنگل میں غزالوں پہ پلنگ
مچھلیوں پر لگے منہ کھولنے دریا میں نہنگ

حق نے شائستۂ ہر باب بنایا تھا ہمیں
ایک ہی دام میں پھنسنا نہ سکھایا تھا ہمیں
رستہ ہر کوچہ و منزل کا بتایا تھا ہمیں
زینہ ہر بام پہ چڑھنے کا دکھایا تھا ہمیں

ایسا کچھ بادۂ غفلت نے کیا متوالا
طوق خدمت کا لیا اور گلے میں ڈالا

درِ مخلوق کو ہم ملجا و ماویٰ سمجھے
طاعتِ خلق کو اعزاز کا تمغا سمجھے
پیشہ و حرفہ کو اجلاف کا شیوہ سمجھے

ننگِ خدمت کو شرافت کا تقاضا سمجھے
عیب لگنے لگے نجاری و حدادی کو
بیچتے پھرنے لگے جوہرِ آزادی کو

نوکری ٹھہری ہے لے دے کے اب اوقات اپنی
پیشہ سمجھے تھے جسے، ہو گئی وہ ذات اپنی
اب نہ دن اپنا رہا اور نہ رہی رات اپنی
جا پڑی غیر کے ہاتھوں میں ہر اک بات اپنی

ہاتھ اپنے دلِ آزاد سے ہم دھو بیٹھے
ایک دولت تھی ہماری سو اسے کھو بیٹھے

ا۔ مطابق مجموعۂ نظم حالی طبع اول (ص 44)۔ دیگر نسخوں میں "تَظَلُّم" چھپا ہے۔ (مرتب)

کرتے ہیں قصدِ تجارت تو گرہ میں نہیں دام
دست کاری کو سمجھتے ہیں کہ ہے کارِ عوام
نہیں ہل جوتنے میں راحت و آرام کا نام
بنتے پھرتے ہیں اسی واسطے ایک اک کے غلام

نظر آتی نہیں مطلب کی کوئی گھات ہمیں
وہ پڑا نقشہ کہ ہر چال میں ہے مات ہمیں

ایک آقا ہو تو خدمت کا ہو حق اس کی ادا
ایک آقا ہو تو حکم اس کا کوئی لائے بجا
زید کی رائے جدا، عمرو کی تجویز جدا
ایک بندے کو بھگتنے کئی پڑتے ہیں خدا

بھاگو خدمت سے کہ اچھا نہیں انجام اس کا
جس کا پتھر کا کلیجہ ہو وہ لے نام اس کا

کہیں بہتان کا اندیشہ کہیں بیمِ گناہ
کہیں غماز کا دھڑکا، کہیں خوفِ بدخواہ

جھیلنے روز وہ افسر کہ نہ ہو جن سے نباہ
خدمت اک بارِ گراں ہے کہ عیاذاً باللہ

پڑے پتھر پہ تو پتھر میں گرانی نہ رہے
گرے دریا پہ تو دریا میں روانی نہ رہے

آتی ہیں نوکروں کے سر پہ بلائیں اکثر
بے سبب اُن پہ گزرتی ہیں جفائیں اکثر
ماننی پڑتی ہیں ناکردہ خطائیں اکثر
سامنے جاتے ہیں پڑھ پڑھ کے دعائیں اکثر

غیرت آئی جنہیں وہ ٹھہرنے پاتے نہیں یاں
جو کہ عاقل ہیں، کبھی کان ہلاتے نہیں یاں

کیجیے فرض کہ ہے زید بڑا منصب دار
اور عمرو اس کا ہے اک بندۂ فرماں بردار
فرق دونوں میں نہیں اس کے سوا کچھ زنہار
کہ یہ میلا ہے وہ اُجلا، یہ پیادہ وہ سوار

ورنہ انصاف سے دیکھو تو ہیں نوکر دونوں
قید میں، عجز میں، ذلت میں برابر دونوں

عمرو کرتا ہے اگر اس کا ادب اور تعظیم
کرنی پڑتی ہے اسے بھی کہیں جھک کر تسلیم
زید کی جھڑکیوں سے گر ہے دلِ عمرو دو نیم
جا کے سنتا ہے کہیں زید بھی الفاظِ سقیم

پاجی، احمق، اسے کہنے کا اگر ہے دستور
''ڈیم فول'' اس کو بھی سننا کہیں پڑتا ہے ضرور

رکھتے ہیں حضرتِ انساں جو بڑائی میں قدم
گاؤخر ان سے ہیں کیا جانیے کس بات میں کم

مالکوں کے انہیں گر جھیلنے پڑتے ہیں ستم
ذلتیں اُن کے لیے بھی ہیں مہیا ہر دم
ننگِ خدمت کی حقیقت کو بشر گر سمجھے
چاکروں کو گدھے اور بیل سے بدتر سمجھے

کھیت سے اپنے بچھڑنے کا ہے گر ان کو ملال
مدتیں گزریں کہ لوٹا گیا یاں عیشِ وصال
نوکری نے جونہی دکھلایا طلسمِ اقبال
چھوڑ کر شہر و وطن کو ہوے جویاے محال
گھر چھٹا، یار چھٹے، خویش و یگانہ چھوٹا
ایک ذلت ملی اور سارا زمانہ چھوٹا

ان کی گردن میں اگر قید کی رسی ہے پڑی
اپنی بے بال و پری کی بھی کہانی ہے بڑی
تازہ حکموں کی لگی رہتی ہے ہر وقت جھڑی
نہیں خالی کوئی ساعت، کوئی پل، کوئی گھڑی
مرغِ بے پر کی طرح قیدیِ صیاد ہیں ہم
کہیے پھر کون سی حجت سے کہ آزاد ہیں ہم

ہوتے ہیں فرطِ مشقت سے اگر وہ رنجور
مالک ان کی نگرانی میں نہیں کرتے قصور
دیکھ لیتے نہیں جب تک کہ ہوئے روگ سے دور
رکھتے ہیں محنت و تکلیف سے اُن کو معذور
جانتے ہیں یہی دھن ہے، یہی دولت اپنی
دم سے وابستہ انھی کے ہے معیشت اپنی

اپنی گر جان پہ بن جائے مشقت سے یہاں
نہیں اُمید کہ گزرے کسی خاطر پہ گراں

مطمئن ہیں کہ ہے مزدوروں کا دنیا میں سماں
نہ ہوا ایک تو رکتی نہیں تعمیرِ مکاں
پھرتے ہیں پیٹ کی یاں دیتے دہائی لاکھوں
گر نہیں آپ تو ہیں آپ کے بھائی لاکھوں

حق کسی کا نہیں ماتحت ہو یا ہو افسر
ایک سے کام لیا، ایک کو سونپا دفتر
یہی کُھسر بدلیاں رہتی ہیں یہاں شام وسحر
فی المثل ایک کرایے کی دکاں ہے نوکر
رہے، جب تک کسی بنیاد میں آیا نہ خلل
جب لگی بیٹھنے لی جا کے کہیں اور بدل

نوکروں سے ہیں بہایم کہیں رتبے میں سوا
کہ نہیں خدمتِ ہم جنس کا اُن پر دھبّا
گائے ہو، بیل ہو، گھوڑا ہو کہ اس میں ہو گدھا
ایک کا ایک کو تابع کہیں دیکھا نہ سنا
کسی مخلوق کو رتبہ نہ خدا نے بخشا
جو غلاموں کو شرف عقلِ رسا نے بخشا

اس سے بڑھ کر نہیں ذلت کی کوئی شان یہاں
کہ ہو ہم جنس کی ہم جنس کے قبضے میں عناں
ایک گلے میں کوئی بھیڑ ہو اور کوئی شباں
نسلِ آدم میں کوئی ڈھور ہو کوئی انساں
ناتواں ٹھہرے کوئی، کوئی تنومند بنے
ایک نوکر بنے اور ایک خداوند بنے

ایک ہی تخم سے پیلو بھی ہو شمشاد بھی ہو
ایک ہی اصل سے خسرو بھی ہو فرہاد بھی ہو

ایک ہی ڈار میں آہو بھی ہو صیاد بھی ہو
ایک ہی نسل سے بندہ بھی ہو آزاد بھی ہو

ایک ہی سبزۂ جو تازہ بھی ہو، خشک بھی ہو
ایک ہی قطرۂ خوں ریم بھی ہو مشک بھی ہو

ایک وہ ہیں کہ نہیں غیر کے فرماں بردار
اپنی ہر بات کے ہر کام کے خود ہیں مختار
نہیں سرکار سے دربار سے ان کو سروکار
جس جگہ بیٹھ گئے ہے وہی ان کا دربار

گر تونگر ہیں تو دس بیس ہیں ان کے محکوم
ورنہ خادم ہیں کسی کے نہ کسی کے مخدوم

حکم سے کوئی نہیں اُن کا بلانے والا
جبر سے کوئی نہیں اُن کا دبانے والا
بیٹھ جائیں تو نہیں کوئی اُٹھانے والا
سو رہیں جب تو نہیں کوئی جگانے والا

اٹھ کے چل دیں تو نہیں روکنے والا کوئی
اُلٹے پھر جائیں جو ہو ٹوکنے والا کوئی

ایک وہ ہیں کہ زمانہ کرے انصاف اگر
اور کھل جائیں کمالات بھی ان کے سب پر
جوہری جو ہیں وہ سب ان کے پرکھ لیں جوہر
کامیابی نہیں ان کے لیے اس سے بڑھ کر

کہ سدا قید رہیں مرغِ خوش الحاں کی طرح
جا کے بک جائیں کہیں یوسفِ کنعاں کی طرح

دیکھ لیں جب انہیں ہر علم و ہنر میں یکتا
شرفِ ذات میں اور اصل و گہر میں یکتا

زورِ بازو میں بلندیِ نظر میں یکتا
الغرض جملہ کمالاتِ بشر میں یکتا

اور پھر اس پہ مدد طالعِ بیدار کی ہو
تب نصیب ان کو غلامی کسی سرکار کی ہو

ورنہ دن رات پھریں ٹھوکریں کھاتے در در
سندیں، چٹھیاں، پروانے دکھاتے در در
چاپلوسی سے دل ایک اک کا لبھاتے در در
ذائقہ نفس کو ذلت کا چکھاتے در در

تا کہ ذلت سے بسر کرنے کی عادت ہو جائے
نفس جس طرح بنے لائق خدمت ہو جائے

کوئی دفتر نہیں اور کوئی کچہری ایسی
کہ جہاں گزری ہو ایک آدھ نہ عرضی ان کی
سنتے مشرق میں ہیں گر کوئی اسامی خالی
قافلے ہوتے ہیں مغرب سے اسی دم راہی

برسوں اس پر بھی گزر جاتے ہیں بے نیلِ مرام
کوئی آقا نہیں ملتا کہ بنیں اس کے غلام

تنگ ہوتے ہیں تو تقدیر کا کرتے ہیں گلا
کبھی ٹھہراتے ہیں گردش کو زمانے کی برا
کبھی سرکار کو کہتے ہیں کہ ہے بے پروا
کبھی فرماتے ہیں یہ ہو کے مشیّت سے خفا

وعدۂ رزق میں سنتے تھے کہ ہوتی نہیں دیر
پھر جو نوکر نہیں ہوتے تو یہ ہے کیا اندھیر

جانتے ہیں کہ ہے جس رزق کا ہم سے وعدہ
اس کا حیلہ نہیں یاں کوئی غلامی کے سوا

اور دروازے ہوئے بند سب اُن پر گویا
اب فلک پر انھیں ملجا نہیں زمیں پر ماویٰ

کام ہوتا کوئی اور اُن سے سرانجام نہیں
جس طرح بیل کو جُتنے کے سوا کام نہیں

جن کے اسلاف نے تھا قوم کا دیکھا اقبال
یاد کرتے ہیں جب اسلاف کا وہ جاہ و جلال
پاتے ہیں اُن کو عنایات سے شاہوں کی نہال
مال و دولت سے انھیں دیکھتے ہیں مالا مال

ایک کی ایک سے پاتے ہیں فزوں تر توقیر
کوئی بخشی کوئی دیوان کوئی صدرِ کبیر

دیکھتے جب ہیں کہ دم ساز تھے اُن سے ایام
بادۂ عیش سے لبریز تھا جام اُن کا مدام
کہتے ہیں خدمتِ سلطاں میں ہے اعزاز تمام
اس لیے ہم نے لیا پیشۂ آبائے کرام

دیکھیں منہ ڈال کے گر اپنے گریبان میں وہ
عمر برباد کریں پھر نہ اس ارمان میں وہ

ہنس کی چال حماقت سے چلا جو کوا
اپنی بھی چال گیا بھول بہ قولِ حکما
پیروی کرتے ہیں اسلاف کی اب جو حمقا
وہ نہیں جانتے رنگ آج زمانے کا ہے کیا

اپنا کیا حال ہے اسلاف کی حالت کیا تھی
اپنی توقیر ہے کیا اُن کی وجاہت کیا تھی

سلطنت کے وہی اعضا تھے وہی تھے ارکاں
ان سے ہر حال میں دربار کو تھا اطمیناں

رتق اور فتق کی ہاتھوں میں انہی کے تھی عناں
طبل و نقارہ انہی کا تھا، انہی کا تھا نشاں

تھے وہی قائدِ لشکر وہی دفتر کے دبیر
تھے وہی شرع کے مفتی وہی دولت کے مشیر

مشورت اُن سے ہر اک بات میں لی جاتی تھی
جستجو ان کی مہمات میں کی جاتی تھی
رخصتِ خلوت و جلوت انہیں دی جاتی تھی
سب چھپی اور ڈھکی ان سے کہی جاتی تھی

ڈھونڈ ڈھونڈ ان کو بلاتے تھے حکومت کے لیے
خدمت ان کے لیے تھی اور وہ خدمت کے لیے

اُن کی نسلوں کی بھی کیا آج یہی ہے توقیر
نوکری کے لیے پھرتے ہیں جو کرتے تدبیر
کاش سوجھے انہیں جو پیٹ رہے ہیں وہ لکیر
کاش سمجھیں کہ ہیں کس وہم کے پھندے میں اسیر

بھاگوان آیا تھا جو قوم پہ وہ سال گیا
گئے منصب بھی، جہاں قوم کا اقبال گیا

اب حسب اور نسب کچھ نہیں نازش کا محل
گردشِ دہر نے دی صورتِ احوال بدل
خاندانوں کی نجیبوں کے گئی ٹھیک نکل
کسی قابل نہ رہے شیخ نہ سید نہ مغل

گر گئے جو مئے پندار کے تھے متوالے
بڑھ گئے پیشہ و مزدوری و محنت والے

جن کو منظور ہے مشکل کو نہ دشوار کریں
چاہیے سعی و مشقت سے نہ وہ عار کریں

ہو میسر جنہیں وہ خدمتِ سرکار کریں
ورنہ مزدوری و محنت سرِ بازار کریں

آبرو اس میں ہے شان اس میں ہے عزت اس میں
فخر اس میں ہے شرف اس میں شرافت اس میں

پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں
کشت کاری کریں آئینِ فلاحت سیکھیں
گھر سے نکلیں کہیں آدابِ سیاحت سیکھیں
الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں

کہیں تسلیم کریں جا کے نہ آداب کریں
خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں

بیٹا عمران کا وہ فخرِ بنی اسرائیل
ہم سخن جس سے ہوا طور پہ خود ربِ جلیل
جس نے فرعون کے لشکر کو کیا خوار و ذلیل
جس کے خود دست و عصا میں تھی رسالت کی دلیل

گلہ بانی کے لیے پایا جو ایمائے شعیب
بکریاں اس نے چرانے میں نہ کچھ سمجھا عیب

انبیا پیشے پہ گزران سدا کرتے رہے
اولیا خلق کی طاعت سے ابا کرتے رہے
خدمتِ جنس سے نفرت حکما کرتے رہے
حاجتیں آپ ہی سب اپنی روا کرتے رہے

اپنے ہاتھوں سے ہر اک کام نبیڑا اپنا
کھینچ کر لے گئے خود موج سے بیڑا اپنا

کی ہے مردوں نے اسی طرح سے دنیا میں گزر
ہوئی تکلیف سے یا چین سے اوقات بسر

نہ ہوئے غیر کے تا زیست کبھی دست نگر
جب پڑی اپنے ہی بازو پہ پڑی جا کے نظر
گئے دل جمع یہاں سے کہ پریشان گئے
پر زمانے کے نہ شرمندۂ احسان گئے

ہوں گے حالی سے نہ دنیا میں کہیں ہرزہ سرا
خود ہیں گم راہ مگر قوم کے ہیں راہ نما
جھکتے جھکتے ہوئی پشت آپ کی خدمت میں دوتا
اس پہ ہے خیر سے آزادہ روی کا دعویٰ
بات کہنی وہی زیبا ہے کہ ہو جس میں اثر
ورنہ بے صرفہ نصیحت سے خموشی بہتر

3 مسلمانوں کی تعلیم [1]

(1889ء)

زمانہ دیر سے چلّا رہا ہے اے مسلمانو!
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
سنے ہوں گر نہ معنی ''لَاتَسُبُّوا الدَّہرَ''[2] کے تم نے
تو اب سن لو کہ ہوں میں شانِ ربانی مجھے مانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو
مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو
خبر تم کو بھی ہے کچھ، اے مری چالوں سے بیگانو!
گئے وہ دن کہ نفریں کرتے تھے دیں دار دنیا پر
بقائے دین و ملت منحصر دنیا پہ اب جانو
گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے

بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ، اے تن آسانو!

گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنریاں عیش کرتے تھے

ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل، مری جانو!

مٹے ہو جس ہنر اور فن پہ تم وہ مٹنے والے ہیں

یہ سودا کب تک اے شمعِ سحر گاہی کے پروانو

بھرا سمجھے ہو جس گھر کو نہیں دیار واں کوئی

کہاں بیٹھے ہو تم اے خانۂ ویراں کے دربانو

نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ

پھری جس وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ

io

ا۔ یہ ترکیب بند محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے چوتھے سالانہ اجلاس (منعقدہ دسمبر 1889ء) میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا۔

۲۔ ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: لَا تَسُبُّوا الدَّہْرَ فَاِنَّ الدَّہْرَ ہُوَ اللہ (یعنی زمانے کو برا نہ کہو کیونکہ وہ بھی شیون الٰہی میں سے ایک شان ہے)

گیا دورِ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری

جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عمل داری

جنہیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ اُن کو

کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری

ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں

نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری

جہاں علمِ تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر

تجارت کی نہ ہو گی تا قیامت گرم بازاری

نہ آئے گی پسند ان نوکروں کی خدمت و طاعت

جنھیں پائیں گے آقا زیورِ تعلیم سے عاری

اگر چاہیں گے کرنی آدمی گھوڑوں کی سائیسی

تو دینا ہو گا اُن کو امتحانِ علمِ بیطاری

نہ مستغنی بکاول علم سے ہے اب، نہ باورچی

ہوا ہے مدرسوں سے مطبخوں تک فلسفہ جاری

یقیں جانو کہ آئندہ ملے گی درس گاہوں میں

گر آٹا پیسنے کو چاہیے گی اک پسنہاری

کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز

نہ فصّادی، نہ جرّاحی، نہ کحّالی، نہ عطّاری

جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرماں روائی ہے

جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

io

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انسان کا زیور

ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر

کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا

نہ زرگر اور نہ آہن گر، نہ بازی گر، نہ سوداگر

مہندس چاہیے مزدور اب اور راج اقلیدس

بس اب دنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور

نہ پہنے گا کوئی جاہل کی شاید سی ہوئی جوتی

بس اب موچی فلاطوں سے یونہی کچھ ہوں تو ہوں کمتر

جہاں داری میں آج ایک ایک عامل ہے جم و کسریٰ

جہاں گیری میں ہے اک اک سپاہی طغرل وسنجر
گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے
برابر تھا بیے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر
یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا
جو آج اک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اُس سے اعلیٰ تر
کوئی دن میں خسارہ سب سے بڑھ کر اس کو سمجھیں
گے
کہ دو دن آدمی ٹھہرا رہے یاں ایک حالت پر
نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان وحیواں میں
دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آ کر
زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام اُن کا مٹا دوں گا

io

ہمارے شکر سے اے قوم! احساں اس کا بالا ہے
کہ جس نے قوم کی تعلیم کا یاں ڈول ڈالا ہے
خدا کی برکت و رحمت ہو نازل تجھ پہ اے سیّد
کہ تو نے بھائیوں کا ڈوبتا بیڑا سنبھالا ہے
فدائی قوم کے تجھ سے ہی گزرے ہوں گے دنیا میں
کہ دل سوزی کا جن کی آج قوموں میں اُجالا ہے
بھلائی کا تری احسان مانیں یا نہ مانیں ہم
بھلائی کرنے والوں کا ہمیشہ بول بالا ہے

کریں کیا گر نہ ابنائے زماں ہوں بدگماں تجھ

سے

کہ دردِ دل کی کیفیت سمجھ سے اُن کی بالا ہے

نمونہ کوئی ہمدردی کا دیکھا تھا نہ یاروں نے

ترے کاموں نے ان کو اس لیے حیرت میں ڈالا ہے

کیا ہے کام جو تو نے نہ ڈر انجام سے اس کے

کہ نیکی کا نشاں قائم خدا خود رکھنے والا ہے

کیا گو تو نے سب کچھ پر بہت کچھ ہے ابھی کرنا

ہے آخر قوم کی تعلیم یا منہ کا نوالا ہے

جسے احباب اک قصرِ رفیع الشان سمجھے ہیں

نہ ہو تو اس کا پشتی باں تو اک مکڑی کا جالا ہے

عزیزوں کو خدا وہ نامبارک دن نہ دکھلائے

کہ سایہ تیری ہمدردی کا اُن کے سر سے اُٹھ جائے

io

ترے احسان رہ رہ کر سدا یاد آئیں گے اُن کو

کریں گے ذکر ہر مجلس میں اور دہرائیں گے اُن کو

تری کوشش پہ تیری زندگی میں جو کہ ہنستے ہیں

نتائج اس کے تیرے بعد خوں رلوائیں گے اُن کو

تری رایوں کو جو منسوب کرتے ہیں ضلالت سے

زمانے کے حوائج جلد تری شرمائیں گے اُن کو

ترے کاموں کو خود کامی پہ جو محمول کرتے ہیں

دل اُن کے کوئی دن جاتا ہے خود بھلائیں گے اُن کو

انہوں نے خود غرض شکلیں کبھی دیکھی نہیں شاید
وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم دکھلائیں گے اُن
کو

بہت مشکل ہے جانی سرد مہری قوم کے دل سے
مگر تیرے ہی دل کے داغ کچھ گرمائیں گے اُن کو

اگر ہیں بھی کہیں کچھ کچھ دبی چنگاریاں باقی
لگائیں گی وہ گھر میں آگ جب سلگائیں گے اُن کو

بہت ہیں مدعی ہمدردیِ اسلام کے لیکن
ٹٹولیں گے انہیں جب یار خالی پائیں گے اُن کو

کبھی تسبیح کو اُن کی ملی فرصت وظائف سے
تو تیری خدمتیں اسلام کی گنوائیں گے اُن کو

ملا گو قوم سے اب تک نہیں اصلا صلہ تجھ کو
نہیں اُمید پر تجھ سے کہ ہو اس کا گلہ تجھ کو

io

جنہوں نے قوم کی اصلاح کی بیڑا اٹھایا ہے
اُنہوں نے پھل سدا محنت کا کم دنیا میں پایا ہے

یہ تیری خوش نصیبی ہے کہ ثمرہ تیری کوشش کا
خدا نے زندگانی میں تری تجھ کو دکھایا ہے

بہت جھکڑ چلے اور آئیں اکثر آندھیاں لیکن
رہا گلزار ہو کر باغ جو تو نے لگایا ہے

دیا ہے ساتھ بھی تیرا ہزاروں نے دل وجاں سے
اگر دو چار نے کچھ کہہ کے دل تیرا دُکھایا ہے

ادھر پورب سے پچھم تک ادھر اُتر سے دکھن تک
مددگار اپنا جس گوشے میں ڈھونڈا تو نے پایا ہے

اودھ سے سندھ تک کشمیر سے راس کماری تک
دلوں میں تو نے سکہ شہر شہر اپنا بٹھایا ہے

دکن میں تیرے یاور ہیں دو آبے میں ترے ساتھی
ترا مداح ملکوں میں ہر اک اپنا پرایا ہے

خصوصاً وہ مبارک ملک جس نے ہند میں اوّل
رکاب اسلام کی تھامی اور اس پر سر جھکایا ہے

خدا کی برکتیں پنجاب اور پنجاب والوں پر
جنھوں نے ہر سفر میں تجھ کو آنکھوں پر بٹھایا ہے

جنھوں نے قوم کا ہمدرد دل سے تجھ کو مانا ہے
تری نصرت میں اخلاصِ مسلمانی دکھایا ہے

نہ ہو افسردہ دل اور قوم پر فیض اپنا رکھ جاری
کہ اک ہمت سے تیری بندھ رہی ہیں ہمتیں ساری

io

ہوئے ہیں سرد دل یاروں کے، تو ڈھارس بندھاتا رہ
اُمیدیں اُن کی استقلال سے اپنے بڑھاتا رہ

ہوا پُروا ہو یا پچھوا، نہ کر تو اس کی کچھ پَروا
لگایا ہے چمن تو نے تو پود اس میں لگاتا رہ

اُمیدیں ہیں بہت وابستہ تیری زندگانی سے
دعائیں قوم کی لے لے کے عمر اپنی بڑھاتا رہ

ابھی سیراب کم ہیں اور بہت ہیں تشنہ لب باقی
سبیل آخر لگائی ہے تو پیاسوں کو پلاتا رہ

نہیں تعلیم بے علموں کی کم احیاے موتٰی سے
جہاں تک تجھ میں دم باقی ہے مُردوں کو جلاتا رہ

زبانیں تو نے گر اپنے پہ کھلوائی ہیں حق کہہ کر
تو خاموشی سے اپنی، نکتہ چینوں کو تھکاتا رہ

فرو ہوتی نہیں آتش سے جب آتش بھڑکتی ہے
ہر اک شعلے کو آبِ بُردباری سے بجھاتا رہ

کیا ہے زندہ قوموں کو سدا قوموں کے کشتوں نے
مہم گر فتح کرنی ہے تو چوٹیں دل پہ کھاتا رہ

شداید میں تحمّل خاص میراث انبیا کی ہے
جو تو آلِ محمد e ہے تو سب صدمے اُٹھاتا رہ

کوئی دن اور اس دارالمحن میں رنج سہنا ہے
پھر اس کے بعد تجھ کو زندۂ جاوید رہنا ہے

io

عزیزو، حق کی رحمت ہے یہ پیر ناتواں ہم میں
پھر ایسا پیر ہے ہم میں، نہ ہے کوئی جواں ہم میں

ہزاروں ہم میں ہوں گے بیچلر اور ماسٹر پیدا
مگر اے قوم پھر یہ صورتیں پیدا کہاں ہم میں

ہو ہم میں قوم کا ہمدرد، یہ قدرت خدا کی ہے
نہیں رشتہ کوئی مدت سے باقی درمیاں ہم میں

ہمارے تفرقوں نے کر دیے تحلیل سب اجزا
نہ پاؤ گے کہیں ترکیبِ قومی کا نشاں ہم میں

ابھی اٹھ کر فلاحِ قوم پر کوئی کمر باندھے
ہزاروں اس سے ہو جائیں گے پیدا بدگماں ہم
میں

ابھی سن لیں کسی قومی جماعت میں شکررنجی
ہزاروں ہوں گے یہ بدفال سن کر شادماں ہم میں

بن آئے قوم کی خدمت تو کیوں کر ہم سے بن آئے
نہ دور اندیشیاں ہم میں، نہ خیر اندیشیاں ہم میں

اگر بوجھ اس پہیلی کی نہ سیّد ہم کو بتلاتا
تو اسلامی اخوت تھی فقط اک چیستاں ہم میں

نہ کی سیّد کے منصوبوں کی گر تائید یاروں نے
تو پھر ہرگز سنبھلنے کی نہیں تاب وتواں ہم میں

بہت مشکل سے ہاتھ آیا ہے منزل کا نشاں یارو
پہنچنے دو سلامت تا بہ منزل کارواں یارو

io

رہو جیسے رہے ہو قوم کے غم خوار و یار اب تک
کرو دھندلا نہ اس رستے کو جو ہے بے غبار اب تک
جماعت کو تمہاری دیکھتے ہیں لوگ حیرت سے

879

تمہارے دم سے ہے کچھ قوم کا باقی وقار اب تک

تمہاری کوشش اور ہمت کا ہے چرچا زمانے میں
تمہاری خدمتوں کی قوم ہے منت گزار اب تک

جو کام انجام کرنا ہے تو سیّد کے رہو حامی
کہ قومی کامیابی کا اسی پر ہے مدار اب تک

وگرنہ دوستو! سن لو کہ ہے آپس کی ان بن کا
وہی انجام جو ہوتا رہا ہے آشکار اب تک

پڑے ہیں جا بجا بکھرے ہوئے اطرافِ عالم
میں
کھنڈر لاکھوں، ہمارے تفرقوں کی یادگار اب تک

ہزاروں باغ ویراں ہو گئے آپس کے جھگڑوں
میں
پلٹ کر پھر نہیں آئی جہاں فصلِ بہار اب تک

سفینے غرق لاکھوں کر دیے بادِ مخالف نے
زمانے کو نہیں معلوم خود جن کا شمار اب تک

نہ سمجھو یہ کہ فارغ ہو گئے ہم خاک میں مل کر
ہماری گھات میں ہے انقلابِ روزگار اب تک

نظر آتا نہیں یاں حملۂ دوراں سے بچنے کو
سوا اک درس گاہِ قوم کے کوئی حصار اب تک

کرو پورا حصارِ قوم کو سر جوڑ کر یارو!
ہٹاؤ حملۂ دوراں کو سب جی توڑ کر یارو!

io

یہ دار العلم سدِّ راہِ آسیبِ زماں ہو گا

اسی دار الشفا میں بختِ پیر اپنا جواں ہو گا

نہیں صورت اُبھرنے کی ہمارے کوئی پستی سے
اگر ہو گا اسی گھر سے بلند اپنا نشاں ہو گا

کمی نے کر دیا ہے علم کی ہم کو سبک سب سے
اسی پاسنگ سے ہو گا تو یہ پلّہ گراں ہو گا

یہ بیت العلم روز افزوں ترقی کا ہے سرچشمہ
اسی چشمے سے دیکھو گے تو اک دریا رواں ہو گا

اگر راس آ گئی آب و ہوا اس کھیت کی ہم کو
تو جو اُٹھے گا پودا اس زمیں سے آسماں ہو گا

یقیں ہے ٹہنیاں پھیلیں گی طوبیٰ سے سوا اس کی
ہمارے واسطے دنیا میں یہ باغِ جناں ہو گا

اگر اسلام میں باقی ہے خصلت حق شناسی کی
تو ایک اک نونہال اس باغ کا خود باغباں ہو گا

جو حق نے عالمِ اسباب دنیا کو بنایا ہے
تو جو نکلے گا یاں سے کامیاب و کامراں ہو گا

بہت مدت سے ہے قحط الرجال اے قوم اُمت میں
اسی کھیتی سے اس میں جنسِ مردم کا سماں ہو گا

بنا اسلام کی کہتے ہیں یہ تعلیم ڈھا دے گی
نہ ڈھینے دے گا حق اسلام پر گر مہرباں ہو گا

کسوٹی ہے یہ دار العلم اسلامی اخوت کی
ہم اُس سے بدگماں ہوں گے جو اس سے بدگماں ہو گا

کبھی یاں آ کے کچھ دیکھا بھی ہے اے نکتہ چیں یارو؟
برا کہنا گھروں میں بیٹھ کر اچھا نہیں یارو!

io

اگر رکھتے ہیں دل پہلو میں، آ کر یہ چمن دیکھیں
ریاضِ قوم کا فصلِ خزاں میں بانکپن دیکھیں

وطن کو جو سمجھتے ہیں کہ ہے ترجیح غربت پر
وہ آ کر شامِ غربت بہتر از صبحِ وطن دیکھیں

ہوئے ہیں جمع یاں جو نونہال اطراف سے آ کر
بہم سب کو شریکِ شادی و رنج و محن دیکھیں

محبت اُن میں جب دیکھیں تو سمجھیں بھائی ماں جائے
وطن پوچھیں تو ہند و سند و پنجاب و دکن دیکھیں

اگر غیبت میں پوچھیں ایک کا حال ایک سے آ کر
تو ہر طفل و جواں میں حفظِ عیب و حسنِ ظن دیکھیں

تکلف سے بری ایک اک کو دیکھیں اور بناوٹ سے
سخن میں راستی دیکھیں بیاں میں سادہ پن
دیکھیں

تواضع منعموں کی دیکھیں اور غیرت غریبوں کی
ادب بچوں کا دیکھیں، نوجوانوں کا چلن دیکھیں

تامل رائے میں دیکھیں تو دیکھیں کام میں پھُرتی
لڑائی فیلڈ [1] میں دیکھیں کلب میں یونین [2]
دیکھیں

اطاعت سلطنت کی، احترام اہلِ حکومت کا
وفاداری کی گردن میں بندھی سب کے رسن دیکھیں

نہ بو اُن میں غلامی کی، نہ بے باکی کی خُو ان میں

ادب اور معتدل آزادگی ان کا چلن دیکھیں

ا۔ فیلڈ (Field): میدان، مراد کھیل کا میدان ۲۔ یونین (Union): اتحاد

زباں سے قیصرِ ہندوستان کا نام لے کوئی
تو اک دریا محبت کا دلوں میں موج زن دیکھیں

سلف پر فخر دیکھیں اور تأسف اپنی حالت پر
لگن اسلام کی اور قوم کی دل میں چبھن دیکھیں

نمازوں کی تقید دیکھیں اور روزوں کی پابندی
اجازت نیک کرداری کی اور ہر کام کی بندی

io

کلب میں آ کے گر احباب رنگِ انجمن دیکھیں
تو زیبِ کرسیِ صدر اک مجسم یونین دیکھیں

نہ دیکھی ہوں جنھوں نے شفقت وطاعت کی تصویریں
وہ بیک اور اس کے شاگردوں کو مصروفِ سخن دیکھیں

تأسف کرتے ہیں جو ہند کی نااتفاقی پر
کلب میں ہندیوں کے آئیں وہ اور یونین دیکھیں

اگر باور نہ ہو اخلاص سنی اور شیعی کا
بہم شیر و شکریاں چار یار و پنج تن دیکھیں

نہ دیکھا ہو جنھوں نے پیار ہندو اور مسلماں میں
وہ آ کر مسلم و ہندو کو یک جان و دو تن دیکھیں

مسیحی پوششیں دیکھیں مسلمانوں کے بچوں کی
مسیحی کو مسلمانی قبا زیبِ بدن دیکھیں

مجسم دیکھنی ہو شکلِ مہرِ مادری جن کو

وہ بچوں سے سلوک آرنلڈ و ماریسن دیکھیں
اگر ہو دیکھنی تقریر میں تصویر معنی کی
تو والس کا بہ وقتِ درس اندازِ سخن دیکھیں
اگر اسکول میں چاہیں کہ دیکھیں ہورسٹ کو آ کر
فرائض میں تمام اوقات اس کے مرتہن دیکھیں
دم تدریس دیکھیں چکرورتی اے کو اگر برسوں
نہ پیشانی پہ بل دیکھیں، نہ ابرو میں شکن دیکھیں
ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں
سخن کوتاہ، دار العلم پر ہوں قوم کے نازاں
جو آ کر اس کا ایک اک دُرِ مکنوں من وعن دیکھیں
پھر اُن کے بعد گر دیکھیں مربّی اپنے بچوں کا
تو اک بچوں سے بڑھ کر زندہ دل پیرِ کہن دیکھیں
خوشی میں رنج میں صحت میں بیماری میں دکھ سکھ میں
اسے جب آ کے دیکھیں قوم کی دھن میں مگن دیکھیں
رہیں چپ کس طرح ہم باغباں کی مدح و تحسیں سے
جب ایسا حیرت افزا آنکھ سے اپنی چمن دیکھیں
نہ سمجھیں یہ کہ ہے اس کو ہماری مدح کی پروا
اگر سیّد کا استحقاق اہلِ انجمن دیکھیں
محبِ قوم سنتا ہے در و دیوار سے تحسیں
جنہیں باور نہ آئے وہ محبِ قوم بن دیکھیں
ادا سیّد کا حق تو ہم سے ہو سکتا ہے کیا حالی
مگر ہاں ہم کو اپنا فرض کرنا تھا ادا حالی

io

ا۔ اس بند میں علی گڑھ کالج کے چند اساتذہ کا ذکر آیا ہے۔ مسٹر تھیوڈور بیک کالج کے پرنسپل اور ہورسٹ ایم۔ اے۔ اور کالجیٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بقیہ اساتذہ میں سے آرنلڈ اُستاد فلسفہ، ماریسن اور والس اُستاد انگریزی، بابو چکرورتی اُستاد ریاضیات، شبلی اُستاد فارسی اور مولانا عباس ابن جعفر اُستاد دینیات تھے۔

4 ترکیب بند (''قوم کا متوسط طبقہ'') ا۔
(1891ء)

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیوں کر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں
جب ہوئے بھوکے تو بخشی تو نے نان و نانخورش
پر نہ اتنی معدہ و احشا پہ جو گزرے گراں
جب ہوئے پیاسے تو بخشا آبِ شیریں اور خنک
پر نہ ایسا ہو صراحی جس کی یاروں سے نہاں
ڈھانکنا چاہا بدن جب تو دیا تو نے لباس
پر نہ ایسا جس کو حسرت سے تکیں خورد و کلاں

ا۔ یہ ترکیب بند محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے سالانہ اجلاس (منعقدہ 27 تا 30 دسمبر 1891ء) میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا۔ نظم کا عنوان بعد میں تجویز کیا گیا، دیوان میں درج نہیں ہے۔
''اس نظم میں متوسط درجے کے لوگوں کی حالت کو فقرا اور اغنیا کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے۔ متوسطین سے وہ

لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سلف ہلپ سے دولت، عزت، نیک نامی یا علم و فضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کر کے اپنے ہم سروں میں تمیاز حاصل کیا ہو۔ ادنیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا چاہتے ہیں مگر نہیں بڑھ سکتے۔ اعلیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت و عزت کے لحاظ سے ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوئے مگر اس حالت سے ترقی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نیز اس حالت پر قائم رہنے کی فکر اور اس سے تنزل کرنے کا کچھ انسداد نہیں کرتے۔'' (حالی)

کھانے پینے کو کیے برتن ہمیں تو نے عطا
پر نہ ایسے ٹوٹنے سے جن کے ہو خوفِ زیاں

سونے اور آرام کرنے کو دیا بستر ہمیں
پر نہ ایسا جس سے اٹھنا ہو طبیعت پر گراں

رہنے سہنے کو دیے گھر تو نے ہم کو ہر جگہ
پر نہ ایسے ہو تعلق جن سے مثلِ جسم و جاں

آنے جانے کو دیے دو پاؤں یاں تو نے ہمیں
جن سے ڈر لے بھاگنے کا اور نہ گرنے کا گماں

راہ اور بے راہ یکساں جن کو ہنگامِ خرام
کوہ سدِّ راہ جن کا اور نہ خندق اور کنواں

کی سواری بھی عطا اکثر جو پیش آیا سفر
پر نہ ایسی تختِ فرعونی کا ہو جس پر گماں

سیم و زر وقتِ ضرورت ہم کو تو دیتا رہا
پر نہ اتنا ہو نگہبانی میں جس کی بیم جاں

آبرو تو نے ہمیں دنیا میں دی اور امتیاز
پر نہ ایسی جس سے ہوں محسودِ ابنائے زماں

نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دی
تا کہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہم پر عیاں

راحتیں اکثر میسر آئیں تکلیفوں کے بعد

تا کہ کھو بیٹھیں نہ ہم ان راحتوں کو رائگاں
وقت پر کرتا رہا بارانِ رحمت سے نہال
قحط اور طوفان دونوں سے بچایا بال بال

io

الحذر، اس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
لومڑی جاتے ہیں بن جس کی بدولت شیرِ نر
چاپلوسی جا کے کرتے ہیں سفیہوں کی فقیر
ناکسوں کے نازِ بے جا سہتے ہیں اہلِ ہنر
وزن میں علم وفضیلت جن کے ہے ہم سنگِ کوہ
وہ سبک تر دانۂ خردل سے آتے ہیں نظر
فقر وحاجت میں نہ ہوانساں کو جب صبر وشکیب
پھر نہیں کوئی برائی فقر و حاجت سے بتر
بھیک منگوائے، جوا کھلوائے، یہ چوری کرائے
پت گنوائے، آبرو کھوئے، پھرائے دربدر
ہو سکے محتاج سے طاعت نہ یادِ اللہ کی
لے سکے محتاج جورو کی، نہ بچوں کی خبر
گہ زباں آلودہ اس کی شکوۂ تقدیر سے
اور کبھی بوچھار اس کی آسمانِ پیر پر
گر بخیلوں کی مذمت پر کبھی آ جائے وہ
ہو نہ سب وشتم سے سیری اسے دو دو پہر
اُگلے زہر اتنا کہ ہو جائے مذاقِ بزم تلخ
کھول دے غیبت کا دفتر اہل دولت کی اگر
گہ وبائے عام کی مانگے دعا اللہ سے

تا کہ دولت مند بھی کچھ دن رہیں آسیمہ گر
اور کبھی چاہے کہ ہو دنیا میں کوئی انقلاب
تا کہ ہو جائیں بلند اور پست سب زیر و زبر
بے حلاوت اس کی دنیا اور مذہب اس کا دیں
خوف ناک اس کا ارادہ، نیت اُس کی پرخطر
رات اس کی حسرت آگیں اور دن اندوہ گیں
شام اس کی پرنحوست اور شوم اس کی سحر
گو کہ بدتر فقر سے یارب نہ تھی کوئی بلا
تھا مگر ثروت میں اس سے بھی زیادہ شور و شر
فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں
پر نہ دی ثروت سو اس کے شکر کی طاقت نہیں

io

نشۂ دولت سے تھا پھر ہوش میں رہنا محال
اس مئے مرد آزما کی تھی بہت مشکل سنبھال
نفسِ اتارہ اور اس پر چھیڑ مال و جاہ کی
ڈھیر ہے بارود کا، دیجے پتنگا جس میں ڈال
بادِ صرصر آگ کو اس طرح بھڑکاتی نہیں
جس طرح جذباتِ نفسانی کو بھڑکاتا ہے مال
ہضم کرنا اور بچانا مال و دولت کا ہے بس
نفسِ انساں میں اگر بالفرض ہے کوئی کمال
ورنہ مال و جاہ و مکنت کا جہاں آیا قدم
اور ہوئے سلب آدمی سے آدمیت کے خصال
عقل ٹھہراتی ہے جو افعال انساں پر حرام

کر دیے اس کے لیے سب مال و دولت نے حلال

فقر میں تھا نفسِ دوں واماندہ جس پرواز سے
آ کے ثروت نے دیے پر واسطے اس کے نکال

خواہشیں یوں نفس میں اب دم بہ دم بڑھنے لگیں
مغز میں جس طرح دیوانے کے گوناگوں خیال

آپ کو گننے لگا بالاتر از ابنائے جنس
چیونٹیوں میں ایک نے گویا نکالے پر و بال

مسرفِ بے زر ہو جیسے قرض خواہوں میں گھرا
خواہشوں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے بال بال

جھک پڑی طبعِ دنی گر بخل و خست کی طرف
ہو گئی فرزند و زن پر زندگی اس کی وبال

اور اگر بھوت اس کے سر پر چڑھ گیا اسراف کا
پھر نہیں گنجینۂ قاروں کچھ آگے اس کے مال

آ گیا غالب طبیعت پر گر استقائے حرص
ہے سمندر سے بھی اس کی پیاس کا بجھنا محال

باڑھ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اس قدر
جس قدر ثروت میں ہے دشوار پاسِ اعتدال

گلشنِ دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر
دیکھا اے روباہِ نفسِ دوں حذر، ان سے حذر

io

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی
فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنے سے بری

چین ہے دنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہے

یہ جو ہے برزخ میان مکنت و دستِ تہی

فقر و ثروت فی المثل ہوں دوزخ و جنت اگر
مانگتے ہیں ہم حذر دوزخ سے اور جنت سے بھی

دخل شیطاں کا ہو جس میں ایسی جنت کو سلام
منزلِ اعراف سو بار ایسی جنت سے بھلی

اس کٹھن منزل میں ہے بٹیا یہی اک بے خطر
ہیں ادھر کھڈ اور چڑھائی ہے اُدھر البرز کی

رکھتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بین بین
ہیں حسد اور کبر کے امراضِ مہلک سے بری

اپنے سے اعلیٰ کی حالت پر اگر آتا ہے رشک
دیکھ کر ادنیٰ کو کر لیتے ہیں اپنی دل دہی

سن کے ہو جاتے ہیں سیدھے وہ بڑوں کا فخر و ناز
مل کے چھوٹوں سے بہک جاتا ہے گر خنّا کبھی

لذتِ فقر و غنا دونوں سے ہیں وہ آشنا
اغنیا میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی

جو گزرتی ہے گدا پر اس سے ہیں وہ باخبر
کیونکہ حالت گاہ گاہ اُن پر بھی گزری ہے یہی

امتحاں دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے
کیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس مے کے بدمستی وہی

اس لیے جب دیکھتے ہیں عسرتِ ابنائے جنس
جوش ہمدردی سے بے کل اُن کا ہو جاتا ہے جی

اور نہیں کرتے زبانِ طعن بے دردی سے وا
جب کہ سنتے ہیں کسی منعم کی ازخود رفتگی

مست کی بے اختیار، تشنگی مخمور کی
واردات اک ایک کی ہے سر بسر اُن پر کھلی
جنت اور دوزخ ہے سب اعرافیوں پر جلوہ گر
گندم اور زقوم دونوں ان کے ہیں پیشِ نظر

io

دل توانا اور قوی یاروں کی ہمت اُن سے ہے
منتظم ہر قوم و ملت کی جماعت اُن سے ہے
مشکلیں اکثر انہی سے قوم کی ہوتی ہیں حل
بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت اُن سے ہے
ہے انہی کے دم سے جو ہے گرمی ہنگامہ آج
ساری قومی مجلسوں کی زیب و زینت اُن سے ہے
ہے جہاں دولت، یہی ہیں نظم دولت کے کفیل
ملک کی دولت میں ہے جو خیر و برکت اُن سے ہے
ہاتھ میں ان کے ہیں جتنے عقل و دانش کے ہیں کام
عقل و دانش میں ہے جن ملکوں کی شہرت اُن سے ہے
ہیں گداؤں کے وسیلے اور شاہوں کے مشیر
شاہ ہوں یا ہوں گدا دونوں کو قوت اُن سے ہے
آدمیت سیکھتے ہیں ان سے سب چھوٹے بڑے
نوعِ انساں میں بقائے آدمیت ان سے ہے
یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں
رونقِ بازارِ جنسِ علم و حکمت ان سے ہے
پاؤ گے ان میں طبیب ان میں ادیب ان میں
خطیب

ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت ان سے ہے
پاؤ گے ان میں مہندس، پاؤ گے ان میں حکیم
آدمی مصداقِ رحمانی خلافت ان سے ہے
کرتے ہیں اخلاق ادنیٰ اور اعلیٰ ان سے اخذ
آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت اُن سے ہے
ان میں قوموں کے ہیں مصلح ان میں ملکوں کے وکیل
آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت اُن سے ہے
پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں
ہے جہاں قوموں میں یک رنگی و وحدت ان سے ہے
دم سے ہے وابستہ ان کے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

io

گر نہ ہو ہر حال میں ان کی مصالح پر نظر
ہیں مفاسد گرد و پیش ان کے فراہم سربسر
کھیلتی ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں
ہے انہیں بھی شر سے یاں بچ بچ کے رہنا عمر بھر
گھاٹیاں فقر و غنا کی ان کے ہیں دونوں طرف
اور رستہ بیچ میں ہے بال سے باریک تر
ایک جانب پستیِ فطرت ہے اور دوں ہمتی
ایک جانب سستی و غفلت ہے اور کبر و بطر
جھک پڑے گر اس طرف تو مفت کھو بیٹھے انہیں
وہ جو اُڑنے کے لیے حق نے دیے تھے بال و پر
ڈھل گئے گر اُس طرف سو اس بلا میں پھنس گئے
جس میں پھنس جاتی ہے مکھی شہد میٹھا جان کر

برکتیں اللہ کی اس قوم پر جس قوم میں
رہ سپر یہ طبقۂ والا ہو سیدھی راہ پر
ہیں معطل اغنیا اور بے نوا کوتاہ دست
سب کی پڑتی ہے انھی کے دست و بازو پر نظر
جو قویٰ ان کو ملے ہیں کام میں لائیں انہیں
تا کہ زندوں کی طرح ہو زندگی ان کی بسر
فرض ہیں جو ان کے ذمے خالق اور مخلوق کے
اُن میں سرگرداں رہیں دیوانہ وار آٹھوں پہر
قوم ہو گر ناتواں تو تقویت بخشیں اسے
کیونکہ اس کے ضعف سے ہے ان کی قوت کو ضرر
گو نجات انساں کو مکروہاتِ دنیا سے نہیں
جن سے بچنا گوشت سے ناخن چھٹانا ہے، مگر
کام دنیا میں سنوارے ہیں جنھوں نے قوم کے
تھے نکموں سے وہ مکروہات میں آلودہ تر
سارے بھگتاتے تھے بائیں ہاتھ سے دنیا کے
کام
اور دائیں سے مہمیں قوم کی کرتے تھے سر
جس طرح اس انجمن کے رکن آئے ہیں تمام
قوم کی خاطر ہزاروں چھوڑ کر دنیا کے کام

io

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جاں آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی
اتفاق قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل

رائی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی

مال و دولت نامبارک ہے نہ ہو گر اتفاق
قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہے یہی

یاں وکیل ایک اک ہے شہر اور ملک کا قائم مقام
دانے کو کرتی ہے جو خرمن، وہ برکت ہے یہی

رائگاں جائے گا یاروں کا نہ یہ رنجِ سفر
راحتیں جس کی طفیلی ہیں وہ زحمت ہے یہی

فرد فرد آتے ہیں جو جاتے ہیں یاں سے مجتمع
ملتے ہیں جس کی بدولت دل وہ ملت ہے یہی

تم ہمارے کام آؤ، ہم تمہارے آئیں کام
جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی

قوم کی خدمت میں ہے مضمر ربوبیت کی شان
جو کہ پجواتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی

قوم کی ذلت کو سمجھیں ذلت اپنی سب عزیز
ملک میں عزت سے اب رہنے کی صورت ہے یہی

سال بھر رہتا ہے نقش اس انجمن کا یادگار
جو کبھی برہم نہیں ہوتی وہ صحبت ہے یہی

کر رہا ہے قوم کے سرکل اے کو یہ مجمع وسیع
جزر سے افزوں ہے مد جس کا وہ رجعت ہے یہی

اتفاقاً گر کبھی ہو جائے یہ ہنگامہ سرد
ڈر نہیں اس کا کہ خود قانونِ قدرت ہے یہی

ہے کبھی افراطِ باراں اور کبھی ہے قحطِ آب

طینتِ عالم میں خاصیت ودیعت ہے یہی
کال ہے گر اس برس تو ہے سماں اگلے برس
جو خبر دیتی ہے کثرت کی وہ قلت ہے یہی
دیگ تو پکنی ہے یہ پکے گی دھیمی آنچ میں
کچھ اُبال آیا تو ہے اس میں غنیمت ہے یہی
انجمن ہے قوم کی ہنگامۂ شادی نہیں
ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں [۲]

۱؎ Circle: دائرہ ۲؎ ترجمہ انگریزی ضرب المثل: Rome was not built in a day

5 ترکیب بند (''جشنِ قومی'') [۱]

(1892ء)

یہ خاک، آج جس پر ہیں جمع اہلِ آرا
یاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا
اس باغ میں بہاریں جو جو گزر چکی ہیں
آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا
کل جشنِ فتح تھا یاں، ہے آج جشنِ شادی

ہر دم عروج پر ہے اسلام کا ستارا

بلبن کے آج مہماں خاقاں ہیں اور سلاطیں
اصطخر ہے کہ دلی، بلبن ہے یا کہ دارا

فیروز شہ کی ہے کل ٹھٹھے سے آمد آمد
دولہا بنا ہوا ہے تزئیں سے شہر سارا

تغلق کا آج لشکر تیمور کے مقابل
بہرِ مدافعت ہے میدان میں صف آرا

ا۔ یہ نظم، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں سالانہ اجلاس میں بمقام دہلی پڑھی گئی۔ دیوان میں نظم کا عنوان درج نہیں۔ موضوع کی مناسبت سے یہ عنوان مرتب نے تجویز کیا ہے۔ (اس)

مغلوں کے اُڑ رہے ہیں گل جشنِ فتح و نصرت
تیمور سے زمانہ ہے برسرِ مدارا

کل سوریوں میں ہر سو بجتے ہیں شادیانے
مغلوں کا آ رہا ہے گردش میں کچھ ستارا

ہے جشنِ فتح پھر آج چغتائیوں میں برپا
اقبال نے ہے گویا مغلوں سے قول ہارا

جس دھوم سے ہے گھر گھر جشنِ جلوسِ اکبر
ہے گرد اس کے آگے جشنِ قباد و دارا

شاہِ جہاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا
تعمیر ہو چکے ہیں شہر و فصیل و بارا

تیاری اس خوشی میں جشنِ عظیم کی ہے
گویا کہ ہے جہاں میں جشنِ سدہ [1] دوبارا

اطرافِ ہند سے ہیں اعیانِ ملک آئے
پا کر حضورِ شہ سے سب جشن کا اشارا

ارکانِ سلطنت ہیں سب پائے تخت حاضر
بالائے تختِ طاؤس ہے شاہ جلوہ آرا

وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں
پر جشن اُن کے اب تک سب زیبِ داستان ہیں

io

ا۔ سدہ آگ کو کہتے ہیں۔ جشنِ سدہ وہ جشن ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے اول جمشید نے پتھر میں سے آگ نکلنے کی خوشی میں بڑی دھوم سے ایران میں کیا تھا۔'' (حاشیہ، دیوان حالی، طبع اول)

اے خاکِ پاکِ دہلی! اے تخت گاہ شاہاں!
پیشِ نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز و ساماں

ہنگامے اس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہر سو
پر کوئی جشنِ قومی آتا نہیں نظر یاں

تقریبِ جشن جس میں ہو کچھ نہ جز اخوّت
ملکوں سے جمع آ کر جس میں ہوئے ہوں اخواں

پائین و صدر کا ہو جس میں نہ کچھ تفاوت
خورد و بزرگ کی ہو جس میں نشست یکساں

جن کو نہ ہو بلاوا حاکم کا اور نہ قدغن
لایا ہو کھینچ کر دل ان کو، نہ حکمِ سلطاں

خادم ہوں جس قدر واں مخدوم قوم کے ہوں
مخدوم جتنے ہوں واں سب قوم پر ہوں قرباں

خاطر کسی سے چاہے کوئی نہ واں تواضع
ہوں خود ہی میزباں وہ اور خود ہی ہوں وہ مہماں

ٹھہرائیں جس کو چاہیں وہ آپ میرِ مجلس
چاہیں جنہیں بنائیں وہ آپ میرِ ساماں

آئے ہوں اس غرض سے سب مل کے تا کہ سوچیں
دنیا میں کس طرح ہوں سرسبز پھر مسلماں

ہندوستاں میں کیوں کر باقی رہے نشانی
اس قوم کی کہ تھا کل جن کے وہ زیرِ فرماں

نکلیں تو کیوں کہ نکلیں ذلت سے وہ گھرانے
اعزاز نے تھا باندھا جن کے بڑوں سے پیماں

ان مدرسوں کا کیوں کر جاری رہے افاضہ
جن کے سبب ہے زندہ نامِ حدیث و قرآں

جو مسجدیں ہیں بہرِ ذکرِ خدائے واحد
محفوظ حادثوں سے کیوں کر ہوں ان کے ارکاں

جو کچھ ہے بھائیوں کی تقدیر میں وہ سر پر
اپنی طرف سے لیکن ہے سعی فرضِ انساں

اے شہ نشینِ اسلام، اے معدنِ سلاطیں
اے پائے تختِ سادات، اے دارِ ملکِ مغلاں

تو جشن گاہِ شاہاں ہر عہد میں رہا ہے
ایسا بھی جشن کوئی تجھ میں کبھی ہوا ہے؟

io

شاہوں کے جشن تھے وہ، یہ جشن قوم کا ہے
شوکت میں وہ بڑے تھے، عظمت میں یہ بڑا ہے

دولت کے تھے وہ جلوے، ملت کا ہے یہ نقشہ
کاغذ کی تھیں وہ ناویں، بیڑا یہ نوح g کا ہے

بے روح تھے وہ قالب، ہے اس میں روح

خویش

موجِ سراب تھے وہ، یہ چشمۂ بقا ہے

میلے نہ وہ بچھڑتے روح ان میں گر یہ ہوتی

رہتا ہے آندھیوں میں روشن، یہ وہ دیا ہے

وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر

اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے

بس سلطنت یہی ہے مل بیٹھنا ہمارا

یہ چھت نہ سکھو سر پر یہ سایۂ ہما ہے

گم گشتہ بخت جس کو پھرتے ہیں ڈھونڈتے ہم

لگتا ہے کچھ تو اس کا لگتا یہیں پتا ہے

وہ مشکلیں کریں گے اب حل ہمی تمہی کچھ

جن مشکلوں کا ہم کو اور تم کو سامنا ہے

ہم میں اگر مخالف کچھ ہوں اس انجمن کے

معذور ہیں وہ اُن سے شکوہ نہ کچھ گلہ ہے

فوجِ کمک کو اکثر سمجھا ہے فوجِ دشمن

حملہ کمک پہ اپنی اپنوں نے خود کیا ہے

نادم ہوئے ہیں لیکن روشن ہوا ہے جب دن

انساں سے یہ ہمیشہ ہوتی رہی خطا ہے

قدر ایسی مجلسوں کی مدت میں ہوگی ہم کو

اب تک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے

ہوتی ہے قدر ان کی بنتی ہے جان پر جب

لاتے ہیں تب یہ ناویں جب بیڑا ڈوبتا ہے

گو سب جہاز والے خطرے سے بے خبر ہیں

پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا ہے

879

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر، روتا ہے ناخدا جب

io

گلشن میں فصلِ گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں
پر چیں سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں

طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں
اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچین و باغباں ہیں

غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی
بے فکر و بے خبر ہیں بوڑھے ہیں یا جواں ہیں

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کدھر ہے ان کا اور جا رہے کہاں ہیں

فضل و کمال ان کے کچھ تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو، اٹھتی جوانیاں ہیں

تم سے تھمے تو تھامو عزت کو قوم کی کچھ
اپنے تو قافلے سب پا در رکاب یاں ہیں

اک خضر رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے
رستے پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں

خدمت میں ان کی حالی کہتا ہے یہ ادب سے
اس وقت رونق افزا یاں جتنے مہرباں ہیں

دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں

عرصہ ہوا کہ ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں
قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکمراں ہیں

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

گھڑیال اور مگرمچھ، ہیں ان کو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

سنبھلو، وگرنہ رہنا یاں اس طرح پڑے گا
بھیل اور گونڈ جیسے گم نام و بے نشاں ہیں

یہ غفلتیں مبادا اب روزِ بد دکھائیں
دھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ نہ جائیں

io

6 صدائے گدایانِ قوم [۱]

ڈھونڈھنے خضرِ مبارک پے کو یاں آئے ہیں ہم
چھوڑ کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم

ڈر ہے جو خوش دل ہیں وہ سن کر نہ ہوں پژمردہ دل
سخت عبرت خیز لے کر داستاں آئے ہیں ہم

ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن
لے کے اس کا مژدۂ فصلِ خزاں آئے ہیں ہم [۲]

علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد نے [۳]

879

آج اس در پر اُسی کے نوحہ خواں آئے ہیں ہم

۱۔ ڈاکٹر شجاعت علی نے اس نظم کا سن تصنیف 1901ء بیان کیا ہے۔ (''حالی بحیثیت شاعر''، صفحہ 60)۔ ڈاکٹر غلام مصطفی خاں نے بھی 1901ء کی تصانیف کے ضمن میں اس نظم کا ذکر کیا ہے۔ (حالی کا ذہنی ارتقا، صفحہ 194) لیکن یہ نظم دیوان حالی، طبع اول (مطبوعہ 1893ء، صفحہ 209) میں موجود ہے۔ فاضل محققین کو اس لیے تسامح ہوا کہ ''گدایانِ قوم'' کے عنوان سے 165 اشعار کی ایک مثنوی حالی نے 1901ء میں لکھی تھی۔ چنانچہ یہ دونوں نظمیں ایک ہی جماعت ''گدایانِ قوم'' سے منسوب کی گئیں۔ حالانکہ دوسری نظم کا کوئی تعلق پنجاب کی اُس ''اسلامی انجمن'' سے نہیں ہے جس کے لیے ''صدائے گدایانِ قوم'' لکھی گئی۔

مولانا حالی اس نظم کے حاشیے میں لکھتے ہیں: ''پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی طرف سے چند باہمت لوگوں نے جنہوں نے اپنی جماعت کا نام 'گدایانِ قوم' رکھا ہے، ریاست بہاول پور کے لوگوں سے چندہ وصول کرنے کے لیے جانے کا ارادہ کیا تھا۔ اُن کا قصد رئیس کے حضور میں یہ اشعار پڑھنے کا تھا لیکن غالباً جانا نہیں ہوا۔'' (اص)

۲۔ دیوان کے ہر نسخے میں یہ مصرع اسی طرح ہے لیکن لفظ ''مژدہ'' محلِ نظر ہے۔

۳۔ ''چونکہ رئیس بہاول پور بنی عباس میں سے ہیں اور عباسیوں کی خلافت میں علم کو بہت ترقی ہوئی تھی، اس لیے یہ مضمون اس طرح ادا کیا گیا۔'' (حالی)

قوم کھو بیٹھی ہے جو عباسیوں کی یادگار
جستجو میں اس کی مشعل لے کے یاں آئے ہیں ہم

تا کہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا
اس لیے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم

خودغرض ٹھہرائیں یا مکار ہم کو یا گدا
ذلتیں یہ کر کے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم

فخر سب بے جا ہیں اُن کے، قوم ہے جن کی ذلیل
فخر و عزت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم

ہے بنی ہاشم کی مہماں پروری ضرب المثل
اس لیے یاں بن بلائے میہماں آئے ہیں ہم

تشنگی اپنی بجھانی ہو گی اے آبِ حیات!

لے کے منہ میں قوم کی سوکھی زباں آئے ہیں ہم

io

7 حاضرینِ کانفرنس سے خطاب

اے خاصگانِ ملت و اے یاورانِ قوم!
اے زمرۂ معارف و اے طبقۂ کرام!
بندھتی ہے بہتری کی تمھیں دیکھ کر اُمید
ورنہ دلوں پہ چھائی ہیں مایوسیاں تمام
تم آ کے مردہ قوم میں دیتے ہو جان ڈال

ورنہ تمام اس کا بس اب ہو چکا ہے کام
قومی خوشی کے ہیں یہی گویا کہ چار دن
پھر سال بھر وہی غم و اندوہ صبح و شام
جس جوش میں کہ آتے ہو یاں دور دور سے
گر سال بھر رہے یونہی اس جوش کو قیام
پھر جائیں دن یقیں ہے بہت جلد قوم کے
پا جائیں جلد قوم کے سب زخم التیام
دعوے یہ حبِ قوم کے سب بے دلیل ہیں
جب تک نہ کر کے ہاتھ سے دکھلاؤ کوئی کام
میلہ نہ سمجھو، جلسۂ قومی ہے دوستو
آنا ہے دل لگی کی غرض سے جہاں حرام
سیّد کو دو سہارا کہ غفلت سے قوم کی
اب تک پڑے ہیں کام بہت اس کے ناتمام
سر اپنے دھر لیا ہے اُسے ایک فرد نے
ہے یارو چھے کروڑ کے کرنے کا جو کہ کام
انصاف سے بعید ہے ساتھ اس کا چھوڑنا
گھلتا تمہاری فکر میں ہے جو کہ صبح و شام
خواہش ہے جس کی یہ کہ ہو دنیا میں تم عزیز
جو چاہتا ہے یہ کہ رہو تم بہ احترام
عزت تمہاری دیکھ کے بڑھتا ہے جس کا خوں
جو تم کو شاد دیکھ کے ہوتا ہے شاد کام
خدمت میں قوم کی جسے ''کافر'' لقب ملا

پشتی میں پایا دین کی ''بے دین'' جس نے نام
پر سر سے اُس کے قوم کا سودا نہ کم ہوا
سب کچھ سنا پہ کام کا چھوڑا نہ التزام
بڑھتا گیا دم اُس کا ہوئی جس قدر لتاڑ
کوڑے تھے حق میں اس کے وہ سب طعنہ و ملام
ہے اک چراغِ آخرِ شب ٹمٹما رہا
یہ بجھ گیا تو بزم ہے تاریک پھر تمام
ایسا نمونہ جب کہ ہو آنکھوں کے سامنے
پھر حیف ہے کہ ہو نہ سکے تم سے کوئی کام
کرنا ہے کچھ تو کر لو کہ باقی ہے وقت ابھی
پھر آگے دانت پیسنے کے دن ہیں، والسلام

io

8 علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے؟

یہ کالج قوم کو آپ اپنے بل چلنا سکھاتا ہے
سہارا غیر کا چھوڑیں یہ ایک اک کو بجھاتا ہے
نہ چھوڑیں دین کا دامن، رہیں دنیا میں عزت سے
سبق سب قوم کے بچوں کو یہ دونوں پڑھاتا ہے
نہیں پاتا کبھی عزت کی خواہش سے کوئی عزت
معزز کس طرح بنتے ہیں؟ گر اُس کے بتاتا ہے
خدا نے کر دیا ہے حکمراں جس قوم کو ہم پر
خلوص اور دوستی اُس قوم کی دل میں بٹھاتا ہے

رعیت کو برابر حق دیے ہیں جو حکومت نے
طلب سے پہلے اُن کا مستحق بننا بتاتا ہے

زمانہ قوم نے غفلت میں جو پہلے گزارا ہے
ڈرانی صورتوں میں بار بار اس کو دکھاتا ہے

یہ باہم مذہبی فرقوں کو ہے شیر و شکر کرتا
یہ روٹھوں کو مناتا ہے، یہ بچھڑوں کو ملاتا ہے

کھلاتا ہے یہ کھانا ایک دسترخوان پر سب کو
نمازیں پنجگانہ ایک مسجد میں پڑھاتا ہے

وفا کا بیج بوتا ہے، تعصب دل سے کھوتا ہے
مسلمانوں کو گڈ سجکٹ [1] بننا یہ سکھاتا ہے

نہ چھوڑے گا یہ باقی قوم میں دیکھے گا جو خامی
خدا کی برکتیں اُن پر جو اس کالج کے ہیں حامی

---

[1] Good Subject: اچھی رعایا

9 شکریہ حضور نظام

یہ اک میدان تھا سنسان، وحشت جس پہ تھی چھائی
نہ سایہ تھا درختوں کا، نہ یہ پانی کی سرسائی

مکیں ہوتا اگر کوئی تو یاں کوئی مکاں ہوتا
پڑے تھے کچھ کھنڈر، جن پر جمی تھی جابجا کائی

خبر کس کو تھی برپا ہوگا اک دارالعلوم اس جا
زمیں پر جس کو حیرت سے تکے گا چرخِ مینائی

جسے دیکھیں گے اعیان و ملوک آ کر تمنا سے
جہاں آفاق سے سیکھیں گے آ کر علم و دانائی

یہ تھی اُمید کس کو پر خدا نے اپنی قدرت کا

دیا جلوہ دکھا، ہے جس کا اک عالم تماشائی
نہ تھی خود قوم راضی اور مخالف اک زمانہ تھا
گھٹا مایوسیوں کی بانیوں کے دل پہ تھی چھائی
مگر سید کے استقلال نے منوا دیا سب کو
کہ پربت ہو تو ہو جاتا ہے استقلال سے رائی
رعیت نے مدد کی سلطنت نے سرپرستی کی
بہت جلد اپنی نادانی سے آخر قوم پچھتائی
مگر سچ پوچھیے تو قالب بے روح تھا کالج
نہ کی ہوتی اگر سرکار عالی نے مسیحائی
جب آئی پیش مشکل، جب پڑا کالج پہ وقت آ کر
مدد پر کی مدد، امداد پر امداد فرمائی
رہے گا قوم میں تعلیم کا باقی نشاں جب تک
رہیں گے شکرِ آصف جاہ میں رطب اللساں تب تک

io

0شکریہ والیِ رام پور [1]

صاحبو! سمجھو نہ اس جلسے کو ہرگز سرسری
ہیں مرادیں اور اُمیدیں کوٹ کوٹ اس میں
بھری
جب تک اس جھاڑو کی سینکوں کا کوئی بندھن نہ تھا

جہل سے لڑنے کو تھی اک فوج لیکن بے سری

اہلِ ملک و جاہ جو ہیں قوم کی اُمیدگاہ
سب نظر آتے تھے ہمدردی کی تہمت سے بری

دور ہی دور ابر دریا دل برستا تھا سدا
قوم کی کھیتی نظر آتی نہ تھی ہوتی ہری

ا۔ یہ نظم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھویں اجلاس (منعقدہ رام پور، دسمبر 1900ء) کے لیے لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر شجاعت علی نے اس کا سنہ تصنیف 1901ع بیان کیا ہے (حالی بحیثیت شاعر۔صفحہ 90) ڈاکٹر غلام مصطفی خاں نے بھی یہی سنہ درج فرمایا ہے۔ (حالی کا ذہنی ارتقا،صفحہ 197) لیکن ایجوکیشنل کانفرنس کا مذکورۂ بالا اجلاس 27 تا30 دسمبر 1900ء کو رام پور میں منعقد ہوا تھا۔ (ملاحظہ ہو روداد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بابت چودھواں اجلاس 1900ء۔مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ)۔ یہ نظم سب سے پہلے رسالہ معارف، پانی پت، بابت ماہ دسمبر 1900ع (جلد: ۳، شمارہ: ۲) میں شائع ہوئی تھی۔ مولوی سلیم پانی پتی (مدیر معارف) اس نظم کے تعارفی نوٹ میں لکھتے ہیں: ''یہ وہ بے نظیر اور فصیح و بلیغ نظم ہے جو ہماری قوم کے ملک الشعرا مولانا خواجہ الطاف حسین حالی نے رام پور کی کانفرنس کے لیے تیار کی تھی مگر کسی وجہ سے ناتمام رہ گئی تھی۔ کانفرنس کے آخری دن یعنی 30 دسمبر 1900ء کو عالم باغ میں وایونگ پارٹی ہز ہائینس نواب صاحب والیٔ ریاست رام پور کی طرف سے ممبران کانفرنس کو دی گئی تھی، اس میں حاضرین جلسہ کے بے حد اصرار کرنے سے مولانا نے یہ نظم ناتمام پڑھ دی تھی......'' (رسالہ معارف، بابت ماہ دسمبر 1900ء، صفحہ 161)

سر میں کچھ سودا تھا جن کے قوم کی تعلیم کا
تھیں فقط دینے کو ان کے پاس اسپیچیں نری

گو فصاحت اور بلاغت ان کی تھی ضرب المثل
گو کہ اسپیچیں تھیں اُن کی سربسر جادو بھری

سننے والوں پر مگر چلتا نہ تھا اُن کا فسوں
کوئی کافر جانتا تھا اُن کو، کوئی نیچری

قوم کی تعلیم کا عقدہ تھا لاینحل ہوا
پیش جاتی تھی نہ کچھ تدبیر کی کاریگری

جان و دل ہز ہائینس حامد علی خاں پر نثار
جو ہوا ہے اک متاعِ کس مخر کا مشتری

آج سے وہ سب مسلمانوں کے سر کا تاج ہے
دے رہی ہے یہ شہادت قوم کی مجلس بھری

جان لی ہے قوم کی اُس نے اگر درماندگی
مان لی ہے قوم نے بھی دل سے اس کی سروری

پہلے سر جھکتے تھے در پر اس کے، اب دل جھک گئے
شہریاری ہے وہی جس میں ہو شانِ دلبری

ایسے کچھ خوش خوش نظر آتے ہیں آج افرادِ قوم
مل گئی گویا سلیماں کی انہیں انگشتری

آج کا جلسہ ہے حق میں قوم کے اک نیک فال
موج زن جس دل میں دیکھو ہے اُمیدِ بہتری

اتفاق اور ایسے پیش آ جائیں گر دو چار اب
قوم کی تعلیم کا ہوتا ہے بیڑا پار اب

io

لی ہے کروٹ ایک مدت سے زمانے نے بدل
راس تھا اگلوں کو جو موسم، گیا کب کا نکل

جو تمدن کی عمارت تھے، گئے اسلاف چھوڑ
آ گیا ہے اس کی بنیادوں میں سر تا سر خلل

کام کے ہیں اب نہ دنیا میں ہنر اُن کے، نہ فن
اور بکار آمد زمانے میں ہے کس اُن کا نہ بل

ہیں نئی رسمیں، نئے آئیں، نئی ہے چال ڈھال
اور نئے علم و ہنر کا ہے جدھر دیکھو عمل

ہے نئی گویا زمیں، ہے آسماں گویا نیا
کینچلی گویا کہ لی ہے زالِ دنیا نے بدل

بڑھ رہے ہیں جو ہوا کا رخ ہیں یاں پہچانتے
مل رہے ہیں اپنی دور اندیشیوں کے ان کو پھل

مٹ رہے ہیں جو ہیں اپنی آن پر مچلے ہوئے
آج گزری خیریت سے تو نہیں خیر ان کی کل

ساتھ انہیں دینا پڑے گا یاں زمانے کا ضرور
ورنہ رہنا ہو گا دنیا میں بحالِ مبتذل

زندگی ہے قوم کی اب منحصر تعلیم پر
ورنہ سن لو قوم کی نزدیک آ پہنچی اجل

سلطنت ہو یا ریاست، قوم ہو یا خانداں
جو نہیں تعلیم پر مائل، وہ سب جائیں سنبھل

جس کو کہتے ہیں زمانہ، ہے وہ شانِ کبریا
اُس کے وعدے ہیں اٹل، اس کی وعیدیں ہیں اٹل

جو چلے منزل گہِ دنیا میں چال اس کے خلاف
رفتہ رفتہ اس کی چالوں نے دیا ان کو کچل

ہاتھ ملتی ہیں وہ قومیں اپنی نادانی پہ آج
ہاتھ سے جن کے گیا، تعلیم کا پہلو نکل

جب یہ حالت ہے تو بتلاؤ کہ کیا کرنا ہے اب
ملک میں عزت سے جینا ہے کہ بس مرنا ہے اب

io

یاد ہے اے رام پور اپنا تجھے عہدِ کہن
جب کہ تھا ایک اک جواں یاں رشکِ گیو و تہمتن

خاک سے سانونت اُگتے تھے تری اور سورما

879

تیری یہ بانسی نہ تھی گویا کہ تھا شیروں کا بن

معرکوں سے اُن کے رنگیں ہیں ورق تاریخ کے
شاد سے جن کو بھلا سکتا نہیں طولِ زمن

پر وہ اب دم خم رہا تجھ میں، نہ وہ کس بل رہا
کر دیے گردش نے دوراں کی نشے سارے ہرن

ملک سے رخصت ہوئے دن جنگ اور پیکار کے
لے لیا فتنوں سے ہجرت کا زمانے نے چلن

شیر بکری آج کل پیتے ہیں پانی ایک گھاٹ
چین سے ہیں پاؤں سب پھیلا کے سوتے مرد و زن

عام ہے اس عہد فرخ فال میں امن و اماں
شرق سے تا غرب اور اُتر سے لے کر تا دکن

پر دلیروں کے لیے میدان خالی ہیں بہت
گر سلف کا اُن کے دل گردوں میں کچھ باقی ہے کن

اک قوی دشمن کا ہے درپیش اُن کو سامنا
جس کی روندن میں ہزاروں ہو گئے ویراں چمن

روک دی دریا کی رو حملے سے جو اُس کے بچا
کر دیا پربت کو رائی جس نے جیتا اُس سے رن

نام ہے اس کا تعصب اور جہالت ہے لقب
کج روی کا ہے وہ رہبر، راستی کا راہ زن

یہ وہ دشمن ہے کہ غالب آ گیا جس قوم پر
ہو گئی وہ قوم آنکھوں دیکھتے زیر و زبر

io

سہل مت سمجھو تعصب کو بری ہے یہ بلا
کر دیا ہے اس نے قوموں اور گھرانوں کو فنا

حکم ہے اس کا کہ فاقہ ہے تو فاقے میں مرو
اور جو ذلت ہے تو ذلت پر رہو قانع سدا

حکم ہے اس کا کہ کوئی قوم جس حالت میں ہے
بس وہی ہے اس کی عزت اور شرف کی انتہا

باپ دادا جو گئے ہیں چھوڑ یاں رسم و رواج
ناخلف ہے ایک انچ اُس سے اگر آگے بڑھا

آدم و حوا نے گر پتوں سے ڈھانکا تھا بدن
نسل میں اُن کی وہی پوشش رہے جاری سدا

نوح کی کشتی میں تختے تھے اگر ان گھڑ لگے
ہوں جہاز اب بھی اسی کینڈے کے بے چون و چرا

آدمی کا گھر ہو ایسا ہی پرانی چال کا
لومڑی کا جیسے بھٹ ہے اور بئے کا گھونسلا

ایک کا نام آدمی ہو، ایک کا ہو جانور
آدمی اور جانور میں ہو نہ فرق اس کے سوا

باپ دادا کے لیے بیٹھے ہو کیا رسم و رواج
وہ گئے اور دم کے ساتھ اُن کا دمامہ بھی گیا

دیکھو تم گرتے چلے جاتے ہو پستی کی طرف
آگے آتا ہے گڑھا، بعد اس کے ہے تحت الثریٰ

گر کرو زیر ایسے دشمن کو تو ہے مردانگی
جو ابھرنے کی نہیں دیتا تمھیں پروانگی

iO

اے گدایانِ قوم!

(1901ء)

جن کو ہے حب الوطنی کا خیال

بحث میں لاتے ہیں یہ اکثر سوال

مانگتے پھرتے ہیں جو اکثر گدا

دینا ہے کچھ ان کو بھلا یا برا؟

فرقہ ہے ''کنسر ویٹو'' ۲؎ اُن میں جو ایک

کہتا ہے دینا ہے بہرحال نیک

مانگنے کی گو کہ ہے عادت بری

اس سے بھی ہے بخل کی خصلت بری

رد نہ سوالِ فقرا کیجیے

جان بھی مانگیں تو فدا کیجیے

داد و دہش کے ہیں نتائج بڑے

اہلِ سخا کے ہیں مدارج بڑے

۱؎ ڈاکٹر شجاعت علی، حالی کی نظم ''صدائے گدایانِ قوم'' اور ''گدایانِ قوم'' کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ دونوں نظمیں مولانا نے پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی جماعت گدایانِ قوم کے لیے لکھی تھیں۔'' (حالی بحیثیت شاعر، صفحہ 90) لیکن یہ نظم پنجاب کی اسلامی انجمن (حمایت اسلام) کی جماعت ''گدایانِ قوم'' سے متعلق نہیں بلکہ 1901ء میں مدرسۂ طبیہ دہلی کا ایک وفد علی گڑھ آیا تھا، اسی سلسلے میں ایک جلسے کے لیے یہ نظم لکھی گئی تھی۔ چنانچہ نظم کے آخری حصے میں طب یونانی کے فروغ کی ترغیب دی گئی ہے۔ (اس)

۲؎ Conservative: قدامت پسند

خیر کے کام آج جنھوں نے کیے

کوثر و جنت ہے کل اُن کے لیے

اُن کے لیے وقف ہے دارالسلام

اُن کا ہے فردوس میں اعلیٰ مقام

پر ''لبرل'' ۱؎ کی ہے خلاف اُن کے رائے

جس میں بہ ظاہر نہیں حجت کی جائے

کہتے ہیں وہ، دیتے ہیں سائل کو جو

879

دونوں جہاں سے اُسے دیتے ہیں کھو
رہتا ہے دنیا کا ، نہ وہ دین کا
شرع کا پابند، نہ آئین کا
اس کو نہ غیرت، نہ حمیّت ہے کچھ
اور نہ ڈھٹائی سے ندامت ہے کچھ
قوتیں جو اس کو ہوئی تھیں عطا
سب کو دیا خاک میں اُس نے ملا
جانتا ہے مانگنے کو ہے زباں
''دعوت'' کی صدا سننے کی خاطر ہیں کاں
سونگھنے کو ناک ہے بوے طعام
دیکھنے کو آنکھ ہے خوانِ کرام
پاؤں ہیں پھرتے کے لیے در بدر
جوڑنے کو ہاتھ ہیں پیشِ بشر
دیتے ہیں جو بھیک انہیں صبح و شام
وہ کوئی نیکی کا نہیں کرتے کام
جو کہ سوال اُن کا نہیں کرتے رد
ملک میں پھیلاتے ہیں اخلاق بد

ا۔ Liberal: آزادخیال

مانگنا خود اُن کو سکھاتے ہیں وہ
حوصلہ دے دے کے بڑھاتے ہیں وہ
بعضوں کو اس بات میں یاں تک ہے کد
روکیے قانون سے یہ رسمِ بد
کیجیے سرکار سے فریاد و داد
تاکہ کرے مانگنے کا انسداد

ایسا وہ قانون بنائے کوئی
بھیک نہ پھر مانگنے پائے کوئی

ہے لبرل کی یہی کوشش اگر
لائے گی آخر کو یہ کوشش ثمر

ایک دن ایسا بھی ضرور آئے گا
مانگنا اک جرم ٹھہر جائے گا

مانگتے پھرتے ہیں جو اب در بدر
آئے گی پرچھائیں نہ اُن کی نظر

ہے مگر اک فرقہ سوا ان کے اور
مانگنے کے جن کے نرالے ہیں طور

جتنے بھکاری کہ ہیں نزدیک و دور
کان پکڑتے ہیں سب اُن کے حضور

چور رہیں اُن سے اچھوتے، نہ ساہ
مانگتا ہے اُن سے زمانہ پناہ

مل کے صدا سارے لگاتے ہیں جب
اُنگلیاں دے لیتے ہیں کانوں میں سب

وضع اگر دیکھیے تو سربسر
آتے ہیں خاصے بھلے مانس نظر

شکلیں ثقہ، داڑھیاں اکثر سفید
باتیں موثر کہ کریں دل میں چھید

ہے کوئی شمس العلماء، کوئی سر
خان بہادر ہے، کوئی ڈاکٹر

ملک کا مشہور ہے محسن کوئی
کوئی مسن ہے تو ہے کم سن کوئی

ہے کوئی شاعر تو ہے کوئی حکیم
رکھتا ہے دیکھو جسے شانِ عظیم

جن کے یہ درجے ہیں، یہ رتبے، یہ شان
جوگیوں کے کترے انہوں نے ہیں کان

در پہ الکھ آ کے جگاتے ہیں جب
سن کے گھروں سے نکل آتے ہیں سب

مانگنے پر پھر جو اُترتے ہیں شیر
ہوتے ہیں لاکھوں نہ ہزاروں سے سیر

ایسوں کو بتلاؤ بھلا دیجے کیا؟
دیجے تو پھر اس کے عوض لیجے کیا؟

دیتے ہیں مسکین کو خیرات جب
دیتے ہیں اُمید پہ عقبیٰ کی سب

ایک اگر دیتا ہے انسان یاں
رکھتا ہے ہفتاد کی اُمید واں

پر یہ دلاتے نہیں کوئی اُمید
دیتے بشارت ہیں، نہ کوئی نوید

وعدۂ عقبیٰ نہیں کرتے کبھی
خلد کی ہامی نہیں بھرتے کبھی

کہتے ہیں یہ صاف بہ صد شد و مد
ہے وہ بَج جس میں ہو داد وستد

کہتے ہیں دینے سے رکھو کام تم
لینے کا زنہار نہ لو نام تم

داد و دہش ورنہ اکارت ہے یہ
یہ نہیں خیرات، تجارت ہے یہ

ہیں یہ دلیلیں مگر اُن کی فضول
نیچریوں کے سے ہیں سارے اصول

ہم انہیں معقول نہیں جانتے
ایسی دلیلوں کو نہیں مانتے

پر نہیں اک بات کا ان کی جواب
سن کے جسے زہرہ ہو پتھر کا آب

کہتے ہیں انسان اٹھاتا ہے جو
اپنے حوائج میں زر و سیم کو

اس کی ہو عقبیٰ میں اگر کچھ جزا
قوم کی امداد کا بھی ہو صلہ

کھانے کی ہے جیسے ضرورت اُسے
پانی کی جس طرح ہے حاجت اُسے

چاہیے جس طرح کہ رہنے کو گھر
زادِ سفر چاہیے بہرِ سفر

چاہیے نفقہ پئے فرزند و زن
چاہیے آرام پئے جان و تن

فرض اسی طرح ہے امدادِ قوم
یاد خدا پہلے ہے، پھر یادِ قوم

کہتے ہیں دنیا سے ہے جب تک لگاؤ
دل میں بشر کے ہے اُمنگ اور چاؤ

بھاگتے جب تک کہ ہیں ذلت سے سب
رہنا ہیں یاں چاہتے عزت سے سب

جب تلک انساں میں ہے غیرت کی شان

پُتلے میں اس خاک کے باقی ہے آن

قوم کی طاقت کا بڑھانا ہے فرض
قوم کا قرضہ یہ چکانا ہے فرض

فرض یہ محسوس ہوا ہے جنہیں
کل نہیں اس فرض سے دم بھر انہیں

قوم کی رفعت کے ہیں طالب سدا
ہو سکے تو اس کو اُدھر لیں اٹھا

جانتے ہیں اپنی یہی برتری
قوم کی کوئی نہ کرے ہم سری

اپنی سمجھتے ہیں بڑائی یہی
قوم ہو آفاق میں اُن کی بڑی

قوم شریک اُن کی کمائی میں ہے
قوم کی جیت اُن کی بھلائی میں ہے

اُن کی ہر اک راہ میں ساتھی ہے قوم
جان میں اور مال میں ساجھی ہے قوم

رکھتے ہیں سب پیر ہوں یا ہوں جواں
قوم کی ایک ایک ضرورت کا دھیاں

تاکہ رہے یاد زمانِ سلف
مٹنے نہیں دیتے نشانِ سلف

مردہ زبانوں کو جلاتے ہیں وہ

خفتہ طبابت کو جگاتے ہیں وہ

ہم کہ زبانیں ہیں ہماری تمام
زندہ، جنہیں بولتے ہیں خاص و عام

پر ہمیں پروا نہیں اُن کی ذرا
دے کوئی دنیا سے گر ان کو مٹا

زندہ طبابت ہے ہماری ابھی
فیض کا چشمہ ہے یہ جاری ابھی

ہند میں اسلام کی ہے یادگار
اُس کا ہے پبلک میں وہی اعتبار

ملک میں ہے اس کی ضرورت بہت
قوم کو ہے اس سے عقیدت بہت

جانتے ہیں اس کو پسندیدہ سب
اُس کے علاجوں کے ہیں گرویدہ سب

یہ بھی ہے معلوم کہ دنیا میں آج
سب سے سوا ہم میں ہے اس کا رواج

اس کے مصنف ہیں مسلماں تمام
غیر کا تم اُن میں نہ پاؤ گے نام

اس نے جنم خواہ کہیں ہو لیا
پرورش اسلام نے اس کو کیا

عہد سے عباسیوں کے آج تک

فن یہ ہمارا تھا نہیں اس میں شک
پر نظر آتی نہیں اب اس کی خیر
روز بروز اس کا ہے اب حال غیر
جاتا ہمارے ہی نہیں ہاتھ سے
ڈر ہے کہ دنیا سے نہ وہ چل بسے
حاذق الملک [1] اس کا مربی تھا جو
کنجِ لحد میں وہ رہا جا کے سو
اب نہ رہا اس کا سہارا کوئی
اُس کے چمن کا چمن آرا کوئی
چاہیے اب قوم سنبھالے اُسے
نزع کی حالت سے نکالے اُسے
طب کو گر اپنی نہ سنبھالیں گے ہم
اک بڑی دولت کو گنوا دیں گے ہم

io

---

[1] حاذق الملک سے مراد حکیم عبدالمجید خاں صاحب، بانی مدرسۂ طبیہ دہلی

@ تحفۃ الاخوان [1]

(1902ء)

دوستو! انکار اگر تم کو بداہت کا نہیں
عالمِ اسباب ہے دنیا، اسے جانو یقیں

کاہ سے لے کوہ تک، ذرے سے لے تا آفتاب
سب کو ہے جکڑے ہوئے اسباب کی حبل المتیں

اک مرتب سلسلہ پاؤ گے تم اسباب کا
دشت میں پتّا کھڑکتا تم اگر دیکھو کہیں

یوں خدا چاہے تو لے اسباب کی تاثیر چھین
لیکن اس قیومِ بے ہمتا کی یہ عادت نہیں

بھاپ اٹھے گی سمندر سے تو اُمڈے گی گھٹا
آسماں برسے گا جب، اُگلے گی دولت تب زمیں

ہے یہی قانون محکم مالکِ مختار کا
جو کہ سطحِ خاک سے نافذ ہے تا چرخِ بریں

ا۔ مولانا حالی نے یہ نظم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سولہویں سالانہ جلسے کے چھٹے اجلاس میں جو 2 جنوری 1903ء کو منعقد ہوا تھا، پڑھی تھی۔ ڈاکٹر غلام مصطفی لکھتے ہیں: ''شروع دسمبر میں کانفرنس کے لیے مولانا نے نظم لکھنی شروع کی تھی لیکن انہی دنوں ان کی صحت نے جواب دیا اور مختلف شکایتیں پیدا ہو گئیں...... تاہم کسی صورت سے وہ نظم پوری کی...... جو کانفرنس کے اجلاس میں پڑھی گئی۔'' (حالی کا ذہنی ارتقا۔ صفحہ 200) شیخ محمد اسماعیل لکھتے ہیں:
''اس نظم کے سنتے ہی ساری محفل مجلس عزا بن گئی...... نظم کے مسودے کو نیلام کیا گیا جو 201 روپے پر چھٹا۔''
(کلیاتِ نظمِ حالی، جلد دوم، صفحہ 97)

وہ یہی قانون ہے جس سے لگا لیتے ہیں کھوج
وقت سے پہلے ہر اک انجام کا انجام بیں

جان لیتے ہیں کہ جس گھر کی ہے پانی پر بنا
کوئی دن میں وہ رہے گا ہو کے پیوندِ زمیں

بس کہ ہے اُن کو قوانینِ الٰہی پر وثوق
اس لیے رکھتے ہیں اپنی پیش گوئی پر یقیں

دیکھتے ہیں روشنی وہ دن کی جب جاتی ہوئی
اُن کو آنکھوں سے نظر آتی ہے رات آتی ہوئی

io

جب کہ قانونِ الٰہی کا یہ ٹھہرا مقتضا
وہ رہے گا ہو کے جو ہے مقتضا اسباب کا

دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس قوم کا ہوتا ہے حال
شاہراہِ عام سے ہے جس کی پگڈنڈی جدا

ساری قومیں دے رہی ہیں وقت کا ساتھ آج
کل
اور ان کی چڑ ہے وہ جو وقت کا ہے مقتضا

ہیں رواں تیراک سب دریا کی رو کے ساتھ ساتھ
اور انہیں کد ہے کہ دیں دریا کی رو الٹی بہا

اور اپنے اپنے جوہر ہیں جہاں دکھلا رہے
یہ دکھاتے پھرتے ہیں جوہر سلف کے جا بہ جا

اور قومیں ہیں جہاں مال تجارت بیچتی
یہ وہاں گھر بار کے کرتے ہیں کوڑے برملا

جتنے ہیں اوروں میں کھاؤ، اتنے ہی واں ہیں کماؤ
یاں کماؤ ایک ہے تو کھانے والا قافلا

اور مفلس ہوں تو روزی کو پھریں کرتے تلاش
یہ جو مفلس ہوں تو قسمت کا پھریں کرتے گلا

اور ہیں سب سود لینے میں، یہ دینے میں دلیر
اور ہیں سب لوٹنے پر، یہ لٹانے پر فدا

جب کوئی اوروں میں ہو جاتا ہے دولت سے نہال
اپنی نسلوں میں وہ جڑ دولت کی جاتا ہے جما

اور تنگی سے گزارا کرتے ہیں آج اس لیے
تا کہ غیروں کی نہ کل کرنی پڑے کچھ التجا

یاں گیا بلی کے بھاگوں ٹوٹ اگر چھینکا کہیں
پڑ گئی پشتوں تلک واں فاقہ مستوں کی بنا

زندگی جس قوم کی دنیا میں گزرے اس طرح
وہ رہے گی قوم دنیا میں بتاؤ کس طرح

io

نیند غفلت کی ہے سر تاپا مسلط قوم پر
سب کی آنکھیں ہیں کھلی، سوتے ہیں لیکن بے خبر

مصر کی ممیاں ہیں سب گویا نہیں جن میں حیات
گو کہ جیتے جاگتے آتے ہیں ظاہر میں نظر

خاندانوں کو رہا ہے میٹ دورِ روزگار
آج بگڑا یہ گھرانا اور کل اُجڑا وہ گھر

پر نگاہِ بد کی جو زد میں نہیں آئے ابھی
جانتے ہیں دورِ گردوں کا نہیں ہم تک گزر

بھیڑیا نوبت بہ نوبت گوسفندوں کو شکار
کر رہا ہے اور نہیں کچھ گوسفندوں کو خبر

ہم جو بنتے ہیں بھی تو اکثر بگڑنے کے لیے
گرتے ہیں بانسوں، اُچھلتے ہیں اگر بالشت بھر

قوم کو اپنے تنزل سے اُبھرنے کی اُمید
اہلِ علم و اہلِ دولت سے بہت کچھ تھی مگر

اہلِ دولت کا ہے اس عالم سے اک عالم جدا
عالمِ بالا سے بھی ہے جو کئی منزل اُدھر

جن دعاؤں کی پہنچ ہے عالمِ بالا تلک
اُن دعاؤں کا نہیں ڈیوڑھی تلک اُن کی گزر

اب رہے عالم تو ہو دنیا کی فکر اُن کو کہاں
دین کا پھر کون ہے دنیا میں وہ اُلجھیں اگر

کون جا کر چین میں پھر دین کی دعوت کرے
کون گم راہوں کی لے جاپان میں جا کر خبر

حجتِ حق کون لندن میں کرے جا کر تمام
کون برلن میں کرے تبلیغِ قرآن و خبر

کون ہے ان کے سوا اسلام کے فرقوں کو جو
مل کے آپس میں نہ ہونے دے کبھی شیر و شکر

اُن کی غفلت کا یہ عالم، ان کی فرصت کا یہ حال
ہو یہ بیڑا کیوں نہ پھر منجدھار میں زیر و زبر

ہیں یہی گر قوم کے ساتھ آج بے پروائیاں
تو یہ سن لو غافلو کل ہیں کھڑی رسوائیاں

io

پڑ رہی ہے چار سُو دوڑ و بڑھو کی یاں پکار
نیند کے ماتو! نہیں اب وقتِ غفلت، ہوشیار!

ہو رہی ہے عرصۂ آفاق میں قوموں کی دوڑ
بڑھ رہے ہے پیادوں سے پیادے ہیں سواروں سے سوار

تھوڑی تھوڑی غفلتوں پر ہو رہی ہیں بازیاں
چال چوکا اور ہوئی گردن پہ ہار آ کر سوار

پولو اور گھڑ دوڑ کی سمجھو نہ ہار اس ہار کو
جو یہاں ہارا، ہوئی ذلت گلے کا اس کے ہار

قوم جو اس دوڑ میں ہاری، اسے سمجھو کہ وہ
ہو گئی زور آزمائی کا حریفوں کی شکار

سایے میں برگد کے جیسے جل کے رہ جاتی ہے گھاس
زورمندوں میں یونہی ہوتی ہے مٹی اس کی خوار

حق ہے غالب کا کہ کچلے اور دلے مغلوب کو
ہے یہی مغلوب ہونے کا مآلِ انجام کار

کرتے آئے ہیں سب اپنی اپنی باری میں یہی
اور یہی جاری رہے گا دور تا روزِ شمار

قوم کا درجے سے گر جانا ہے اپنے وہ گناہ
مرتکب جس کا نہیں بچتا سزا سے زینہار

یاد رکھو دوستو! سنت ہے یہ اللہ کی
جو نہ بدلی ہے نہ بدلے گی الی یوم القرار

جو بڑھے گا، حوصلہ اس کا بڑھایا جائے گا
جو گرے گا، اپنے درجے سے گرایا جائے گا

io

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ یار سب کھولے کمر
جو مہم درپیش تھی وہ کر چکے گویا کہ سر

قوم میں تعلیم پھیلانا تھی سو پھیلا چکے
ہو گیا، وہ بیج جو بویا تھا، نخلِ بارور

پر جو سچ پوچھو تو ہم اب تک اُسی منزل میں ہیں
باندھ کر اٹھے تھے جس منزل سے احرامِ سفر

روشنیِ تعلیم کی کچھ کچھ جو یاں پاتے ہو تم
سب یہ جگنو کے سے چمکارے ہیں اے اہلِ نظر

ہے جہالت کا اندھیرا ہم پہ جو چھایا ہوا
اس اندھیرے میں ہی آتے ہیں یہ سب جلوے نظر

سارے ہو جاتے ہیں چمکارے ابھی کافور یہ
اس اندھیرے سے ذرا نکلو اُجالے میں اگر

ہم نے یہ مانا کہ ہم جو تھے زمیں پکڑے ہوئے
اس سے آگے کچھ قدم ہم نے بڑھایا ہے مگر

دیکھنا ہی ہے کہ اوروں سے ہے کیا نسبت ہمیں
اور بڑھتے ہیں گزوں، بڑھتے ہیں ہم گر انچ بھر

جبکہ ٹھہری ہم میں اور اوروں میں یہ نسبت تو ہم
اتنے ہی یاں گھٹ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں جس قدر

پس ہے ہمسر سے جو اپنے، یہ سمجھا دو اسے
خاک ہے وہ گو کہ ہے پہنچا ہوا افلاک پر

اپنی پستی کے نشاں پاتے ہیں ہر منزل میں ہم
کیا تجارت، کیا صناعت اور کیا علم و ہنر

کھل رہے ہیں جو کلوں کے کارخانے ملک میں
جن کے مالک ہیں وطن کے اہلِ ہمت سربسر

جو کہ ہیں ملکی ترقی کے لیے اک فالِ نیک
جن میں امیدیں ہیں مثلِ روزِ روشن جلوہ گر

قوم کا حصہ نہ واں پاؤ گے تم اس کے سوا
دن چھپے قلیوں کی اک فوج آئے گی تم کو نظر

کون سا پستی کا درجہ اب رہا ہے اس کے بعد
یہ وہ پستی ہے کہ بس تحت الثریٰ ہے اس کے بعد

io

ہم نے مانا ہے موافق جن سے دورِ ماہ و سال
بھاگوان ایسے بھی ہیں اس قوم میں پر خال خال

چند جانیں بچ رہی تھیں جو کہ قومِ نوح میں
ساٹھ ملیَن میں ہے وہ ان بھاگوانوں کی مثال

ان کی کیا عزت ہے یارو قوم ہے جن کی ذلیل
ان کو کیا راحت ہے جن کی قوم ہے سب خستہ حال

ہے وہ ایسا غول میں قلیوں کے جیسے ایک میٹ
ہے ہزاروں مفلسوں میں اک اگر آسودہ حال

شال گدڑی سے ہے واں سو مرتبہ بدتر، جہاں
ہوں ہزاروں گدڑیاں اور ایک کے کندھے پہ
شال

یاد رکھو ہے بہت دامن فراخ اسلام کا
دی ہے بنیادِ اخوت اس نے کل امت میں ڈال

ہیں سی امت میں جو ڈھوتے ہیں دن بھر ٹوکری
ہیں اسی امت میں جو ہیں دھو نکتے دن رات کھال

ہیں انہی میں جن کے سپنے میں نہیں آیا سماں
جب سے آنکھ ان کی کھلی دیکھا ہے گھر میں اپنے کال

ہیں انہی میں جو کہ بہرِ نفقۂ فرزند و زن

سامنے اک اک کے پھیلاتے ہیں وہ دستِ سوال
ان عزیزوں کی اخوت سے جنہیں آتا ہو ننگ
نام لیں فہرست سے اسلام کی اپنا نکال
ورنہ ذلت سے نکالیں اُن کو اور یہ جان لیں
ان کی ذلت میں انہیں عزت سے رہنا ہے محال
گھر میں اپنے بیٹھ کر جو چاہے سو بن لے کوئی
غیر قوموں میں نہیں حاصل اسے جز انفعال
کہتے ہیں غیر اس کو ہم جنسوں میں اپنے دیکھ کر
''یہ وہی کوا ہے لیکن ہنس کی چلتا ہے چال''
وہ یہی خطرہ ہے جس کے ڈر سے مال اور جان
سب کر رہے ہیں اپنی اپنی قوم پر قربان سب

io

وہ گئے دن جب کہ تھے مختارِ مطلق حکمراں
قسمتوں کی، قبضۂ قدرت میں تھی ان کے عناں
ہاتھ میں غسال کے مردہ ہو بے حس جس طرح
تھے جہاں بانوں کے ہاتھوں میں یونہی اہلِ
جہاں
تھا رعیت کا کوئی ہمدرد تو تھا بادشاہ
اور مصلح تھا کوئی اس کا تو تھا خود حکمراں
تھی نہ اہلِ ملک کو قومی مقاصد سے غرض
تھا نہ قومیت کا قوموں میں کہیں باقی نشاں
خواہشیں سب کی جدا، اغراض تھیں سب کی الگ
اپنے اپنے راگ تھے اور اپنی اپنی ڈفلیاں
قوم اپنی حد سے آگے کوئی بڑھ سکتی نہ تھی
پیش قدمی سے رکے کب کے کھڑے تھے

کارواں

بند تھے ناکے ترقی کے کہ آخر غیب سے
آیا اک سیلابِ آزادی کا ریلا ناگہاں
جس نے سب روکیں ہٹا کر کر دیا میدان صاف
غار یا ٹیلا رہا باقی نہ کوئی درمیاں
ایک قانونِ مُسلّم کی اطاعت کے سوا
ہو گئے ہر قید سے آزاد سب خورد و کلاں
کر دیے انصاف نے ہموار سب پست و بلند
آ گئے سب ایک لیول [1] پر قوی اور ناتواں
اب نہ قوموں کی ترقی میں ہے کوئی سدِّ راہ
اور نہ قوموں کے مدارج میں تفاوت درمیاں
سلطنت نے سب کو دے رکھے ہیں حق ڈنڈی کے
تول
وزن میں پلڑا نہیں کوئی سبک، کوئی گراں
جن کو دعویٰ ہے کہ ہم بیٹے بڑے باپوں کے ہیں
ان کو کرنے ہوں گے اب جوہر عدالت کے عیاں
ورنہ لینے ہوں گے واپس اپنے سب دعوے انہیں
اور بھلانی ہو گی سب دل سے بڑوں کی داستاں
وہ گئے دن جب کہ کر دیتے تھے چھوٹوں کو بڑا
انقلاباتِ جہاں یا اتفاقاتِ زماں
اب بڑائی کا ہے استحقاق پر سارا مدار

879

ہو گا جو "کرّار" اس کو مرحمت ہو گا نشاں

ا؎ Level: سطح

قسمتوں کی آزمائش کا زمانہ ہو چکا
ہے بس اب یاں ہمتوں اور غیرتوں کا امتحاں

ہے تمہاری اب تمہارے ہاتھ موت اور زندگی
ہو تمھی اپنے مسیحا اور تمھی ہو جاں ستاں

یا کرو کوشش کہ مردہ قوم میں پڑ جائے جاں
اور دکھا دو خلق کو اس راکھ سے اُٹھتا دھواں

یا رہو دنیا میں بھنگوں اور پسوؤں کی طرح
جن کا ہے دنیا میں ہونا اور نہ ہونا ایک ساں

قوم گنتی میں ہو گو مور و ملخ سے بھی سوا
مر گئے جب قوم کے دل قوم میں پھر کیا رہا

io

#فلسفۂ ترقی [1]

(1903ء)

اے عزیزو! تم بھی ہو آخر بنی نوعِ بشر
غل ہے کیا نوعِ بشر میں کچھ تمہیں بھی ہے خبر

کر رہا ہے خاک کا پُتلا وہ جوہر آشکار
ہو رہی ہے جس سے شانِ کبریائی جلوہ گر

رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا وہاں
طائرِ وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر

اُس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کر لیا
ابر و برق و باد سے تا بحر و برّ و دشت و در

حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا
دے رہے ہیں اُس خلافت پر گواہی بحر و بر

تھا ارسطو اور فلاطوں کو بہت کچھ جن پہ ناز
ہو گئے تقویمِ پارینہ وہ سب علم و ہنر

---

[1] یہ نظم مولانا حالی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے سترھویں جلسے (منعقدہ بمبئی) کے چوتھے اجلاس میں جو مسٹر

بدرالدین طیب جی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، 31 دسمبر 1903ء کو پڑھ کر سنائی تھی۔ مولوی بشیرالدین، بانی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے اسے ''ترقی وتنزل'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ ''جواہراتِ حالی'' میں ''فلسفۂ ترقی'' کا عنوان درج ہے۔ (ا ص)

کل کی تحقیقات نظروں سے اُتر جاتی ہے آج
بڑھ رہا ہے دم بہ دم یوں آج کل علم بشر

قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر

ساز و ساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب
کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ در بدر

کہتے ہیں مغرب سے جب ہو گا برآمد آفتاب
عرصہ آفاق میں ہو گی قیامت جلوہ گر

دوستو! شاید وہ نازک وقت آ پہنچا قریب
آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اُٹھتی نظر

رو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر

دست کاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

io

ہند میں بھی یارو آ پہنچا ہے اس رو کا قدم

جو ہیں نا قابل اب اُن کا کھلنے والا ہے بھرم

ہے ترقی، پر تنزل بھی ہے اُس کے ساتھ ساتھ
یہ کسی کے حق میں امرت ہے کسی کے حق میں سم

پست کو بالا یہ کر دیتی ہے اور بالا کو پست
کر دیا زیر و زبر اس نے جہاں رکھا قدم

گل کھلایا اس نے جو اقصائے مشرق میں ابھی
اس کے لکھتے وقت ہاتھوں میں لرزتے ہیں قلم

چین جو وسعت میں کم اک براعظم سے نہ تھا
اک جزیرے کی لپٹ[1] نے کر دیا اس کو بھسم

دیکھنا پیچھے نہ ہم چشموں سے رہ جانا کہیں
حق میں ہمسائے کے ہمسائے کا بڑھنا ہے ستم

جانتے ہو اے عزیزو ہے تنزل چیز کیا؟
اُس پہ کر لینا قناعت مل گیا جو بیش و کم

گو کہ ہے افراد کے حق میں یہ خصلت کیمیا
حق میں لیکن قوم کے یارو یہی خصلت ہے سم

تن پہ تھا فاروق اعظمؓ کے پھٹا کرتا، مگر
قوم کی خاطر بھری نیت نہ لے کر ملکِ جم

جیتے ہیں دنیا میں وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح
جن کو بڑھنے کی تمنا اور نہ کچھ گھٹنے کا غم

جس طرح موری کا کیڑا خوش ہے اپنے حال میں
گزرے جو حالت، اُسی میں بس مگن رہتے ہیں
ہم

پر زمانہ کہہ رہا ہے یہ بہ آوازِ بلند

''یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہِ عدم''

بے ترقی ملک میں جینا ہے دشوار آج کل
وحشیوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

io

ا۔ مراد جاپان جس نے 95-1894ء کی جنگ میں چین کو پے در پے شکستیں دیں۔

ہو نہ ہمدردی کا عنصر قوم میں یارو جہاں
واں ترقی کے لیے سب کوششیں ہیں رائگاں

راس بیڑے کو ترقی کے نہیں کوئی ہوا
جوشِ ہمدردی سے ہوتا ہے جہاز اُس کا رواں

قوم تھی یونان کی دنیا میں اک محدود قوم
ہو گئی حب وطن سے فخرِ اقوامِ جہاں

ایک کو کچھ ایک کی پروا نہ ہو جب قوم میں
ہے حماقت قوم کی کثرت پہ ہونا شادماں

قوم کس گنتی میں ہے وہ، دل نہ ہوں جس کے ملے
گو کہ وہ کثرت سے اپنی گھیر لے سارا جہاں

ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جن کے دل وہ قوم کیا
ہے وہ اک مقتل، لہو روتا ہے جس پر آسماں

یاد رکھو پڑ گئی جس ملک یا ملت میں پھوٹ
ہیں وہ اس مہماں سرا میں کوئی دن کے میہماں

غزنوی، غوری، مغل، سادات، لودی اور غلام
رہ گئے نوبت بہ نوبت ہند پر جو حکمراں

دن برے جب آئے اور باہم لگے سر پھوڑنے
صفحۂ ہستی سے اُن کا مٹ گیا نام و نشاں

دین کہتے ہیں جسے وہ خیرخواہی کا ہے نام

ہے مسلمانو! یہ ارشادِ رسول e انس و جاں ؎

ہیں نمازیں اور روزے اور حج بے کار سب
سوزِ امت کی نہ چنگاری ہو گر دل میں نہاں

جس کا تم بھرتے ہو کلمہ، جس پہ پڑھتے ہو درود
نام پر جس کے عزیزو! تم فدا کرتے ہو جاں

؎ حدیثِ نبوی: اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ۔

جیتے جی اُمت کی لو دل کو رہی اس کے لگی
وقتِ آخر اُمت اُمت اُس کے تھا وردِ زباں

بھائی بھائی ہو گئے ہو دین کی برکت سے تم
ہے غضب گر بھائیوں پر ہوں نہ بھائی مہرباں

کھول کر دیکھو کتاب اللہ کی کہتی ہے کیا
''کلمہ پڑھ لینے سے کچھ حاصل نہیں بے امتحاں''
؎

دین کا دعویٰ اور اُمت کی خبر لیتے نہیں
چاہتے ہو تم سند اور امتحاں دیتے نہیں

io

اُن سے کہہ دو، ہے مسلمانی کا جن کو ادّعا
قوم کی خدمت میں ہے پوشیدہ بھید اسلام کا

وہ یہی خدمت، یہی منصب ہے جس کے واسطے
آئے ہیں دنیا میں سب نوبت بہ نوبت انبیا

قوم کی خدمت میں کر دیں اپنی جب عمریں تمام
تب فرائض سے نبوت کے ہوئے عہدہ برآ

وہ رسولِ ہاشمی وہ رحمۃ للعالمین e

پیروی کا جس کی دم بھرتے ہو تم صبح و مسا

جانتے ہو قوم سے تھا اپنی کیا اس کا سلوک؟
اس طرف سے تھی جفا اور اس طرف سے تھی دعا

کون سی تکلیف تھی جو قوم نے اس کو نہ دی
پر کبھی چاہا نہ اُس نے قوم کا اپنی برا

۱؎ اس آیت کی طرف اشارہ ہے: "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ ہُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ"

(سورۃ العنکبوت:2:29)

جب اُحد میں ہو گیا دندانِ پاک اس کا شہید
قوم کے حق میں نہ نکلا منہ سے کچھ اس کے سوا

"کر ہدایت قوم کو یا رب کہ ہیں معذور یہ
ان کی عقلوں پر ہے پردہ جہل و غفلت کا پڑا" ۱؎

قوم کے حملے رہے جب تک کہ اس کی ذات پر
خندہ پیشانی سے سب اُن کے سہے جور و جفا

پر لگی جب قوم سب مل کر مٹانے نامِ حق
اور خدا کا پوجنا بندوں کو مشکل ہو گیا

غیرتِ حق نے نہ دی پھر مہلت صبر و شکیب
دین کی آخر حمایت پر کھڑا ہونا پڑا

لشکرِ حق سے مگر جب ہو گئی مغلوب قوم
پھر وہی شفقت، وہی رحمت، وہی احسان تھا

تھی یہی وہ قوم، جس کے حق میں فرماتے تھے
آپ
"ہے عرب کی دوستی جز دین اور ایمان کا" ۲؎
تھی یہی وہ قوم، تھا جس کے لیے ارشاد یہ

''قوم کا خادم ہے آقا سب کا، بے چون و چرا''
۳ے

قوم کے خادم رہے اور دوست جب تک اہلِ دیں
دین اور دنیا میں بول اسلام کا بالا رہا
پر دیے خود غرضیوں نے جبکہ دل اک اک کے پھاڑ
حکم جو مالک کا تھا بندوں کو وہ پورا ہوا
حکم تھا اس کا کہ جھگڑوں سے رہو تم برکنار
ورنہ کھو بیٹھو گے سب اپنا وقار اور اعتبار
io

ا۔ مترجمہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْن۔''
۲۔ حدیث: حب العرب من الایمان۔ ۳۔ حدیث: سید القوم خادمہم۔

سچ کسی دانا نے تھا یہ قوم سے اپنی کہا
''جو کہ حامی قوم کے ہیں اُن کا حامی ہے خدا''
دیکھ لو ممتاز دنیا میں وہی قومیں ہیں آج
قوم پر قربان ہے جن کا، ہر اک چھوٹا بڑا
یاں تلک پھیلا ہے اب قوموں میں قومیت کا درد
اپنے ایک اک فرد پر قوموں کی جانیں ہیں فدا
ملک سارا چھین کر بھی اُن کو چین آتا نہیں
اپنے اک مقتول کا جب مانگتے ہیں خوں بہا
اختلافِ دین و مذہب گھل رہا تھا جس میں زہر
جس نے ملکوں میں دیے تھے خون کے دریا بہا
دم بہ دم وہ اختلاف اب بن رہا ہے اتفاق
زہر میں ہونے کو ہے پیدا اثر تریاق کا
کر رہا ہے جوشِ ہمدردی کی صورت میں ظہور

وہ تعصب جس نے باپوں سے کیے بیٹے جدا
دیتے ہیں وہ اپنے ذاتی فائدوں پر خاک ڈال
اپنے جب نقصان میں وہ قوم کا اُن کی بھلا
وہ ہملٹن کی جواں مردی سنی ہو گی کہ جب
ہو گئی فرخ سیر کو ہاتھ سے اُس کے شفا
قوم پر قربان کر دیں اپنی اُمیدیں تمام
آپ کچھ لینا نہ چاہا اپنی خدمت کا صلا
ہے اُسی حب وطن کا اُس کے یہ سارا ظہور
ہند پر ہے آج جو برطانیہ فرماں روا
ایک ماما جس کو دس ملتے ہیں ہفتے میں شلنگ
جس کے کنبے کا سب اس تنخواہ پر ہے آسرا
جا کے دے آتی ہے خوش خوش ایک ہفتے کی طلب
قوم کی خاطر کہیں سنتی ہے جب چندہ کھلا
ہے غرض چندے کی کیا، اس سے نہیں کچھ اس کو
کام
قوم کا نام آیا اور قابو سے باہر دل ہوا
حق کو ہوتا ہے جنہیں دنیا میں کرنا سر بلند
خصلتیں یہ برگزیدہ اُن کو ہوتی ہیں عطا
اُن کے مفلس، قوم کی خاطر وہ کر جاتے ہیں کام
پست قوموں میں نہیں کر سکتے جو کام اغنیا
ہے انہی ہمدردیوں کا اُن کی یہ ثمرہ کہ آج
اس کرہ کے گرد ہیں چھائی ہوئی مثلِ ہوا
لوہا مقناطیس کی جانب ہے کھنچتا جس طرح
اس طرف کھنچتی چلی جاتی ہے دنیا اس طرح

io

ہے یہ قوموں کی ترقی اور تنزل سے عیاں
خود تنزل میں ہے سرچشمہ ترقی کا نہاں

ایک کا ہے جو تنزل، دوسرے کا ہے عروج
اس کا بکتا ہے مکاں، تب اُس کی چلتی ہے دکاں

کوئی یاں بنتا نہیں، جب تک نہ بگڑے دوسرا
گھاس کھد جاتی ہے جب، پڑتی ہے تب کھیتی میں جاں

ہوتے ہوتے خشک جب دریا میں خاک اُڑنے لگی
تب ہوئے نہروں سے جنگل غیرتِ باغ جناں

چہچہے مرغ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب
کر چکا کیڑے مکوڑے جب ہزاروں نوش جاں

جان لو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب
جب سنو یارو، بگڑتا کوئی گھر یا خانداں

آسماں سے بن کے خوان آتا نہیں اقبال کا
ہے وہی اک چیز کل مہماں یہاں تھی آج واں

میزباں کی دیکھتی ہے آنکھ جب بدلی ہوئی
واں سے اُٹھ کر دوسرا جا ڈھونڈتی ہے میزباں

جانے والا ہے مقرر اُن کا گھر غیروں کے پاس
جو کمر باندھے ہوئے بیٹھے ہیں گھر کھونے پہ یاں

قصر و ایواں ہوں مبارک تم کو اے محنت کشو!
عیش کے بندے بہت ہونے کو ہیں بے خانماں

یاد رکھو، ہوں گے اب حق دار اُن کے جانشیں
ہاتھ سے حق کھو دیے اپنے جنھوں نے رائگاں

ہوں گے مزدور اور کمیرے اُن کے اب قائم مقام
پھرتے ہیں بے کار جن کے کودک و پیر و جواں

اے مسلمانو! فلک کی گردشوں سے غافلو!
تم کو رخصت ہے لٹاؤ وقت و دولت رائگاں

دیکھو جب غیروں کو تم بڑھتا، کرو اپنے پہ ناز
ہیں تمہارے عیش وغفلت کی یہ سب فیاضیاں

مت کرو شکوہ مشیت کا، خدا ظالم نہیں
بلکہ ظالم ہیں تمہاری اپنی بداعمالیاں

ہے یہ قانونِ الٰہی، جو کبھی ٹلتا نہیں
گو جگہ سے اپنی ٹل جائے زمین و آسماں

چھٹتی جائیں گی وہ قومیں جو بگڑتی جائیں گی
ٹہنیاں جو سوکھتی جائیں گی، جھڑتی جائیں گی

io

$انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور اور اس کے کام[1]
(1904ء)

1

دے خدا برکت جماعت میں تری اے انجمن!

کر دیا تو نے نیا اسلام کا عہدِ کہن

جس طرح اسلام کی بنیاد غربت میں پڑی
تو نے بھی غربت میں جھیلے مدتوں رنج و محن

ا۔ یہ نظم اپریل 1904ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی۔ مولانا کے ایک خط (مورخہ 9 اپریل 1904ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انجمن کے جلسے میں شرکت کے لیے اپریل کے پہلے ہفتے میں لاہور آئے تھے اور آٹھ دن کے قیام کے بعد لاہور سے واپسی ہوئی۔ (بحوالہ مکتوبات حالی، جلد دوم، صفحہ 356)
انجمن کے اسی جلسے میں علامہ اقبال نے بھی ایک نظم سنائی تھی۔ مولانا حالی کو اقبال کا ایک شعر بہت پسند آیا جس کی داد یوں دی کہ انجمن کو دس روپے عطا فرمائے۔ آخر میں مولانا حالی نظم سنانے کے لیے کھڑے ہوئے مگر اُن کی نحیف آواز ہزاروں کے مجمعے میں بہتوں کو سنائی نہ دی۔ حاضرین کی بے قراری دیکھ کر شیخ عبدالقادر صاحب نے اعلان کیا: ''مولانا حالی کی زبان سے تبرکاً جو کچھ سنا جائے سن لیجیے، بعد میں یہی نظم اقبال پڑھ کر سنائیں گے۔''
جب اقبال سٹیج پر آئے تو مولانا حالی کی نظم سنانے سے پہلے یہ رباعی فی البدیہہ پڑھی:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

(بحوالہ باقیات اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی، صفحہ 132)

جیسے گزرے سخت پہلے چند سال اسلام کے
تیرے یاور بھی یونہی تھے ابتدا میں چند تن

بدگماں اسلام سے جیسے رہے اول قریش
تیری نسبت بھی بہت کچھ تھے دلوں میں سوءِ ظن

سلطنت پر یا رئیسوں پر نہ تھا تکیہ تجھے
جز خدا کوئی نہ تھا سر پر ترے سایہ فگن

تیری کوشش کی تھی بارانی زراعت کی مثال

ہو جسے ہر دم لگی تائید غیبی کی لگن

باغبانوں کے پسینے کے سوا رکھتا نہ تھا

آبیاری کا کہیں سے آسرا تیرا چمن

پر رہا دل تیرا ایسا اپنی ہمت سے قوی

گویا لشکر تھا خدا کا تیرے ساتھ اے انجمن

فتح پائی تو نے آخر اپنے استقلال سے

بج گیا ڈنکا ترا کابل سے لے کر تا دکن

سانچ کو جب تک نہیں اے انجمن دنیا میں آنچ

تیری پشتی پر رہے تائیدِ ربِ ذوالمنن

تجھ سے اُمیدیں ہیں وابستہ بہت احباب کی

قوم کی دایہ ہے تو، اور ماں ہے تو پنجاب کی

2

تو نے لی جس وقت لاورث یتیموں کی خبر

قوم میں کوئی شفیق اُن کا نہ آتا تھا نظر ا

کہہ رہی تھی بے کسی اُن کی زبانِ حال سے

دین پر تھی اپنے جو نازاں وہ اُمت ہے کدھر؟

ہو رہی ہے پود کب سے پائمال اسلام کی

اور کوئی کلمہ گو لیتا نہیں اُس کی خبر

بھائیوں کے دل پہ اُس سے میل تک آتا نہیں

جو مصیبت دیکھ کر غیروں کا جی آتا ہے بھر

کر رہے ہیں قحط کے دورے قیامت آشکار

چھٹ رہی ہیں بیٹیاں ماؤں سے، باپوں سے پسر

ا۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اس بند کے مندرجۂ ذیل پانچ شعر مولانا حالی کے قلمی مسودات سے نقل کیے ہیں۔ یہ اشعار اب تک کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئے:

پر تجھے ہے اے مبارک انجمن یہ بھی خبر
قوم تیرے دم سے رکھتی ہے اُمیدیں کس قدر

دھر لیا ہے اپنے سر گویا کہ اک عالم کا بوجھ
قوم کی خدمت پہ جب سے تو نے باندھی ہے کمر

حس و حرکت قوم میں باقی نہیں رہتی جہاں
مورتیں مٹی کی آتی ہیں نظر دیکھو جدھر

ہے مثل مشہور "جو بولے گا گھی کو جائے گا"
تو ہی ہے خود گنہگار اپنے منہ سے بول کر

تک رہے ہیں تیری جانب قوم کے لاکھوں یتیم
چند معصوموں کو گہوارے میں تیرے دیکھ کر

سیاقِ کلام سے ظاہر ہے کہ یہ اشعار، بند کے دسویں شعر سے مربوط ہیں۔ آخری شعر اور بند کے گیارہویں شعر کا مصرعِ اولیٰ بھی مشترک ہے۔ غالباً بغرضِ اختصار یہ اشعار حذف کر دیے گئے۔ (اس)

ڈالتی ہیں کھیتیوں پر ٹڈیاں جس طرح لوٹ

قحط سالی میں یونہی پڑتی ہے لوٹ اسلام پر

ناج آٹے کے عوض بکتا ہے یوں دینِ مبیں

جس طرح بکتی ہے بازاروں میں جنسِ کس مخر

سب سے پہلے بے کسوں کی یہ صدا تو نے سنی

دل گیا تیرا لرز اُن کی تباہی دیکھ کر

تھا قساوت کا مسلمانوں پہ جو دھبّا اسے

تو نے دھویا دھل سکا ہاتھوں سے تیرے جس قدر

879

پر یہ دھبّا قوم کے دامن سے چھٹ سکتا نہیں
ہاتھ بٹوایا نہ مل کر قوم نے تیرا اگر

تک رہے ہیں تیری جانب قوم کے لاکھوں یتیم
دور سے سن کر ترے دار الیتامیٰ کی خبر

ایک انار اور اُس کو تکتے سیکڑوں بیمار ہیں
لے گی کس کس کی خبر تو، قوم غافل ہے اگر؟

پائیں گے ڈھونڈھے نہ پھر اسلام کو دنیا میں یہ
قحط کے دورے گئے دور چار اگر ان پر گزر

ہو گئے خالی ہزاروں گھر یونہی اسلام سے
گونجتی رہتی تھیں تکبیریں جہاں شام و سحر

قوم کو پروا نہیں ان کی تو سن اے انجمن
ہے پھر ان لاوارثوں کا ملجا و ماویٰ مشن

io

3

پرورش میں ان کی اپنی جاں کھپاتے ہیں جہاں
اُن کو شفقت سے کھلاتے اور پلاتے ہیں جہاں

عادتیں دیتے ہیں سب اُن کی جہاں سانچے میں ڈھال
جانور سے آدمی ان کو بناتے ہیں جہاں

رکھتے ہیں ماں باپ سے بڑھ کر جہاں ان کا
خیال
لاڈلوں کی طرح ناز ان کے اٹھاتے ہیں جہاں

کرتے ہیں لائق انہیں دنیا میں رہنے کے لیے
صنعت وعلم و ہنر ان کو سکھاتے ہیں جہاں

مینہ برستا ہے جہاں دولت کا اُن کے واسطے
رات دن امداد کے پیغام آتے ہیں جہاں

شیر خواروں کو جہاں رکھتے ہیں ماؤں کی طرح
نرم نرم ان کو بچھونوں پر سلاتے ہیں جہاں

اُن کی خدمت کے لیے، ان کی حفاظت کے لیے
دائیاں، انائیں، مامائیں بلاتے ہیں جہاں

ان کو جھولوں میں جھلاتے ہیں جہاں شام وسحر
مثل فرزندوں کے ان کو رکھ رکھاتے ہیں جہاں

قوم میں پرسش نہیں ان کی تو واں پہنچیں گے وہ
پتلیوں پر ان کو آنکھوں کی بٹھاتے ہیں جہاں

اب کہو حق دار ان کا ہے مشن یا انجمن؟
سال بھر میں تین دن لے دے کے آتے ہیں
جہاں

جب کہ آ کر انجمن کی سنتے ہیں روداد ہم
پھر کبھی کرتے نہیں بھولے سے اس کو یاد ہم

4

اس سے بڑھ کر ہوگی کیا اے قوم عبرت کی جگہ
ہو مشنِ اسلام کے پودوں کی خدمت کی جگہ

دل نہ اپنوں کا پسیجے اور کڑھے غیروں کا جی
ہے مسلمانو! یہ غیرت اور حمیت کی جگہ

کیا قیامت ہے کہ حامی جن کے بیگانے بنیں

وہ نہ پائیں قوم میں اپنی حمایت کی جگہ

کیا غضب ہے غیرِ آسائش کے ہوں جن کی کفیل
اُن کو اپنوں میں ملے ڈھونڈے نہ راحت کی جگہ

ہمسری غیروں کی گر دولت میں کر سکتے نہیں
دین کی غیرت تو تم رکھتے ہو دولت کی جگہ

بے کسوں کا دین بھی جس سے بچے اور جان بھی
اس سے بڑھ کر کون سی ہوگی اعانت کی جگہ؟

ادعا ہے تم کو اسلامی حمیت کا اگر
اس سے بڑھ کر کون سی ہوگی حمیت کی جگہ؟

اپنے بچوں کو مشن میں دیکھیں اور ہم مر نہ جائیں
کون سی اس سے زیادہ ہوگی ذلت کی جگہ؟

اب سوا اس کے کہ ہم اپنے پہ خود نفریں کریں
رہ گئی ہے کون سی باقی ملامت کی جگہ؟

قحط نے یارو لیا ہے دیکھ گھر اسلام کا
گھر کو رکھنا ہے تو ہے یہ بذلِ ہمت کی جگہ

لوٹ سے قحطوں کی کچھ دن اور اگر غفلت رہی
گود خالی ایک دن ہو جائے گی اسلام کی

5

وہ گیا دورہ کہ تھے خلقت کے جتنے کاروبار
سب کا سلطانی اعانت پر تھا بس دار و مدار

راج کے ذمے تھی پرجا کی ہر اک بہبود و سود
آدمی اپنے فرائض کے نہ تھے خود ذمہ دار

اب زمانہ وہ ہے جس میں جز نظامِ مملکت
راج کے ذمے نہیں پرجا کا کوئی بوجھ بار

کر رہی ہیں اپنے اپنے بل پہ اب قومیں وہ کام
جو نہیں کر سکتے شاہنشاہ و شاہ و شہریار

پڑ رہا ہے آج دنیا میں یہی غل چار سو
خود خبر لو قوم کی، گر قوم کے ہو غم گسار

دین کا گر درد ہے تم کو، تو دو اس کو فروغ
اور کرو ہر نیک و بد پر حجتِ حق آشکار

علم و فن کی درس گاہیں ملک میں قائم کرو
بھائیوں کی گر جہالت دل پہ گزرے ناگوار

دیکھ کر حالت یتیموں کی اگر کڑھتا ہے جی
مال و دولت مل کے سب اُن پر کرو یارو نثار

انجمن کو سمجھو اپنے حق میں اک انعامِ حق
کر رہی ہے جو ادا قومی فرائض بے شمار

انجمن کو، شکر کی جا ہے کہ ہے ہر دم فروغ
دن بدن بڑھتے چلے جاتے ہیں اس کے کاروبار

ہے تمنا یہ ترقی اُس کی روز افزوں رہے
اس ترقی سے مگر رہنا عزیزو ہوشیار

ہو رہی ہے جو عمارت دم بہ دم یارو بلند
اس کو خطرہ ہے اگر بنیاد ہے نا اُستوار

اس سے کیا حاصل کہ تم نے جوت لی میلوں زمیں
آبپاشی کی بھی کچھ تدبیر کی ہے یا نہیں؟

6

اب نہیں وہ دن کہ کھو کر مال و دولت رائگاں
چند نا اہلوں میں ہوں مشہور فیاضِ زماں

نام روشن باپ دادا کا کریں لے لے کے قرض
بیچ بیچ اسلاف کا ترکہ رچائیں شادیاں

ایک مونڈن یا کہ بسم اللہ کی تقریب میں اُسے

ہوں بہت ممنون گر رکھ لے کوئی گروی مکاں

لیں نہ کچھ اس کی خبر مفلس کوئی بھائی ہو گر

پر ہوں دسترخوان پر دس بیس حاضر میہماں

در سے خالی ہاتھ کوئی مانگنے والا نہ جائے

گو کہ فاقے سے ہوں ہمسائے کے بچے نیم جاں

ساری یہ فیاضیاں نبھ سکتی تھیں یارو جبھی

قوم کے سر پر نہ تھا جب قوم کا بارِ گراں

اب عزیزو جزرسی کا اور کفایت کا ہے وقت

ہے تمہارا میہماں لوٹا ہوا اک کارواں

آج کل ہے بس یونہی امداد کی محتاج قوم

قحط میں پانی کی بھوکی جیسی یارو کھیتیاں

اغنیا غافل ہیں اور ماوشما سب تنگ دست

پونجیاں اوچھی ہیں اور درپیش ہے خرچ گراں

ناؤ ان ہاتھوں سے اُس امت کی کھینی ہے تمہیں

تھا کھویا جس کے بیڑے کا رسول e انس و جاں

جس کی عزت درحقیقت عزتِ اسلام ہے

جس کی ذلت خود تمہاری ذلتوں کا نام ہے

io

لے ''ایک مونڈیاں یا کہ بسم اللہ کی تقریب میں'': جواہرات حالی صفحہ 69

%ترغیبِ امدادِ یتیماں لے

(1905ء)

اسلام بہت دن سے یہ کرتا تھا منادی
اے غافلو، اے بے خبرو! ہوش میں آؤ

فارغ غمِ اُمت سے اور اسلام کا دعویٰ
دنیا کو بس اب دین پہ اپنے نہ ہنساؤ

گو دین کی صورت ہے پہ سیرت نہیں اس کی
یہ دین ہے یا دین کا ہے سانگ، بتاؤ؟

مقبول نہ حج ہیں، نہ نمازیں ہیں، نہ روزے
جب تک غمِ اُمت میں نہ جاں اپنی گھلاؤ

دعویٰ نہیں مسموع شہادت نہ ہو جب تک
ہے دین کا دعویٰ تو شہادت کوئی لاؤ

گر اپنے یتیموں کی خبر لے نہیں سکتے
تو دین سے تم قطعِ تعلق کرو، جاؤ

ا۔ یہ نظم 1905ء میں انجمن مؤید الاسلام دہلی کے جلسے میں پڑھی گئی۔ (بحوالہ "حالی بحیثیت شاعر"۔ صفحہ 91)

اعضا تو نمازوں میں بہت تم نے دُکھائے
دل کو بھی کبھی ہاتھ سے کچھ دے کے دُکھاؤ

دنیا میں جراحت، یہی عقبیٰ میں ہے راحت
کل پھل کوئی کھانا ہے تو زخم آج اٹھاؤ

یہ قوم کے بچے جو پڑے پھرتے ہیں بے کس
یہ پود ہے میری اسے دیکھو، نہ گنواؤ

879

شیریں ہے پھل ان پودوں کا اور سایہ ہے گھن کا
سیوا کرو ان کی انہیں پروان چڑھاؤ

دیکھو نہ حقارت سے پھٹے کپڑوں کو ان کے
ان گدڑوں میں جو لعل کہ گم ہیں انہیں پاؤ

سنولائے ہوئے چہروں میں نور اُن کے ہے تاباں
ان کوئلوں کو ہیرے جلا دے کے بناؤ

ہیں ان میں فقیہ، ان میں حکیم، ان میں محدث
ان کی بری حالت پہ، بری گت پہ نہ جاؤ

جو ان میں ہیں جوہر کہیں زنگ ان کو نہ کھا جائے
گن دیکھنے ہیں اُن کے تو زنگ ان کا چھٹاؤ

افواجِ مخالف ہیں تگ و دو میں چپ و راست
رُند جائیں نہ یہ خاک سے، جلد ان کو اٹھاؤ

پھرتے ہیں بہت گھات میں یاں ان کے شکاری
ان پنچھیوں کو موت کے چنگل سے بچاؤ

اے یارو! یہ بے غیرتی اور دین کا دعویٰ
دیں داری کا اور دین کا بس منہ نہ چڑاؤ

امت کے یتیموں کو ہو انجیل کی تعلیم
اور اپنی تم اولاد کو قرآن پڑھاؤ

تثلیث کی پاتے ہوئے دیکھو انہیں تلقین
اور اپنے جگر گوشوں کو توحید سکھاؤ

گرجا میں حریف ان کو سکھائیں مری توہین
اور کان نہ توہین پہ تم میری ہلاؤ

جن بچوں کو بیٹوں کی طرح چاہیے رکھنا
ہاتھ آئیں تمہارے تو غلام اُن کو بناؤ

کھانے کی بھی کپڑے کی بھی لیں اُن کی خبر غیر
اور تم نہ کبھی بھول کے آنکھ اُن سے ملاؤ

اپنا تمھیں وہ جان کے گر راہ میں ٹھٹکیں
تم غیروں کی مانند گزر پاس سے جاؤ

اسلامیو! بے مہریاں آخر یہ کہاں تک
جو منہ کو تمہارے تکیں آنکھ اُن سے چراؤ

بے کس نہ گنو ان کو یہ کنبا ہے خدا کا
تم پھیر کے منہ ان سے خدا کو نہ رلھاؤ

عبرت کی جگہ ہے، ڈرو گردش سے فلک کی
اولاد کو اپنی نظرِ بد سے بچاؤ

بن باپ کے بنتے ہوئے لگتی نہیں کچھ دیر
غیرت کو بس اللہ کی حرکت میں نہ لاؤ

اُمت میں ہو تم اس کی جو اُمت پہ فدا تھا
لو تم بھی عزیزو اُسی اُمت سے لگاؤ

وہ جیسا غریبوں کا، یتیموں کا تھا عاشق
تم بھی انہیں آنکھوں پہ اسی طرح بٹھاؤ

جو خلق تھا ہر بے کس و ناچار سے اس کا
اخلاق میں کچھ اس کی جھلک تم بھی دکھاؤ

کڑھتا تھا وہ جس طرح مصیبت پہ ہر اک کی
جی تم بھی مصیبت پہ یونہی سب کی کڑھاؤ

ٹوٹے ہوئے دل ہیں یہ گزرگاہ خدا کی
مانا ہے خدا سے تو اسی راہ سے جاؤ

مدت سے تھا یہ دے رہا اسلام دہائی

اور کہتی تھی غفلت نہ ادھر کان لگاؤ

بارے سنی احباب نے اسلام کی آواز
اور مل کے کیا عہد کہ کچھ کر کے دکھاؤ

جو نشہ غفلت میں ہیں چور ان کو جھنجوڑو
اور نیند کے متوالے ہیں جو اُن کو جگاؤ

بھولے ہوئے جو روزے نمازوں پہ ہیں اپنے
اسلام کی فریاد انہیں چل کے سناؤ

قبل اس کے کہ حج کا کریں کعبے کے ارادہ
حج ہند میں جو اُن پہ ہے فرض اُن کو جتاؤ

بن باپ کے بچوں کے ہیں ٹوٹے ہوئے جو دل
کعبے کی طرح گرد طواف اُن کے کراؤ

امداد پہ ان کی کرو کل قوم کو مجبور
دل دکھتے اگر اس میں کسی کا تو دکھاؤ

قائم کرو اک انجمن اخوانِ صفا کی
اور بیڑا یتیموں کی حمایت کا اٹھاؤ

io

صد شکر ہوئیں کوششیں احباب کی مشکور
پھل دیکھنے نیت کے ہوں گر اُن کی تو آؤ

فیاضیاں جو قوم کے غم خواروں نے کی ہیں
دیکھو انہیں اور بھائیوں کو جا کے سناؤ

باقی ہیں ابھی قوم میں کچھ قوم کے غم خوار
اس شکر میں تم حمد خداوند کی گاؤ

اس وقت کہ نازک ہے بہت قوم پہ یہ وقت
جو قوم کا غم خوار ہو خیر اس کی مناؤ

ہے چار طرف قوم میں اب نفسی ہی نفسی
لو اُس کے قدم خود غرضی جس میں نہ پاؤ

رحمت ہے خدا کی یہ عزیزوں کی جماعت
پر اس کی خوشی میں ابھی بغلیں نہ بجاؤ

دے قوم سہارا تو یہ ہے نوح کی کشتی
پر قوم نہ کھیوے تو یہ کاغذ کی ہے ناؤ

سرچشمے سے ہوتی نہیں پانی کی جب آمد
دم بھر میں اتر جاتا ہے دریا کا چڑھاؤ

جوتی ہے یہ یاروں نے بھروسے پہ تمہاری
کیوں کر چلے، جب تم ہی یہ گاڑی نہ چلاؤ

ہیں قوم کی غفلت نے بہت کھیل بگاڑے
تم اس کے جہاں چاہے نشاں دیکھ لو، جاؤ

یاروں کو ابھی کام بہت کرنے ہیں باقی
دو اُن کو مدد کام میں اور ہاتھ بٹاؤ

مجلس کہیں جی چھوڑ نہ دے ہو کے ہراساں
اس ناؤ کو جس طرح بنے پار لگھاؤ

879

دو چار کے، دس پانچ کے بس کا نہیں یہ کام
سر جوڑ کے اس کام میں سب زور لگاؤ

گو کام ہے دشوار پر مردوں کو ہے آساں
کرنا ہے گر اس کام کو پورا، کیے جاؤ

io

بابِ دوازدہم

بچوں کی نظمیں

بچوں کی نظموں پر ایک نظر

علم و ہنر، اخلاق و کردار، تعلیم و تربیت کی نشو ونما بچپن سے کی جاتی ہے اسی لیے مہذب خاندانوں، تعلیم یافتہ گھرانوں میں بچوں کے لیے اتالیق رکھے جاتے، جو ہر قدم پر موقع و محل کے حساب سے بچوں کی تہذیب کی پرورش کرتے تھے۔ شعروادب بھی ایک ایسی آموزش گاہ ہے جس میں شاعر اور ادیب استاد معنوی تصور کیے جاتے جو تحریروں اور تقریروں کے ذریعے بچوں کا ادب تشکیل دے کر ان کی تفریح کے سامان کے ساتھ تعمیری فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

ادب برائے ہدف شاعری برائے زندگی جسے مقصدی ادب و شاعری بھی کہتے ہیں اُس کا ایک اہم جز و انسان سازی بھی ہے جو مہد سے لحد تک جاری رہتی ہے۔ چنان چہ اس تربیت میں بچوں اور نسل جوان کے ادب کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُردو شعر و ادب میں دوسری زبانوں کے مقابل بچوں کے ادب پر کم کام ہوا ہے جس پر ہم آگے روشنی ڈالیں گے لیکن پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون کون سے لوازمات اور نکات و خصوصیات ہیں جو بچوں کے ادب کے لیے ضروری ہیں۔ بچوں کے ادب کی زبان سیدھی سادی، سلیس و شگفتہ اور پیچیدہ تشبیہات اور استعارات سے پاک ہونی چاہیے ایسی ضیق و مشکل بھی نہ ہوں جس سے سمجھنے میں دقت پیش آئے۔ ان کے علاوہ اگر ادب میں بچگانہ پن یا بچپن نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں بچوں کا ادب نہیں

کہلا سکتا۔ یعنی شعر و ادب میں موضوع کا انتخاب بچوں کے سن و سال سے ہم آہنگ ہو اور پھر طرز بیان کچھ ایسا ہو جو بچوں کی نفسیات اور جذبات سے میل کھاتا ہو جس کی وجہ سے بچوں کا کامیاب ادیب و شاعر خود اس تخلیق کے وقت بچہ بن جاتا ہے۔ ایسے اشعار کو کم درجے کے بے روح اور سبک سستے شعر نہیں کہنا چاہیے یہ وہ اشعار ہیں جو بچپن سے بڑھاپے تک ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اشعار اگر چہ بہت آسان اور عام فہم بھی بچوں اور نسل جوان کی عمروں کے مطابق نہ ہو لیکن بچوں کو یاد ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے بچپن کی یادداشت بن جاتے ہیں جس کی وجہ ان شعروں کا بچوں کی فکر اور جذبات سے یکساں ہونا ہوتا ہے۔ جیسے علامہ اقبال کا یہ شعر

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اس شعر کے مقابلے میں جہاں بچگانہ پن ہر لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ شعر اسماعیل میرٹھی کا ہے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

جہاں تک اُردو شعر و ادب میں بچوں کے ادب کا تعلق ہے اس کی کمی کی وجوہات میں اُردو کی کم عمری بچپن کی کوتاہ مدت اور اُردو کے بچپن میں اس کا زیادہ تر بڑوں کے ساتھ ملاپ شامل ہے۔ بچوں کی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کے ادب کی پذیرائی بھی ویسے نہیں ہوئی جس طرح ہونی تھی چنان چہ بچوں کے ادب کے ادیب و شاعر بھی کچھ دن کے بعد ہمیشہ کے لیے بڑوں کے ادب کے ہو کر ہو گئے۔ بعض عمدہ شاعروں اور ادیبوں نے یہ روش ہمیشہ جاری رکھی جن میں نظیر اکبر آبادی، میر امن، اسماعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی، اقبال، حفیظ جالندھری، راشد الخیری، امتیاز علی تاج اور کئی چھوٹے بڑے جدید شاعروں اور ادیبوں کے نام اور کام شامل ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے وہ حصے جس میں تماشا کھیل طنز و مزاح سادگی کے ساتھ ملتا ہے بچوں کی توجہ کا باعث رہا۔ بچوں کی خاص نظمیں ''ہنس'' ریچھ کا بچہ ان کے تماشے کی یاد تازہ کر

دیتا تھا۔ میرامن کے پاس کہانی کا جو تجسّس اور شیریں بیانی تھی وہ بچوں اور نسل جدید کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ محمد حسین آزاد حقیقت میں استاد تھے ان کی نظموں اور نثر کی کتابوں میں وہ سب چیزیں تھیں جنہیں شاگردوں کے لیے لکھا تھا۔ آزاد کی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں ''قصص ہند'' اور ''نصیحت کا کرن پھول'' اُس دور میں پسند کی گئی تھیں۔ اسماعیل میرٹھی سب سے مشہور بچوں کے شاعر گزرے ہیں ان کی نظموں کو جو بچپن سے لبریز ہیں اور سادگی میں تازہ مضامین کی پیش کش ہے ایک کامیاب شاعر میں ڈھال دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے فارسی میں بچوں اور نسل جواں جاوید سے خطاب وغیرہ لکھا اور اُردو میں بھی ان کا کلام بچوں کے لیے کم مگر پُرتاثیر ہے اسی وجہ سے ان کے اشعار بچوں کو یاد ہیں ایک مصرعہ پڑھیے دوسرا وہ اٹھا لیتے ہیں۔ حالی نے ایک معلم کی حیثیت سے اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ گزارا وہ بچوں اور نسل جواں کی نفسیات جذبات اور ضروریات سے واقف تھے وہ تہذیب وتمدن کی امانت نئی نسل کو سپرد کرنے سے پہلے انہیں اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ وہ قومی قدروں کو اضافوں کے ساتھ اپنی آئندہ نسلوں کو پیش کرسکیں۔ حالی نے اگرچہ نثر میں کوئی علاحدہ کتاب نہیں لکھی مگر مجالس النسا میں بچوں کے لیے کارآمد باتیں کیں جن سے عورتیں اور ان کی آغوش میں پلے بچے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ حالی کی شاعری خصوصی طور پر ان کی نظمیں اور مسدس سے بچے جوان بڑھے سب اپنی اپنی فکر اور علمی استطاعت کے مطابق استفادہ کر رہے تھے۔ اسی لیے ان کی نظموں اور مسدس کے بند کو درسی کتابوں میں جگہ دی گئی تھی۔ اگرچہ ان شعروں کا مقصد اخلاق سازی اور قوم سازی تھا اور اس میں بچپن کا چلبلا پن اور معصومیت نہیں تھی اس لیے ہم ان اشعار کو نسل جدید کی تعمیر وتربیت کے شعر تو کہہ سکتے ہیں لیکن انہیں مکمل طور پر بچوں کے ادب میں جگہ نہیں دے سکتے۔ بچوں کے ادب کے متعلق ناقدوں نے انہی اشعار کو موردِ بحث وتنقید کیا کیوں کہ وہ حالی کی اُن بچوں کی نظموں سے واقف نہیں تھے جنہیں حالی نے محکمہ تعلیم کے تقاضے اور فرمائشات پر لکھی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب ٹریننگ کالج لاہور کے پرنسپل نولٹن کی زیرنگرانی بچوں کی نظموں کا مجموعہ ''اطوار بازیچہ'' شائع ہو چکا تھا اور بچوں کے متعلق نظمیں ''بچوں کا اخبار'' میں بھی شائع ہوئی تھیں۔ حالی نے بچوں کے لیے چھوٹی بڑی چودہ نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں حالی کی زندگی کے آخری دور کی نشانیاں ہیں۔ حالی نے ان نظموں کے لیے

مربع،مخمس،مسدس اور مثنوی کی ہیئت استعمال کی۔

جدول

عنوان	ہیئت	تعداد شعر
1-خدا کی شان	مثنوی	17شعر
2-بڑوں کا حکم مانو	مربع	18شعر
3-مرغی اور اس کے بچے	مثنوی	14شعر
4-بلی اور چوہا	قطعہ	6شعر
5-شیر کا شکار	مسدس	15شعر
6-پیشے	مثنوی	84شعر
7- گھڑیاں اور گھنٹے	مسدس	24شعر
8-دھان بونا	مثنوی	9شعر
9-روٹی کیوں کر میسر آتی ہے	......	78شعر
10-موچی	مخمس	12شعر
11- چٹھی رساں	قطعہ	22شعر
12-سپاہی	مثنوی	8شعر
13-ایک چھوٹی بچی کے خصائل	......	39شعر
14-نیک بنو نیکی پھیلاؤ	مسدس	21شعر

ان نظموں کا ماخذ جواہرات حالی ہے صرف آخری نظم مجموعہ نظم بچوں کا اخبار لاہور سے لی گئی ہے۔حالی کی نظموں کی یہ تعداد صحیح نہیں بلکہ اگر تلاش اور تحقیق کی جائے تو مزید نظموں کے ملنے کا امکان ہے۔سب سے بڑی نظم مثنوی ''پیشے'' کے عنوان سے لکھی اور سب سے چھوٹی نظم قطعہ ''بلی اور چوہا'' چھ شعر کا لکھا۔حالی کی ان نظموں میں بیانیہ انداز ہلکے پھلکے مگر دلچسپ موضوعات،تفریحی اور معلوماتی اشعار جو آسانی سے بچوں کو یاد ہو جائیں نظر آتے ہیں۔ان نظموں میں حالی نے بچوں

کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے پڑھنے والے کو بچہ بن کر پڑھنا پڑے گا ورنہ اس کے لطف ومزے سے فائدہ اٹھا نہیں سکے گا۔ حالی نے کسی حد تک بچوں کی نظموں میں اسماعیل میرٹھی کی نظموں کی تقلید کی ہے۔ اگرچہ وہ اُس سطح تک پہنچ نہ سکے۔ اسماعیل میرٹھی نے 1893ء میں اپنی بچوں کی نظموں سے زینت دے کر ابتدائی کلاسوں کے لیے ایک درسی کتابوں کا سلسلہ جاری کیا تھا جو محکمہ تعلیم کی ترغیبات کا نتیجہ بھی تھا۔ ان درسی کتابوں میں شامل بچوں کی نظمیں بہت مقبول ہوئیں اور کئی لوگ اُس دور میں اس میں دلچسپی لینے لگے۔

یہاں ہم پہلے حالی کی اُن مخصوص نظموں پر بات چیت کریں گے جو خاص بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اوپر دیئے گئے چودہ نظموں کے تقریباً پونے چار سو شعروں میں ایک شعر بھی مشکل سے ایسا نہیں نکلے گا جو کم عمر بچہ کی سمجھ سے باہر ہوگا۔ خدا کی شان کے عنوان سے اس چھوٹی سی سترہ (17) اشعار کی مثنوی میں خدا کی معرفت، خدا کی محبت، خدا کی نعمتیں، خدا کی رحمتیں ان مثالوں اور حالات سے بیان کی گئی ہیں جس سے بچہ واقف ہے۔ اسے تک بندی نہیں بلکہ بچوں کی شاعری سمجھنا چاہیے اور اس کی لذت سے آشنا ہونے کے لیے ناقد کو بچہ بننا ضروری ہے۔

تو ہی ہے سب کا پالنے والا
کام سب کا نکالنے والا

مغربی دنیا میں چھوٹے بچوں کے مکتب اور مدرسوں کو کنڈر گارڈن کہتے ہیں وہاں سب سے پہلے بچے کو اُس کے اعضا اور ان کے کاموں سے روشناس کیا جاتا ہے۔ حالی نے اس کام کے ساتھ بچے کے ذہن میں ہر نعمت کے والی اور ہر مشکل کے حل کرنے والے کے ساتھ ایک ابدی رشتہ بھی پیدا کیا ہے۔

آنکھ دی تو نے دیکھنے کے لیے
کام کرنے کو ہاتھ پاؤں دیئے
بات کے سننے کو دیئے دو کان
بات کہنے کو تو نے بخشی زبان

بھوک پیاس گرمی سردی جاڑا برسات سب کا یہاں ذکر کر کے اس کا ربط خدا سے کر دیا کہ جب لوگ ان سے تنگ آ جاتے ہیں تو صرف خدا ہی ان سے نجات دلاتا ہے۔

کیں سدا تو نے مشکلیں آساں
تیری مشکل کشائی کے قرباں

ایک ہلکی پھلکی لیکن موسیقی سے بھر پور نظم جو مربع کی شکل میں ہے اور کورس کے طور پر مل کر پڑھی جاسکتی ہے اخلاق کا سبق ہے۔

چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو
سر پر بڑوں کا سایہ، سایہ خدا کا جانو
وہ کام مت کرو تم جس کام سے وہ روکیں
اُس بات سے بچو تم جس بات پر وہ ٹوکیں
تم کو نہیں خبر کچھ اپنے برے بھلے کی
جتنی ہے عمر چھوٹی اتنی ہے عقل چھوٹی
سیکھو گے علم و حکمت ان کی ہدایتوں سے
پاؤ گے مال و دولت ان کی نصیحتوں سے

پوری نظم نصیحت سے سجی ہے لیکن نصیحت آمیز کچھ مبالغہ مصرعوں کے باوجود دل کو چھونے والی ہے۔ ابتدائی مکتب کے بچوں کے لیے اچھا ترانہ ہے۔

مرغی اور اس کے بچے کی مثنوی میں لاشعوری طور پر بچے اور ماں کے رشتے کو مضبوط کیا گیا ہے کہ بچے ماں کے ساتھ رہیں ماں کا کہنا سنیں اور یہ ممتا کی محبت ہی ہے جو حیوانوں اور انسانوں میں زندگی کا رنگ بھرتی ہے اور اس ممتا سے کئی گنا زیادہ خدا کی محبت ہے جو بندوں کی حفاظت اور ہدایت کرتا ہے۔ اس نظم میں بچے جو سنتے ہیں جو دیکھتے ہیں اُس کو نظم کہا گیا ہے۔

یہ جو ہے گھر میں تمہارے مرغا
چیختا زور سے ہے ککڑوں کوں
دن نکلتے ہی ادھر مرغی بھی

فوج بچوں کی لیے نکلے گی
ٹکڑے روٹی کے ہوں یا ہو دانہ
چونچ سے دے گی وہ منہ میں ان کے
مرغی جس طرح کہ ان بچوں کی
کرتی ہے شام و سحر رکھوالی
بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا
ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

حالی کی ان نظموں میں ہندوستانی اور ہندی کے الفاظ حسب ضرورت مصرعوں میں خوب صورت طریقے سے جڑ دیئے گئے ہیں۔ ان نظموں میں شاید ہی کوئی ترکیب اضافت تلمیح یا ادق خارجی لفظ ہو۔ محاورے وہ بھی روزمرہ میں جو بچوں کی علمی اور فکری معیار سے نسبت رکھتے ہوں نظم میں خوب صورتی اور تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ حالی کی شاعری میں ترقی پسندی کا عنصر یہاں کھل کر سامنے آتا ہے جہاں ہر کام کی قدر اور اس کی عزت کی گئی ہے۔ کوئی بھی معمولی یا جاگیردارانہ لہجہ میں ادنی پیشہ حقیقت میں ادنی نہیں ہوتا اور اُس پیشہ کو عمدگی سے کرنے والا کسی دوسرے اعلی پیشے سے کم نہیں ہوتا۔ حالی قوم کی تربیت کر رہے تھے جہاں روسا حکمران اونچے خاندان کے افراد شاہی کے بجائے گدائی کر رہے تھے۔ روٹی کپڑا اور مکان کے محتاج ہو گئے تھے لیکن اُن پیشوں کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتے تھے جن میں محنت مشقت عرق ریزی کی ضرورت ہوتی تھی۔ قوم جل چکی تھی لیکن رسی کا بل ابھی باقی تھا جس کا اثر ان خاندان کے بچوں پر منفی پڑ رہا تھا ایسے حساس موقع پر حالی نے کئی بچوں کی نظمیں لکھ کر انہیں ترغیب دی کہ ہر پیشہ معتبر اور مقتدر ہے۔ ایک کارگر جو جوتے بنانے میں ماہر ہے اس کی مہارت اور کاریگری کسی طرح سے یونان کے فلاسفر افلاطون کے فلسفۂ کلام سے کم نہیں۔

حالی کی نظمیں پیشے، چٹھی رساں، موچی، سپاہی وغیرہ وہ نظمیں ہیں جن میں اوپر بیان کیے گئے مطالب کے ساتھ ساتھ اُن پیشوں کی معلومات اور اصطلاحوں سے بچوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔

حالی نے پیشہ کے عنوان سے مثنوی کی شکل میں چوراسی (84) اشعار پر مشتمل بچوں کی

طویل ترین نظم لکھی ہے۔ یہ نظم ماں اور بیٹوں کے درمیان بات چیت ہے۔ یہاں حالی نے سات بیٹوں کی گفتگو کو نظم کیا ہے جو اپنی ماں سے مخاطب ہو کر باری باری سے کہتے ہیں۔

ے میں بڑا ہوں گا جب تو اماں جان
اپنے مقدور بھر بنوں گا کسان

ے میں جواں ہوں گا جب تو اماں جان
فوج میں جا کے ہوں گا میں بھرتی

ع آپ کے باغ کا بنوں مالی
ع کہ بڑا ہو کر میں بنوں دھوبی
ع کنسٹبل بنوں گا اول بار
ع ہو سکا تو بنوں گا چٹھی رساں
ع اک بڑھی مستر بنوں گا میں

ہمارے معاشرے میں کسان، دھوبی، سپاہی، ڈاکیا، کنسٹبل، بڑھئی اور مالی بننا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صرف اعلیٰ ملازمتوں، انجینئروں، ڈاکٹروں، پروفیسروں اور تاجروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا جس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا کہ لوگ بیکاری اور گدائی کے شکار ہو کر ذلیل و خوار ہوئے۔ حالی بچوں کے ذہنوں اور ان کی نفسیات سے واقف تھے وہ یہ بیج بچپن کے زرخیز ذہن میں بو رہے تھے تاکہ جب وہ بڑے ہوں تو یہ صحیح فکر کا تناور درخت بن جائے۔ وہ ہر پیشہ کے کام و کاج کے ساتھ اس میں ترقی اور مہارت کی اپج بھی بچہ کی زبان سے دوہرا رہے تھے۔

(کسان)

ہل چلاؤں گا بیج بوؤں گا
وقت پر جب کہ غلہ کاٹوں گا
بھائی بہنوں کا حصہ باٹوں گا

جو کماؤں گا گھر میں لاؤں گا

(سپاہی)

سیکھ لوں میں کہیں قواعد جنگ
مشق بندوق کے لگانے کی

جنگ کی ہے مہم سے کیا ڈرنا
آدمی کو ہے ایک دن مرنا

کیا عجب ہے رسالہ دار بنوں
اونچی ہو جائے گی تمہاری ناک

سب کہیں گے رسالہ دار کا ماں

(مالی)

کیاریاں ہر طرح کی کھودوں گا
نت نئے پھول میں اگاؤں گا

موتیا اور چنبیلی اور جوہی
دیکھنا کیسے گل کھلاؤں گا

(دھوبی)

اونچے کر کر کے دست و بازو میں
کپڑے دھویا کروں چھوا چھو میں

اجلے براق صاف اور ستھرے
برف شرمائے دیکھ کر جن کو

کھاؤں گا اور کھلاؤں گا اماں

تم کو میں حق حلال کا لقما

(کانسٹبل)

بدمعاشوں کو تنگ کر دوں گا
جیل خانوں کو ان سے بھر دوں گا
جو کروں گا تو میں دل و جاں سے
راست بازی سے اور ایماں سے

(ڈاکیا)

لے کے سب چٹھیوں کا میں طومار
بانٹ آیا کروں گا نام بنام
خط کسی کا نہ میں کروں گا تلف
نہ بنوں گا ملامتوں کا ہدف

(بڑھئی)

نہ بڑھئی وہ ہے جن کا نام بڑھئی
جو کہ پھرتے ہیں کہتے کام بڑھئی
اس ہنر میں بنوں گا میں استاد
اور کروں گا نئے نئے ایجاد
کارخانہ خود اک بنا لوں گا
ہو گی جب ہر طرف مری شہرت
دیکھنا گاہکوں کی پھر کثرت
مستری ایک ہو اگر ہشیار

ہر جگہ اس کے مشتری ہیں ہزار

حالی یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی کام گرا ہوا بے کار یا ذلیل نہیں ہوتا۔ اگر ایک ظاہری طور پر معمولی کام ہو لیکن کارگر اُسے کمال سے انجام دے تو اس کاریگر کی حیثیت کسی عظیم شخصیت سے کم نہیں۔ حالی معاشرے کی خامیوں کو خوبیوں سے بدل رہے تھے جس کا پھل ہم نے برصغیر میں دیکھا۔ اس موقع پر ہم ایک واقعہ جسے مولوی عبدالحق نے اپنے خطبوں میں لکھا ہے پیش کر کے حالی کے انقلاب ذہن کی نشان دہی کرتے ہیں۔

حالی کی ایک چھوٹی بارہ شعر کی نظم موچی ہے۔ جہاں ایک بچہ جو کہتا ہے ''میں موچی کہلاتا ہوں''۔

ڈاکٹر اقبال ایک زمانے میں انارکلی میں رہتے تھے، اس بازار میں رہنے کے مکان اوپر تھے اور نیچے دکانیں تھیں جہاں ڈاکٹر اقبال رہتے تھے، اس کے عین نیچے ایک درزی کی دُکان تھی، جس نے نہایت جلی حروف میں خوشخط شیشے کے ایک چوکھٹے میں غالب کا یہ مصرع لکھ رکھا تھا ''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا'' اس درزی کی فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے، وہ قوت کے تقاضا کو کیا خوب سمجھا اور اس نے اس مصرع سے کیا خوب کام لیا، اس نے ہماری بھی ایک مشکل حل کر دی، یعنی انسان اب درزی کی دکانوں، ہیر کٹنگ سیلون اور بیوٹی کلچر ایوانوں میں بنتے ہیں۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ موچی کیسے چمڑے سے جوتا بناتا ہے اس میں موچی کے اوزار رانپی اور برشا اور اس کام میں بھی محنت عمدگی کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ ہم کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔

چمڑا مول منگاتا ہوں
دھو کے اُسے سکھلاتا ہوں

کل کر نرم بناتا ہوں
کرتا ہوں خوب ان کو صفا

پھر لے نپا اور تلا
سیتا ہوں دونوں کو ملا

پھر جوتی قالب پہ چڑھا
ٹھوک ٹھکا اور کوٹ کٹا

رانپی سے برشا کے تلا
سیتا ہوں دونوں کو ملا

سال کے اندر میرا بوٹ
میں ضامن جو جائے ٹوٹ

اسی طرح سپاہی اور چٹھی رساں یعنی پوسٹ مین کے بارے میں قدرے تفصیل سے اُن کے کام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حالی کی ایک عمدہ بچوں کی نظم ہے ''روٹی کیوں کر میسر آتی ہے'' یہ نظم مثنوی کی شکل میں تقریباً اسی (80) اشعار سے بنی ہے۔ یہاں حالی نے پہلے تو بچوں کو یہ بتایا ہے کہ کسان گیہوں اگاتا ہے اور اسے بازار میں فروخت کرتا ہے جسے خرید کر گھر میں ماں چکی سے پیس کر آٹا بناتی ہے اور چھان کر اس کو گوندھ کر روٹی پکاتی ہے۔ لیکن ان سادے کام کاج بیان کرتے ہوئے حالی بچوں کے لیے نصیحت کے علاوہ مزاح کے پہلو بھی نکالتے ہیں: ؎

کسانوں کا ہے یہ احسان ہم پر کہ ہوتے ہیں گیہوں ہم کو میسّر
خدا کے گھر کا سمجھو ان کو مودی
وہ بے چاری ہمیشہ صبح ہوتے کہ جب تم بے خبر ہوتے ہو سوتے
جھٹ آٹا پیسنے جا بیٹھتی ہے
اسی چکی کا پسا تھا وہ آٹا چڑھے پروان ہو تم جس کو کھا کھا
لگی جب گوندھنے آٹا جھپا جھپ اور اس میں مارنے مکّی شپاشپ
وہ یوں آٹے کو ہے دیتی تھپکتی کہ گویا لڑ رہی ہے اس سے کشتی

حالی نے روٹی جو گھر پر توے پر پکائی جاتی ہے اور باہر تندور پر بنائی جاتی ہے دونوں کو خوبصورت طریقے سے بیانیہ شعروں میں نظم کیا ہے۔ کچھ الفاظ جیسے روٹی کو جس کپڑے کے گدے پر لگا کر تنور میں لگاتے ہیں بچوں کو سکھاتے ہیں۔

گھڑی ہاتھوں پہ پھیلائی بڑھائی
رفیدے پر دھری اور چٹ لگائی

اس نظم کا خاص حسن اس میں ماں کی محنت اور اس کی بچوں کی خاطر ہر قسم کی زحمت کو برداشت کرنا ہے جس سے بچوں کے دل و دماغ میں ماں کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو۔

بھلا ماں کے سوا کس سے بن آئے
نہ کھائے آپ اور سب کو کھلائے

یہی رہتا ہے دن رات اس کو رونا
پکانا ریندھنا سینا پرونا

اُسے تم کو کھلانے سے ہے مطلب
نہیں کچھ اپنے کھانے سے ہے مطلب

وہ کرتی رہتی ہے تم سب کی خدمت
نہیں ملتی اُسے مرنے تک فرصت

نہیں کر سکتے حق ان کا ادا تم
کرو ان پر سے گر جاں بھی فدا تم

سمجھ لو اس سے ماں کی قدر و عظمت
کہ اس کے پاؤں کے نیچے ہے جنت

ایک نو شعر کی مثنوی ''دھان بونا'' میں دھان کس طرح بویا جاتا ہے جس میں کئی ہندی الفاظ سیوا، سہاگا، گیانی اور محاورہ دھان پان استعمال کیا گیا ہے۔

بس دھان کو نازک ایسا ہی جان
ہو جیسے کہ دھان پان انسان

حالی کی بچوں کی نظموں میں سب سے نسبتاً مشکل نظم گھڑیاں اور گھنٹے کے عنوان سے مسدس کی شکل میں چوبیس اشعار کی نظم ہے جس کا محور وقت ہے یعنی گھڑیاں جو وقت بتانے کا آلہ ہیں وہ دن رات کام کرتی رہتی ہیں انہیں دن رات گرما سرما اور پر نیچے امیر غریب بلندی پستی شاہ و گدا سب کے پاس ایک ہی حالت میں مسلسل چلتی رہتی ہے تھکن اور آرام ان کے لیے موت ہے۔

چنان چہ انسان کو بھی رکنا نہیں چاہیے بلکہ زندگی کا سفر ہر طرح اور ہر طریقے سے جاری وساری رہے۔ سچ کہا ہے حرکت میں برکت ہے۔ کچھ شعر نمونے کے پیش کر رہے ہیں۔

دوپہر ہو یا رات ہو یا صبح ہو یا شام
جب دیکھیے چلنے سے سدا اپنے انہیں کام

مینار کے اوپر ہوں کہ تہہ خانے کے اندر
رکھے انہیں پاس اپنے سکندر کہ قلندر

ان کو نہیں یاں اونچ کا یا نیچ کا کچھ غم
اپنی اسی ٹک ٹک سے سروکار ہے ہر دم

دیتے ہیں سنو غور سے ہر دم یہ دہائی
لو وقت چلا ہاتھ سے کچھ کر لو کمائی

حالی نے مسدس کی شکل میں ٹیپ کے شعر کو ساتوں بندوں میں یکساں رکھ کر ترجیع بند لکھا۔

تو مکو اچھے کام دکھاو
نیک بنو نیکی پھیلاو

سچ بولو، صاف اور ستھرائی رکھو، ہمسایے سے اچھے برتاو کرو، محنت کرو علم حاصل کرنے کے لیے کمانے کے لیے اور رحم دل رہو بری عادتوں میں مت پڑو۔

سچ بولو سچے کہلاو
سچ کی سب کو ریس دلاو

ہو گی تم میں گر ستھرائی
سب سیکھیں گے تم سے صفائی

جو پڑھنے میں کرتے ہیں محنت
سیکھتی ہے شوق اُن سے جماعت

نیک ہے نیکی سب کو بتاتا
بد اوروں کو بد ہے بناتا

جواہرات حالی میں ایک مثنوی انتالیس شعر کی ایک چھوٹی بچی کے خصائل کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ نظم حالی نے 1909ء میں ممتاز فاطمہ عرف سیدہ خاتون کے لیے لکھی جب وہ ڈھائی سال کی تھی۔ سیدہ خواجہ غلام ثقلین کی بیٹی اور غلام سیدین کی چھوٹی بہن تھی۔ حالی اسے بہت چاہتے تھے۔ حالی نے اس نظم میں نہ صرف سیدہ کی رفتار گفتار صورت شکل عادت و مزاج کو اس نظم میں پیش کیا ہے بلکہ اُس کی نفسیات اور بچوں کے نکات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس نظم کو ہر دو ڈھائی سالہ بچے کی نفسیات، عادات اور خصوصیات سے جوڑا جا سکتا ہے۔

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے
صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے

ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان
پر سب اچھے برے کی ہے پہچان

ہے ادب سے بڑوں کا لیتی نام
سب کو کرتی ہے ہاتھ اٹھا کے سلام

نہیں منہ سے نکلتے پورے بول
بولتی ہے سدا ادھورے بول

نئے آتے ہیں گھر میں جب مہمان
دیکھ دیکھ اُن کو ہوتی ہے خنداں

دیکھتی ہے مڑ مڑ سب کو
پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو

بس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا
اور وہیں اُس نے ہاتھ پھیلایا

عمر اس کی خدا دراز کرے
علم سے اس کو سرفراز کرے

حالی لڑکیوں کی تعلیم کے حامی تھے وہ دعا کے ساتھ اس کا بندوبست بھی کرتے تھے چنان چہ اپنے خاندان اور محلے کی لڑکیوں کے لیے لڑکیوں کا مدرسہ کھولا تھا۔

حالی نے اسی طرح ایک دولت مند باپ اور اس کے تین بیٹوں کی کہانی نظم کی جس میں بتایا کہ خیانت نہ کرنا کسی معصوم زندگی کو بچانا نیک اور عمدہ کام ہیں لیکن سب سے اہم اور مبارک کام دشمن سے انتقام کے بدلے رحم کرنا ہے۔ جیسا کہ اُس کے چھوٹے بیٹے نے دشمن کو بچا کر اپنی صورت بھی نہ بتائی یہ سب سے بڑا احسان تھا۔

مارنا اس کا نہ تھا کچھ دشوار
اک اشارہ میں تھا وہ لقمۂ غار

منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا
اس کو شرمندۂ احسان نہ کیا

حالی خود محب وطن تھے اور اس جذبہ کو عام کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ان کی خوب صورت نظم حب وطن ان کے ایمان کا جزو معلوم ہوتی ہے۔ حالی نے اس محبت کو صرف زبانی نہیں رکھا بلکہ اہل وطن کے ساتھ محبت اخوّت ہمکاری ہمدردی، خوش اخلاقی، ایثار و قربانی کا جذبہ بھی ضروری بتایا۔ حالی وطن کو خوش حال توانا اور پریم کا ساگر دیکھنا چاہتے تھے۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

حالی ایسے وطن کی ایک مشتِ خاک کو بہشت سے بدلنے کو تیار نہ تھے۔

تری اک مشت خاک کے بدلے

لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالی چونکہ خود مذہبی ذہن کے مالک تھے اسی لیے وہ نئی نسل میں خدا کی شان اس کی نعمتوں کا ذکر اس کی عبادت کا مزا اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق بندے پر زور دیتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایمان کا بیج بچپن ہی سے بویا جائے اس لیے نرم اور سلیس زبان میں معرفت کے درس دیتے تھے۔

تو ہی ہے سب کا پلانے والا　　کام سب کے نکالنے والا
بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے　　پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے

وہ خدا پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتے اور اسی ایمان کو کامیابی کی کنجی سمجھتے تھے۔

خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے
کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے
پڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو تم آپ ہانکو

حالی کے تمام تر کلام کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کی شاعری کا ایک اہم مقصد بچوں اور نئی نسل کے نوجوانوں میں تعلیم و تربیت کا شوق محنت اور کوشش کی عادت، شرافت اور انسانیت کی نمو اخلاق و کردار سازی کے ساتھ ساتھ وقت کی قدر ہمت و استقلال کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ وہ جانتے تھے بزرگوں پر اخلاقی فرض ہے کہ وہ بچوں کی راہنمائی کریں اور اکثر لوگ غفلت برتتے تھے چنان چہ خود انہوں نے سیدھی سادہ زبان میں میٹھے میٹھے انداز میں ان قدروں کو اپنی نظموں میں ایسا پیش کیا جو فوری دل نشین ہو گئے۔ قطعات ہو کہ رباعیات، غزلیات ہو کہ مثنویات، مسدس ہو کہ ترکیب بند ہر صنف شاعری میں موقع کی نزاکت اور متن کی رعایت سے مذہبی، قومی، علمی، وطنی، اخلاقی، تعلیمی اور رفاہی نکات لکھ دیتے جوان کے کلام میں مختلف طولانی نظموں اور چند قطعات کے علاوہ وہ غزلوں کے اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں۔ خدا پر ایمان اور پیغمبر اسلام سے محبت جیسے خود رکھتے اُسی طرح نسل جوان کو بھی نصیحت کرتے۔

حالی قصے کہانی کے ذریعہ بچوں اور نوجوانوں میں نیکی، ہمدردی اور مدد کا جذبہ ابھارتے

ہیں۔ کہیں یہ بتاتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا چراغ جو راستے پر بڑھیا نے رکھا ہے وہ محلوں کے اُن فانوسوں اور برقی جھاڑوں سے بہتر ہے کیوں کہ یہ مٹی کا چراغ کئی لوگوں کا مونس اور مددگار ہے دراصل یہی وہ چراغ ہیں جن کی معنوی روشنی افلاک تک پھیلی ہوئی ہے۔

چھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِرہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آسان گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور فانوس سے
روشنی محلوں کے اندر رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

حالی نے اپنے کلام میں جا بجا عشقِ رسول e کو ظاہر کیا ہے۔ وہ سیرت رسول e کو شریعت کا لازم جانتے تھے۔ وہ حضور کی تعلیمات، اخلاقیات، حقوق انسان کی حفاظت، حریت اور حضور کی اور ان کی اولاد کی محبت کو جزو دین مانتے تھے اور یہ محبت کا بیج وہ بچپن سے ہی دل میں بونا چاہتے تھے تا کہ وہ آگے چل کر عشق محمدی e کا توانا درخت بن جائے۔

ایمان جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے وہ تیری محبت تری عزت کی ولا ہے

حالی نے ضمیمۂ مسدس کے ساتھ ایک نعتیہ نظم عرض حال بجناب سرور کائنات e لکھی۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت
اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

ایک دوسری نعتیہ نظم دیکھیے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطاکار سے درگزر کرنے والا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کا شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

1 خدا کی شان

اے زمین آسمان کے مالک
ساری دنیا جہان کے مالک
تیرے قبضے میں سب خدائی ہے
تیرے ہی واسطے بڑائی ہے
تو ہی ہے سب کا پالنے والا
کام سب کا نکالنے والا
بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے
پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے
آنکھ دی تو نے دیکھنے کے لیے
کام کرنے کو ہاتھ پاؤں دیے
بات کے سننے کو دیے دو کان
بات کہنے کو تو نے بخشی زبان

دن بنایا کمائی کرنے کو
رات دی تو نے نیند بھرنے کو

آئی موسم سے تنگ جب خلقت
تو نے موسم کی دی بدل صورت

گرمیاں ہو گئیں اجیرن جب
تو نے برسات بھیج دی یا رب

سب کے گرمی سے تھے خطا اوسان
مینہ برسنے سے آئی جان میں جان

گئے جب مینہ سے لوگ سب گھبرا
حکم سے تیرے چل پڑی پچھوا

یا تو تھیں ساری چیزیں سیل رہیں
یا رہا سیل کا نہ نام کہیں

جاڑا آ پہنچا اور گئی برسات
دم کے دم میں پلٹ گئے دن رات

پھر لگی پڑنے جب بہت سردی
مشکل آسان تو نے پھر کر دی

جاڑا آخر ہوا اور آئی بہار
جنگل اور ٹیلے ہو گئے گلزار

تو یوں ہی رت پہ رت بدلتا رہا
یوں ہی دنیا کا کام چلتا رہا

کیں سدا تو نے مشکلیں آساں
تیری مشکل کشائی کے قرباں

io

2 بڑوں کا حکم مانو

اے بھولے بھالے بچو، نادانو، ناتوانو
سر پر بڑوں کا سایہ، سایہ خدا کا جانو
حکم اُن کا ماننے میں برکت ہے میری جانو!
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

ماں باپ اور اُستاد سب ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک اُن کی حق میں تمہارے نعمت
کڑوی نصیحتوں میں اُن کی بھرا ہے امرت
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

ماں باپ کا عزیزو! مانا نہ جس نے کہنا
دشوار ہے جہاں میں عزت سے اُس کا رہنا
ڈر ہے پڑے نہ صدمہ ذلت کا اُس کو سہنا

879

چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

دنیا میں کی جنھوں نے ماں باپ کی اطاعت
دنیا میں پائی عزت، عقبیٰ میں پائی راحت
ماں باپ کی اطاعت ہے دو جہاں کی دولت
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

سیکھو گے علم و حکمت، ان کی ہدایتوں سے
پاؤ گے مال و دولت اُس کی نصیحتوں سے
پھولو گے اور پھلو گے، اُن کی ملامتوں سے
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

تم کو نہیں خبر کچھ اپنے برے بھلے کی
جتنی ہے عمر چھوٹی، اتنی ہے عقل چھوٹی
ہے بہتری اُسی میں جو ہے بڑوں کی مرضی
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

وہ کام مت کرو تم جس کام سے وہ روکیں
اُس بات سے بچو تم جس بات پر وہ ٹوکیں
جھٹک جاؤ دوڑ کر تم گر آگ میں وہ جھونکیں
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

جو دیں تمہیں وہ کھا لو نعمت سمجھ کے اس کو
دیں زہر بھی تو پی لو امرت سمجھ کے اُس کو
اور خاک دیں تو لے لو دولت سمجھ کے اس کو
چاہو اگر بڑائی ، کہنا بڑوں کا مانو

ہے کوئی دن میں پیارو وہ وقت آنے والا
دنیا کی مشکلوں سے تم کو پڑے گا پالا

مانے گا جو بڑوں کی جیتے گا وہ ہی پالا [1]

چاہو اگر بڑائی، کہنا بڑوں کا مانو

io

[1] جواہراتِ حالی (صفحہ 3) ''جیتے گا وہی پالا'' درج ہے۔ ''وہی پالا'' مفاعیلن کا ہم وزن ہے۔ یہ نظم، بحر مضارع مثمن اخرب میں ہے جس کا آخری رکن ''فاعلاتن'' ہے۔

3 مرغی اور اس کے بچے

شام ہے اور اندھیرے کا وقت

ہے پرندوں کے بسیرے کا وقت

اب ہے پانی کی نہ دانے کی تلاش

جس کو ہے اپنے ٹھکانے کی تلاش

رات بھر جب کہ گزر جائے گی

اور اُجالے کی گھڑی آئے گی

سنیو تم اُٹھ کے اندھیرے سے ذرا

یہ جو ہے گھر میں تمہارے مرغا

پھڑپھڑاتا ہے پر و بال کو کیا

جاڑ دیتا ہے وہ سستی گویا

اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

چیختا زور ہے ہے "ککڑوں کوں"

دن نکلتے ہی ادھر مرغی بھی
فوج بچوں کی لیے نکلے گی

تاکہ وہ صبح کا کھائیں کھانا
رات بھر کے ہیں بے آب و دانہ

چونچ سے دے گی وہ منہ میں ان کے
جو پڑے پائے گی دانے ڈُنکے

ٹکڑے روٹی کے ہوں یا ہو دانہ
ہے غذا ان کی یہی روزانہ

مینہ برستا ہے تو بچے سارے
آ دبکتے ہیں پروں میں ماں کے

چین سے ان میں چھپے رہتے ہیں
ماں کی چھاتی سے لگے رہتے ہیں

مرغی جس طرح کہ ان بچوں کی
کرتی ہے شام و سحر رکھوالی

بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا
ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

4 بلی اور چوہا

سچ پوچھیے تو چوہوں کا بھی دم ہے ناک میں
دیکھا نا، بلی آ ہی گئی ان کی تاک میں

چوہے ہمیں ستاتے ہیں اور بلّیاں انہیں
دم ان سے اُن کا، اُن سے ہمارا ہے ناک میں

دیکھا تو جا بہ جا سے وہ کترا ہوا ہے آج
آیا تھا اک لفافہ بڑا کل کی ڈاک میں

ان کے سوا تھا چور کہو اس کا اور کون؟
تھا شہد کچھ لگا ہوا بوتل کی کاک میں

گر بلیاں نہ ہوں تو بلیں کھود کھود کر
چوہے ملا کے چھوڑیں مکانوں کو خاک میں
بلی ادھر ہٹی اورادھر آئے سب نکل
وہ ان کی تاک میں ہے تو یہ اس کی تاک میں

io

5 شیر کا شکار

سامنے دیکھو ہے وہ جنگل
وحشی جانوروں کا دنگل
پھرتے ہیں یاں سب توڑتے کل کل
شیر ، بگیلا ، چیتا ، چیتل
بعضے بے آزار ہیں ان میں
اور بعضے خوں خوار ہیں ان میں
دیکھنا وہ اک کہری ناہر [1]
نکلا اپنی بنی [2] سے باہر
پکڑے گا ظالم داؤں لگا کر
کوئی نہ کوئی صید مقرر
بھوک میں ہے سب کچھ کھا لیتا

بھیڑوں پہ لیکن جان ہے دیتا

بیٹھ کے ہاتھی پر بے کھٹکے
ہم بھی اب اس کے پیچھے پیچھے
آہستہ آہستہ ہیں چلتے
ہم سے کہاں جائے گا یہ بچ کے

یہ بھی شکاری، ہم بھی شکاری
دید کے قابل ہے یہ سواری

لو دیکھو وہ دبکا دبکا
بھیڑوں کے ریوڑ میں جا پہنچا

شیر اور اس پر بھوک میں جھلا
کر ہی گیا اک بھیڑ کو لقما

ٹوک کے اور للکار کے اس کو
جائیں گے ہم بھی مار کے اس کو

دیکھو دیکھو غل نہ مچاؤ
چھتیا کر بندوق لگاؤ

خوب نشانہ بیٹھا ہے آؤ
گرتے ہی اس کو جا منگواؤ

کھال ہم اس کی لے کے چلیں گے
دوستوں کو سوغات یہ دیں گے

۱۔ کہری ناہر: نہایت زبردست شیر (ناہر ہندی میں شیر کو کہتے ہیں)۔ (بحوالہ Platts)
۲۔ ''بنی'': بن کی تصغیر کے طور پر یہ لفظ چھوٹے جنگل یا کچھار کے معنی میں، کہیں کہیں مستعمل ہے۔

6 پیشے
(ماں سے بیٹوں کی گفتگو)

(1)

میں بڑا ہوں گا جب تو اماں جان
اپنے مقدور بھر بنوں گا کسان
کام جو کرنا چاہو ہے آسان
ہیں یہ آخر کسان بھی انسان
نہیں محنت سے ہوں میں گھبراتا
خالی پھرنا نہیں مجھے بھاتا
ہل چلاؤں گا بیج بوؤں گا
شوق میں کھاؤں گا نہ سوؤں گا
وقت پر جب کہ غلہ کاٹوں گا
بھائیو بہنوں کا حصہ باٹوں گا
ناج سے گھر تمہارا بھر دوں گا
ان سے تم کو نچنت کر دوں گا
چھکڑے بھر بھر کے شہر جاؤں گا
ناج کے بدلے چاندی لاؤں گا

بھس کے انبار یاں لگا دوں گا
گائے بیلوں کو میں چھکا دوں گا

اتنی لایا کروں گا ترکاری
کہ نہ آئے گی پکنے کی باری

الغرض خوب سا کماؤں گا
جو کماؤں گا گھر میں لاؤں گا

کام کوئی نہ پھر رہے گا بند
میں بنا دوں گا تم کو دولت مند

(2)

میں جواں ہوں گا جب تو اماں جان
اپنے جی میں یہ میں نے لی ہے ٹھان
تم نے مجھ کو اگر اجازت دی
فوج میں جا کے ہوں گا میں بھرتی

ہے بہت ہی یہ میرے جی میں امنگ
سیکھ لوں میں کہیں قواعدِ جنگ
میں نے سیکھی ہے مدرسوں میں ڈرل
ایسی ہو گی کہاں کی وہ مشکل

گو نہیں ہوں سپاہی زادہ میں
ہوں سپاہی سے پر زیادہ میں
جنگ کی ہے مہم سے کیا ڈرنا
آدمی کو ہے ایک دن مرنا

مشق بندوق کی لگانے کی
رسم ہے آج کل زمانے کی
روزمرہ کا ہے یہ خاصا کھیل
ہوئی تو کیا کبھی کبھی کی جھمیل

کام اپنا کیا کروں گا خوب
فرض اپنا ادا کروں گا خوب
حکم کی وہ کروں گا میں تعمیل

کہ نہ ہو گی ذرا بھی اس میں ڈھیل

کیا عجب ہے رسالدار بنوں
اور سواروں میں شہ سوار بنوں

فوج میں ہو کچھ آبرو میری
ہے یہ مدت سے آرزو میری

ملک میں جبکہ ہو گی میری دھاک
اونچی ہو جائے گی تمہاری ناک

پھر تو تم کو بھی اے مری اماں
سب کہیں گے رسالدار کی ماں

(3)

میری جاں اور میری اماں جی
میں بڑا ہوں تو چاہتا ہے جی

گھر میں بیٹھا رہوں نہ یوں خالی
آپ کے باغ کا بنوں مالی

خود ہی اس کام سے مجھے ہے لگاؤ
کوئی مجھ کو بتاؤ یا نہ بتاؤ

کیاریاں ہر طرح کی کھودوں گا
خوب ان کی زمیں کو گودوں گا

ایسا رکھوں گا رستہ صاف ان کا
کہیں ڈھونڈا نہ پائے گا تنکا

نت نئے پھول میں اگاؤں گا
دیکھنا کیسے گل کھلاؤں گا

باغ میں اپنے نہر لوں گا میں
سر درختی میں پانی دوں گا میں

جو لگاؤں گا پود جائے گی لگ
او پودے لگاؤں گا سو الگ

موتیا اور چنبیلی اور جوہی
روز کے روز ڈھیروں اترے گی

ہے بہت شوق تم کو پھولوں سے
روز لاؤں گا جھولیاں بھر کے

کیوں نہ آئے گی آئے دن ڈالی
جب خدا اپنے گھر کا دے مالی

کس طرح ہو گی پھر نہ خوش حالی
آپ کا باغ، آپ کا مالی

(4)

میری تو یہ خوشی ہے اماں جی
کہ بڑا ہو کے میں بنوں دھوبی

صبح اٹھتے ہی ہاتھ اور منہ دھو
فارغ اپنی ضرورتوں سے ہو

روز جایا کروں میں دریا پر
لادی کپڑوں کی بیل پر لے کر

چھوڑ دوں بیل کو وہاں چرنے
اور کام اپنا پھر لگوں کرنے

اونچے کر کر کے دست و بازو میں
کپڑے دھویا کروں چھوا چھو میں

لاؤں دھو دھو کے ایسے میں کپڑے
اُجلے، برّاق، صاف اور ستھرے

برف شرمائے دیکھ کر جن کو
آنکھ میں میل ہو اور ان میں نہ وہ

محنت اس طرح کر کے میں دن بھر
گھاٹ سے آؤں شام کو گھر پر

ٹھیک کر کے کلپ سے کندی سے
مالکوں کو دے آؤں جلدی سے

پھر یوں ہی میلے کپڑے لا لا کر
از سر نو چڑھاؤں بھٹی پر

گھاٹ کی آج، گھر کی کل باری
رہے یہ سلسلہ یوں ہی جاری

الغرض خوب کپڑے دھوؤں گا
نہ چراؤں گا او نہ کھوؤں گا

نہ کبھی کام سے تھکوں گا میں
کام یہ خوب کر سکوں گا میں

کھاؤں گا اور کھلاؤں گا اماں
تم کو میں حق حلال کا لقما

(5)

جب کہ ہوں گا بڑا تو اے حضرت
لوں گا کوئی پولس کی میں خدمت

کنسٹبل بنوں گا اول بار
اور پھر رفتہ رفتہ تھانے دار

پھر ہوا سامنے نصیب اگر
کوتوالی کا آئے گا نمبر

گشت کرتا پھروں گا راتوں کو
دیکھتا چوٹوں کی گھاتوں کو

چور، اُچکے، اُٹھائی گیرے جو
پاؤں گا، باندھ لاؤں گا سب کو

میرے دل پر رہے گا چور کا داغ
جب تک اس کا لگا نہ لوں گا سراغ

بدمعاشوں کو تنگ کر دوں گا
جیل خانوں کو ان سے بھر دوں گا

جو کروں گا تو میں دل و جاں سے
راست بازی سے اور ایماں سے

نہیں کرنے کا تیرا میرا خوف
دل میں رکھوں گا بس خدا کا خوف

ہو گر اس نوکری میں خوف خدا
تو نہیں کام کوئی اس سے بھلا

(6)

میں بڑا ہوں گا جب کہ بی اماں
ہو سکا تو بنوں گا چٹھی رساں

ڈاک خانے سے ڈاک لاؤں گا
پھرتی سے جاؤں گا اور آؤں گا

لے کے سب چٹھیوں کا میں طومار
اور لگا کر انہیں محلے وار

بانٹ آیا کروں گا نام بنام
صبح کی صبح اور شام کی شام

کارڈ ہوں یا لفافے یا پیکٹ
پارسل اور سارے پیمفلٹ

لاؤں گا اپنی ذمہ داری سے
اور دوں گا بھی ہوشیاری سے

حقِّ خدمت ادا کروں گا میں
غفلتوں سے بچا کروں گا میں

کام اپنا کروں گا چستی سے
نہ کہ مچلائی اور سستی سے
خط کسی کا نہ میں کروں گا تلف
نہ بنوں گا ملامتوں کا ہدف
کھاؤں گا اور کھلاؤں گا ایسی
تم کو اماں حلال کی روزی

(7)

جب کہ اماں جوان ہوں گا میں
اک بڑھئی مستری بنوں گا میں
نہ بڑھئی وہ، ہے جن کا نام بڑھئی
جو کہ پھرتے ہیں کہتے ''کام بڑھئی''
بلکہ ایسا بنوں گا کاری گر
خود غرض مند آئیں جس کے گھر
آرزو یہ میری بر آئے کاش
دیکھنا پھر میری تراش خراش
میں نہانی [1] سے اور بسولے سے
ایسے کتروں گا پول اور پتے
کہ کروں گا مصوروں کو مات
رہوں مات ان کو کر کے تو ہے بات
اس ہنر میں بنوں گا میں استاد
اور کروں گا نئے نئے ایجاد
لکڑی برتا کروں گا میں نگرا [1]
آئے، لاگت زیادہ آئے اگر
چیز گھٹیل کبھی نہ بیچوں گا
نفع سے ایسے ہاتھ کھینچوں گا

---

[1] پمفلٹ: رسالہ، کتابچہ (Pamphlet)

میرا سامان ہو گا سب اچھا
عمدہ سے عمدہ تحفہ سے تحفہ

کارخانہ خود اک بنا لوں گا
بیسیوں کاریگر بٹھا لوں گا

ہو گی جب ہر طرف مری شہرت
دیکھنا گاہکوں کی پھر کثرت

مستری ایک ہو اگر ہشیار
ہر جگہ اس کے مشتری ہیں ہزار

ا۔ تہائی: کاٹنے اور چھیلنے کا ایک اوزار

7 گھڑیاں اور گھنٹے

ہوں جس قدر آفاق میں گھڑیاں ہوں کہ گھنٹے
ہے سب کا عمل ایک، بڑے یا کہ ہوں چھوٹے

چھوٹے بھی کسی طرح بڑوں سے نہیں ہیٹے
دراصل یہ سب ایک ہی تھیلی کے ہیں بٹے

گو ایک سے اُن کے نہیں ہوتے قد و قامت
طے کرتے ہیں پر سب کے سب اک ساتھ مسافت

دوپہر ہو یا رات ہو یا صبح ہو یا شام
جب دیکھیے چلنے سے سدا اپنے انہیں کام

لیتے کسی ساعت کسی لحظہ نہیں آرام
ہو جاتے اسی میں ہیں بسر عمر کے ایام

نقل و حرکت سے انہیں فرصت نہیں دم بھر
گویا انہیں جانا ہے کہیں دور مہم پر

ہر چند کہ رفتار میں اپنی نہیں مختار
پر ٹھہرنے کو اپنے سمجھتے ہیں یہ بے کار

رہتے ہیں سفر ہی میں، ہو دن یا کہ شبِ تار
ہٹتے نہیں پیچھے قدم ان کے دم رفتار

جب دیکھیے پاتے ہیں یہ سرگرم روانی
عمر گزراں کی کہو ایک ان کو نشانی

دم رکھتے ہیں گو جان نہیں رکھتے بدن میں
گویا ہیں، زباں گرچہ نہیں ان کے دہن میں

عادت میں نرالے ہیں انوکھے ہیں چلن میں
دیکھا یہ انہی کو کہ مسافر ہیں وطن میں

ہے جیسے کہ گردش میں زمانہ سحر و شام
ان کا وہ سفر ہے نہیں جس کا کہیں انجام

خشکی ہو گزرگاہ میں ان کی کہ سمندر

کھاڑی ہو کہ ہو جھیل، جزیرہ ہو کہ بندر
مینار کے اوپر ہوں کہ تہہ خانے کے اندر
رکھے انہیں پاس اپنے سکندر کہ قلندر

ان کو نہیں یاں اونچ کا یا نیچ کا کچھ غم
اپنی اسی 'ٹک ٹک' سے سروکار ہے ہر دم
کھٹکا انہیں آندھی کا نہ بارش کا خطر کچھ
نقصاں نہیں جاڑے سے نہ گرمی سے ضرر کچھ

طوفان کا کچھ خوف نہ بھونچال کا ڈر کچھ
ہوں لاکھ تغیر، نہیں پر ان کو خبر کچھ
کچھ موسم گل کی نہ خزاں کی انہیں پروا
ہیں دونوں برابر انہیں پچھوا ہو کہ پُروا

شُمن کے کھٹاکے سے کم ان کا نہیں کھٹکا
خارص ہے یہ اک یادِ خدا کے لیے لٹکا
کوڑا ہے یہ اس کے لیے جو راہ سے بھٹکا
کانٹوں میں دیا دامن دل جس نے کہ اٹکا

دیتے ہیں، سنو غور سے، ہر دم یہ دہائی
لو وقت چلا ہاتھ سے، کچھ کر لو کمائی
کیا ان کی بساط اور کہو کیا ان کی ہے اوقات
جانے دو نہیں ان میں اگر کوئی کرامات

انصاف کرو تو ہے یہی کتنی بڑی بات
جس کام کے ہیں اس میں لگے رہتے ہیں دن رات

ہیں چلنے میں تھکتے نہ ٹھٹکتے نہ مچلتے
جس راہ پہ دو ڈال اسی راہ میں چلتے

io

8 دھان بونا

ہوتے ہیں بتاؤ دھان کیوں کر؟
ہم سے سنو آؤ دھیان دے کر

ہے یہ بھی سمجھ لو کام انہی کا
جو کرتے ہیں یاں زمیں کی سیوا

پہلے وہ زمیں پہ ہل چلا کر
اور مٹی تلے کی کر کے اوپر

دیتے ہیں سہاگا پھیر اس پر
کرتے ہیں زمیں کو یہ برابر

پھر دیتے ہیں چھوڑ اس میں پانی
جو دھان کی کاشت کے ہیں گیانی

پانی ہیں جب اس پہ پھیر دیتے

ہیں بیج وہاں بکھیر دیتے

ہے سہل اگرچہ دھان بونا
آسان نہیں پر اس کا ہونا

یہ دھان ہوئے کہ پان اے یار
دونوں کا ہے رکھ رکھاؤ دشوار

بس دھان کو نازک ایسا ہی جان
ہو جیسے کہ دھان پان انسان

9 روٹی کیوں کر میسر آتی ہے

یہ کھاتے ہو جو تم ہر روز روٹی
بتاؤ کیوں کہ ہے تیار ہوتی

اگر آٹے کی پکتی ہے تو آٹا
بتاؤ ہے کہاں سے روز آتا؟

اگر آٹا یہ گیہوں کا ہے پستا
تو پھر یہ پیسنا ہے کام کس کا

گیہوں کس طرح ہوتے ہیں میسر؟
اور آتے ہیں کہاں سے اور کیوں کر؟

کسانوں کا ہے یہ احسان ہم پر
کہ ہوتے ہیں گیہوں ہم کو میسر

879

یہی پہنچاتے ہیں بندوں کو روزی
خدا کے گھر کا سمجھو ان کو مودی[1]

انہی کا کام ہے ہر فصل کی کاشت
انہی کا کام ہے محنت کی برداشت

یہی بو کر بہم پہنچاتے ہیں ناج
ہے اس میں ساری خلقت ان کی محتاج

---

[1] مودی: غلے کا سوداگر، بنیا، بقال

کساں اکثر ادھر کے اور ادھر کے
گیہوں لے آتے ہیں چھکڑوں میں بھر کے

جو بازاروں میں بیٹھے ہیں دکاں دار
وہ ان چھکڑوں کے ہوتے ہیں خریدار

گیہوں کا بھاؤ اک کر کے مقرر
دکانوں میں وہ اپنی لیتے ہیں بھر

پٹا رہتا ہے سب غلے سے بازار
جدھر دیکھو ادھر غلے کا انبار

گیہوں ہم لوگ لیتے ہیں انہی سے
روپے کے، دو روپے کے، دس روپے کے

تمہارا باپ ہے جو کچھ کماتا
اناج اس کا ہے وہ بھی مول لاتا

تمہاری ماں کو دے دیتا ہے لا کر
وہ ان کو چن پھٹک کر اور بنا کر

خود اپنے ہاتھ سے ہے پیس لیتی
لگا رکھی ہے اس نے گھر میں چکی

اسی چکی کا پیسا تھا وہ آٹا
چڑھے پروان ہو تم جس کو کھا کھا
وہ بے چاری ہمیشہ صبح ہوتے
کہ جب تم بے خبر ہوتے ہو سوتے
جھٹ آٹا پیسنے جا بیٹھتی ہے
عجب بندی خدا کی محنتی ہے
وہ ہے اس ہاتھ سے چکی چلاتی
اور اس سے غلہ پیہم ڈالے جاتی
جب اس کا ہاتھ تھک جاتا ہے دایاں
بدل لیتی ہے تب وہ ہاتھ بایاں
کبھی گھبرا کے دل ہی دل میں اپنے
خدا کا نام وہ لگتی ہے جپنے
کبھی دل کو خدا سے لو لگا کر
تسلی دیتی ہے وہ گیت گا کر
جب آٹا پیس چکتی ہے تو گویا
سمجھتی ہے بڑا گڑھ میں نے جیتا
پھر آٹا چھان کر بھوسی جدا کر
اسے بھرتی ہے مٹکے میں اٹھا کر
لگی پھر گوندھنے آٹا جھپا جھپ
اور اس میں مارنے مکی شپاشپ
وہ یوں آٹے کو ہے دیتی تھپکتی
کہ گویا لڑ رہی ہے اس سے کشتی
جب آٹا گوندھ چکتی ہے تو لے کر
توا، دیتی ہے رکھ چولہے کے اوپر

بناتی ہے گندھے آٹے کے پیڑے
کہ ہو جس طرح سے جلدی نبیڑے

وہ جھپ جھپ پھر پکا لیتی ہے روٹی
چپاتی خواہ ہلکی خواہ موٹی

ذرا دیکھو تو کوئی اس کی پھرتی
توے پر دم میں ڈالی اور الٹی

پکا کر، ریندھ کر، کھا کر، کھلا کر
ہوئے جھوٹے جو باسن، دھو دھلا کر

لیا کچھ اور گھر کا کام دھندا
یہی ہے اس کا صبح و شام دھندا

کبھی ایندھن نہیں ہوتا میسر
تو لے کر وہ طباق آٹے کا سر پر

پہنچتی ہے بچاری سیدھی تندور[1]
نہیں جو اس کے گھر سے کچھ بہت دور

وہ بھٹیارا جو ہے تندور والا
سب آٹا اس سے پکواتے ہیں لا لا

لگا رہتا ہے صبح و شام تانتا
اک آتا ہے دکاں پر ایک جاتا

وہ باندھے بیٹھا رہتا ہے لنگوٹی
لگاتا ہے بہت پھرتی سے روٹی

گھڑی، ہاتھوں پہ پھیلائی، بڑھائی
رفیدے[2] پر دھری اور چٹ لگائی

دکھاتا ہے وہ یوں ہاتھوں کے انداز
کہ جیسے کوئی پھرتیلا پٹے باز

وہ ہے یوں پیٹتا پیڑوں کو پیہم
کہ گویا ٹھونکتا ہے پہلواں خم

اترتی روٹیاں ہیں باری باری
وہ گرما گرم سوندھی اور کراری

۱؎ تنور کو عام بول چال کے مطابق ''تندور'' باندھا گیا ہے۔
۲؎ رفیدہ: گول گدی جس پر روٹی رکھ کر تنور میں لگاتے ہیں۔

اتر سب روٹیاں جب آئیں پک کر
تو دسترخوان سے لاتی ہے ڈھک کر

ادھر تم ساری بہنیں اور بھائی
ہو اس دھن میں کہ آئی ماں اب آئی

تکا کرتے ہو بھوکے راہ ماں کی
سمجھتے کچھ نہیں پر چاہ ماں کی

وہ کرتی رہتی ہے تم سب کی خدمت
نہیں ملتی اسے سونے کی فرصت

یہی رہتا ہے دن رات اس کو رونا
پکانا، ریندھنا، سینا، پرونا

رُندھی رہتی ہے تم بچوں میں دن رات
کرے بھی تو کسی سے کیا کرے بات

نہ ہوش اچھے کا اس کو اور برے کا
نہ ہدڑا پہننے اور اوڑھنے کا

کہیں پڑ رہنا، فارغ جب کہ ہونا

879

کوئی سونے میں داخل ہے یہ سونا؟

ڈھلا دن اور چڑھا سر کھانے کا فکر
تمہارے باپ کے گھر آنے کا فکر

سویرے کا وہ نکلا نکلا گھر سے
پھرے گا شام کو جب کام پر سے

تو اس کو دیکھتے ہی آپ سے آپ
بڑے اور چھوٹے ہو جائیں گے چپ چاپ

قدم رکھے گا جوں ہی گھر کے اندر
سنبھل بیٹھو گے تم سب اس سے ڈر کر

اور اماں چھوڑ کر پھر سوئی تاگا
لگے گی لینے اس کی آگا تاگا

وہ ستانے نہیں پاتا کہ لا کے
بچھا دیتی ہے دسترخوان آگے

گھڑی تم کو کھڑی جھلتی ہے پنکھا
گھڑی پانی پلاتی ہے وہ لا لا

دیے جاتی ہے تم سب کو وہ سالن
رہے اپنے لیے گو کچھ نہ لاون [1]

جو بچ رہتی ہے پیچھے ہڈی بوٹی
لگا کر اس سے کھا لیتی ہے روٹی

اسے تم کو کھلانے سے ہے مطلب
نہیں کچھ اپنے کھانے سے ہے مطلب

اگر کھانے میں آئی تم کو لذت
تو سمجھو لگ گئی ٹھیک اس کی محنت

نہ پکّا گر مزے کا تو نگوڑی

879

ہوئی جاتی ہے دل میں تھوڑی تھوڑی

بھلا ماں کے سوا کس سے بن آئے؟
نہ کھائے آپ اور تم کو کھلائے

تمہیں کیا فکر ان جھگڑوں کا بھائی
کہ ملتی ہے تمہیں پکی پکائی

پکانے سے نہ پکوانے سے مطلب
اگر ہے تم کو تو کھانے سے مطلب

ذرا سی دیر کھانے میں اگر ہو
تو تم رو رو کے گھر سر پر اٹھا لو

ا۔ لاون: کوئی چیز جو ذائقے کے لیے سالن کے طور پر استعمال ہو۔

نہ الفت باپ کی تم جانتے ہو
نہ ماں کی مامتا پہچانتے ہو

نہ ان کی محنتوں کی ہے خبر کچھ
نہ ان کی جاں فشانی پر نظر کچھ

نہیں کر سکتے حق ان کا ادا تم
کرو ان پر سے گر جاں بھی فدا تم

دل و جاں سے کرو تم ان کی عظمت
بجا لاؤ ادب سے ان کی خدمت

سمجھ لو اس سے ماں کی قدر و عظمت
کہ اس کے پاؤں کے نیچے ہے جنت

تمہیں محنت سے پالا اور پوسا
ستایا تم نے پر اس نے نہ کوسا

سبق ماں باپ سے یہ سیکھ رکھو
بڑے ہو کر یہی کرنا ہے تم کو

مزا جب ہے کہ ہاتھ ان کا بٹاؤ
بڑے ہو کر تم ان کے کام آؤ

کبھی ہونا نہ تم ست اور کاہل
لگانا اپنے اپنے کام میں دل

نہ ڈھیلی چھوڑنا تم اپنی ڈوری
سمجھنا جی چرانے کو بھی چوری

io

0موچی

چمڑا مول منگاتا ہوں دھو کے اُسے سکھلاتا ہوں
مل کے نرم بناتا ہوں یوں چمڑے کو کماتا ہوں
میں موچی کہلاتا ہوں

پنّے وَتے کاٹ کٹا کرتا ہوں خوب اُن کو صفا
پھر لے پنا اور تکلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
یوں کام اپنا بناتا ہوں

پھر جوتی قالب پہ چڑھا ٹھوک ٹھکا اور کوٹ کٹا
رانپی لے سے بُرشا کے تلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
پھر کام اور لگاتا ہوں

چاہیے گر اندھا گھوڑا میری دکاں کا لو جوڑا
پھر درکار نہیں کوڑا جتنا چلاؤ ہے تھوڑا
مضبوط ایسا بناتا ہوں
اوروں کی سی یاں نہیں لوٹ جانیو میری بات نہ جھوٹ
سال کے اندر میرا بوٹ میں ضامن جو جائے ٹوٹ
اس کی شرط لگاتا ہوں
بابو ہو یا ہو لالہ گورا ہو یا ہو کالا
بوڑھا ہو یا ہو بالا ادنیٰ ہو یا ہو اعلیٰ
سب کا حکم بجاتا ہوں

ا۔ ایک اوزار جس سے موچی چمڑے کو تراشتے اور صاف کرتے ہیں۔

چٹھی رساں!

لو وہ دیکھو آ رہا ہے ڈاکیا
منتظر تھا جس کا ہر چھوٹا بڑا
ہے اسی جانب کو سیدھا اس کا رخ
خط تمہارا ہو گا یا شاید مرا
پوچھتا ہے اس سے ہر اک اپنا خط
نام بتلاتا ہے اپنا اور پتا
دیکھتا ہے وہ لفافہ غور سے
دیتا ہے پڑھ پڑھ کے، ہے لکھا پڑھا
یہ تو بتلاؤ خطوں کا اتنا ڈھیر

اس کو کیوں کر اور کہاں سے مل گیا؟

دیکھتے ہو روز کیفیت یہ تم
پر نہیں رکھتے خبر اس کی ذرا

رات کو سوتے تھے جب ہم، ایک شخص
جا رہا تھا اس طرف سے دوڑتا

تھے کمر سے اس کی کچھ گھنگھرو بندھے
تاکہ سب جانیں کہ ہے یہ ڈاکیا

ہر قدم پر دوڑتا تھا جب کہ وہ
گھنگھروؤں کی اس کے آتی تھی صدا

کہتے ہیں ہرکارہ جس کو تھا وہی
تم نے بھی یہ نام شاید ہو سنا

وہ چلا تھا لے کے ڈاک اس شہر کی
آ کے دم یاں ڈاک خانے میں لیا

تھیلیاں تھیں ایک تھیلے میں کئی
جن سے تھا وہ ڈاک کا تھیلا بھرا

تھیلیوں میں تھے بھرے پیکٹ تمام
تھا کوئی دھولا تو کوئی زرد تھا

تھا غرض جو بوجھ اس کے پاس سب
ڈاک منشی کے حوالے کر دیا

شام تک اب اس کو ہوش آئے تو آئے
وہ تو ایسا ہو کے بے دم جا پڑا

اور ادھر وہ تھیلیاں جھٹ پٹ سنبھال
ڈاک منشی نے سنو اب کیا کیا

کھول کر سب کر لیے پیکٹ الگ
اور خط بھی رکھ لیے کر کے جدا

بانٹنے کو ڈاک پھر دے دی تمام
ڈاک کے چٹھی رسانوں کو بلا

ڈاک میں میرا بھی اک آیا ہے خط
اوہو! یہ تو خط ہے میرے دوست کا

پڑھ کے خط تو ہو گی جو ہو گی خوشی
پہلے آنکھوں سے تو لوں اس کو لگا

دوست کے پاس آئے نامہ دوست کا
اس خوشی سے ہے زیادہ اور کیا

اب پڑھوں گا جا کے اطمینان سے
گھر میں اپنے بیٹھ کر سب سے جدا

io

@سپاہی

سنا بھی یہ آواز کیا آ رہی ہے؟
بگل کی برابر صدا آ رہی ہے

چلو اُٹھو بندوق کندھے پہ رکھو
کہ وقت آ گیا دور جانا ہے تم کو

ہلے ہاتھ ہرگز تمہارا، نہ شانہ
جہاں چاہو واں جا کے بیٹھے نشانہ

نظر چاہیے تیز ایسی تمہاری

ہو گویا کہ اس وقت تم اک شکاری

قدم ہو جنچا ایسا جیسے ہرن کا
سمجھ لو کہ ہے بس یہی وقت رن کا
کبھی فتح مندی کا دعویٰ نہ کیجیے
کہ چلتے نہیں اس میں دعوے کسی کے
جو ذکر ایسی باتوں کا کرتے ہیں اکثر
ظفر مند انہیں ہوتے دیکھا ہے کم تر
بڑی بات یہ ہے تم اس کو سمجھ لو
کہ فرض اپنا جو ہے بجا لاؤ اس کو

io

#ایک چھوٹی بچی کے خصائل[1]

سیّدہ کیسی پیاری بچی ہے
صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے
ذرا دیکھو تو اس کی صورت کو
سچی چینی کی جیسی مورت ہو
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان
پر سب اچھے برے کی ہے پہچان
ماں نے جو کچھ اُسے سکھایا ہے

جو ادب قاعدہ بتایا ہے

وہ سبق سارے اُس کو ہیں ازبر
نقش ایک ایک بات ہے دل پر

ہے ادب سے بڑوں کا لیتی نام
سب کو کرتی ہے ہاتھ اُٹھا کے سلام

پھر ادب سے وہیں سلام کے ساتھ
پوچھتی ہے مزاج جوڑ کے ہاتھ

جھوٹ موٹ اس کو گر ڈراتے ہیں
بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں

ا؎ ''ممتاز فاطمہ عرف 'سیدہ خاتون' جو آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی بچی ہے، اُس سے مولانا کو بہت محبت تھی۔ مولانا نے اس پر 1909ء میں جب کہ سیدہ کی عمر ڈھائی سال کی تھی، یہ نظم لکھی تھی۔'' (جواہرات حالی، صفحہ 19)

بکّے پن سے یقیں نہیں کرتی
دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

وہ کسی بات پر مچلتی نہیں
اپنی عادت کبھی بدلتی نہیں

ایک بیماری سے تو ہے لاچار
ورنہ روتی نہیں کبھی زنہار

اس کم عمر بے سمجھ ہو کر
دودھ بھی مانگتی نہیں رو کر

بے پیے دودھ جب نہیں سرتی
ہے وہ ماں کی خوشامدیں کرتی

کبھی کہتی ہے پیار سے ''اماں!''
اور کبھی ڈالتی ہے گل بَیّاں

کوٹ کوٹ اس میں ہے بھری غیرت
اُس کو کوئی گھرک دے کیا طاقت
ماں نے جھوٹوں کبھی جو گھور دیا
اُس نے سچ مچ وہیں بسور دیا
ماں کی خفگی سے ہے بہت ڈرتی
اُس کے تیور ہے دیکھتی رہتی
جب ذرا دیکھتی ہے چُپ ماں کو
بار بار اُس کو کہتی ہے "بولو!"
ماں یہ سن کر اگر ذرا ہنس دی
پھر کوئی دیکھے اُس کی آ کے خوشی
ہنستی ہے اور کھِل کھلاتی ہے
بچی پھولی نہیں سماتی ہے
چاہنے والے اُس کے ہیں جو جو
خوب پہچانتی ہے ایک اک کو
پھوپھیوں سے تو ہے لگاؤ بہت
گھر کا خالاؤں کے ہے چاؤ بہت
ہے چچاؤں کے نام کی عاشق
اُن کے کلمے کلام کی عاشق
غور سے اُن کا پڑھنا سنتی ہے
اور سن سن کے سر کو دھنتی ہے
ختم ہو چکتے ہیں جب اُن کے بول
کہتی ہے بار بار "ابا اول"
آرزو تو بہت ہے بولنے کی
پر نہیں اُٹھتی ہے زبان ابھی

یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زباں
جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوں غاں

پھر تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار
ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار

نہیں مُنہ سے نکلتے پورے بول
بولتی ہے سدا ادھورے بول

لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب
زرگری اپنی بولتی ہے جب

نئے آتے ہیں گھر میں جب مہماں
دیکھ دیکھ اُن کو ہوتی ہے خنداں

پا کے بیٹھا ادھر اُدھر سب کو
دیکھتی ہے مڑ مڑ سب کو

اوپری شکل سے ہے گھبراتی
ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی

ہیں جو ماں جائے بھائی اور بہن
یوں تو ہے سب کی اس کے دل میں لگن

پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو
کیوں کہ اُوپر تلے کے ہیں دونوں

پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا
اور وہیں اُس نے ہاتھ پھیلایا

جا لپٹتی ہے دوڑ کے ماں سے
بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے

عمر اس کی خدا دراز کرے

علم سے اُس کو سرفراز کرے
چڑھیں ماں باپ کی سلامتی میں
سارے پروان بھائی اور بہنیں

io

$ نیک بنو، نیکی پھیلاؤ ا

سچ بولو سچے کہلاؤ
سچ کی سب کو ریس دلاؤ

جب اوروں کو راہ بتاؤ
خود رستے پر تم آ جاؤ
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو ، نیکی پھیلاؤ

ہو گی تم میں گر ستھرائی
سب سیکھیں گے تم سے صفائی
ہمسائے کی دیکھ بھلائی
چھوڑتے ہیں ہمسائے برائی
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

ا۔ یہ نظم اب تک کلام حالی کے کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئی۔ ''بچوں کا اخبار'' لاہور، شمارہ ماہ جولائی 1905ء میں یہ نظم ''ریس'' کے عنوان سے چھپی تھی، اُس پرچے سے یہاں نقل کی گئی ہے۔ (اس)

ہے جس گھر میں ایک بھی اچھا
واں نہ رہے گا نام برے کا
تم بھی چلن دکھلاؤ کچھ ایسا
جس سے ہو سارے جگ میں اُجالا
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

گاؤں میں آیا ایک جواری
اُس نے بگاڑی بستی ساری
کام میں عزت ہو یا خواری
لوگ کریں گے ریس تمہاری
قوم کو اچھے کام دکھاؤ

نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

جو پڑھنے میں کرتے ہیں محنت
سیکھتی ہے شوق اُن سے جماعت
ہوتی ہے جن کو کھیل کی عادت
دیتے ہیں سب کو کھیل کی رغبت

قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

محنت کر کے جو ہیں کماتے
سب کو محنت وہ ہیں سکھاتے
جو نہیں ہاتھ اور پاؤں ہلاتے
سب کو اپاہج وہ ہیں بناتے

قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

رحم ہے سب کو رحم سکھاتا
ظلم ہے سب کو ظلم سجھاتا
نیک ہے نیکی سب کو بتاتا
بد اوروں کو بد ہے بناتا

قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

io

بابِ سیزدہم

تراجم

زمزمۂ قیصری کا مختصر تعارف

مسدس مدوجزر اسلام کی تصنیف سے ایک سال قبل حالی نے 1878ء میں زمزمہ قیصری کے زیر عنوان پینتیس (35) بند کا ترکیب بند لکھا جس کے ہر بند میں سات شعر ہیں۔ اس دوسو پینتالیس اشعار کی طولانی نظم کا ترجمہ حالی نے انگریز پویم سے کیا جس کے بارے میں ہم یہاں خود حالی کی توضیحاتی تحریر پیش کرتے ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

یہ نظم ایک انگریزی پویم کے تین حصوں میں سے اول حصے کا منظوم ترجمہ ہے۔ شاید مسٹر ایسٹوک اس کے مصنف ہیں جنہوں نے کرنل ڈیوس کے توسط سے، جب کہ وہ دہلی میں کمشنر تھے، اس تمام پویم کو دلی کے چند لائق آدمیوں سے فارسی میں نظم کرا کر ولایت میں بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے۔ فارسی نظم لکھے جانے سے پہلے صاحب کمشنر نے یہ پویم اُردو میں ترجمہ کرا کر نظم کرنے کے لیے میرے پاس بھیجی تھی۔ میں اُن کے حکم سے صرف پہلے حصے کو اُردو میں کرنے پایا تھا کہ مصنف نے فارسی میں نظم کرانا چاہا۔ میں نے بہ سبب علالت کے فارسی نظم سرانجام کرنے سے اپنی معذوری بیان کی اور یہ کام اوروں کے سپرد ہو گیا۔ اس نظم کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کا ذکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں تمام رئیسوں کا، جو دربار قیصری میں شریک ہوئے تھے، عموماً اور حضور نظام کا خصوصاً تذکرہ ہے۔ مصنف نے پہلے حصے میں بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ناظرین اس کو دیکھ کر مجھ سے خوش یا ناراض نہ ہوں۔ میرا صرف اتنا قصور ہے کہ میں نے ان خیالات کو ایک ایسی زبان میں

نظم کر دیا ہے جس کو میرے ہم وطن سمجھ سکتے ہیں۔ اس نظم میں جہاں کہیں ضرورت نے مجبور کیا ہے، اپنی طرف سے بھی کوئی بات اضافہ کر دی ہے اور اکثر تمیز کے لیے اس کو بریکٹ میں محدود کر دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ ممکن ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی کہیں کہیں کچھ اختلاف پایا جائے۔ لیکن جو لوگ انگریزی پولیٹکل خیالات کو اردو نظم میں بیان کرنے کی دقتوں سے بخوبی واقف ہیں اُن سے اُمید ہے کہ ایسی خفیف فروگزاشتوں سے چشم پوشی فرمائیں گے۔

حالی نے اپنی زندگی میں اس نظم کو اہمیت نہیں دی اور نہ حالی کے ہم عصروں یا بعد میں آنے والے حالی شناسوں نے اس نظم کا تجزیہ کر کے اس کا حق ادا کیا۔ یہ سچ ہے کہ اس ترکیب بند کا مطلب اور متن انگریزی شاعر ایسٹوک کا ہے لیکن اس نظم پر لکھا گیا بسیط حاشیہ اور شاہکار ترجمہ تو حالی کا ہے جو صاف سلیس اور رواں دواں ہے جو عام طور پر ترجمہ کرتے ہوئے باقی نہیں رہتا۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں کوشش کے باوجود انگریزی پویم یا اس کا فارسی مطبوعہ ترجمہ دستیاب نہ ہو سکا لیکن حالی کے تشریحی حاشیے سے یہ پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ایمانداری سے ترجمہ کر کے جن مطالب سے وہ متفق نہ تھے حاشیے میں اظہار کیا ہے۔

ہم یہاں اجمالی طور پر اس ترکیب بند پر اس لیے بھی گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ یہ طویل ترجمہ محنت اور مشکل پسندی سے ہوا ہے۔ یہ ترکیب بند فن اور شعریت کے لحاظ سے حالی کی کئی نظموں مثنویوں، قصیدوں، مرثیوں، قطعوں اور غزلوں سے بلند ہے۔

حالی نے اگر نظم میں کہیں مطلب اپنی طرف سے شعر کی تکمیل یا بند کی تشکیل کے لیے رکھا تو اس کو ظاہر کرنے کے لیے بریکٹ کے اندر لکھا۔

نظم کے آغاز میں کشور ہندوستان کو حصار عافیت کہنا اور اُسے سارا جہان کہہ کر اس کے نقشے کو یوں بیان کرنا کہ مضمون بھی ادا ہو جائے اور شعری نقش نگار بھی دل لبھائے آسان کام نہیں۔

اے حصار عافیت اے کشور ہندوستاں
زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے سارا جہاں
اک طرف کھینچی ہے قدرت نے ترے دیوار کو
موج زن ہے ایک جانب تیرے بحرِ بے کراں

بلندی اور پستی، شور اور خموشی کا سماں دیکھیے۔ صنعت تضاد متن اور الفاظ سے یہ شعر بنے ہیں۔

چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا
ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں
بحر میں ہوتا ہے اک شور قیامت آشکار
جب کہ اس میں آ کے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں

شاعر نے ہندوستان پر اسکندر اعظم اور یونان کے بادشاہ مینندر کے حملوں اور فتوحات کا ذکر کر کے ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملے کو بیان کیا جس کا ترجمہ حالی یوں کرتے ہیں:

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند
جانب ہندوستاں محمود نے ہانکا سمند

وہ مسلمانوں کے حق میں ابر رحمت تھا مگر
ہندوؤں کے دل رہے اس کے ستم سے دردمند

روندتا تھا جس کو وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری
صلح سے بجھتا نہ تھا ہوتا تھا جو شعلہ بلند

خوف تھا دل میں خدا کا اور نہ کچھ بندوں پر رحم
غارت و تاراج تھا اک بازی سلطاں پسند

جب وہ آیا تھا تو سرتاپا گلستاں تھا یہ ملک
جب گیا یاں سے تو مثل دشتِ ویراں تھا یہ ملک

حالی ان اشعار پر احتجاج اور اعتراض نثر کی صورت میں حاشیے میں کرتے ہیں۔

انگریزی مورخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ اور مسلمانوں پر غضب ناک اور افروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے تھے۔ جس طرح اس بند میں محمود کی بے رحمی اور ظلم کا بیان کیا گیا ہے، اسی طرح ایک انگریز نے اس کی شان میں کچھ اشعار لکھے ہیں، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے: (نظم)

اے ملک زرنگار قدم ہے وہ کون سا
حملے سے جس کے ہے ترے ارکاں میں زلزلہ

وہ تیرے قصر اور ستوں دار سائباں
معبد وہ جو پہاڑوں کے غاروں میں ہیں نہاں

ٹھاکر اور اُن کے مندر، راجا اور ان کے تخت
حملے سے اس کے آ کے پڑا سب پہ وقت سخت

پتلا غضب کا کون سا وہ ہولناک ہے؟
اے ملک زرنگار وہ غزنی کی خاک ہے

آتا ہے لوٹتا ہوا اس بزم گاہ میں
پھرتے ہیں بکھرے تاج بہت اس کی راہ میں

کتے جو اس کے ساتھ شکاری ہیں بے شمار
ان کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار

بے رحم فوج لائی ہے جو لوٹ مار کر
مقتول رانیوں کے گلے سے اُتار کر

کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ
اور بے گنہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ

اگر چہ ان دونوں شاعروں نے محمود کے تشدد کو بہت مبالغے کے ساتھ بیان کیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اُن کے بعض بادشاہوں کی ظالمانہ کارروائیاں، گو وہ کیسی ہی تاریکی اور وحشت کے زمانے میں کی گئی ہوں، ہمیشہ باعث شرم وندامت رہیں گی۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آیا دنیا میں کوئی ایسی قوم ہے جو اس دھبے سے پاک ہو؟ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ یورپ کی شائستہ قومیں، جو آج اپنے سوا تمام دنیا کی قوموں کو وحشی یا نیم وحشی کا خطاب دیتی ہیں، محمود کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد کئی صدیوں ایشیا سے بہ مراتب زیادہ وحشت وخوں ریزی و بے رحمی میں مبتلا تھیں اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو بنی نوع انسان کی دو خصلتیں نہ کبھی بدلی ہیں،

نہ آئندہ بدلنے کی امید ہے: ایک طمع اور خود غرضی، دوسرے زبردستوں کا زیردستوں کو دلنا اور پیسنا۔ جس طرح مگر مچھ مچھلیوں اور مینڈکوں کو یا شیر اور چیتا ہرن اور نیل گائے کو نوش جان کرتا ہے، اسی طرح جو انسان قوی اور زبردست ہیں، وہ ضعیف اور کم زور انسانوں کے شکار کرنے سے کبھی درگزر نہیں کرتے۔ سولہویں صدی کو جس میں اہل یورپ، امریکہ میں جا کر آباد ہوئے، کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا۔

اس صدی میں یورپ کی بعض قوموں کے ہاتھ سے امریکہ کے اصلی باشندوں پر کون سا ظلم اور کون سی بے رحمی ہے جو روا نہیں رکھی گئی۔ میکسیکو اور پیرو جو کہ امریکا کے دو شائستہ ملک تھے، وہاں کے مفتوحین پر جو وحشیانہ ظلم ہسپانیہ والوں نے کیے، ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ کورٹیز جو کہ ہسپانیہ کا رہنے والا اور میکسیکو کا فاتح تھا، اس نے اور اس کے بعد نئے وارد ہونے والے جرنیلوں نے یہ ٹھان لی کہ میکسیکو کو مکمل طور پر ویران کر دیجیے اور وہاں ہسپانیہ کی ایک کالونی آباد کیجیے۔ چنانچہ جہاں تک اُن سے ہو سکا، وہاں کے قدیم باشندوں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ کورٹیز نے میکسیکو کے شاہنشاہ مونٹی زوما کو گرفتار کر کے الٹا لٹکا دیا اور اس کی رعایا کو اس کی آنکھ کے سامنے جلایا اور قتل کرایا۔

یہ ہسپانیہ کے وہی مقدس اور بے عیب عیسائی تھے جنہوں نے ''کافروں'' یعنی مسلمانوں کو غنڈے اور ایک ناپاک اور گنہ گار قوم ہونے کا الزام لگا کر نکالا تھا اور جن کا قول تھا کہ ظالم اور بددین مسلمان اس لائق نہیں ہیں کہ فرشتہ صفت عیسائیوں کے ہم سایہ اور ہم وطن ہو کر رہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ایک ملین بنی آدم ان مقدس عیسائیوں کے ہاتھ سے طرح طرح کی عقوبت اور سختی کے ساتھ مارے اور جلائے گئے۔ یہی حال کچھ دنوں بعد پیرو کا ہوا۔

ہماری نظر میں انگریز شاعر نے سکے کے دونوں رخ دکھائے ہیں۔ ہر دہی بیچنے والی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دہی کو میٹھا کہے چنان چہ اگر انگریز شاعر انگلستان کی مدح سرائی اور مسیحیت کی تبلیغ کر رہا ہے تو آتش زیر پا ہونے کی ضرورت اس لیے بھی نہیں کہ بعض اسلامی حکمرانوں نے اسلام کے اصولوں اور حضور اکرم e کے فرمودات پر عمل نہیں کیا۔

شاعر پوچھتا ہے:

آخر اے دانا حکیمو کچھ سبب اس کا بتاؤ
ہے بنی آدم کو کیوں قتل بنی آدم کا چاؤ
کیا یہ زیبا ہے کہ دینِ حق کو اے ابنائے جنس
زور سے منواؤ تم اور ندیاں خون کی بہاؤ
یا یہ بہتر ہے کہ سچی دوستی اور پیار سے
دل کرو اہلِ جہاں کے پہلے تسخیر اور پھر
حکم پھیلاؤ خدا کے اور یقین ان پر دلاؤ

اس کے ترجمہ میں اکبرِ اعظم کی تعریف ہوتی ہے اور مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب انگریز شاعر نے جو بتایا وہ حالی کی زبان سے آشکار ہے۔ اس ترجمہ کا حسن یہ بھی ہے کہ نظم ترجمانی نہیں تصنیف کی طرح دلکش ہے۔ اشعار کا تسلسل مضمون کو اتنا صاف بیان کر رہا ہے کہ کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

اے جلال الدین ہے تو ہی وہ شاہِ نام دار
صلحِ کل جس کی زمانے میں رہے گی یادگار
بسکہ آزادی بنی نوعِ بشر کو تو نے دی
رائے پر ہر شخص کی ٹھہرا عقیدے کا مدار
پر تری اولاد نے کی پیروی تیری نہ حیف
ہو گیا ان کا تعصب خود گلے کا ان کے ہار
ثمرہ آخر مل گیا ان کے تعصب کا انہیں
کر گیا رحلت جہاں سے جلد ان کا اقتدار

یہاں اورنگ زیب عالم گیر کی طرف اشارہ ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے دوران ہندوستان میں مرہٹے، سادات اور افغان وغیرہ کے اقتدار اور خانہ جنگی کے مسائل رہے۔ اس کے بعد انگریز شاعر نے اپنی نظم میں انگریز قوم کی ہندوستان میں آمد کو اس ملک کی نجات بتایا۔

ڈوبنے کے جب نظر آنے لگے آثار سے
آ کے انگلستان نے طوفاں کو للکارا کے بس
ہند کو اپنوں نے دی آ کر نجات اغیار سے

یہاں اپنوں سے مراد انگریز اور اغیار سے مراد مسلمان ہیں۔

اس نظم میں مہابھارت کے اساطیری واقعات کو نظمایا گیا ہے جہاں سمندر کے بلونا سے امرت برآمد کیا گیا۔

اہل انگلستان کا آنا سمندر پار سے
ہے سمندر کا بلونا فی المثل اے محترم
زندگی جو اس سے اہل ہند کو حاصل ہوئی
ہے وہ امرت جو کہ پہنچا ہے سمندر سے بہم

راجا اشوک کی لاٹھوں پر کندہ قوانین کا ذکر کر کے پھر انگلستانی اور ملکہ انگلستان کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

راج پر راجا اشوکا کے ہیں وہ لاٹھیں گواہ
ہے ہویدا ان سے اس کے وسعتِ تمکین و جاہ
ہم نے یہ مانا کہ پتھر پر ہیں جو کندہ حروف
وہ رہیں گے منقش اس پر ہزاروں سال و ماہ
نام ہے وکٹوریا کا ان سے بڑھ کر پایدار
نقش ہر اک صفحۂ دل پر ہے جس کا استوار

اس ترکیب بند میں زیادہ تر بند انگلستان کی تاریخ، فتوحات، دولت وعظمت کے بارے میں ہیں۔ ملکہ اور شاہزادوں کا ذکر احترام اور احتشام سے کیا گیا ہے جو یقیناً اس نظم کی زیب داستان معلوم ہوتا ہے۔ انگریز شاعر کو ہندوستان کی خاک سے محبت ہے اور اس کے مناظر قدرتی اور ذرائع معدنی سے الفت ہے لیکن ہندوستانی عوام کے مسائل سے دلچسپی نہیں وہ قحط سالی کو قدرت کا آبادی کم کرنے کا نظام سمجھتا ہے۔

کچھ نہیں تو قحط کا دور سلامت چاہیے
بڑھنے پائے گا نہ آدم زاد کا حد سے شمار

اس نظم کو ہم کشمیر کی خوبصورت منظر کشی پر تمام کرتے ہیں۔ حالی نے تین بندوں میں خوب صورت منظر نگاری کر کے کشمیر پر لکھے گئے عمدہ ترین اشعار میں شامل کر دیا ہے۔ کشمیر پر چند مصرعے اور شعر سنیے اور حالی کے فن کی داد دیجیے۔

ہے کوئی وادی جہاں میں ہمسر کشمیر آج
شہر ہے جو مرکز کشمیر مانند طلسم

طرفہ کیفیت سے ہے لہروں میں ڈل کی جلوہ گر
دیکھتے ہیں آب صافی میں جب اس کا انعکاس

دوسرا وینس کا نقشہ صاف آتا ہے نظر
باغ شالیمار جو رونق فزا ہے اس کے پاس

ہے وہ اک نیرنگ قدرت کا تماشا سربسر
چوٹیاں پربت کی ہیں یوں برف میں لپٹی ہوئی

جا بہ جا گویا کھڑے ہیں دیو اور جن پہرہ دار

جنت اے کشمیر کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں
تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں

1 ترکیب بند موسوم بہ
زمزمۂ قیصری
(1878ء)

(1)

اے حصارِ عافیت اے کشورِ ہندوستاں
زیب دیتا ہے، اگر کہیے تجھے سارا جہاں
اک طرف کھینچی ہے قدرت نے ترے دیوارِ کوہ
موج زن ہے ایک جانب تیرے بحرِ بے کراں
چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا
ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں
بحر میں ہوتا ہے اک شورِ قیامت آشکار
جب کہ اس میں آ کے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں
خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ ہے اندر کا فکر
(دستِ گل چیں نارسا وَ نخلِ دولت گل فشاں)
تو نے فارغ کر دیا ہے فتحِ ملکِ غیر سے
پھر ضرورت کیا کہ کھولیں بے سبب تیرا نشاں
چل رہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوش گوار
(ہو نہ اب کہہ دو خزاں سے رخنہ اندازِ بہار)

(2)

اے مقدس آریہ ورتھ! آئی کیا تجھ پر بلا؟
جس نے بزمِ یک دلی کو تیری برہم کر دیا

کوچ کر جاتا نہ تجھ سے گر وفاق اور اتحاد
کون تھا جو تیری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا

تو کہاں اور اہلِ مغرب کے بھلا حملے کہاں
ہاں مگر نااتفاقی کی ملی تجھ کو سزا

گر تری اولاد میں ہوتا سلوک اور آشتی
لڑکھڑا جاتے قدم غیروں کے ہنگامِ وغا

گھاٹیوں میں آ کے جب ہوتی فراہم تیری فوج
ہوش کھو دیتی سُمِ اسپانِ ہندی کی صدا

بھاگنا بھی دشمنوں کو واں سے ہو جاتا محال
دیکھتے جب ہر طرف سے آمدِ سیلِ بلا

یا اطاعت کرتے اور لڑنے سے باز آتے وہیں
یا (اگر کرتے بہت ہمت تو) مر جاتے وہیں

(3)

ہند کا حق تھا کہ ہوتی مہر و الفت کی زمیں
قوم کے ہم درد ہوتے اس مکاں کے سب مکیں

حیف جس مٹی سے اگنا چاہیے تھا نخلِ مہر
جم گیا آب و ہوائے دہر سے واں تخم کیں

سر بسر تختے گلِ خود رو کے جس جنگل میں تھے
(غور سے دیکھا تو) پنہاں تھے درندے بھی
وہیں

(امن قایم تھا طلوعِ صبح کے آغاز میں
(جتنا دن چڑھتا گیا ہوتا گیا عزلت گزیں) اے

ا۔ یہ شعر اپنی طرف سے بڑھادیا گیا ہے تاکہ بند کے پورے سات شعر ہو جائیں۔ (حالی)

دیوتا جو آریا کے زعم میں فانی نہ تھے
فانیوں کی طرح یاں آ کر رہے وہ بالیقیں

جنگ وخوں ریزی کے خوگر ہوئے وہ رہ نما
ورنہ فتنے کا قدم تک یاں نہ آیا تھا کہیں

یک بہ یک آیا خلل امن واماں میں ہر طرف
اک تزلزل پڑ گیا ہندوستان میں ہر طرف

(4)

مرحبا اے خطۂ ہندوستان (صد مرحبا!)
اس خرابی پر بھی روکے تو نے حملے بارہا

جانتا ہے اک جہاں اسکندرِ اعظم کا نام
چشمۂ حیواں پہ جس کو لے گیا بخت رسا

تھا جہاں خوف اور سناٹا بشر کا سدِّ راہ
اور نیچر کے طلسموں میں خلل آیا نہ تھا

گہرے اور تاریک غاروں میں تھا آبِ زندگی
سایہ ہیبت تھا جن پر سربسر چھایا ہوا

گو ہوئی اس کی رسائی چشمۂ حیواں تلک
پر نہ ہرگز تیرے سارے مرحلے طے کر سکا

جی میں جو حسرت تھی وہ آخر نہ نکلی زینہار
(دل میں جو ارمان تھا وہ دل کا دل ہی میں رہا)

دقتوں نے فتح کی بے طرح گھبرایا اسے

کام ہی مشکل تھا یا مشکل نظر آیا اسے

(5)

جس جگہ ملتا ہے ستلج سے سبک رفتار بیاس
رہ گئیں فوجیں ٹھٹک کر اس کی واں ساحل کے پاس

بات سنتا تھا نہ کوئی کارواں سالار کی
کارواں اور کارواں سالار کی ٹوٹی تھی آس

تھا کھڑا حیراں سکندر اور یہ کہتا تھا کہ بس
فتحِ ہند اک خواب تھا اور اس کی تھی تعبیر یاس

بعدِ مدت پھر وہیں آئی اُمنڈ کر اک گھٹا [1]
بیاس کے میداں میں جس سے چھا گیا خوف و ہراس

جائے حیرت ہے کہ وہ کشور کشائے نام ور [2]
پھر گیا لے کر جہاں سے اپنی فوجِ بے قیاس

کر سکے کچھ واں نہ اس حملے کے آگے اہلِ ہند
چھوڑ کر ندی بھری کشتوں سے بھاگے اہلِ ہند

(6)

پہلے اس فتحِ نمایاں سے بھی اکثر جنگ جو
کر گئے یاں آن کر تیغ آزمائی میں غلو

ندیاں جو راہ میں حائل تھیں ان سے بارہا
حملہ آور اُترے اور پڑتے رہے رن سو بہ سو

وہ نشاں جن کی چمک تھی بے بقا مثلِ شہاب [3]
گہہ نظر آئے اٹک پر اور ستلج پر کبھو

---

[1] اس سے مراد انگریزی فوج کا حملہ ہے جو 1846ء میں پنجاب پر ہوا۔ (حالی)
[2] یعنی سکندر اعظم۔ (حالی)

۳؎ یعنی جن کے جھنڈوں کے پھریروں کی چمک شہاب ثاقب کی طرح بے بقا اور ناپائیدار تھی اور جو ہندوستان پر حملے کر کے محض ناکام یا چند روز شمالی ہند پر حکومت کر کے واپس چلے گئے۔ (حالی)

رفتہ رفتہ سرزمینِ گنگ تک پہنچا ہراس
آ کے ٹھہرا پہلے میںنڈر ۱؎ کنارِ آب جو

دھار میں گنگا کی وہ ہتھیار چمکے سربسر
ہند تک یونان سے جو پیتے آئے تھے لہو

ناگہاں جھیلم پہ چمکی آن کر ستھیا ۲؎ کی آگ
اور پھر کرتی رہی آہستہ آہستہ نمو

پہنچی جب گنگا کے لگ بھگ بیاس اور ستلج کو پھاند
ہو گئے یونان کے ہتھیار آگے اُن کے ماند

(7)

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند
جانبِ ہندوستان محمود ۳؎ نے ہانکا سمند

وہ مسلمانوں کے حق میں ابرِ رحمت تھا مگر
ہندوؤں کے دل رہے اس کے ستم سے دردمند

۱؎ میںنڈر: یونان کے سوتیر خاندان کا ایک مشہور بادشاہ تھا۔ یہ خاندان سکندرِ اعظم کے بعد ملک باختر یعنی خراسان وغیرہ میں غالباً حضرت عیسیٰ g سے دو سو برس پہلے مسلط ہو گیا تھا۔ میںنڈر نے، جیسا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے، ہندوستان پر 181 قبل مسیح سے 161 قبل مسیح کے درمیان حملے کیے ہیں۔ اس نے جنوب میں سندھ اور کچھ تک اور مشرق میں تک متھرا فتح کر لیا تھا۔ (حالی)

۲؎ بحرِ اسود اور کوہ قاف اور بحیرۂ کیسپین کے شمال میں جو وحشی قومیں آباد تھیں، قدیم زمانے میں اُن کو "ستھیا والے" کہتے تھے۔ اب وہ تمام ممالک یورپین روس اور ایشیائی روس میں شامل ہیں۔ ستھیا والوں کے حملے حضرت مسیح سے سو برس پہلے شروع ہو گئے تھے۔ ان وحشیوں کے غول کے غول ہندوستان پر چڑھ آتے تھے اور لوٹ مار کر کے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت مسیح کی ولادت سے چند سال بعد کشمیر کے قریب اُن کی زبردست سلطنت قائم ہو گئی تھی۔ ان کا سب سے مشہور بادشاہ کنشکا ہے جس نے شمالی ایشیا میں جو بدھ مذہب کی چوتھی کونسل منعقد کرائی۔ شمالی ایشیا میں جو بدھ مذہب کی شکل ہے، وہ اسی کونسل کا نتیجہ ہے۔ ستھیا کی آگ سے غالباً اُن کی جہاں سوزی و تاخت و تاراج مراد ہے، جیسے کہ بایزید عثمانی کو "ایلدرم" کہا گیا ہے اور عرب کی فتوحات کو برق سے

تشبیہ دی گئی ہے۔(حالی)

۳۔ انگریزی مورخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر ...

وہ پہنچتا تھا جہاں ہوتی تھی واں آفت بپا
اور چلتا تھا جلو میں اس کے آسیب و گزند

غش پہ غش آتے تھے ہر ذی روح کو پیہم وہاں
سانس لیتا تھا جہاں وہ اژدہائے زور مند

روندتا تھا جس کو وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری
صلح سے بجھتا نہ تھا ہوتا تھا جو شعلہ بلند

... فریفتہ اور مسلمانوں پر غضب ناک اور افروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے تھے۔ جس طرح اس بند میں محمود کی بے رحمی اور ظلم کا بیان کیا گیا ہے، اسی طرح ایک انگریز نے اس کی شان میں کچھ اشعار لکھے ہیں، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے: (نظم)

اے ملک زرنگار قدم ہے وہ کون سا
حملے سے جس کے ہے ترے ارکاں میں زلزلہ

وہ تیرے قصر اور ستوں دار سائباں
معبد وہ جو پہاڑوں کے غاروں میں ہیں نہاں

ٹھاکر اور اُن کے مندر، راجا اور ان کے تخت
حملے سے اس کے آ کے پڑا سب پہ وقت سخت

پتلا غضب کا کون سا وہ ہولناک ہے؟
اے ملک زرنگار وہ غزنی کی خاک ہے

آتا ہے لوٹتا ہوا اس بزم گاہ میں
پھرتے ہیں بکھرے تاج بہت اس کی راہ میں

کتے جو اس کے ساتھ شکاری ہیں بے شمار
ان کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار

بے رحم فوج لائی ہے جو لوٹ مار کر
مقتول رانیوں کے گلے سے اُتار کر

کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ
اور بے گنہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ

انگریزوں کا بیان ہے کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں پر بہت سختی نہیں کی گئی۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو وہاں سختی کی بہت ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ بے چارے اس درجے ناہموار، بے ڈول، ؎

خوف تھا دل میں خدا کا اور نہ کچھ بندوں پہ رحم
غارت و تاراج تھا اک بازیِ سلطان پسند

جب وہ آیا تھا تو سرتاپا گلستاں تھا یہ ملک
جب گیا یاں سے تو مثلِ دشت ویراں تھا یہ ملک

؎ اور ناشائستہ تھے کہ انگریز فاتحوں کی صورتیں، ٹیپ اور چمک دمک دیکھ کر شرم کے مارے زمین میں گڑے جاتے تھے اور کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ان کے پڑوس میں رہ سکیں۔ جس قدر انگریز مہاجروں کی تعداد آسٹریلیا میں بڑھتی گئی، وہ لوگ ملک کے اندرونی حصے میں غائب ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ معدوم ہوتے گئے۔ اب شاذ و نادر کہیں کہیں اندرونی پہاڑوں کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔ ٹسمانیہ کے قدیم باشندے جو ایک خوش بشرہ مگر ان سویلائزڈ قوم تھی، یورپ والوں کی ہمسائیگی کے باعث بالکل فنا ہوگئی، یہاں تک کہ اب ایک متنفس بھی اُن کی نسل کا باقی نہیں۔ پس آسٹریلیا کے قدیم باشندے جو انڈومان والوں سے بھی زیادہ بدقوارہ اور ناشائستہ تھے، انگریز جیسی اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم کے پڑوس میں کیوں کر ٹھہر سکتے تھے:

تو بجلوہ چوں در آئی اجل از سر ترحم
ہمہ جا کند منادی پے احتراز کردن

اگر فی الواقع انگریزوں نے آسٹریلیا والوں پر سختی نہیں کی تو یہ ان کی عین دانائی تھی کہ انہوں نے مفت کی بدنامی نہیں لی اور تمام براعظم اُن کے لیے خود بہ خود خس و خاشاک سے پاک ہوگیا۔

بات یہ ہے کہ دُنیا کے ایک بڑے حصے نے علم و ہنر میں اس قدر ترقی کی ہے کہ وہ دوسرے حصے کے ابنائے جنس سے اس قدر آگے بڑھ گیا کہ اگلے زمانے کے فاتح اور کشورکشا جن ناجائز ذریعوں سے مفتوحین کی دولت، ثروت اور سلطنت کے مالک ہوتے تھے، ان ذریعوں کے کام میں لانے کی اب مطلق ضرورت نہیں رہی۔ جس قدر مال و دولت پہلے قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیا جاتا تھا، اس سے اضعاف مضاعفہ، اب صنعت و تجارت کے ذریعے سے خود بہ خود کھنچا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب دو ایسی گورنمنٹوں کے درمیان، جن میں سے ایک شائستہ اور دوسری ناشائستہ ہو، تجارتی عہد نامہ تحریر ہو جاتا ہے تو یہ یقینا سمجھ لیا جاتا ہے کہ شائستہ گورنمنٹ بغیر اس کے کہ ہلدی لگے یا پھٹکری، دوسری گورنمنٹ کے تمام مال و دولت و منافع و محاصل کی بالکل مالک ہوگئی۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی، لیکن
حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں

یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گل چیں، یا ہے قزاقی؟

شاید ان شعروں میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ جو نتیجہ اگلے زمانے کے غارت گروں کی ...

(8)

آخر اے دانا حکیمو! کچھ سبب اس کا بتاؤ
ہے بنی آدم کو کیوں قتلِ بنی آدم کا چاؤ؟

جب کہ حق اور راستی ہے خاص رحمانی صفت
پھر تعجب ہے کہ جباری کا ہو اس میں لگاؤ

... لوٹ کھسوٹ سے مرتب ہوتا تھا، اس نتیجے کے قریب قریب یہ شائستہ لوٹ بھی پہنچا دیتی ہے۔ کروڑوں اہلِ صنعت وحرفت جن کی دستکاری، مشینکس کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی، نان شبینہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ فلاحت پیشہ لوگوں پر یہ بپتا پڑتی ہے کہ زمین کی پیداوار جس قدر کثرت کے ساتھ غیر ملکوں کو جاتی ہے، اسی قدر ملک میں زیادہ کاشت کا تردد کیا جاتا ہے اور اس سبب سے روز بروز زیادہ لاگت لگانی پڑتی ہے اور محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا۔ یہ پولیٹیکل اکونمی کا مسلم مسئلہ ہے کہ قدرتی پیداوار کی جس قدر مانگ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے بہم پہنچانے میں زیادہ لاگت اور زیادہ محنت صرف ہوتی ہے اور مصنوعی چیزوں کی جس قدر زیادہ طلب ہوتی ہے، اسی قدر ان پر کم لاگت آتی ہے اور کم محنت صرف ہوتی ہے۔ ملکی تاجروں کے لیے جو کہ شائستہ ملکوں کی مصنوعی تجارت کرتے ہیں، اول تو اوپر والے منافع کی کچھ گنجائش ہی نہیں چھوڑتے اور اگر قدرے قلیل (جیسے آٹے میں نمک) کچھ فائدہ بھی ہے تو اپنے ملک کی نہایت ضروری اور ناگزیر اشیاء کا نرخ گراں ہونے کے سبب اُن کی کمائی میں سے بہت کم پس انداز ہوتا ہے اور جس قدر ہوتا ہے، وہ غیر ملکوں کی آرائشی اور غیر ضروری چیزوں کے خریدنے میں، جو باوجود کمالِ نفاست اور لطافت کے نہایت ارزاں دست یاب ہوتی ہیں، صرف ہو جاتا ہے۔ پس ان کو بھی فارغ البالی اور آسودگی کبھی نصیب نہیں ہوتی اور اگر سو دو سو میں دو چار ایسے نکل بھی آتے ہیں، جو اپنے ملک میں مرفہ الحال سمجھے جاتے ہیں، ان کا معاملہ اور لین دین اُن کروڑ پتیوں سے ہوتا ہے جن کے مقابلے میں وہ اپنے تئیں محض مفلس اور قلاش تصور کرتے ہیں اور جن کی مانگ سے ہمیشہ دوالہ نکل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طمع اور خود غرضی اور زیردستوں کو دلنا اور پیسنا جیسا تاریکی اور وحشت کے زمانے میں تھا، اسی کے قریب قریب اب بھی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ دولت گھسیٹنے کے لیے پہلے جبر و تعدی کی ضرورت تھی، اب اس کی کچھ ضرورت نہیں رہی۔ ان سویلائزڈ دنیا کی دولت سویلائزڈ دنیا کی طرف خود بہ خود کھنچی چلی جاتی ہے۔

(تمثیل): ایک اژدہا شیر کو بہت برا بھلا کہہ رہا تھا کہ تُو کیسا بے رحم ہے کہ ہمیشہ جان داروں کا خون پینے کی فکر میں رہتا ہے اور شکار کی دھن میں دور دور کے دھاوے کرتا ہے۔ تمام جنگل میں تیری دھاک ہے۔ آج اس ہرن کو پھاڑ ڈالا کل اس پاڑے کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دیے۔ ایسی خوں خواری پر کمر باندھنی اچھی نہیں ہے۔ شیر نے کہا کہ قبلہ!

اگر میری سانس میں ایسی کشش ہوتی کہ دور دور سے جانور خود گھسٹتے ہوئے میرے منہ میں چلے آتے اور میری حرص و آز کی آگ بجھا دیتے تو میں بھی ہرگز کسی بے گناہ کے خون میں اپنے ہاتھ رنگین نہ کرتا۔ مع ذالک اگر کہیں آزادی تجارت میں کوئی مزاحمت پیش آتی ہے اور بغیر جبر و تعدی کے کام نہیں چلتا تو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی ...

جب کہ ہے سرچشمۂ مہر و محبت ذاتِ حق
پھر نہ مانی جائے کیوں اس کی شریعت بے دباؤ

کیا یہ زیبا ہے کہ دینِ حق کو، اے ابنائے جنس!
زور سے منواؤ تم اور ندیاں خوں کی بہاؤ

یا یہ بہتر ہے کہ سچی دوستی اور پیار سے
اور اُن باتوں سے جن میں جلوہ الفت کا دکھاؤ

دل کرو اہلِ جہاں کے پہلے تسخیر اور پھر
حکم پھیلاؤ خدا کے اور یقیں اُن پر دلاؤ

راہ حق کا خار و خس سے پاک ہونا چاہیے
گلشنِ دیں بے خس و خاشاک ہونا چاہیے

(9)

خار ہی خار آتے ہیں مدت سے لیکن یاں نظر
خون ہے استاد اور شاگرد دونوں کا ہدر

راستی اور امن کی دیتے ہیں جو تعلیم یاں
راحت اور آرام کو کھوتے ہیں اپنے سر بسر

... شائستہ قوم سب کچھ کرنے کو موجود ہو جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آزادی تجارت کی مزاحمت رفع کرنی عین انصاف ہے۔ حالانکہ آج تک پولیٹکل اکونمی نے اس بات کا تصفیہ نہیں کیا کہ فری ٹریڈ کا قاعدہ مطلقاً قرین انصاف ہے یا خاص خاص صورتوں میں خلاف انصاف بھی ہو سکتا ہے۔ انگلینڈ کا فائدہ فری ٹریڈ میں ہے، اس لیے وہ اسی کو عین انصاف سمجھتا ہے۔ فرانس اور یونائٹڈ اسٹیٹس اس کو اپنے حق میں بالفعل مضر سمجھتے ہیں، اس لیے وہ اس کو جائز نہیں رکھتے۔ لیکن انصاف شرط ہے، جن حکمتوں اور تدبیروں سے آج کل دنیا کی دولت گھسٹی جاتی ہے، ان پر بہ خلاف اگلے زمانے کی جابرانہ لوٹ کھسوٹ کے کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مشہور ہے کہ حکیم علوی خاں کے زمانے میں جو کہ محمد شاہ کا معالج اور ایک نہایت حاذق طبیب تھا، ایک عطار بھی اس کے نسخے دیکھتے دیکھتے علاج کرنے لگا تھا۔ لوگوں نے اس کا ذکر علوی خاں کے سامنے بھی کیا اور یہ کہا کہ جس قدر مریض آپ کے علاج سے اچھے ہوتے

ہیں اور مرتے ہیں، اس کے قریب قریب اس کے علاج سے اچھے بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ علوی خاں نے کہا: ''بلے، لاکن من بقاعدہ می کشم و آں قرم ساق بے قاعدہ می کشد''۔ (حالی)

ا۔ استاد اور شاگرد کی شرح نیچے کے دو شعروں میں کی گئی ہے۔ (حالی)

اور لینی چاہتے ہیں اس طرح تعلیم جو
وہ زمانے کے ستم لیتے ہیں اپنی جان پر

بات حیرت خیز ہے پر شک نہیں اس میں ذرا
نخلِ شادی آنسوؤں کی نم سے لاتا ہے ثمر

دم بہ دم سیراب اگر خونِ شہیداں سے نہ ہو
رہ نہیں سکتا ہرا دنیا کی راحت کا شجر

بے شہادت مل نہیں سکتی حیاتِ سرمدی
موت ہے در زندگی کا اور الم بابِ ظفر

غیر کے زخموں پہ ہرگز رحم ہم کھاتے نہیں
آپ جب تک زخمِ کاری کا مزا پاتے نہیں

(10)

اے جلال الدین ہے تو ہی وہ شاہِ نام دار
صلحِ کل جس کی زمانے میں رہے گی یادگار

بسکہ آزادی بنی نوعِ بشر کو تو نے دی
رائے پر ہر شخص کی ٹھہرا عقیدے کا مدار

فہم سے بندوں کے بالاتر تھے جو اسرارِ دیں
بحث کرنے کا ملا بندوں کو اُن میں اختیار

حوصلہ نکلا ترا شاہانِ پیشیں سے وسیع
تجھ سے القابِ شہنشاہی نے پایا اعتبار

پر تری اولاد نے کی پیروی تیری نہ حیف
ہو گیا اُن کا تعصب خود گلے کا اُن کے ہار

ثمرہ آخر مل گیا اُن کے تعصب کا انہیں

879

کر گیا رحلت جہاں سے جلد اُن کا اقتدار
خاروخس کے ڈھیر ہیں کھنڈروں میں اُن کے آج واں
دولتِ روئے زمیں کل جلوہ آرا تھی جہاں

(11)

خیر اُن کے ذکر سے اب کیجیے قطعِ نظر
خوبیاں تھیں عہد میں ان کے نہ لیکن اس قدر

امن و راحت، اتفاق اور برکتیں انصاف کی
ملک افزائش سے ہو جن کی بدولت بہرہ ور

اور رعیت کی اطاعت جو نہ مجبوری سے ہو
بلکہ جس سے رغبت اور اخلاص ہو خود جلوہ گر

نعمتیں ہندوستاں کو یہ ہوئیں اس دم نصیب
چھا رہی تھی جب کہ مایوسی دلوں پر سربسر

امن و راحت کا تصور تک نہ آیا تھا کبھی
جائے حق ناحق کا سکہ چل رہا تھا بے خطر

دیکھ کر آخر بدی کا دور دورہ، نیکیاں
ہو چکی تھیں یاں سے رخصت آہ ٹھنڈی کھینچ کر

اس اندھیرے میں اجالا ناگہاں پیدا ہوا
(چشمۂ حیواں کا ظلمت میں نشاں پیدا ہوا)

(12)

کیا مرہٹے، کیا مغل، سادات کیا، افغان کیا

عہد میں سب کے رہی یاں بارشِ ابرِ بلا
علم، فن، جرأت، نکوئی، مٹ گئیں سب خوبیاں
دم بہ دم طوفاں بدی اور عیب کا بڑھتا رہا
یاس سے حالت عجب اک ہند پر طاری ہوئی
بحرِ بے پایاں میں گویا سخت طوفاں تھا بپا
ناخداؤں کے بجا تھے اور نہ ملاحوں کے ہوش
اور جہازِ عافیت تدبیر کے بس میں نہ تھا
بے طرح چھایا ہوا تھا ابرِ ظلمت چارسو
کوکبِ رہبر کا ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا پتا
کوندنا بجلی کا تھا گویا کہ جگنو کی چمک
اک جھلک آئی نظر اور پھر اندھیرا چھا گیا
جو کہ بزدل تھے وہ غش کھا کھا کے گرتے تھے
وہاں
اور جی چھوڑے ہوئے تھا ہر جری اور سورماں

(13)

ڈوبنے کے جب نظر آنے لگے آثار سے
تب نجات آئی یہاں ساتوں سمندر پار سے
آ کے انگلستان نے طوفاں کو للکارا کہ بس
باز رہ اے فتنہ اپنی گرمیِ رفتار سے
مدتوں کی سختیوں سے ملک چھوٹا یک قلم
ہند کو اپنوں نے دی آ کر نجات اغیار سے
اہلِ ہند اور اہلِ مغرب اصل میں سب ایک تھے
کچھ دنوں بچھڑے رہے پر گردشِ ادوار سے
گو رہے چندے جدا پر مل گئے انجام کو
کلفتیں بدلی گئیں فرقت کی آخر پیار سے

اہلِ مغرب کو نہ سمجھیں غیر ہرگز اہلِ ہند
(آئنہ اور سنگ دونوں نکلے ہیں کہسار سے)

اب نہ چھوڑے گا یقیں وہموں کی لڑ کاٹے بغیر
دوستی رہتی ہے کب نفرت کی جڑ کاٹے بغیر

ا۔ اپنوں سے مراد مغربی آریا یعنی انگریز اور اغیار سے مراد مسلمان ہیں۔ (حالی)

(14)

دہریوں کا فرقۂ لایعقل اور کوتاہ بیں
اپنی کج رائی سے جو تقدیر کا قائل نہیں

اب ہیولی کو نہ سمجھے مصدرِ کل کائنات
اتفاقِ دہر پر رکھے نہ بنیادِ یقیں

ورنہ ہم پوچھیں گے اس سے کس طرح اک اتفاق
یا ہیولی لے گیا مغرب سے تا مشرق زمیں

کچھ جہاز اور چند سوداگر تجارت کے لیے
تا کہ ہوں پردیسیوں کی طرح واں جا کر مکیں

اور پھر اُس کشورِ آباد پر قابض ہوں وہ
ایک مدت تک رہا مغلوں کے جو زیرِ نگیں

کیا یہ سب کچھ اتفاقاً ہو گیا اے اہلِ رائے؟
یا مشیت نے تماشے اپنی قدرت کے دکھائے

(15)

ایسے ہذیاناتِ بے جا سے یہ بہتر ہے کہ ہم
مان لیں سر اور اسر ا۔ کی داستاں بے بیش و کم

گو کہ افسانہ ہے لیکن دہریوں کے قول سے
اس میں کچھ باتیں زیادہ دل نشیں پاتے ہیں ہم

اے سُر دیوتا اور اسر راکشس کو کہتے ہیں۔ مہا بھارت میں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک بار دیوتاؤں اور راکشسوں کی لڑائی ہوئی تھی، جس میں دیوتا فتح یاب ہوئے اور راکشس ہارے۔ راکشسوں کو یہ خیال ہوا کہ ہم باوجودے کہ دیوتاؤں سے قوی اور زبردست ہیں، پھر کیوں اُن سے مغلوب ہو گئے۔ آخر یہ معلوم ہوا کہ اُن کے پاس علم یعنی منتروں کی طاقت ہے۔ راکشسوں نے اُن کے منتر اور کتابیں چرالیں اور ایک راکشس سنکھا سر نام اُن سب کو لے کر سمندر میں غائب ہو گیا۔ ایشر نے جو یہ حال دیکھا تو خود مچھلی کا روپ بھر سنکھا سر کو سمندر میں جا کر ہلاک کر دیا اور دیوتاؤں کے سارے منتر اور پستکیں صاف نکال لائے۔ ایشر جی کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا ۔۔۔

اہلِ انگلستان کا آنا سمندر پار سے
ہے سمندر کا بلونا فی المثل اے محترم

زندگی جو اس سے اہلِ ہند کو حاصل ہوئی
ہے وہ امرت جو کہ پہنچا ہے سمندر سے بہم

اب رہا وہ زہر جس سے حلق شیو کا جل گیا
یہ وہی حق ہے کہ جو ہے واسطے باطل کے سم

۔۔۔ کہ سمندر میں اور بھی بہت سے رتن یعنی مفید و نایاب چیزیں ہیں، ان کو نکالنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میں کچھوا بنتا ہوں۔ میری پیٹھ پر رئی کی جگہ ہمالیہ پربت کو رکھ دینا اور تسمے کی جگہ باسُکی (سانپ کا نام ہے) کو وہ ہمالیہ کے گرد لپیٹ کر اس کے دونوں سرے سر اور اسر اس طرح سے پکڑیں کہ سانپ کے منہ کی طرف سے سروں کے اور دم کی طرف سے اسروں کے ہاتھ میں رہے اور اس طرح سمندر کو بلو ڈالیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ سمندر میں سے چودہ رتن یعنی لچھمی، جواہر، شراب، دھنتر بید، چاند، گئو، گھوڑا، سفید ہاتھی، تیر کمان، امرت اور بس وغیرہ برآمد ہوئے۔ امرت پر سروں اور اسروں کی باہم تکرار ہو گئی۔ انہوں نے کہا ہم لیں، انہوں نے کہا ہم لیں۔ ایشر ایک حسین عورت کا روپ بھر کر اُن پر ظاہر ہوئے۔ دیوتا اور راکشس دونوں اس کی صورت پر فریفتہ ہو گئے اور آپس میں یہ بات قرار دی کہ یہ عورت جس کو جو کچھ دے وہ اس کو خوشی سے لے لے۔ چنانچہ اس عورت یعنی ایشر نے ایک لچھمی تو اپنے واسطے رکھ لی اور باقی تمام رتن دونوں فریق پر تقسیم کر دیے۔ امرت سروں کے حصے میں آیا تھا مگر تھوڑا سا تقسیم ہونا باقی تھا کہ ایک راکشس اٹھا کر پی گیا۔ دیوتاؤں میں سے ایک نے اس کا سر اڑا دیا۔ لیکن بس کو کسی نے لینا قبول نہیں کیا۔ شیو یعنی مہادیو جی نے کہا لاؤ اس کو میں کھا جاؤں۔ وہ اس کو کھا تو نہ سکے مگر اپنے کنٹھ یعنی حلق میں رکھ لیا، جس کے سبب سے اُن کا گلا نیلا پڑ گیا۔ شاعر اس بند میں قصہ مذکور کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ برٹش حکومت کا ہندوستان میں قائم ہونا اس قصے کا مصداق ہے۔ گویا انگریز مثل دیوتاؤں کے ہیں جو اپنے علم کی طاقت سے راکشسوں یعنی ہندوستان کے لٹیروں اور پنڈاروں اور ظالم حکمرانوں پر غالب آئے اور وہ جو انگلستان سے کئی سمندر طے کر کے ہندوستان تک پہنچے، گویا سمندر کا بلونا تھا اور ان کی سلطنت سے زندگی

یعنی امن ورفاہ وآزادی اور جان ومال کی حفاظت ہندوستان کو حاصل ہوئی۔ یہ وہ امرت ہے جو سمندر سے برآمد ہوا اور جس زہر سے کہ مہادیو جی کا حلق جل گیا یا نیلا پڑ گیا تھا، اس سے خود انگریزی سلطنت کو مثال دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح حق باطل کے واسطے زہر ہے، اسی طرح یہ سلطنت قدیم سلطنتوں اور ان کی طرز حکومت کے حق میں زہر ہلاہل کا حکم رکھتی ہے۔ اس سے اگلے دیوتاؤں یعنی قدیم بادشاہوں کی حکمرانی کے طریقے اور قاعدے سب محو ہو جائیں گے اور اُن کی تائید میں جو غیب سے آوازیں آتی تھیں وہ بند ہو جائیں گی اور جب تک کہ ہندوستان میں صبح صادق علم اور شائستگی کی روشنی نمودار نہ ہوگی، برابر قدیم زمانے کی تاریکیوں کو یہ سلطنت محو کرتی رہے گی۔

جس سے ہو گی محو اگلے دیوتاؤں کی نمود
اور ہوں گے ہاتفانِ غیب گونگے یک قلم

جو مٹائے جائے گا باطل کی ظلمت کے نشاں
صبح صادق کی نہ ہو گی روشنی جب تک عیاں

(16)

ہند میں پہلے کبھی جو سلطنت یک سو نہ تھی
اس کو امرِ اتفاقی جاننا ہے ابلہی

یہ بھی کہنا غیر ممکن ہے کہ تھی اسلاف میں
تجربے کی، عقل کی، تدبیر و جرأت کی کمی

ہاں مگر تقدیر پر ہے جب کہ ہر شے کا مدار
چاہیے کہنا کہ تقدیرِ الٰہی تھی یہی

اکبر اور شاہِ جہاں کی ذات میں کیا کچھ نہ تھا
سلطنت کی جو لیاقت چاہیے وہ ان میں تھی

دھاک نادر شاہ کی بھی کم نہ تھی شیروں سے کچھ
فتح ان کی پر نہ اپنی حد سے آگے بڑھ سکی

آج یہ صوبہ پھرا، کل ملک وہ باغی ہوا
عہد میں سب کے یہی نقشہ، یہی صورت رہی

دُور تھا وہ دن کہ سر ہوں ایک در پر سب کے خم
ہند کی فوجیں ہوں ساری زیرِ سلطانی علم

(17)

راج پر راجا اشوکا کے ہیں وہ لاٹھیں گواہ
جن پہ فرماں اس کے اب تک ثبت ہیں بے اشتباہ
ہند میں از بس کہ جو لاٹھیں گڑی ہیں دور دور
ہے ہویدا ان سے اس کی وسعتِ تمکین و جاہ
پر نشانِ فتح جو اول پلاسی میں گڑا
اور پھر کابل میں پہنچی چرخ تک اس کی کلاہ
مدتیں گزریں کہ وہ اُتر سے لے کر تا دکن
کر چکا ہے حد سے ان لاٹھوں کی بڑھ کر قطعِ راہ
پورب اور پچھم میں بھی ڈالا ہے اس نے دور دور
سایۂ عدل و نکوئی، پرتوِ امن و رفاہ
ہم نے یہ مانا کہ پتھر پر ہیں جو کندہ حروف
وہ رہیں گے منقش اس پر ہزاروں سال و ماہ
نام ہے وکٹوریا کا ان سے بڑھ کر پائیدار
نقش ہر اک صفحۂ دل پر ہے جس کا استوار

(18)

مشرقی تاج آج تک تھا پیشِ ربِ ذوالمنن
اک امانت جس سے محرم تھا نہ فرقِ مرد و زن
قبضۂ تقدیر میں اب تک رہا محفوظ وہ
مر گئے اس کی تمنا میں سلاطینِ زمن
ہاں مگر اے فخرِ شاہانِ جہاں وکٹوریا!

تھی ترے فرقِ مبارک سے لگی اس کی لگن

گر کہے کوئی کہ اوروں نے نہ کیوں پایا یہ تاج
اس سے کہہ دو لایقِ حلوا نہیں ہے ہر دہن

گو بہت دنیا میں شاہ و شاہ بانو ہیں مگر
بانوے برطانیہ کا سب سے بالا ہے چلن

ماں کسی اولاد کو ایسی نہیں ہوتی نصیب
اور نہ ماں کو ایسی بیٹی اور نہ دولہا کو دلہن

نیک نیت پاک دل ایسے بشر ہوتے نہیں
رنج سہنے کے لیے ایسے جگر ہوتے نہیں

(19)

وہ جزیرہ جو کہ روئے بحر پر ہے مثلِ خال
دھوپ کا اور روشنی کا جس کی سرحد میں ہے کال

جس سے آگے بڑھ کے ہیں آثارِ قدرت ناپدید
کچھ نہیں آتا نظر جز ذاتِ ربِ ذوالجلال

یعنی انگلستان، ہے جس کی حقیقت اس قدر
شاید اس کے باب میں کوئی یہ کر بیٹھے سوال

کیا ضرورت ہے کہ وہ مختار اور قابض رہے
سرزمینِ ہند پر ہے جس کی وسعت کا یہ حال

اس سے کہہ دو، خوں بہے اولاد کا اس کی جہاں
آبِ باراں کی طرح اور بحر و بر ہو جائیں لال

جس کے لینے اور بچانے کے لیے لاکھوں شجاع
جنگ میں گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہوئے ہیں پائمال

مفت اسے ہاتھوں سے کھودینا روا ہو کس طرح؟

خوں بہا ان سورماؤں کا ادا ہو کس طرح؟

(20)

اور سب جانے دو کیا عظمت کی کچھ قیمت نہیں؟
یا فتوحاتِ نمایاں لائقِ وقعت نہیں؟

پے بہ پے فتح و ظفر کی قیمتی زنجیر، کیا
دوش پر اک قوم کے پیرایۂ عزت نہیں؟

واسطے اولاد کے میراث جس کو چھوڑ جائیں
اس قدر بھی دولتِ عزت میں کیا برکت نہیں؟

سمجھے اس دولت کو جو ناچیز اس کی روح کو
جسم خاکی سے جو سچ پوچھو تو کچھ سبقت نہیں

بحث کرنی اس سے لاحاصل ہے، سمجھا دو اسے
تجھ کو انگلستان کی شہرت سے کچھ نسبت نہیں

ناحق ایسے شخص کے کہنے کا تم مانو برا
جس کی فطرت میں کہ حیوانوں سے کم خست نہیں

ننگِ ذلت ہے نہ کچھ پروائے عزت ہے جسے
ہر مذلت اور پستی پر قناعت ہے جسے

(21)

جرائتیں اسپارٹا سے یہ نہ ہوتیں آشکار
گر بزرگوں کی مہمیں واں نہ ہوتیں یادگار

جب بڑوں کے اپنے سا کے یاد آتے تھے انہیں
آبرو پر جان وتن بڑھ بڑھ کے کرتے تھے نثار

سورما تھرموپلی کا نام سن پاتے ہیں جب
جوش میں آتے ہیں کیا کیا اُن کے دل بے اختیار

آئے ہیں اس معرکے میں کام جو شیرِ جری

نسل میں اُن کی وہی عزت رہے گی برقرار
جو کہ دہلی یا اسائی میں ہوئے ہیں فتح یاب
ہم وطن بھائی ہوں اُن کے یا عزیز اور دوست دار
جی چرائیں گے نہ ہرگز جان دینے سے کہیں
فی المثل گر دس گنی طاقت سے بھی ہوں گے دوچار
تا کہ فتحِ دہلی و فتحِ اسائی کا شرف
قوم میں باقی رہے گو اپنی جانیں ہوں تلف

(21)

یاد ہو گا سب کو وہ حق کا عتاب اولیں
جس نے ڈالی تھی بشر کی ذات میں بنیادِ کیں
تفرقے نے توڑ کر پھینکا تھا سب کو دور دور
تھی پڑی جس وقت بن بوئی جُتی ساری زمیں
کون ہو گا جس کے دل میں یہ تمنا ہو کہ پھر
ہو وہی پہلا عتاب انسان پر نازل کہیں
قومیں آپس میں بہت رکھتی ہیں یاں جو میل
جول
ان کی عقلیں ہوتی جاتی ہیں زیادہ دور بیں
ایک حاکم کی رعیت دوست ہوتی ہے سدا
گر نہ ہو تو ایک دن ہو جائے گی وہ بالیقیں
قوت اور امن و خوشی ہیں ثمرہ ہائے اتفاق
ثمرۂ نااتفاقی جز ہزیمت کچھ نہیں
نوعِ انساں میں بدی سے جو کہ پھیلا تھا نفاق

کرتا جاتا ہے زمانہ اس میں پیدا اتفاق

(23)

ہے زبردستوں کا یارو بول بالا آج کل
پودنے کی اصل کیا، دیووں کا ہو جس جا خلل [1]

اک ذراسی ٹھیس میں ہوتا ہے کام اس کا تمام
دیو کی جنبش ہے اس کے حق میں پیغامِ اجل

[1] یہ روس کی طرف اشارہ ہے۔ انگلینڈ کو پودنے اور روس کو دیو سے تشبیہ دی ہے۔ (حالی)

دے گر انگلستان کا ساری رعیت مل کے ساتھ
تنگ ہو جائے عدو پر عرصۂ جنگ و جدل

ورنہ وہ ملت کہ جو دو براعظم پر ہے آج
سایہ افگن صورتِ نخلِ تناور، فی المثل

کیا تعجب ہے کہ اس کا سایۂ دور و دراز
رفتہ رفتہ جائے باہر اپنی سرحد سے نکل

سامنے اس قوم کے انگلینڈ کی ہے وہ مثال
جیسے اک بالشتیا آ جائے پیشِ مردِ طویل

وقت پر سب مل کے گر اس کا نہ دیں گے ساتھ یاں
ایک طرف ہو جائے گا پلہ ترازو کا گراں

(24)

نوعِ انساں کو ملی ہے جب کہ عقلِ ناتمام
پھر حماقت ہے کہ کیجیے آج، کل کا اہتمام

بات جو کل ہو چکی اس کی بھی حسرت ہے عبث
رہتے ہیں آج اس لیے ہر حال میں ہم شادکام

جب کہ اک ہموار رستے پر چلے جاتے ہیں ہم

دائیں بائیں کے بلند و پست سے کیا ہم کو کام
کچھ دنوں سے چڑھ رہے ہیں ہم بلندی کی طرف
کر چکے ہیں قطع تھے یاں پُرخطر جتنے مقام
آن پہنچے جب بلندی پر تو لازم ہے کہ اب
خوف کا ہرگز رہے باقی نہ دل میں اپنے نام
جب بلندی پر سے دیکھیں جھک کے پستی کی طرف
شکرِ حق لائیں بجا اور بخت کو بھیجیں سلام
جو خوشی دی ہے خدا نے اس سے جی ٹھنڈا کریں
یادِ غم ہائے گزشتہ سے نہ دل میلا کریں

(25)

راگنی اب وقت کی ہم چھیڑتے ہیں برملا
جس سے ظاہر ہو کہ حالت ہند کی ہے آج کیا

اتفاق اور دوستی نے کر دیا ہے سب کو ایک
اور آزادی نے کر رکھا ہے ہر اک کو جدا [1]

مملکت فوجوں سے اور قلعوں سے ہے معمور سب
پایۂ نظم و نسق پہنچا ہے تا فوق السما

سر پہ دو تاج ہمایوں ہند کے رکھے گئے
واجبی حق الغرض مدت کے بعد اس کو ملا

برخلاف اس ملک کے جو ڈھک رہا ہے برف سے
ہر طرف ہے بن ہی بن اور قحط ہے جاں دار کا

۲؎

بھیڑیوں کے غول پھرتے ہیں بنوں میں چیڑ کے
تا کہ جو مل جائے واں آوارۂ دشتِ بلا

کر کے چھوڑیں اس کو ایسا بے کس و بے خانماں
حشر تک پیارے رہیں فرقت میں اس کی نوحہ خواں

۱؎ یعنی سب کو رائے کی آزادی حاصل ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کے اور خود گورنمنٹ کے خلاف رائے دینے کا مجاز ہے۔ گویا آزادی کی حیثیت سے سب جدا جدا ہیں اور اتفاق کی حیثیت سے سب ایک ہیں۔ (حالی)
۲؎ یہ روس کے ویران اور غیر آباد ملک کی طرف اشارہ ہے۔ (حالی)

(26)

بارے ایسی ہند کی حالت نہیں زار و نزار
ہے موافق اس کی وسعت کے رعیت کا شمار

فرض کیجیے کل بنی آدم کے چھ حصے اگر
ایک حصہ اس میں اہلِ ہند پائیں گے قرار

ہے یقیں مقدار اس کی اس سے بھی بڑھ جائے کچھ
کیوں کہ فتنے کو نہیں مدت سے ملتا اس میں بار

زندگی کی ریت اب شیشے میں ٹھہرے گی سوا
پیش تر جس کے نکلنے کا بندھا رہتا تھا تار

اس قدر بندوں کی روزی کا ہمیں کیوں فکر ہو
ہے خدا کے حکم پر سب کی معیشت کا مدار

کچھ نہیں تو قحط کا دورہ سلامت چاہیے
بڑھنے پائے گا نہ آدم زاد کا حد سے شمار ۱؎

یاد رکھ اے منکرِ حق ہے یقیں اصلِ نجات
وسوسوں سے اور کھل جاتی ہے راہِ مشکلات

ا۔ اس خیال سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک غریب ہندوستانیوں کی جانیں خضراے دمن اور حشرات الارض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ کاش وہ ہندوستان کی آبادی گھٹنے کے لیے یہ اُمید ظاہر کرتا کہ جس قدر تجارت، سیاحت اور علوم وفنون کی ملک میں ترقی ہوتی جائے گی، اسی قدر یہاں کے باشندے ترک وطن اختیار کرتے جائیں گے اور اسی طرح رفتہ رفتہ ملک کے باشندوں کی تعداد ایک مناسب مقدار پر آ ٹھہرے گی۔ اس بیان میں ایک اور بھی خلل ہے۔ اوپر کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مردم شماری زیادہ ہونے سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی پیداوار ہندوستانیوں کی خوراک کے لیے کافی نہ ہو اور اس سبب سے بہت سے لوگ بھوک سے مرنے لگیں۔ اس اندیشے کو وہ اس طرح رفع کرتا ہے کہ جب قحط سالیوں میں لوگ بھوک سے مرتے رہیں گے تو مردم شماری بڑھنے نہ پائے گی اور ملک کی پیداوار ملک والوں کو کافی ہو گی۔ گویا بھوک سے مرنے کا علاج بھوک ہی سے مرنا بتاتا ہے۔ (حالی)

(27)

ہر کرن سورج کی اور ہر بوند پانی کی ہے یاں
لاکھوں جاں داروں کے رہنے کو علیحدہ اک جہاں

وہ خدا جس نے بنایا اور پھر پالا انھیں
کیا تجھے اور نسل کو تیری نہ دے گا قوت و ناں

ہند کا دریا جو چڑھتا ہے تو چڑھنے دو اسے
تو یقیں کو اپنے رکھ مضبوط بے وہم و گماں

ہے اگر غلبے کا کثرت پر رعایا کی مدار [1]
ہند ہو سکتا ہے آدھے ایشیا پر حکمراں

ہے کوئی وادی جہاں میں ہمسرِ کشمیر آج
یا کوئی گنگا کے میداں سے زمیں زرخیز تر

شہر ہے جو مرکزِ کشمیر [2] مانندِ طلسم

879

طرفہ کیفیت سے ہے لہروں میں ڈل کی جلوہ گر

دیکھتے ہیں آبِ صافی میں جب اس کا انعکاس

دوسرا وینس کا نقشہ صاف آتا ہے نظر

باغِ شالامار جو رونق فزا ہے اس کے پاس

ہے وہ اک نیرنگِ قدرت کا تماشا سربسر

سبزہ و نسرین و گل کی سرزمیں کہیے اُسے

صفحۂ گیتی پہ یا خلدِ بریں کہیے، اُسے

ا۔ غلبے کا مدار کثرت رعایا پر نہیں ہے بلکہ رعیت کے ذہن میں یہ بات تہ نشیں ہونی چاہیے کہ ہمارے اور گورنمنٹ کے مقاصد متحد ہیں اور ہم پر ہماری ہی بہبودی کے لیے حکومت کی جاتی ہے۔ جب تک رعیت کو اس بات کا یقین نہ ہو، کیوں کر امید کی جا سکتی ہے کہ وہ سلطنت کی جاں نثار ہوگی؟ (حالی)

۲۔ مرکز کشمیر سے مراد سری نگر ہے۔ (حالی)

(29)

فی المثل تختہ زمرد کا ہے واں اک سبزہ زار

سایہ افگن اس طرح ہیں ہو بہو اس پر چنار

جھیل کے چاروں طرف جس طرح آتے ہیں نظر

زیر و بالا اونچے نیچے گھر قطار اندر قطار

تھی بنانے سے غرض تیرے پرے باغِ نسیم

باغِ جنت کا نہ انساں کو رہے کچھ انتظار

چوٹیاں پربت کی ہیں یوں برف میں لپٹی ہوئی

جا بہ جا گویا کھڑے ہیں دیو اور جن پہرہ دار

ان کی رفعت اور بلندی کی نہیں کچھ انتہا

سینۂ گردوں سے گویا اب نکل جائیں گی پار

روزِ روشن میں جب اُن کا جھیل پر پڑتا ہے عکس

نقرئی پانی کی اس کے پھر کوئی دیکھے بہار

اور پھر جھرمٹ زنانِ مہ لقا کا ہر طرف
(سامنا آفت کا فتنے کا بلا کا ہر طرف)

(30)

جنت اے کشمیر کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں
تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں

ہر چمن یاں پھول سے اور پھل سے مالا مال ہے
ہر چمن میں یاں مہیا ہیں مکاں بہرِ مکیں

ان مکانوں اور خیابانوں سے جب آگے بڑھے
پھر وہ عالم ہے جہاں غیر از خموشی کچھ نہیں

جیسے ہوتا ہے ابد پر وقت جا کر منتہی
ختم ہو جاتی ہے دنیا بھی یہاں آ کر یونہیں

یعنی اقلیمِ ابد اور یہ جہانِ خامشی
طاقتِ انساں کی حد سے ہیں پرے دونوں کہیں

طرفہ سناٹا ہے اس سنسان کوہستان پر
جس کی دنیا میں نہیں تمثیل کوئی دل نشیں

ہیں سراسر ناپدید آثارِ انسانی یہاں
منہ لپیٹے ہیں پڑے اسرارِ یزدانی یہاں

(31)

ڈھونڈھیے گر ان پہاڑوں کی بلندی کی مثال
ظاہرا اُن کا اور انگلستان کا ہے ایک حال

جیسے وادی کی زمیں سے تا فلک پہنچے ہیں یہ
وہ بھی پستی سے یونہی پہنچا ہے تا اوجِ کمال

ہے یقیں رستے ہی میں ہو جائے کام ان کا تمام
ہو جنہیں اس کی بلندی تک پہنچنے کا خیال

تا پتی پر آ کے انگریزوں نے جب کھولی دکاں
ایک مدت تک ترقی نے نہ بدلی اپنی چال

یعنی اس دم تک کہ سکھوں سے ہوا گہرا بگاڑ
اور دریا ہو گئے پنجاب کے سب خوں سے لال

لشکرِ مقدونیہ کی قتل گاہوں پر ہوا
بعدِ مدت گرم پھر ہنگامۂ جنگ و جدال

اہلِ انگلستان کو جھگڑوں سے فرصت کم ملی
امن کو فتنے کے ہاتھوں سے فراغت کم ملی

(32)

جب بغاوت نے اٹھایا سر تو اس سے بھی سوا
آگ بھڑکی مرگ کی اور خون کا دریا بہا

عورتیں اور اُن کے بچے بے گنہ مارے گئے
گھر جلے اور دشمنِ جاں ہو گئے خود دست و پا

بھائی بندوں کی جفائیں دیکھ کر غمگیں ہوئے
اہلِ انگلستان کے ساتھی جو تھے اہلِ وفا

اور ہزاروں نے یہ باندھا مل کے منصوبہ کہ بس
عزت انگلستان کی اب خاک میں دیجے ملا

صفحۂ ہستی سے نام ان کا مٹانے کے لیے
ہو گیا تیار جان و دل سے ہر چھوٹا بڑا

لیکن ان کی گھات میں تھا شحنۂ قہر و غضب

پھنس گئے پنجے میں اس کے یک بیک اہلِ خطا
پلہ انگلستان کا ہو کر رہا آخر گراں
گرتے گرتے تھم گیا اقبال کا اس کے نشاں

(33)

گو ہوئی دلی پہ حاصل برملا فتح و ظفر
پرچم اقبال لہرانے لگا پھر بے خطر
پر نہ اس فتحِ نمایاں کا ہوا اعلان کچھ
وسوسوں سے دل رہے سب اس لیے زیر و زبر
چونک چونک اٹھنے لگے راتوں کو بدخوابی سے لوگ
کر گئی دنیا سے گویا فارغ البالی سفر
صبح کے ہوتے ہی سب کافور ہو جاتی تھیں وہ
شکلیں ہیبت ناک جو راتوں کو آتی تھیں نظر
رائے یہ ٹھہری کہ پائے اب وہ قیصر کا لقب
تابعِ فرماں ہیں جس فرماں روا کے بحر و بر
قوتِ بازو سے جو حاصل کیا ہے قوم نے
وہ ہمایوں تاج رکھا جائے اس کے فرق پر
تاکہ سب جانیں کہ رخصت ہند سے فتنہ ہوا
عہد انگلستان کا جو کچھ کہ تھا پورا ہوا

(34)

اس نویدِ روح پرور کی اشاعت کے لیے
ہند میں آیا پرنس آف ویلز انگلستان سے
ایلبرٹ اڈورڈ جس کے دودۂ اقبال میں

سو جلیل القدر سلطاں اب سے پہلے ہو چکے

جس کے دادا نے کیا زیر و زبر نظمِ فرانس

اور بتاتا ہے لقب جس کا پتے اس جنگ کے

دی فرانسیسوں کو جس میں زک وہ انگلستان نے

جس سے واقف ہیں فرنگستان کے چھوٹے

بڑے

حاکمِ بوہیمیا کی چھین لی تھی جس میں ڈھال

خود ولی عہدِ زماں نے یاریِ اقبال سے

جس میں کلھے اعترافِ بندگی کے برملا

حاکمِ بوہیمیا کے دستخط سے ثبت تھے

جمع تھے جس ذاتِ والا میں فضائل اس قدر

وہ ہوا مامور اس کارِ عظیم الشان پر

(35)

وہ مبارک وقت جب لنکا سے لے کر تا عدن

اس کے آنے کی خوشی میں محو تھے سب مرد و زن

راگ گائے جاتے تھے ہر سو مبارک باد کے

جوشِ شادی میں در و دیوار تک تھے نغمہ زن

شہر میں جنگل میں ہر میدان اور ہر راہ میں

جمع تھی اس کے لیے خلق انجمن در انجمن

وہ سہانے بول شہنا کے وہ باجوں کی جھڑی

پڑ رہی ہے جن کی گویا کان میں اب تک بھرن

کھنچ چکے ہیں اس ہمایوں جشن کے نقشے بہت

میں بھی اے وکٹوریا، اے فخرِ شاہان زمن

چاہتا ہوں کھینچنا اک خاکہ اس دربار کا

جس میں کی تو نے قبائے قیصری زیبِ بدن

جس میں تیرے نام کا ڈنکا بجایا قوم نے

جو کہا تھا منہ سے آخر کر دکھایا قوم نے

io

2انگریزی اشعار کا ترجمہ

وہ دل ربا اُمیدیں جن پر کہ تو ہے شیدا

جب دور تیرے دل سے ہو جائیں گی سراپا

879

وہ عالم جوانی جس پر کہ تو ہے مفتوں
جائے گا ٹوٹ جس دم اُس کا طلسم سارا
جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تو نے اس کو
تھا جو کہ تجھ کو اپنا آرامِ دل سمجھتا
چل دیں گے جب وہ سارے ان بلبلوں کی
مانند
بعد از بہار جو رخ کرتی نہیں چمن کا
جب ہو چکے گا آخر یہ عیش کا زمانہ
کون آ کے دے گا تجھ کو اس کے سوا سہارا
بے مہریوں سے تو نے جس کو کیا ہے غم گیں
تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آ کے لے گا
جس طرح وہ پرندہ جو فصل گل میں جا کر
پھر موسمِ خزاں میں آ کر ہے ہم سے ملتا

io

3 ناقدری

(گرے کے اشعار کا ترجمہ ا ؎)

موتی ہزار قعرِ سمندر میں ہوں نہاں
پر یہ بتاؤ ان کا خریدار ہے کہاں
کھلتے ہیں پھول سیکڑوں ویران دشت میں
ہے کون رنگ و بو کا وہاں اُن کے قدرداں

io

4 واقعۂ ہجرت [۲]

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشعار کا منظوم ترجمہ)

(عربی اشعار)

وقیت بنفسی خیر من وطئ
الحصٰی
و من طاف بالبیت العتیق و
بالحجر

رسول اللہ خاف ان یمکروا بہ
فنجاہ و فی حفظ الالٰہ و فی ستر

۱؎ مولانا حالی نے گرے کی مشہور نظم (Elegy) کے ایک بند کا ترجمہ نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب آنریری سیکریٹری محمڈن کالج علی گڑھ کے برادر معظم کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ اشعار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (مورخہ 2 اپریل 1913ء) سے جواہرات حالی کے آخری صفحے پر نقل کیے گئے۔ گرے کی نظم کا بند درج ذیل ہے:

Full many a gum of purest ray serene
The dark unfathomed caves of ocean bear
Full many a flower is born to blush unseen
And waste its sweetness on the desert air.

۲؎ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشعار اور حالی کا ترجمہ، نقوش کے شمار نمبر 96 میں شائع کرایا۔ اُن کا بیان ہے کہ حالی کا یہ ترجمہ 1917ء میں انہوں نے مولانا مرحوم کی ایک بیاض سے نقل کیا تھا لیکن اصل عربی اشعار کے بغیر اسے جواہرات حالی میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بعد میں خلیفہ سید محمد حسن، وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی کتاب اعجاز التنزیل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشعار مل گئے۔ مولانا حالی نے یہ ترجمہ خلیفہ سید محمد حسین، میر منشی ریاست پٹیالہ کی فرمائش سے 30 نومبر 1886ء کو بہ مقام لاہور کیا تھا۔
(نقوش نمبر 96۔ سالنامہ جنوری 1963ع۔ ص:28-29)

اقام ثلثًا ثم ذمت قلائص
قلائص تغرین الحصٰی این ما
تغر

و بت أراعیہم و ما یثبتوننی
فقد وطنت نفسی علی القتل و

الاسر

اردت بہ نصر الالہ تبتلا
و اضمرتہ حتٰی اُوسد فی قبر

(ترجمہ)

رسولِ مطہر e کہ ہے اس سے کم تر
زمیں پر خدا کی جو ہے چلنے والا
پھرے گرد کعبے کے جو یا پھریں گے
وہ قدر و بزرگی میں ہے سب سے بالا
ہوا خوفِ اعدا، تو اس پر سے میں نے
سپر بن کے خود شرِّ اعدا کو ٹالا
بچایا اُسے مکرِ اعدا سے حق نے
وہ جو سب پہ ہے لطف و احسان والا
خدا خود رہا غار میں اُس کا ایمن
کہ پردہ تھا اُس نے سب آنکھوں پہ ڈالا
ہوئے تین دن جب تو اس حد سے باہر
سواروں نے ناقوں کو اپنے نکالا
وہ ناقے جنہوں نے کہ پیروں سے اپنے
گئے جس زمیں پر اُسے پیس ڈالا
میں اعدا کی ایذا کا تھا منتظر واں
نہ بیڑی ہی تھی شاق مجھ پر نہ بھالا
غرض اس سے تائیدِ حق تھی اور اب بھی
یہی دھن ہے تا وصلِ ایزد تعالیٰ

io

بابِ چہاردہم

قطعاتِ تاریخ اور تاریخی جملے

مقتبس از قرآن

حالؔی کی تاریخ گوئی

اُردو ادب کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے تاریخ گوئی کی ہے اور بعض تاریخیں آج بھی زباں زدِ عام ہیں۔ اگر چہ اس فن میں تخلیق سے زیادہ تشکیل کا دخل ہے پھر بھی یہ فن آج بھی جاری ہے۔حالیؔ تاریخ گوئی کے پرستار نہ تھے جیسا کہ خود لکھتے ہیں:

راقم کو فی الواقع تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تخرجہ یا تعمیہ کے ساتھ اور کبھی حسن اتفاق سے بغیر اس کے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادہ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اس پر صرف مصرعے لگا کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھے لیکن چونکہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزوِ شاعری سمجھا گیا ہے۔ اس لیے اکثر طوعاً وکرہاً یاروں کی فرمایش سے اور کبھی کبھی اپنی اپج سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔ راقم چونکہ تاریخ نکالنے میں سدا سے بیٹا تھا اس لیے ہمیشہ اس امتحان سے کتراتا رہا۔ لیکن بری بھلی چند تاریخیں جو کبھی کبھی دوستوں یا بزرگوں کی فرمایش یا اپنے دل کی خواہش سے لکھی تھیں ان میں سے جس قدر سردست بہم پہنچیں دیوان میں شامل کر دی گئیں۔ تا کہ دیوان کے ضروری اخلاط میں سے ایک خلط کم نہ ہو جائے۔

حالیؔ اُردو کے وہ پہلے ممتاز شاعر ہیں جنہوں نے غالب کی تاریخ وفات خود غالبؔ کے مصرعے سے نکالی۔ بعد میں یہ طریقہ عوام اور خواص میں پھیل گیا۔ چنان چہ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، جوشؔ، اقبالؔ، جگر وغیرہ کی تاریخ وفات انہی کے مصرعوں سے نکالی گئیں۔ اس موقع پر ہم صرف قطعہ تاریخ سے وہ شعر جس میں تاریخی اعداد و شمار ہے پیش کرتے ہیں۔

تاریخ وفات مرزا غالبؔ:

تاریخ ہم نکال چکے پڑھ ''بغیر فکر''
''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''

تاریخ وفات محمد ابراہیم جواں مرگ طالب علم دہلی کالج:

بگفتم ز روے الم سال فوتش

بجان آفرین جانِ شیرین سپردہ

تاریخ بنائے چاہ درمحوطہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ:

زروے سال بعثت چونکہ تھی تاریخ کی خواہش

کہا ہاتف نے حالی سے کہ "چشمہ فیض احمد کا"

1312ھ

تاریخ طبع ترجمہ دربار قیصری:

چھپ کر ہوا تمام تو حالؔی نے یوں کہا

"دربار قیصری کا مرقع چھپا ہے خوب"

تاریخ بنائے مہماں سرا موضع مون:

ساختہ منزل گہہ چو بہر غریباں

تکیہ گہ ہر غریب آمدہ سالش

1877ھ

تاریخ وفات مصطفی خان شیفتہ:

جَزَاہُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّۃً وَّ حَرِیْرًا

1277ھ

تاریخ وفات نقش بند خان فرزند شیفتہ:

وَ حُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّۃٍ

1294ھ

تاریخ بنائے آئینہ خانہ بہاول پور:

کَاَنَّہٗ صَرْحٌ مُمَرَّدٌ مِّنَ الْقَوَارِیْرِ

1292ہجری

تاریخ ولادت فرزند آسمان جاہ:

لَحَاشَ لِلّٰہِ مَا ہٰذَا بَشَرٌ اِنْ ہٰذَا اِلَّا مَلَکٌ

کَرِیْمٌ

تاریخ وفات برادر خواجہ امداد حسین:

سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

1303ھ

تاریخ وفات خلیفہ سید محمد حسین خان:

گفت سال رحلتش مغفورداں

1326ھ

تاریخ وفات خواجہ ناصر وزیرؔ:

عیش میں شعر وغزل روگ میں تاریخ مرگ

غیب سے آئی ندا ''خلد میں ناصر وزیر''

1292ھ

تاریخ طبع جغرافیہ شہاب الدین:

ہو مطلوب تاریخ گر عیسوی

کہو اس کو جغرافیہ بے مثال

تاریخ بنائے سید مہربان علی:

چنیں گفتمش حالیؔ سالِ تعمیر

مکاں بے نظیر آباد بادا

تاریخ اورنگ نشینی محبوب علی پاشا:

بہ تخت سلطنت بنشست و حالی گفت تاریخش

برائے وے مبارک تاج و اورنگ جہان بانی

تاریخ تالیف قواعد اردو مولفہ شہاب الدین:

اگر نام اس کا تاریخی ہو مطلوب

تو ہے اے طالبو ''اکسیر اعظم''

1302ھ

879

تاریخ وفات ضیاء الدین احمد خان:

از طاق وز ایوان و زبزم و جلسا
بکستہ بہ رحمت الٰہی پیوست
1302ھ

تاریخ دیوان اقبال حیف عاشقؔ:

چو حالیؔ ہمی جست تاریخ طبع
صنم خانۂ عاشق آمد سٔین
1307ھ

الحاقی قطعات تاریخ وفات:

حالیؔ کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین مظہرؔ نے جو تاریخ گوئی کی تھی وہ قطعات غلطی سے حالیؔ کے نام سے کئی دیوان حالیؔ میں شائع ہوئے۔ اگرچہ حالیؔ نے اپنے مطبوعہ دیوان 1893ء میں لکھا تھا۔ ''چونکہ برادر مرحوم کی بہت سی تاریخوں میں سے یہ چند قطعے باقی رہ گئے تھے اور ان کی اشاعت کے لیے کوئی اور موقع نہ تھا اس لیے بطور یادگار کے ان کو بھی اپنے دیوان میں شامل کر لیا گیا ہے۔'' ہم یہاں ان قطعات کے اشعار کو پیش کر رہے ہیں تا کہ آئندہ یہ غلطی نہ ہو۔

تاریخ وفات قلندر علی زبیری:

گفت سال وفات او مظہرؔ
رفت عالم بہ جنت ابدی
1300ہجری

تاریخ وفات حافظ سعد اکبر:

چنین سال وفاتش یافت مظہرؔ
شدہ جنت مقام سعد اکبر
1300ہجری

تاریخ اورنگ نشینی حضور محبوب علی پاشا:

سال جلوسش خرد گفت کہ بے سر شدہ
فتنہ و فسق و فجور شر و فریب و فساد
1301ھ

خرد فرق اعدا تراشیدہ گفت
کہ نصر من اللہ و فتح قریب
1301ھ

تاریخ ولادت حضور نظام:

مظہرؔ اندر فکر تاریخ ولادت رفتہ بود
عقل گفت این لعل از کان شرافت آمدہ
1301ھ

تاریخ مدارالمہامی لایق علی خان:

گفتمش خواجہ کے شود دیواں
گفت ''حق می رسد مرکز خود''
1301ھ

تاریخ بنا مسجد ابراہیم حسین انصاری:

خبرش داد ملہم صادق
کرد تعمیر کعبہ ابراہیم
1300ھ

تاریخ طبع دیوان میر مہدی مجروحؔ:

پرسد اگر کسی ز تو تاریخ حالیا
گو ''نظم دل فریب'' بود سال طبع آں
1316ھ

تاریخ بنائے مکان سید عوض علی:

سال ہجرش داں ''ظفر منزل''
1207ھ

تاریخ تعمیر مسجد واقع سونی پت:

بگفتا ''چہ خوش کرد مسجد بنا''
1293ھ

تاریخ وفات خواجہ کرامت علی:

یافت رحلت بہ سالِ غفاری

1291ھ

تاریخ بنائے باغ سید فیاض علی:

خرد فرمود ''باغِ نو مبارک''

1322ھ

تاریخ تعمیر چاہ سید محمد ذکی:

کہ ہست سال بنا ''چشمۂ بہشت بریں''

1317ھ

تاریخ وفات خواجہ فریدالدین احمد:

دید و بخندہ بازگفت ''جابہ بہشت یافتم''

1244ھ

تاریخ وفات چراغ علی:

''شد نہاں حیف چراغ علی از دُنیا'' گفت

تاریخ وفات محسن الملک:

''انجمن آرائے بہشت برین''

1325ھ

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مادہ تاریخ کا فقرہ یا مصرعہ بعض مقامات پر حالی کا نکالا ہوانہیں بلکہ حالی نے اُس مصرعے یا فقرے کو قطعہ کا جزو بنا کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ خواجہ فریدالدین احمد جو سرسید کے نانا تھے ان کی تاریخ وفات کا فقرہ خود ان کے فرزند نے نکالا تھا جسے بعد میں سرسید کے کہنے پر حالی نے نظم کیا۔

1 تاریخ وفات غالب دہلوی مرحوم [1]

غالب نے جب کہ روضۂ رضواں کی راہ لی
ہر لب پہ آہِ سرد تھی ہر دل میں درد تھا

اس دن کچھ اہلِ شہر کی افسردگی نہ پوچھ
دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا

حالی کہ جس کو دعویِ تمکین و ضبط ہے
دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا

تھا گو وہ اک سخن ور ہندوستاں نژاد
عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا

اس قافلے میں آ کے ملا گو وہ سب کے بعد
اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا

ہم اور صبح و شام یہ اندوہِ جاں گزا
دل تھا کہ فکرِ سال میں بے صرفہ گرد تھا

ناگاہ دی یہ غالبِ مرحوم نے صدا
سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا

تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیر "فکر"
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

---

[1] یہ تاریخ غالب مرحوم کی غزل کے ایک مصرع سے نکالی گئی ہے۔ ان کی غزل کا مقطع یہ ہے:

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اخیر مصرعہ کے عدد 2796 ہوتے ہیں۔ جب ان میں سے لفظ تاریخ کے عدد 1211 اور فکر کے عدد یعنی 300 کا تخرجہ کیا گیا تو 1285 باقی رہے اور یہی ان کا سال وفات ہے۔ مختصر صورت تاریخ کی یہ ہوئی:

2796(1211+300)=1285ھ (حالی)

2 تاریخ وفات سید خواجہ ناصر وزیر مرحوم دہلوی

جب ہوئے ناصر وزیر راہیِ ملکِ بقا
سب ہوئے اندوہ گیں شہر کے برنا و پیر
دل نے کہا ہر جگہ پھبتی ہے چیز اک جدا
باغ میں نسرین و گل چرخ پہ مہرِ منیر
عیش میں شعر و غزل سوگ میں تاریخِ مرگ
غیب سے آئی ندا، ''خلد میں ناصر وزیر''

3 تاریخ طبع جغرافیۂ بے مثال مؤلفہ خواجہ شہاب الدین صاحب دہلوی

وہ جغرافیہ جس کی تھی احتیاج
چھپا، مژدہ اے طالبانِ کمال
نئی طرز کا ہے یہ جغرافیہ
عیاں جس سے ہے ربعِ مسکوں کا حال
ملی طرفہ تر اس کی تاریخِ طبع
وہ خود طرفہ ہے جیسے بے قیل و قال
اگر سال ہجری کی ہے جستجو
تو ''جغرافیہ''[۱] خود بتاتا ہے سال
ہو مطلوب تاریخ گر عیسوی
کہو اس کو ''جغرافیہ بے مثال''[۲]

4 تاریخ تالیف قواعد اُردو

مؤلفہ خواجہ شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

قواعد ہے یہ اُردو کی کہ جس کا
بیاں شافی ہے اور ترتیب محکم

[۱] 1299ھ۔ [۲] 1882ء۔

کتابیں اس سے پہلے تھیں بہت سی
زیاد حجم میں اور نفع میں کم
مگر یہ مختصر ہے اک رسالہ
کہ ہیں جس میں قواعد سب فراہم
وجود اس کا ہے گو سب سے مؤخر
پہ خوبی میں ہے اکثر سے مقدم
جو قیمت پوچھیے تو ہے بہت سہل
نہ دینار اس میں لگتے ہیں نہ درہم
اگر نام اس کا تاریخی ہو مطلوب
تو ہے اے طالبو! ''اکسیر اعظم'' [1]

5 تاریخ بنائے چاہ درمحوطۂ مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ

بحساب سال بعثت خاتم النّبیینe بحسن سعی جناب آنریبل سرسید احمد خاں بہادر

ہدایت کیجیے گر سال ہجرت کی محرم سے
تو کہیے سال بعثت کا مہ شوال کو مبدا
کلام اللہ اترا آخرِ ماہِ مبارک میں
ہوا اس واسطے شوال مبدا سال بعثت کا
نکالے یہ مبارک سن جناب سید احمد نے
بنایا جس نے دارالعلم کا یہ چشمۂ زیبا
زروے سال بعثت چونکہ تھی تاریخ کی خواہش
کہا ہاتف نے حالی سے کہ ''چشمہ فیض احمد کا''
1312ھ

6 تاریخ طبع ترجمہ تاریخ دربار قیصری بحساب سال عیسوی

پنجاب کے ادارۂ تعلیم عام نے
ایک اور کام ملک کے حق میں کیا ہے خوب

---
[1] 1306ھ۔

879

دربار قیصری کی جو تاریخ تھی چھپی
اب ترجمہ اسی کا مرتب ہوا ہے خوب

ہیں لفظ دل کشا تو مضامیں ہیں دل نشیں
ہے ترجمہ نفیس تو طرزِ ادا ہے خوب

چھپ کر ہوا تمام تو حالی نے یوں کہا
''دربار قیصری کا مرقع چھپا ہے خوب''

1882ء

7 تاریخ وفات مولانا محمد حسین آزاد

آزاد وہ دریائے سخن کا دُرِ یکتا
جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا

ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ
جو اُس کے قلم سے دمِ تحریر ہے ٹپکا

ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر
چھوڑا نہ دقیقہ کوئی رنج اور تعب کا

دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہلِ قلم میں
تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا لپکا

صحت میں، علالت میں، اقامت میں، سفر میں
ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا

فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے، مشتاق
بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا

آخر شب، عاشور کو تھی جس کی تمنا
آ پہنچا نصیبوں سے بلاوا اُسے رب کا

تاریخِ وفات اُس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ ''ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا'' [1]

1327ھ

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں!۔۔۔

تاریخی جملے مقتبس از قرآن مجید

تاریخِ وفات غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم
رئیس جہانگیر آباد متخلص بہ حسرتی و شیفتہ

"جَزَاہُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنّٰتٍ وَّ حَرِیْرًا"

1277ھ

اس آیۂ قرآنی میں "بِمَا صَبَرُوْا جَنَّۃً وَّ حَرِیْرًا" ہے۔ چونکہ تاریخِ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی اس لیے جنۃ کی جگہ "جنات" کر دیا گیا ہے جیسا کہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں بجائے "فروح و ریحان و جنت نعیم" کے "بہنا روح و ریحان و جنات النعیم" کر دیا ہے۔

چونکہ نواب مرحوم نے مرض الموت میں مرض کے شدائد و آلام بے نظیر صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیے تھے اس لیے اس آیت کا مضمون ان کی وفات کے نہایت مناسب تصور کیا گیا۔ یعنی جناب باری نے بعوض ان کے صبر کے بہشت کا لباس ان کو عنایت کیا۔

تاریخ وفات نواب محمد نقشبند خاں مرحوم
ولد اوسط نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم
رئیس جہانگیر آباد

"وَ حُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّۃٍ"

1294ھ

... شیخ محمد اسماعیل صاحب نے نظم کے عنوان کے نیچے یہ نوٹ تحریر فرمایا ہے: "یہ اشعار شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کی وفات پر کہے گئے تھے جو 1909ء میں واقع ہوئی تھی (ج-ح، ص 97)۔ حالی کے مادۂ تاریخ سے بھی 1327ھ (1909ء) برآمد ہوتا ہے۔ لیکن آزاد کی صحیح تاریخ وفات 9 محرم 1328ھ مطابق 22 جنوری 1910ء ہے (داستان تاریخ اُردو طبع دوم ص-386)۔ نئے سن کے آغاز میں اس قسم کا سہو قرین قیاس ہے۔"
(اص)

چونکہ عزیز موصوف ایک وجیہ وشکیل آدمی تھے اور ان کی وفات عنفوان شباب میں واقع ہوئی تھی اس لیے یہ آیت ان کی تاریخ وفات کے لیے نہایت مناسب اور موزوں سمجھی گئی۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت کے ذکر میں ارشاد فرماتا ہے کہ "پہنائے گئے ان کو چاندی کے کنگن" بجائے مضارع کے ماضی کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ گویا ان کی مغفرت ہو چکی اور اہل جنت کے تمام حقوق اُن کو مل چکے۔

یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں کی تاریخ وفات قرآن مجید سے برآمد ہوئی اور پھر ایک ہی سورت یعنی سورۂ دہر سے نکلی اور دونوں آیتیں اہل جنت ہی کے ذکر میں واقع ہوئی ہیں۔

تاریخ بنائے آئینہ خانہ درریاست گاہ بہاولپور

''كَاَنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنَ الْقَوَارِيْرِ''

1296ھ

قرآن مجید میں اصل آیت ''انہ صرح ممرد من قواریر'' ہے۔ تاریخ میں بہ ضرورت تکمیل اعداد اور نیز بمقتضائے مقام انہ، کی جگہ کانہ کر دیا گیا ہے مگر چونکہ اس سے بھی اعداد پورے نہیں ہوتے اس لیے ''قواریر'' میں الف لام بڑھا کر ''القواریر'' کر دیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان g کے ہاں جب سبا کی بادشاہزادی بلقیس، اول ہی دفعہ وارد ہوئی تو اس کو شیش محل کے صحن پر جس میں آئینے لگے ہوئے تھے یہ گمان ہوا کہ گویا پانی بھرا ہوا ہے۔ اس نے فوراً پائنچے چڑھا لیے۔ حضرت سلیمان نے کہا: انہ صرح ممرد من قواریر (یعنی یہ تو ایک محل ہے جس میں شیشے جڑے ہوئے ہیں)۔ تاریخ بنا میں انہ کی جگہ کانہ کر دینے سے یہ معنی ہو گئے کہ گویا یہ وہی سلیمان کا شیش محل ہے۔

یہ تاریخ ایک دوست کی فرمائش سے جو اس وقت بہاولپور میں ملازم تھے، لکھی گئی۔ مگر ایسا سنا گیا تھا کہ پسند نہیں آئی۔ نہ اس لیے کہ اس میں دو جگہ اپنی طرف سے تصرف کیا گیا ہے بلکہ اس

لیے کہ نواب صاحب کا نام اس میں نہیں تھا۔

تاریخ ولادت فرزند

درحرم سرائے نواب آسمان جاہ بہادر مدارالمہام سرکار عالی

''لحاش للہ ما ہذا بشرا ان ہذا الا ملک کریم''

اس آیت سے سنین مطلوبہ یعنی 1308ھ اس طرح نکلتے ہیں کہ آیت کے جملۂ اولیٰ یعنی لحاش للہ ما ہذا بشرا کے اعداد 1654 ہیں۔ ان میں سے ہذا کا تخرجہ اور ملک کریم کا بجائے اس کے تعمیہ کرنے سے 1308 حاصل ہوجاتے ہیں۔

تخرجہ وتعمیہ کا اشارہ گویا ''ان ہذا الا ملک کریم'' سے نکلتا ہے۔ کیونکہ اس جملے کا ترجمہ اگر یوں کیا جائے کہ نہیں ہے 'ہذا' مگر ملک کریم تو اس سے یہ مطلب مستفاد ہوگا کہ اوپر کے جملے میں ہذا کی جگہ ملک کریم رکھ دو اور اس طرح 1308 حاصل ہوجائیں گے۔

اصل آیت میں ''حاش للہ'' ہے مگر بہ ضرورت لام اضافہ کر کے 'لحاش' کر دیا گیا ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے: (حاشا للہ یہ بشر نہیں ہے یہ تو ہو نہ ہو کوئی معزز فرشتہ ہے۔ جو عورتیں زلیخا کی فریفتگی پر اس کو ملامت کرتی تھیں جب یوسف دفعۃً ان کے سامنے آئے تو اس وقت جو الفاظ ان کے منہ سے نکلے تھے ان کو قرآن میں اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

باب پانزدہم

متفرقات

متفرقات

اشعارِ غزلِ ناتمام

اس زندگی کے ہاتھوں چین ایک دن نہ پایا
یہ جان ہے بدن میں یا خار پیرہن میں

حاضر ہو جب نہ دل ہی ہے باغ و راغ یکساں
ہم دوستوں گئے تو پر کیا گئے چمن میں

ہے اک خراش دل میں ڈر ہے کہ بھر نہ آئے
زخمی ہے قیرواں میں اور مشک ہے ختن میں

تو اپنے بھولے پن سے شیدا ہوئی ہے ورنہ
اے فاختہ دھرا کیا ہے سرو و نارون میں

اشعارِ غزلِ ناتمام

کس قدر یارو ہوا ہے انقلاب
آ گیا یاروں کے اقراروں میں فرق

خود بتائے گا تمہیں دورِ زماں
بے وفاؤں اور وفاداروں میں فرق

ان پہ ہم قرباں ہیں وہ ہم پر نثار
ہے بہت پیاروں میں اور یاروں میں فرق

اشعارِ غزلِ ناتمام

گر نہ ہو نیت گدا میں فرق
آئے کیوں شاہ کی عطا میں فرق

ہیں وفادار اور بھی لیکن

ہے مری جاں وفا وفا میں فرق

اشعارِ قصیدہ ناتمام

یادِ ایام کہ تھی باغِ جوانی پہ بہار
نظر آتا تھا خزاں میں بھی زمانہ گلزار

نشے میں چور تھے اک بادہ پر زور کے ہم
جس کا راحت میں نہ کلفت میں اترتا تھا خمار

سر پہ وہ دیوِ قوی آ کے چڑھا تھا اپنے
یاد تھا جس کا نہ عامل نہ سیانے کو اُتار

روکتا تھا نہ جسے غار نہ خندق نہ کنواں
ہم تھے اس توسن سر زور پہ دن رات سوار

رہتے تھے اس شترِ مست کی صورت بے قید
ہاتھ سے جس نے شتر باں کے تڑا لی ہو مہار

پند گو ہوتے تھے جتنے کہ زیادہ دل سوز
ان کی صحبت سے تھے اتنے ہی زیادہ بے زار

خیر خواہ اور تھے غم خوار و مربی جتنے
ان کی صورت سے ہمیشہ ہمیں چڑھتا تھا بخار

مل کے ہمجولیوں سے جان میں جان آتی تھی
ہنسنے اور بولنے پر زیست کا تھا اپنی مدار

اب اُمنگیں ہیں وہ دل میں نہ ترنگیں باقی
تیرے اے عمر گئے اب وہ کہاں لیل و نہار

حالی کے اُستاد

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

دوست کا درجہ

دوست اور بھائی ہیں دونوں قوتِ بازو مگر
جب کرو گے وزن پلہ دوست کا ہو گا گراں

دوست گر بھائی نہ ہو تو اس میں کچھ نقصاں نہیں

گر نہ بھائی دوست ہو بدخواہ ہے وہ بے گماں

تمہید رقعہ شادی عروسی

شکر کیجے کون سی نعمت کا خالق کی ادا
ایک سے ہے ایک نعمت اس کی بندوں پر سوا

اس کی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہرگز کمی
جس نے جو مانگا وہی اس نے مہیا کر دیا

نخلِ تر کو پھل دیا اور پھل کو بخشا رنگ و بو
سیپ کو موتی دیا موتی کو دی آب و ضیا

کھیتیوں کو مینہ دیا، ماں باپ کو اولاد دی
اس سے دی دنیا کو رونق اس سے آنکھوں کو جلا

عمر روز افزوں عطا فرمائی پھر اولاد کو
کل چھٹی تھی جن کی ہے دن آج ان کے بیاہ کا

آؤ اس کے شکریے میں مل کے باہم شاد ہوں
تاکہ صورت سے ہو ظاہر شکرِ انعامِ خدا

تمہید رقعہ شادی عروسی

چھٹی، بیاہ یا بیج تہوار ہو
ابِ آب یا صحن گلزار ہو

گل و لالہ ہو یا ہو عطر و گلاب
مے و نغمہ ہو یا ہو چنگ و رباب

یہ سارے خوشی کے ہیں سامان جب
کہ ہوں ایک جا جمع احباب سب

بزرگوں سے محفل کی شوکت بڑھے
عزیز اور پیاروں سے عزت بڑھے

جہاں اس طرح جمع ہوں چار یار
ہیں اس بزم پر لاکھ گلشن نثار

باب شانزدہم

باقیات

باقیاتِ حالی

ڈاکٹر افتخار صدیقی نے کلیات نظم حالی جلد دوم میں حالی کے نوادرات کے ذیل حالی کا غیر مدون کلام جس میں قدیم غزل کے اشعار، قطعہ اور مثنوی نشاط کے محذوف اشعار کو ایک تحریری نوٹ کے ساتھ شائع کیا جس کو ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

قدیم غزل کے اشعار[1]

کچھ کچھ صعوبتیں تو وفا میں ہوئیں مگر
وہ نقش جم گیا کہ مٹایا نہ جائے گا

ہاں التفات تم کو نہیں سب پہ کھل گیا
کب تک نقاب رخ سے اٹھایا نہ جائے گا

اظہارِ رنج صحبتِ غیر، اس سے فائدہ
ہم سے تمہاری بزم میں جایا نہ جائے گا

حالی کو دو نہ شعر کی تکلیف ورنہ پھر
یہ خاکسار دل سے بھلایا نہ جائے گا

---

[1] یہ غزل دہلی کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی تھی اور ''گلدستہ'' انجمن 1284ھ (مطبوعہ مطبع اکبری دہلی) میں شائع ہوئی۔ تلامذہ غالب میں سے حالی کے علاوہ رشکی، سالک، شاداں، ولی، مشتاق، عزیز دہلوی وغیرہ شریک

مشاعرہ تھے۔ حالی نے طرح مشاعرہ (''یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا'') میں چودہ اشعار کی غزل کہی تھی۔ دیوان حالی میں صرف دس اشعار شائع ہوئے ہیں۔ (ا ص)

شیخ اور آئینہ [1]

تھا ایک شیخ دیکھ رہا آئینے میں منہ
اک نوجوان کی جو نظر اس پہ جا پڑی

بولا ''اب اپنی شکل سے شرمانے کا ہے وقت
آئینہ دیکھنے کی رت اے شیخ ! اب گئی

پھبتا جواں کو دیکھنا ہے آئینے میں منہ
کندن کی طرح شکل ہے جس کی دمک رہی''

سن کر کہا یہ شیخ نے ''اے طفل سادہ لوح!
چھینٹ اُڑ کے تجھ پہ عقل کی اب تک نہیں پڑی

آئینہ میں نہ دیکھوں تو پھر دیکھے اور کون؟
آئینہ دیکھنے کے تو دن آئے ہیں ابھی

ہر روز اک نیا نظر آتا ہے انقلاب
آج آ رہی خزاں ہے جہاں کل بہار تھی

کندن کی طرح مکھڑا تھا جو کل دمک رہا
اس مکھڑے پر ہیں آج جھڑاں جھریاں پڑی''

(ب) مثنوی ''نشاطِ اُمید'' کے محذوف اشعار

''نشاطِ اُمید'' کے یہ اشعار، مجموعہ نظم حالی (طبع اول 1890ء) سے منقول ہیں۔ بعد کے نسخوں میں سہواً یا عمداً، یہ ٹکڑا حذف کر دیا گیا۔ 'مثنویاتِ حالی' اور 'پنج گنج' حالی کے نسخوں میں بھی یہ اشعار موجود نہیں۔ طبع اول میں مثنوی کے مندرجہ ذیل (انتیسویں) شعر کے بعد یہ اشعار آئے ہیں:

روپ ہیں ہر پنتھ میں تیرے الگ

879

ہے کہیں فردوس کہیں ہے سرگ

ا۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کی کوشش سے مولانا حالی کے جو تبرکات منظرِ عام پر آئے، اُن میں سے یہ نظم رسالہ مخزن لاہور کے شمارہ ماہ جنوری 1949ء میں شائع ہوئی تھی۔ (ا ص)

io

ایک سے ہے ایک انوکھا برن
ہے کہیں محشر، کہیں آواگون

ایک ادا میں تری لاکھوں رشی
کھپ گئے جن کی نہ خبر کچھ ملی

کوہ ہمالہ میں بہت جا گلے
اور تپشیا میں بہت جل بجھے

تیرے تصور میں ہزاروں ولی
ڈوبے کچھ ایسے کہ نہ اچھلے کبھی

پڑھ دیا زاہد پہ کچھ ایسا فسوں
دل کی تپش اس کی ہے ہر دم فزوں

کر دیا راہب پہ خدا جانے کیا
ہو گیا دنیا سے وہ بے زار سا

جس کو غرض دیکھیے ہے دھن یہی
صوفی صافی ہو کہ ہو مولوی

نشہ اُمید میں ہیں چور سب
ایک پیالے سے ہیں مخمور سب

io

جب کہ ہمایوں سے چھٹا ملک و تخت
اور پھنسا بندِ حوادث میں سخت

یا رہا اور نہ کوئی غم گسار
دوست و دشمن کے لگے چلنے وار

پھر گئے دلدادہ فرماں تھے جو
چھٹ گئے وابستہ داماں تھے جو

879

گھر میں نہ رہنے کی ملی کوئی راہ
ملک میں لی غیر کے جا کر پناہ
ہو گئے اغیار یگانے سبھی
تو نے مگر ساتھ نہ چھوڑا کبھی

io

باب ہفدہم

کلیاتِ فارسی

(فارسی)

کلیات فارسی کے چند گوشے

جدول

اصناف	تعداد	تعدادشعر
غزلیات	20	(162)شعر
رباعیات	20	(40)شعر
قصاید	4	(149)شعر
مراثی	2	(96)شعر
قطعات	33	(226)شعر
مخمس	1	(14)شعر

ضمیمہ کے کل فارسی اشعار:687

ضمیمہ کلیات حالیؔ:......تدوین:1912ء

اشاعت:......اگست1914ء مطبع تحفہ ہند پریس دہلی

صفحات:......156

متن:......عربی اور فارسی میں جو نثر اور نظم کا متفرق کلام تھا اُس کو جمع کر کے کتابی شکل دی گئی۔اس میں بیشتر کلام 1320 ہجری تک کا ہے آخری فارسی نظم مرثیہ سرسید ہے جو 1898ء میں

تصنیف ہوئی۔ کتاب میں ((120 صفحات فارسی اور((36 صفحات عربی کے ہیں۔ اسے تین ضمیموں اُردو فارسی اور عربی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فارسی حصے میں پہلے غزلیات پھر رباعیات قصاید قطعات مخمّلہ قطعات تاریخ وفات مراثی جدید وقدیم نثر تراجم اور خطوط شامل ہیں۔ عربی حصے میں قصاید، قطعات تقریظ، مکتوبات اور سرسید کی شخصیت اور فن پر مقالہ بھی موجود ہے۔

حالیؔ جس وقت اپنے عربی فارسی کلام کو جمع کر کے شائع کر رہے تھے اُس وقت برصغیر میں ان دونوں زبانوں کا رواج اور اثر کم ہو چکا تھا اسی وجہ سے حالی نے بھی اس طرف پہلے خاص توجہ نہ دی لیکن بعد میں دوستوں اور رشتہ داروں کے اصرار پر ڈاکٹر لیاقت حسین کے گھر واقع فرید آباد میں چار مہینے رہ کر تدوین وترتیب دیا۔ عربی کی نسبت حالی کی فارسی منجھی ہوئی تھی ویسے انہوں نے اپنے اُردو کلام میں دونوں زبانوں کے سو سے زیادہ اشعار بھی نظم کیے ہیں جو ان زبانوں پر ان کی مہارت کی دلیل ہیں۔

حالیؔ ضمیمہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:''عربی فارسی کی نظم ونثر کے مسودے جو کبھی کبھی کے لکھے ہوئے پڑے تھے ان کی نسبت متردد تھا کہ ان کو کیا کیا جائے۔ قوم میں ایسی محفوظ لائبریری نظر نہ آئی تھی جہاں افرادِ قوم کے ورکس اچھے یا بُرے احتیاط کے ساتھ رکھے جائیں پھر اہل وطن کا ان دونوں زبانوں سے عموماً نا آشنا ہونا اپنے اس قدیم شعر کا مضمون یاد دلاتا ہے:

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

لیکن مذکورہ بالا مسودات کچھ تو اس وجہ سے کہ بڑی کاوش سے لکھے گئے تھے اور زیادہ تر اس خیال سے کہ قومی خصوصیات کی یادگار تھے ان کو رائیگاں کھونا گوارا نہ ہوا۔ چناں چہ تمام پرچے جس قدر بہم پہنچ سکے ادھر اُدھر سے فراہم کیے گئے۔''

حالیؔ کے فارسی کلام میں بیس ((20 غزلیں ہیں۔ دو غزلیں نا تمام ہیں۔ حالیؔ نے ان غزلوں کے شروع میں لکھا ہے کہ:''یہ غزلیں اُسی زمانے کی ہیں جب کہ خیالات میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوا تھا۔ جس قسم کے مضامین غزلوں میں اوپر سے بندھے چلے آئے تھے اسی روش پر چند غزلیں لکھی گئی تھیں جن کو معدودے چند کے سوا میں اپنے موجودہ خیالات کے موافق

پبلک میں پیش کرنے کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن بعض احباب کے اصرار سے ان کو اس مجموعے میں شامل کرنے پر مجبور ہوا۔''

حالیؔ کی فارسی غزلیں ہلکی پھلکی ہیں۔ غزل میں کم از کم تین شعر اور زیادہ سے زیادہ چوبیس ((24 شعر ہیں۔ چند غزلوں میں اساتذہ کے مصرعوں پر تضمین یا کہیں پر تعلّی کی گئی ہے۔ کل غزلیہ اشعار کی تعداد ((162 ہے۔ کچھ مقطع کے اشعار اور کچھ چیدہ غزل کے شعر نمونہ کے طور پر پیش ہیں:

قدر حالی ز قوم کسی نہ شناخت
عاقبت رفت از میانہ ما

(غزل)

خاکساری از جہانی دیگر است　　این زمین را آسمانی دیگر است

''خاکساری دوسرے جہان کی چیز ہے اس زمین کا آسمان جدا ہے۔''

دل کہ بود از چشم موری تنگ تر　　چون نظر کردم جہانی دیگر است

''دل جو چونٹی کی آنکھ سے بھی چھوٹا ہے جو میں نے غور سے دیکھا تو اس کی وسعت ایک عالم کی طرح معلوم ہوئی۔''

منتہاے راہ عشق افتادگی ست　　منزل ما را نشانی دیگر است

''عشق کے راستے کی انتہا فنا پذیری ہے ہماری منزل کی نشانی کچھ اور ہی ہے۔''

کار حالیؔ نیست کاحمد است　　''درس عشقت را بیانی دیگر است''

''یہ حالی کا کام نہیں بلکہ احمؔد جام کا کام ہے۔ (جنہوں نے کہا تھا) عشق کے سبق کا بیان ہی کچھ اور ہے۔''

(غزل)

صید عنقاست پریدیم عبث　　راہ دور است دویدیم عبث

''شکار نہیں تھا بےکار چھلانگ لگا دی۔ راستہ بہت لمبا تھا خوامخواہ بھاگتا رہا۔''

دل ہماں بت کدہ پندار ست　　جامے در کعبہ گزیدیم عبث

''دل تو وہی غرور کا بت کدہ تھا خوامخواہ کعبہ میں کپڑوں کو چاک کیا۔''

عشق از خویش بریدن می خواست حالیؔ از خلق بریدیم عبث

''عشق تو فنا یا اپنے آپ سے جدائی چاہتا ہے حالی ہم خلق سے بے کار جدا ہو گئے۔''

غالب نے کہا تھا:

در تہ ہر حرف غالبؔ چیدہ ام میخانہ ای
تا ز دیوانم کہ سر مست سخن خواہد شدن

''غالبؔ نے ہر حرف کے نیچے میخانہ سجا رکھا ہے تا کہ جو بھی اُسے پڑھے وہ شعر کے نشہ سے مست ہو جائے۔''

حالیؔ اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں: ؎

حالیؔ تہ ہر حرف دو صد نکتہ نہفت ست
سنجند درین بزم اگر نکتہ ورانند

''حالیؔ نے ہر حرف کے نیچے دو سو نکات چھپا دیے ہیں اگر کوئی محفل میں کوئی نکتہ داں ہے تو وہ سمجھ سکے گا۔''

حالیؔ نے غالب کے ایک اور شعر سے استفادہ کر کے غزل کے مقطع میں کہا:

حالیؔ زسخن خواہی رفتن زپۓ غالبؔ
دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شد

حالیؔ نے غالب کی مشہور فارسی نعت جس کا مقطع ہے: ؎

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزدان گزاشیتم
کان ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

''یعنی غالب ہم نے حضور ختمی مرتبت e کی مدح کو اللہ پر چھوڑ رکھا ہے کیونکہ صرف اللہ ہی پوری طرح سے محمد e کے مقام و مرتبے سے واقف ہے۔''

حالیؔ نے اس نعت کے اشعار پر مخمس تضمین کیا ہے۔ اس خوبصورت تضمین کا صرف ایک بند بطور تبرک ملاحظہ کریں۔

شاہد بہ قتل عاشق و عاشق بہ خال و خد

879

مجنون بہ پای لیلیٰ و لیلیٰ بہ فرقِ خود

مومن بہ آلِ احمد و آتش بروحِ جد

''ہر کس قسم بدانچہ عزیزست می خورد

سوگند کردگار بجان محمد است''

حالیؔ نے بیس((20 رباعیات فارسی میں مختلف موضوعات پر لکھی ہیں جن کے موضوعات حمدیہ، رثائیہ، اخلاقی، مدحیہ، اور تاریخی واقعات اور تاریخ وفات پر مشتمل ہیں۔ ذیل کی رباعی میں انیسؔ کی حمدیہ رباعی کی ترجمانی کی ہے:

یا رب کرمی کہ شرمسار آمدہ ایم

سرمایہ ناکسی بہ بار آمدہ ایم

شایستہ دوزخیم و جویائے بہشت

دریاب کہ پر امیدوار آمدہ ایم

io

عباسؑ و علی اکبرؑ آن غیرت ماہ

بودند شبیہ احمد e و شیر اللہ

در نوحہ این ہر دو جوان برلب شاہ

گہہ ''وا ابتاہ'' بود گہہ ''واجداہ''

رباعی نواب ضیاء الدین احمد خان کی مدح میں جو اُردو میں اخشاں اور فارسی میں نیرؔ تخلص کرتے ہیں:

عمریت کہ دہلی جد بے جان است

و ز قحطِ رجال سر بسر ویران است

اما صد شکر کوکب منخفش

روشن و فروغ نیر رخشان است

اس ضمیمہ میں چار قصیدے موجود ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

(ا) قصیدہ محمد کلب علی خان نواب رام پور((78اشعار ہیں۔
(ب) قصیدہ نواب آسمان جاہ کی خدمت میں عید فطر کے موقع پر((24اشعار پر مشتمل ہے۔
(ج) قصیدہ نواب آسمان جاہ کی خدمت میں عید الاضحیٰ کے موقع پر((27اشعار پر مشتمل ہے۔
(د) قصیدہ حبیب اللہ خان والی افغانستان مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے معائینہ کے موقع پر((20 شعر پر مشتمل ہے۔

قصیدوں کے ڈیڑھ سو شعر تاریخی حیثیت کے حامل ہیں اور بیانیہ طرز میں لکھے گئے ہیں۔ نواب کلب علی صاحب کے قصیدے میں قرآنی، حدیثی اور عربی فقرے خوبصورت طور پر نظم کیے گئے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حالی کے محسن آسمان جاہ نے انہیں مصنفین کی مد سے پچھتر((75 روپے ماہانہ کا وظیفہ کیا تھا۔ ان تمام قصیدوں میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی مدد اور سرپرستی کا ذکر ہے۔ یہ قصاید 1877ء سے 1907ء کی تصانیف ہیں۔

قصاید کے بعد مرثیہ سرسید ترکیب بند میں ستر((70 شعروں میں ہے جو 1898ء کی تصنیف ہے۔ مرثیہ کے سالار جنگ تراب علی خان ترجیح بند کی شکل میں((27 اشعار پر مشتمل ہے۔ قطعات تواریخ وفات میں محمد علی خان رشکی((16 شعر، سید محمود علی((10 شعر، خلیفہ سید محمد حسن((19 شعر، خلیفہ سید محمد حسین((19 شعر مولوی چراغ کی((10 شعر خواجہ کرامت علی، محمد ابراہیم، خواجہ فرید الدین، چراغ علی اور نواب محسن الملک کے دو دو شعر کے قطعات موجود ہیں۔ کئی مرثیوں اور خصوصی طور پر مفصل سرسید کے مرثیہ پر شخصی مرثیوں میں گفتگو ہو چکی ہے۔

شبلی نعمانی 1899ء میں شدید بیمار رہے۔ صحت یاب ہونے پر ایک قصیدہ کشمیریہ اپنے دوستوں کو بھیجا جس کا مطلع تھا: ؎

دوستاں ای کہ رہ و رسم و فا کیش شماست
ہیچ دانی کہ شبلی بچہ حال ست و کجاست

''دوستو تمہاری وفا شعار فطرت اور وفا نبھانے کی عادت ہے۔ کچھ جانتے ہو شبلی اب کس حال میں اور کہاں ہے؟''

حالی نے اس قصیدے کی رسید دیتے ہوئے سات شعر کا ایک قطعہ لکھا جس میں شبلی کے

ہنر کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کے تین شعر ترجمانی کے ساتھ یہاں پیش کرتے ہیں۔ شبلی کا نام کمالات میں دنیا کی داستانوں میں لکھا ہوا ہے۔ وہ عالم میں شمس العلما مشہور ہے۔ اُس نے پرکھوں کی تاریخ میں جان ڈالی ہے اور قوم اُس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ وہ اس دنیا میں دراز مدت تک زندہ رہے کیوں کہ تحقیق کی پوشاک کسی اور کے جسم پر ان کے بعد ٹھیک نہیں بیٹھے گی:

آن کہ نامش بہ کمالات سمر در گیتی ست
آن کہ مشہور در آفاق بہ شمس العلما ست
بسکہ او روح دمیدہ است بہ تاریخ سلف
ہر قدر فخر بہ ذاتش بکند قوم رواست
زندہ تا دیر بماناد کہ بر قدِ کسی
بعد ازو خلعت تحقیق نمی آید راست

حالی نے فصلی سال کے بارہ مہینوں کو ایک قطعے میں نظم کیا ہے:

آذر و دی بہمن اسفند ار فرور دین بہشت
باز خور دادست و تیراست و مرداد اے جوان
باز شہر یور سپس مہر ست و آبان اجد ازو
بریک از ماہِ جلالی پیش تو کردم بیان

اسی ضمیمہ میں غالب کو جو قطعات لکھے تھے جس کا خود حالی نے یادگار غالب میں مفصل ذکر کیا ہے طوالت کے باعث یہاں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

حالی نے دو شعر کا قطعہ محبوب علی پاشا کی تخت نشینی ''برای او مبارک تاج و اورنگ جہاں بانی'' لکھا۔ حالی نے کرنل ہال رائیڈ، مسٹر وٹن، نواب حامد علی خان والی رام پور کو 1301ھ شکریے کے قطعات لکھے۔

مختلف شادیوں کے رقعے، مکانوں کی تعمیر کے علاوہ مہمان سرا، مسجد، باغ اور کنویں کی تعمیر کی تاریخیں نکالیں اوران عمارتوں اور تعمیروں کی نسبت سے مصرعے تخلیق کیے:

(ا) تاریخ تعمیر مکان سید عوض علی......سال ہجرش داں ''ظفر منزل'' (1307 ہجری)(2) شعر
(ب) تاریخ تعمیر مسجد سونی پت......بگفتا ''چہ خوش کرد مسجد بنا'' (1293 ہجری)(5) شعر
(ج) تاریخ تعمیر مکان سید مہربان علی......''مکان بے نظیر آباد بادا'' (1299 ہجری)(5) شعر
(د) تاریخ تعمیر مہمان سرای مون......''تکیہ گہہ برغریب'' آمدہ سالش (1877 ہجری)(2) شعر
(ھ) تاریخ تعمیر باغ تہ ضلع مظفر نگر......خرد فرمود ''باغ نو مبارک'' (1322 ہجری)(3) شعر
(ز) تاریخ تعمیر چاہ سونی پت......کہ ہست سال بنا ''چشمہ بہشت برین'' (1317 ہجری)(2) شعر

حالیؔ نے ایک خوبصورت قطعہ تاریخ میر مہدی مجروحؔ کے دیوان کا لکھا۔ اس گیارہ شعر کے قطعہ میں دہلی مرحوم کے نامور شعرا کے جانشین مجروح کی شخصیت اور فن پر تبصرہ ہے۔ اس قطعہ کا سلیس ترجمہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

> ''مجروح سے بزرگوں کا نام زندہ ہے۔ اس کی ذات اس دور کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ دہلی جو ہنر کی کان اور کمال کی معدن تھی آج اس میں کمال کا وجود نہیں۔ جو شخصیتیں فلک بوس تھیں وہ آہستہ آہستہ جنت چلے گئے اور جو کچھ باقی بچے ہیں وہ بھی وقتاً فوقتاً موت کو لبیک کہہ رہے ہیں۔ غالب گئے، نیر اور آزردہ گئے ذوق و مومن حسرتی اور عارف ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔ ان لوگوں کے جانے سے جو ان کی جگہ خالی ہوئی تو کوئی اُس جگہ کو بھرنے والا نہ رہا۔ مجروح ان یادگاروں میں باقی ہے۔ اے خدا اُسے تو اپنی امان میں رکھ کیونکہ یہ بلبل بہار کے قصے سناتا ہے یہی پھول ہمیں گلستان کے دور کی خبر دیتا ہے۔ اس کا دیوان اُردو شعری گلستان کی آخری بہار ہے جو نکتہ سنجوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ شراب جو میر تقی میر اور مرزا غالب کی بچی ہوئی ہے وہ تشنہ جگروں کو پلاتا ہے۔ قصہ مختصر یہ دولت بے بہا شائع ہو کر ارزاں دستیاب ہے جیسے تمام عمر کی پونجی دے کر لینا اچھا سودا ہے۔ اگر کوئی حالیؔ تجھ سے اس کی تاریخ پوچھے تو

کہنا ''نظمِ دل فریب'' (1316) کی اس کی اشاعت کا سال ہے۔''

io

مولانا حالی کا فارسی کلام

(۱) غزلیاتِ فارسی ؎

1

اے تکیہ بہ عفوِ تو خطا را
وے ناز بہ خوفِ تو رجا را

حاجت کند از طرب فراموش
خوانی چو بسوے خود گدا را

جا در دلِ خویش ہم نیابد
رانی ز درت چو پادشا را

علت تو بری و باز بندی
بر صنعتِ دیگراں شفا را

تاثیر ز تست و مصلحت را

بدنام نمودہ ای دوا را

بازارِ صبا نمودہ ای گرم

برہم زدہ طرہ دوتا را

ا۔ یہ غزلیں اُسی زمانے کی ہیں جب کہ خیالات میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوا تھا۔ جس قسم کے مضامین غزلوں میں اوپر سے بندھتے چلے آئے تھے، اسی روش پر چند غزلیں لکھی گئی تھیں جن کو معدودے چند کے سوا میں اپنے موجودہ خیالات کے موافق پبلک میں پیش کرنے کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن بعض احباب کے اصرار سے ان کو اس مجموعے میں شامل کرنے پر مجبور ہوا۔ (حالی)

با مشغلہ ہزار اُمید

پوشیدہ سراغِ مدعا را

در روشنی ہزار خورشید

گم ساختہ چشمہ بقا را

برقے ز افق بروں جہاندہ

برپا زدہ در رہش گیا را

زہرے بگلوے جاں فشاندہ

لب تشنہ خویش کردہ مارا

در بردنِ صبر دادہ دستے

اندازۂ بتانِ دلربا را

از غیر گسستہ اندک اندک

دل ہائے بہ الفت آشنا را

ہر یک ز قیاسِ علم و ادراک

از نورِ تو شد حجاب ما را

ایں پردہ کہ متہم بہ کشف است

بردار ز روے عالم آرا

از آئینہ ام بجز مثالت

ہم زنگ زد او ہم جلا را
زخمے ز تو بے نمک نہ خواہم
ہم درد فرست و ہم دوا را
رازِ تو بہ لب نمی پسندم
ہم ساز بسوز و ہم نوا را
از سختیِ دہر رو نہ تابم
دانم کرمِ ستم نما را
از شعلہ دل بجاں خبر کن
مہمل مگذار کیمیا را
زشتیم ز فرق تا قدم زشت
مارا در چشمِ ما میارا
کردیم گناہ و فاش گفتیم
بپذیر گناہِ بے ریا را
حرفِ طلبت بہ لب نہ زیبد
انداختم از میاں دعا را
تا بر کرمِ تو تکیہ دارم
در راہ فگندہام عصا را
حالی ! چہ زنی تو دم ز توحید
چوں نا بلدی رہِ خدا را
جاے کہ بہ عجز اعتراف است
خلیلِ عرفاء و انبیا را
آں جا چہ مجالِ نطق باشد
ہر یاوہ سرائے ژاژخا را
این جا جز خامشی نہ زیبد

نازم سرِ کبریا را
از بامِ بلند بہ کہ داری
معذور، کمندِ نارسا را

2

چوں نہد گوش بر ترانہ ما
رود از یادِ ما فسانہ ما
درد می بارد از ترانۂ ما
حذر از گرمی زبانہ ما
دردِ دل ہا شنیدہای بسیار
اندکے گوش کن ترانۂ ما
بایدت قدرِ خویشتن دانست
پائے بیروں منہ ز خانۂ ما
در سراب آبِ خضر می جوئی
اے وفا جستہ در زمانۂ ما
گوہرے کز دو کون بیرون است
می تواں یافت در خزانۂ ما
زیرِ لب ناکشودہ طوما ریست
کاش پرسی ز ما فسانۂ ما
برق کز طور داشتند دریغ
سر برآورد ز آشیانۂ ما
قدرِ حالی ز قوم کس نہ شناخت
عاقبت رفت از میانۂ ما

879

3

خاکساری از جہانے دیگر است
ایں زمیں را آسمانے دیگر است [1]

شیخ ! معبودت نہ معبودِ من است
سجدہ‌ام بر آستانے دیگر است

با ہزاراں رنگ باید ساختن
یار را ہر لحظہ شانے دیگر است

---

[1] یہ مصرع نادانستہ نشاط کے مصرعے سے لڑ گیا ہے۔(حالی)

اہلِ دیں معذور دارندم کہ من
آنچہ گویم از زبانے دیگر است

ہم تغافل ہم تطاول دیدہ ام
عشق مردِ امتحانے دیگر است

دل کہ بود از چشمِ مورے تنگ تر
چوں نظر کردم جہانے دیگر است

برنہ تابد دل مدارائے کسے
در سرایش میہمانے دیگر است

بردہ طیبِ سنبلِ زلفم ز یاد
ایں نسیم از بوستانے دیگر است

منتہاے راہِ عشق افتاد گیست
منزلِ ما را نشانے دیگر است

قیس و وامق مردِ راہِ من نیند
اندریں رہ کاروانے دیگر است

من ز رویش حسنِ معنی دیدہ ام
آنچہ دل بردست آنے دیگر است

کارِ حالی نیست کارِ احمد است

درسِ عشقت را بیانے دیگر است[1]

4

یار با تست گرت جذبۂ گیرائے ہست

یوسف آخر رود آں جا کہ زلیخائے ہست

می پسندی کہ زبزمِ تو خجل بر خیزم

بہ سخن گر نتواں آمدن ایمائے ہست

---

[1] ایں مصرع از حضرت احمد جام است قدس سرہ کہ در مطلع غزل خود می فرمایند:

درسِ عشقت را بیانے دیگر است　　　　مرد ایں رہ را نشانے دیگر است (حالی)

گو ملامت گر ما دل بہ نکوہش مخراش

یوسف ہست گرت تاب تماشائے ہست

گردشِ چرخ بکامِ دو جہاں می خواہم

در دلِ ماست بہ ہر دل کہ تمنائے ہست

چوں منِ غم زدہ ناکام ہمی باید زیست

ہر کرا در شب راحت غم فردائے ہست

جائے دہ بر درِ خود ور تو برانی از پیش

نتواں یافت کہ در کون و مکاں جائے ہست

رنجش یا خوشی و لطف و مدارات یکیست

خستہ را کہ چو من کار بہ خود رائے ہست

بر حذر باش گر اور را بہ سخن می آری

حالی تفتہ دروں را دمِ گیرائے ہست

5

غمش تا جاں بود با جاں ضرور است

وگر خود جاں نباشد آں ضرور است

ز تکلیفِ تو دانستم کہ در عشق
نباشد آنچہ در امکاں ضرور است

چو بینم خواجہ نا فرماں نوازست
سرم پیچیدن از فرماں ضرور است

بہ طبعم سازگار افتاد دردش
مرا پرہیز از درماں ضرور است

کشد چوں تیغ بر سر، جاں بر افشاں
سپاسے در خورِ احساں ضرور است

کمندِ جذبۂ دل در کمین است
خلاصِ یوسف از زنداں ضرور است

چہ می رفت از جہاں می گفت حالی
قبولِ عشق را حرماں ضرور است

6

من و از مے دو سہ پیمانہ و یار ولبِ کشت
نہ ز دوزخ بہ دلم بیم و نہ پروائے بہشت

ترسم ایں حسنِ قبولیت برد از راہ صفا
خواجہ وقتست کہ از کعبہ روی سوے کنشت

پردہ گر بر فتد از نفس حروفت بینی
ہمہ پاکیزہ نہاد و ہمہ پاکیزہ سرشت

گر بگیرد ہمہ عیب است چہ عیب و چہ ہنر
ور پذیرد ہمہ زیباست چہ زیبا و چہ زشت

عمرہا از تو بنا کام ہمی باید زیست

وائے آں کس کہ ز کف دامن اُمید نہ ہشت

ترسم از کعبہ بری حسرتِ دیدار بہ خویش
اے فرومانده بہ نظارۂ سنگ و گل و خشت

ہر رقم را نہ بود حسنِ قبول ارزانی
ورنہ حافظ چہ نوشت است کہ حالی نہ نوشت

7

صید عنقاست پریدیم عبث
راہِ دور است دویدیم عبث

بود زہرے بہ شکر آلودہ
لذتِ وصل چشیدیم عبث

جذبۂ آمد و بر منزل برد
راہ یک چند بریدیم عبث

گوش و لب محرمِ راز نہ داشت
ہرچہ گفتند و شنیدیم عبث

بود در ظرفِ مغاں آبِ بقا
منتِ خضر کشیدیم عبث

دل ہماں بت کدۂ پندارست
جاے در کعبہ گزیدیم عبث

جذبِ دل داشت زمامش در کف
از پے ناقہ دویدیم عبث

عشق از خویش بریدن می خواست
حالی از خلق بریدیم عبث

8

روزِ محشر کہ ز ہر شیخ و برہمن پرسند

سر دہم قصۂ شوق تو چو از من پرسند
دل ربایند و بہ ما صبر و شکیب آموزند
جاں ستانند و زما باعثِ شیون پرسند
بگذر از وسوسۂ عقل کہ اربابِ طلب
راہ از غول رہ و چارہ ز رہزن پرسند
پارۂ بے خبری نطق مرا درکارست
مے بیارند و زمن نکتۂ ہر فن پرسند
روے از فرع بہ اصل آر کہ اربابِ طلب
گل بہ بینند و سراغ رہِ گلشن پرسند
بند ، را نیست مجالِ سخن آں جا حالی
ورنہ افسانہ درازست گر از من پرسند

9

بیا کہ جان و دل از غم کرا نہ می خواہند
ز رشک خار بچشمِ زمانہ می خواہند
ز جورہاے تو در سینہ نیست گردِ ملال
بہ صلح با تو سخن درمیانہ می خواہند
خوش است آشتی اما پس از شکایت ہا
کہ دوستاں گلۂ دوستانہ می خواہند
ادب ز حرفِ طلب بستہ است کام و زباں
وگرنہ از تو حریفاں چہا نہ می خواہند
بہ گلشنے کہ منم طائرانِ آزاد اند
بروں ز کون و مکاں آشیانہ می خواہند
شدیم شہرۂ عالم بہ عشق و بے درداں

ہنوز از غمِ پنہاں نشانہ می خواہند

تن فتادہ دراں رہگزار می طلبند
سرِ بریدہ براں آستانہ می خواہند

رسید بزم بہ پایان و گوش ہا بازست
نشیدِ حالی جادو ترانہ می خواہند

0

بے سبب رنجی و گوئی گلہ زیبا نہ بود
طاقتِ جورِ تو در حوصلہ ما نہ بود

سعی اگر نیست بجا ذوق طلب خود چہ کم است
رہرو آں بہ کہ ز رفتار شکیبا نہ بود

مرد صبریم و رضا لیک بہ ہنگامِ وداع
بازوے ہمتِ ما نیز توانا نہ بود

لطفِ طاعت چہ بود نیست اگر ذوقِ نظر
نہ پرستم صنمے را کہ خود آرا نہ بود

می درد رشکِ عدو پردۂ طاقت ورنہ
غمِ عشقِ تو چنیں حوصلہ فرسا نہ بود

مجلسِ وعظ ملامت گہ و ما غمزدگاں
کم نشینیم بہ بزمے کہ مدارا نہ بود

ہمرہِ غیر میا گر بہ خیالم گزری
جز تو در سینہ ام از تنگی دل جا نہ بودی

قدرِ استادنِ من بر درِ خود سنج کہ من
باز گردم درِ فردوس اگر وا نہ بود

879

فتنۂ حشر بپا گشتہ و حالی بہ گماں
کایں ہم از شعبدۂ آں قدِ رعنا نہ بود

!

برقع بہ رخ افگندہ و ہر سو نگرانند
فریاد کہ ایں پردگیاں پردہ درانند
از زلف و رخ آشوبِ دلِ بوالہو سانند
وز ناز و ادا فتنہ صاحب نظرانند
جان داروے عشاق و بہ کامِ دلِ اغیار
عمرِ ابدِ ما و نصیبِ دگرانند
صد حرفِ غلط گفتہ بہ خاطر بنشانند
صد تیرِ خطا کردہ ز دل در گزرانند
سازند و بسوزند و گرایند و رباپند
زنہار ازیں قوم کہ پر فتنہ گرانند
از چشمِ جہاں بیں چہ زیاں اہلِ نظر را
ہر سوے کہ بینند بسوے نگرانند
آشفتگیِ نغمۂ مستاں نہ ز ہوش است
معذور تواں داشت کہ آشفتہ سرانند
حدِ نظر آنست کہ رویش نتواں دید
پیداست کہ ایں مدعیاں بے بصرانند
اُمید کہ از راز خبر داشتہ باشند
دیوانہ دلانے کہ ز خود بے خبرانند
حالی تہِ ہر حرف دو صد نکتہ نہفت ست
سنجند دریں بزم اگر نکتہ ورانند

879

@

عالم ہمہ در بندِ تمنائے تو باشد
گر صوفی و گر رند کہ شیدائے تو باشد

آتش زنِ صد خرمن و ویراں کن صد کشت
بر قیست کہ در نرگسِ شہلائے تو باشد

آں سادہ کہ در عہد تو خرسند بہ ہیچ است
دل باختۂ لطف و مدارائے تو باشد

خرسند نمی سازی و غمگیں نہ پسندی
ناکام کسے کش سر و سودائے تو باشد

نومید مکن ورنہ محال است کہ کس را
یارائے غمِ حوصلہ فرسائے تو باشد

با رائے صوابت چہ کنم رائے جہاں را
اے رائے جہاں در گرو رائے تو باشد

تاب و تب صد شعلہ و بے تابیِ صد برق
ریزند در آں دل کہ تمنائے تو باشد

بر مرگ نہم دل کہ علاج دلِ بیمار
شرط است کہ از لعلِ دل آسائے تو باشد

آں کس کہ بلرزد تنش از مژدۂ دیدار
دانم کہ مگر مردِ تماشائے تو باشد

با حالی بے چارہ تواں ساخت کہ مسکیں
ہم بندہ وہم عاشق شیدائے تو باشد

#

ہردم از عشق خدنگے بہ نشاں می آید
اندک اندک دلم از غصہ بجاں می آید

879

جاں گدازند بہ لطف و بہ غضب شاد کنند
ہرچہ خواہید ازیں عشوہ گراں می آید

بعد ازیں راز بصد پردہ نہاں نتواں داشت
عشق می آید و با طبل و نشاں می آید

در بہاراں بہ تماشاے گل از جا نہ روی
تا نفس راست کنی فصلِ خزاں می آید

سوے من آمدہ مشتاق و ز طرزِ نگہش
می تراود کہ بسوے نگراں می آید

دوش چیزے ز سخن ہاے محبت نہ گزاشت
بجز آں حرف کہ از دل بہ زباں می آید

عجب از خود کنم و سوے فلک می بینم
چوں خدنگ تو بہ سویم ز کماں می آید

چوں نہ ای محرمِ اسرار ہماں در دلِ ما ست
بر زباں ہرچہ ز اسرارِ نہاں می آید

یار چوں نیست موافق چہ وداع و چہ وصال
می رود ناخوش و ناخوش تر ازاں می آید

حالیِ زار گرفتم کہ وفادارِ کسے ست
زود بینی کہ ز دستِ تو بجاں می آید

$

شوقے بہ دوست راہنما داشتم چہ شد
دردے بہ از ہزار دوا داشتم چہ شد

عمریست دل بہ بندِ پیامِ وصال نیست
چشمے بہ رہگزارِ صبا داشتم چہ شد

در دست جامِ بادہ و در دل ہواے دوست

879

وقتے چو اہلِ دل بہ صفا داشتم چہ شد

افتادہ زیرِ سایہ دیوارِ حسرتم
بر فرقِ خویش ظلِ ہما داشتم چہ شد

سود و زیانِ خویش نہ بردے مرا ز جا
پنہاں بہ او معاملہ ہا داشتم چہ شد

یادم کنوں نماندہ کہ پیماں چہ بودہ است
در سینہ خار خارِ وفا داشتم چہ شد

کارم ز سعیِ خضر بجاے نمی رسد
در ظرفِ خویش آبِ بقا داشتم چہ شد

آوارگی ببرد ہواے وطن زیاد
زیں پیش روے خود بہ قفا داشتم چہ شد

حالی کوش آں کہ بود مرا تکیہ بر وفا
ذوقے بہ دل ز جور و جفا داشتم چہ شد

%

لب بہرہ ز رازِ ما نہ دارد
خود زمزمہ سازِ ما نہ دارد

ہر جا صنمے ست معبدِ ما ست
یک قبلہ نمازِ ما نہ دارد

بر نالہ ما دلش نہ سوزد
آن کس کہ گدازِ ما نہ دارد

آں گوش کہ پُر ز حرف و صوتست
گنجائشِ رازِ ما نہ دارد

کارم بہ کسے فتادہ کز ناز

پروائے نیازِ ما ندارد
گر ہر دو جہاں فراہم آرند
اندازۂ آزِ ما نہ دارد
حالی گلہ جفائے دوراں
صوتے ست کہ سازِ ما نہ دارد

۸

دلے خواہم کہ چوں پروانہ سوزد
فتد در آتش و مردانہ سوزد
زید آوارہ و میرد بہ ناکام
دل از رشکم برآں دیوانہ سوزد
تبہ کردست جورِ آشنایم
بحالِ من دلِ بیگانہ سوزد
بہ کنجِ خانہ شمعے می فروزم
کہ چوں درگیرد اول خانہ سوزد
دلے را کش بہ دوزخ سوخت نتواں
فروغے از رخِ جانانہ سوزد
فروغ از من کسے جز من نگیرد
من آں شمعم کہ در ویرانہ سوزد
گر از من بشنوی رودادِ حالی
بہ چشمت خواب زیں افسانہ سوزد

&

(غزلِ ناتمام)

در گلستاں بلبل و در انجمن پروانہ ام
من بہ ہر جا محوِ نیرنگِ رخِ جانانہ ام

محرمیّت نیست دل را با ہزاراں قربِ دوست
یار گرمِ آشنائی ہا و من بیگانہ ام

خضرِ راہِ منزلِ مقصود جز توفیق نیست
زین و آں پرسم نشانِ او مگر دیوانہ ام

*

عشق اگر کیش است ملت ہا کہن خواہد شدن
منبرے ہر گوشہ از دار و رسن خواہد شدن

گر عنانِ بادِ مصر اندر کفِ جذبِ دل است
رنگِ یوسف جملہ بوے پیرہن خواہد شدن

عمرہا شد تشنۂ آبِ دمِ شمشیرِ تست
تیغ بر کش ورنہ جاں بیرون ز تن خواہد شدن

می دمد گل ہر کجا پاے نگاریں می نہی
جادہ ، چوں از سیر باز آئی ، چمن خواہد شدن

شکوہ گر بر لب نیاید عاقبت کیں می شود
زخم را درماں نہ باشد ، چوں کہن خواہد شدن

صید تا افگندہ محوِ دست و بازوے خود است

ایں جواں روزے شکارِ خویشتن خواہد شدن

زیں کہ شد ہم خوابہ خسرو نیرزد نیم جو
گرمیِ بازارِ شیریں کوہکن خواہد شدن

در غریبی طرحِ الفت افگنم با ہر کسے
در دلِ گبر و مسلمانم وطن خواہد شدن

یار در کو چست و من خاموش و جاں بے تاب، گر
جذب در دل نیست کار از دستِ من خواہد شدن

دوست پر تمکین و حالی از ادب بسیار دور
دیر با او ہم نشین و ہم سخن خواہد شدن

(

(غزلِ ناتمام)

بے نورِ صفائے دل پنہاں شدہ ہر پیدا
اے شب تو بہ پایاں رس، اے مہر درخشاں شو

گر بازوے ہمت ہست دستے بہ گریباں زن
در پاے ارادت ہست لختے بہ بیاباں شو

تنہائی و رنجوری ، وانگہ غمِ مہجوری
اے مشکلِ من بکشا ، اے مردنم آساں شو

شوخی ست کہ نگزارد بر ملت خود کس را
اے شیخ ز دیں برگد ، اے گبر مسلماں شو

ساقی بہ قدح بخشی گو توبہ ما بشکن
مطرب بہ نوا سنجی گو رہزنِ ایماں شو

ہم بادہ دما دم خور ، ہم بوسہ پیاپے دہ
بے پردہ تر از گل آے چوں بوے گل ارزاں شو

اے بر تو نقاب از تست ، خود جلوہ حجاب از تست
از خود بخدا پیوند وز خویش برآ آں شو

حالی بہ سخن خواہی رفتن زپے غالب
دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو

(

نہ گردد از تو ہرگز سیریِ چشمِ تماشای
اگر بر دیدہ بنشینی وگر در دل فرود آی [1]

---

[1] یہ مصرع حضرت میر حسن سجزی کی غزل سے لیا گیا ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے:
تو نور العینی اے مہ رو تو جان جانی اے جاناں (حالی)

تخمیس غزل نعتیہ
جناب مرزا غالب مرحوم
کہ درحیات ایشاں نوشتہ شدہ بود

اعجاز از خواصِ لسان محمد e است

عین الحیٰوۃ گم بہ دہانِ محمد e است
گر نور و گر ھدیٰ کہ ازانِ محمد e است
حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمد e است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمد e است

اے خامہ وصفِ قامت معشوق کم نگار
اے دل سخن زراست قداں درمیاں میار
قمری و ذکرِ سرو نفس را نگاہ دار
واعظ حدیثِ سایہ طوبیٰ فرو گزار
کایں جا سخن ز سروِ روانِ محمد e است

شاہد بہ قتلِ عاشق و عاشق بہ خال و خد
مجنوں بہ پاے لیلیٰ و لیلیٰ بہ فرقِ خود
مومن بہ آلِ احمد e و آلش بروحِ جد
ہر کس قسم بدانچہ عزیز ست می خورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمد e است

آں جا کہ از مناقبِ عترت سخن رود
وز آل و از صحابہ امت سخن رود
واں کایں ہمہ ز ختمِ رسالت سخن رود
ور خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمد e است

بینی اگر بدیدۂ دراک وا رسی
گوئی اگر بہ عالمِ ادراک وا رسی

سنجی اگر بہ مرتبہ خاک وا رسی
دانی اگر بہ معنیِ لولاک وا رسی
خود ہرچہ از حق است ازانِ محمد e است

لطفِ خداست گر بہ سرِ کس نہاد دست
قہرِ خداست چوں ز سرِ کیں بجملہ جست
داند کسے کہ شد زمے "مارمیت" مست
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
اما کشادِ آں ز کمانِ محمد e است

ہمت بہ مدحِ شہ من و حالی گماشیتم
گفتیم و از نگاشتنی ہا نگاشتیم
چوں کام و لب فرا خورِ وصفش نہ داشتیم
غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد e است

(ب) رُباعیاتِ فارسی

1

دل دادۂ شوقت چہ ولی و چہ نبی
سودا زدہات ہم عجمی ہم عربی
دل از تو تسلی نتواں کرد بہ ہیچ
اے خوش تر از آب سرد در تشنہ لبی

2

یا رب کرمے کہ شرمسار آمدہایم
سرمایہ نا کسی بہ بار آمدہایم
شایستہ دوزخیم و جویاے بہشت
دریاب کہ پر امیدوار آمدہایم

3

سر بر مفراز، خاکِ پاے ہمہ باش
دل ہا مخراش در رضاے ہمہ باش
با خلق نیامیختن از خامیِ تست
ترکِ ہمہ گیر و آشناے ہمہ باش

4

سر نہ بہ درے و خاکِ پاے ہمہ باش
دل دہ بہ یکے و دل رباے ہمہ باش
خواہی شوی آشناے بیگانہ نما
بیگانہ آشنا نماے ہمہ باش

5

اے آنکہ ز حلۂ صداقت عوری
بنشیں برِ ما یا منشیں ، مہجوری

کس از دلِ دشمنانِ خود دور مباد
چنداں کہ تو از خاطرِ یاراں دوری

6

اے ہیچ بہ ہیچ خود نمائی تا چند
خود بینی و خویشتن ستائی تا چند
چوں می دانی کہ جز کفِ خاک نہ ای
پس ایں ہمہ دعویِ خدائی تا چند

7

از شعر و سخن گوشِ جہاں کر بادا
ویں مشغلہ بیہدہ کم تر بادا
بر ہر کہ دعاے بد کنم می گویم
یا رب کہ گراں مایہ سخن ور بادا

8

چندے بہ ہواے گل عذاراں بگزشت
لختے در بندِ روزگاراں بگزشت
بر نامدہ کامِ دل شباب آخر شد
نشگفتہ گلے و نو بہاراں بگزشت

9

عباس و علی اکبر آں غیرتِ ماہ
بودند شبیہ احمد e و شیرِ الٰہ
در نوحۂ ایں ہر دو جواں بر لبِ شاہ
گہہ ''وا ابتاہ'' بود گہہ ''وا جداہ''

0

(در شکریہ مہمان نوازی قاضی محمد خلیل صاحب بریلوی کہ در زمانہ قحط در بریلی گفتہ شد)

ہر چند ز تیغِ قحط خلقے ست قتیل

879

از بسکہ فلک بہ خاکیاں گشتہ بخیل
اما چہ غم از قحط کسے را کہ مدام
الوانِ نعم می رسد از خوانِ خلیل

!

(درشکرِلطف وعنایتِ سیدکرامت علی مرحوم صفا تخلص، ہنگامِ وداع از پٹیالہ)

حالی نہ شود محو ز لوحِ دلِ ما
لطفے کہ دمِ وداع فرمودہ صفا
گر قدرِ مسافراں بہ غربت این است
صد رہ بہ سفر می رو و صد رہ باز آ

@

(درتاویلِ جراحتِ مولانا شبلی مدظلہ۔ مئی 1907ء)

شبلی کہ گزند ا؎ پاش پر دل شکن است
با خستگیش خجستگی مقترن است
چنداں کہ بکاہند فزایند ایں جا
''کا راستن چمن ز پیراستن است''

ا؎ ''شبلی کہ شکست پاش.....'' (رباعی مطبوعہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ: 11 دسمبر 1907ء)

#

(درتاسف بر وفات یکے از فرزندان مہاراجہ کشن پرشاد بہادر مدار المہام سرکار عالی متخلص بہ شاد)

چرخ از پسِ داغ بر دلش داغ نہاد
اُو جز بہ سپاسِ ایزدی لب نہ کشاد
الحق کہ بہ غصہ شاد و خنداں بودن
زیں گونہ نہ دیدیم جز از حضرتِ شاد

$

879

(رباعیات درشکریہ شیرینی مرسلہ مولوی عبدالعلی خاں والہ، پروفیسر نظام کالج حیدرآباد)

دیئم اخلاص و دوست داری آئیں
من بندۂ دوستان اخلاص گزیں
شیرینی کے کہ یارِ شیریں بخشد
بر وے تواں فشاند جانِ شیریں

%

والہ کہ بہ مردمی فرید آمد و فرد
از مہرِ وطن کرد دلِ حالی سرد
ہر سیرتِ نیک را تواں یافت عدیل
جز سیرتِ والہ کہ مرا والہ کرد

^

برد از دلِ من صبر و دل از پہلوے من
افسونِ وفا و کرمِ اہلِ دکن
زیں ساں دل و صبر اگر بہ غارت ببرند
مشکل کہ رسیم ما غریباں بہ وطن

&

(درشان نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ نیر در فارسی و رخشاں در اُردو)

عمریست کہ دہلی جسدِ بے جان است
وز قحطِ رجال سر بسر ویران است
اما صد شکر کوکبِ متخفش
روشن ز فروغِ نیرِ رخشان است

*

(خطاب بہ حضرت ممتاز مرحوم [1])

اے مدحِ تو شحنۂ جہاں کرد مرا
لطفِ تر خجل ازین و آں کرد مرا
حسنِ ظن تو کہ کردی اندر حق من
ز ابنائے زمانہ بد گماں کرد مرا

(

ممتاز ، آں آشنائے بیگانہ نما
کز ہر سخنش ہمی چکد صدق و صفا
نادیدہ بجاں شوقِ لقایش دارم
گر دست دہد جاں ہرمش روے نما

ا۔ قاضی ممتاز حسین صاحب مرحوم متخلص بہ ممتاز، وکیل و رئیس پیلی بھیت تھے اور روہیل کھنڈ میں فارسی نظم و نثر کے اُستاد تھے۔ انہوں نے قدردانی کی راہ سے چند رباعیاں میری نسبت تحریر فرما کر بھیجی تھیں۔ اُن کے جواب میں یہ تین رباعیاں میں نے بھی لکھی تھیں۔ (حالی)

)

اے پارسی و ریختات ذوق انگیز
وے نظمِ تو چوں نثر ہمہ الفت خیز
در پردہ سخن گفتی و رخ نہ نمودی
بازارِ خود و آتشِ ما کردی تیز

(ج) قصاید فارسی

1 قصیدہ[۱]۔ در مدح جناب غفران مآب حاجی الحرمین الشریفین
نواب محمد کلبِ علی خاں مرحوم رئیس مصطفیٰ آباد (رام پور)

سحر گہ پردہ بگر فتند چوں از زشت و از زیبا
بدل گفتم کدامیں نعمت آید برتر از نعما

بگفتا نعمتے در قدر از ہم بیش و کم نہ بود
ز ساقی عینِ رحمت داں اگر جرعہ وگر مینا

ولے فرماندہِ بیدار دل زیں اصل مستثنیٰ است
کہ چوں او نعمتے نہ تواں نشاداد از پے دنیا

صلاحِ عالمے با رائے اُو وابستگی دارد
جہاں را چوں چمن می داں و اُو را چوں چمن پیرا

۱۔ اس قصیدے کی تمہید اُس وقت لکھی گئی تھی جب کہ شاعرانہ خیالات میں پہلے ہی پہل انقلاب پیدا ہوا تھا اور مبالغے سے نفرت ہونے لگی تھی۔ انھی دنوں میں پہلا دربار قیصری منعقد ہونے والا تھا جو 1877ء میں بہ مقام دہلی وقوع میں آیا۔ جی میں آیا کہ اس تمہید کے بعد کسی ایسے قصیدے کی بنیاد ڈالی جائے جس میں بہ قدر امکان مبالغے سے احتراز کیا جائے۔ چونکہ حضور نواب ممدوح سے فی الجملہ تعارف تھا اور انہوں نے سرسید کی امداد میں سب سے پہلے سبقت کی تھی اور دربار میں اُن کے شریک ہونے کی قوی اُمید تھی، اس لیے انھی کو اس قصیدے کا ممدوح قرار دیا گیا۔ اگرچہ وہ علالت کی وجہ سے شریک دربار نہ ہوسکے اور قصیدہ اُن کی خدمت میں بوجہ دل خواہ پیش نہ ہو سکا۔ (حالی)

رعیت را چناں دارد کہ دارد گلہ را چوپاں
غمِ دل ہا خورد زاں ساں کہ بازرگاں غم کالا

بہ روز از دادِ مظلوماں زمانے برنیا ساید
بہ شب چوں پاسباں بیدار باشد بر درِ دل ہا

یتیماں را پدروار اشک ہا از رخ فروشوید
غریباں را چو غم خواراں برآرد خار ہا از پا

اگر بیوہ زنے نالد ز دستِ ناخدا ترسے

879

بہ دادِ او رسد زاں پیش کاید بر لبش آوا

گدایاں را دہد بخشش کہ دل ہا را غنی سازد
ضعیفاں را دہد زورے کہ پیراں را کند برنا

گہے برہم زند یک شہر بر فریادِ مظلومے
گہے یک جاں ستاند تا اماں بخشد جہانے را

مظالم را بر اندازد ، جہاں از فتنہ پر دازد
عدالت را بر افرازد ، ستم را افگند از پا

ضعیفاں را تواں بخشد ، بہ مظلوماں اماں بخشد
بہ محتاجاں چناں بخشد کہ حاجت را نماند جا

گمارد چوں بہ اصلاحِ مفاسد ہمتِ خود را
کند اصلاحِ آں چنداں کہ سازد زشت را زیبا

فروزد شمعِ دیں زاں ساں کہ ظلمت از جہاں خیزد
ہنر را پرورد چنداں کہ گردد عیب ناپیدا

بہ صحبت بر گزیند نجز دانِ مصلحت جو را
کہ پشتی بانِ ملک و دولت آمد صحبتِ دانا

شریعت را در امر و نہی دارد تکیہ گاہ خود
کہ چوں باشد عصا در دست رہرو را نہ لغزد پا

نہ سازد تکیہ در بے چارگی جز بر توانائے
کہ ابکم را بہ بخشد نطق و اعمیٰ را کند بینا

نہ باشد غرہ در سر پنجگی بر زورِ بازوے
کہ گہہ گہہ تن بہ عجز اندر دہد از پشۂ تنہا

گر امروزش ہمہ سامانِ عیش و خرمی بخشند
نہ سازد با دلش از تلخیِ اندیشۂ فردا

جہاں را پر کند از عدل و از طغیاں تہی سازد

ہمہ مقصودِ اُو ایں باشد از دنیا و ما فیہا

اگر از جاے خود جنبد زند صد فتنہ را برہم
وگر خاموش بنشیند کند صد عقدہ از ہم وا

اگر لطف آورد آید بہ کامِ خلق شیریں تر
از آں انفاسِ جاں پرور کہ کردے مردہ را احیا

وگر خشم آورد با مصلحت نزدیک تر باشد
از آں لطفے کہ شوید گردِ کیں از خاطرِ اعدا

صلاحِ ہر یکے جوید چہ در پیدا چہ در پنہاں
بود در بندِ احسانش اگر ناداں وگر دانا

بہ صورت ملتفت اما نہ بندد جز بہ معنی دل
بہ دنیا مشتغل اما نہ باشد فارغ از عقبیٰ

بود تا در دیارِ خویش سر بر پا فشانندش
وگر اُفتد بہ ملکِ غیر در چشماں دہندش جا

اگر خواہی جہاندارے چنیں بیدار دل بینی
بیا در خیمہ گاہِ دیں پناہِ خروِ والا

دریں جشنِ شہنشاہی کہ گوئی حشرِ اعیان ست
زمانے چشمِ دل بکشا و بنگر عینِ اعیاں را

سحابِ مکرمت کلب علی خاں آنکہ در عہدش
گدا از شاہ و مفلس از تونگر دارد استغنا

نیابی ہیچ کس کش بار گردن نیست احسانش
چہ دولت مندِ مستغنی، چہ عزلت گیرِ بے پروا

نہ تنہا صیتِ احسانش بہ ہند اُفتاد و اقطاعش
کہ شد آوازۂ جودش بلند از یثرب و بطحا

گر از لب بند بکشاید دمد برگوش با افسوں

ور از رخ پردہ بر دارد نظر ہا را کند شیدا

رخے روشن تر از مہر و سرے بالاتر از گردوں
کفے ریزندہ چوں ابر و دلے جوشندہ چوں دریا

جبیں انوار را مسکن ، ضمیر اسرار را مخزن
بروں زیبا دروں روشن ، زہے صورت زہے معنی

خوشا وقتِ سخن سنجے کہ چوں با مدح پر دازد (ق)
نگہ دارد عنانِ خامہ را از جادۂ اطرا

کہ نہ بود ہمچو بیتے سادہ ہرگز کارگر در دل
اگر صد بیتِ رنگیں در ستایش کس کند انشا

دو صد اغراق با یک قولِ صادق بر نمی آید
''فان الحق یعلو کل بہتان ولا
یعلیٰ''

بحمداللہ کہ من مداحِ آں سر چشمہ فضلم
کہ در فضل و کمالش ہر چہ گویم باشدش زیبا

بہ ہر فن پایہ اش والا ، بہ ہر علمش ید طولیٰ
بہ ہر رمزے دلش دانا ، بہ ہر صیدے کفش گیرا

بہ ہر منزلگہش راہے ، بہ ہر کویش گزر گاہے
بہ ہر جایش علم برپا ، بہ ہر راہش قدم پویا

بجائے کز ہنر منداں کسے را در شمار آید
ہنر نالد کہ ''من لی غیرہ فی الدین
والدنیا''

بہ وقتے کز جواں مرداں عزیزے در حساب
آرند
کرم گوید کہ ''مالی دولہ منجی ولا

ماویٰ"

بہ بزمے کز سخن سنجاں حدیثے درمیاں اُفتد
سخن بر خویشتن بالد کہ ما از شاہ و شاہ از ما

سخن را برتری دادہ ، عبارت را تری دادہ
ادا را دلبری دادہ ، زہے منشی زہے انشا

معانی با نزاکت چوں ادا با حسن ہم پیماں
مبانی با عذوبت چوں صفا با دوستی ہم پا

رباعی شیوۂ دارد کہ نتواں دید در جادو
غزل کیفیتے دارد کہ نہ تواں یافت در صہبا

رباعی بشنوی ، از برقِ خاطف در گماں افتی
غزل بینی ، زنی بر سنگ جامِ بادۂ حمرا

جزالت با قصائد تو اماں چوں اوج با کیواں
شگر فی با قوافی ہم عناں چوں موج با دریا

عروجِ پایگاہ مصطفی آباد را نازم
کہ دارد ایں چنیں فرماں روائے مملکت پیرا

تو اے کز وصف شیراز وصفاہاں قصہ ہا راندی
یکے در مصطفی آباد رفتہ چشمِ دل بکشا

نہ پندارم کہ زینساں دیدہ باشی در جہاں شہرے
ہنر را مسقط الرائے و دیں را ملجا و ماویٰ

بہ ہر دکاں متاعِ علم و حکمت چیدہ تو بر تو
بہ ہر بزم اندروں روشن چراغِ ملتِ بیضا

ہم از اہلِ صناعت کاملانش چار سو بینی
ہم از اربابِ علم و فضل یابی فوج فوج آں جا

فقیہاں اجتہاد آثار و دانایاں فلاطوں رائے

879

حکیماں شہرہ در علم و طبیباں در عمل یکتا

گروہے از سخن سنجاں کہ باشد زاں ہمہ ہر یک
سخن را زندگانی بخش و معنی را حیات افزا

بہ موسیقی بسے از سحر کارانِ نکیسا دم
کہ نبود شاں چو بونصرے دریں رہ ہمسر و ہمتا

خوشا شہرے و فرخ شہر یار نام بر دارش
نگہدارد خدا ایں ہر دو را از ناخوشِ دنیا

تو اے کز سیر بنگاہِ سراں[1] ہند می آئی
چہ آوردی بگو از جنسِ معنی ارمغاں ما را

گرفتم دیدہ ای از ملک و دولت بہرہ در جمعے
ولے کم دیدہ باشی علم و دولت را بہم یک جا

کشادستند بر روے ہوا صد طبلہ عطاراں
مشامے کو کہ دریابد شمیمِ عنبرِ سارا

بہ گلشن جلوۂ ہر نو نہالے دیدنی دارد
ولے در خاطرِ بلبل نہ گنجد جز گُلِ رعنا

کسے کو باشد از پیرایہ علم و ہنر عاری
بہ چشمِ اہلِ دل ہیچ است اگر جمشید اگر دارا

الا اے آنکہ از مدحش رطب اللساں دیدی
نہ پنداری کہ فرِّ مال و جاہم بردہ است از جا

[1] یہ خطاب ہے اُس فرضی شخص کی طرف جو گویا کہ درباری رئیسوں اور سرکاری مہمانوں کے ڈیروں اور خیموں کو دیکھ کر واپس آرہا ہے۔ (حالی)

سزاوارِ ستایش گر بہ تنہا سیم و زر بودے
نمی کردند صدیقاں رم از صفراؑ و از بیضا[1]

ولے با فرِ صورت حسنِ معنی جمع چوں دیدم
نای رستم زباں بستن ز شکرِ واہبِ یکتا

کہ در اسلامیاں از جنسِ ایشاں مہترے آورد
بہ مال از علم لذت کش بہ علم از مال بے پروا

نوید اہلِ جہاں آباد را کایں روز آں روزست
کہ نازد ہر قدر ایں بقعہ بر خود باشدش زیبا

ورودِ حضرتِ نواب در دہلی بداں ماند
کہ آبِ رفتہ سوے آب داں باز آید از دریا[۲]

مرا ایں نغمہ بر اب بود کاوازے بہ گوش آمد
کہ پر شد ساغرِ امروز از ناکامیِ فردا

توقع داشتیم از مقدمِ نوابِ دیں پرور
کہ روزے چند ایں ویرانہ گردد خویشتن آرا

ولے ناسازگاری ہاے بختِ واژگوں نہ گزاشت
کہ کشتِ خشکِ ما را تر کند ابرِ کرم فرما

برو حالی تحمل پیشہ کن در ہو خوش و ناخوش
کہ سرے ہست پنہاں در ''عسیٰ ان تکرہوا
شیئا''

ہلال عید را گر بینی و گر منتظر باشی
فروغ افزاید آں در چشم و خرم دارد ایں دل را

ا۔ یہ اشارہ ہے حضرت عمرb کے قول کی طرف کہ ''یا صفرا و یا بیضاء غری غیری۔'' یعنی اے سونے اور اے چاندی میرے سوا کسی اور کو دھوکا دینا۔ (حالی)

۲۔ اس میں اشارہ ہے اُس زمانے کی طرف جب کہ نواب ممدوح کے والد ماجد نواب یوسف علی خاں مرحوم دہلی میں بہ حالت طالب علمی مقیم تھے اور نواب ممدوح صغر سنی میں اُن کے ساتھ یہیں رہتے تھے۔ (حالی)

خداوندا بحق آنکہ از اعجاز انفاسش

بہ دستِ پاکِ اُو مشتِ حصا را کردہ ای گویا

بخشش ایں مہترِ کہتر نوازِ فیض گستر را
نصیبے کامل از دنیا و از دیں بہرۂ اوفیٰ

مدہ اندوہ و غم را در درونِ خاطرش راہے
کہ با جمعیتش وابستہ شد جمعیتِ دلہا

دگر یاری دہد گر بخت و وقت آں آرزو دارم
کہ یک رہ بردرش خود را زنم چوں تشنہ بر دریا

تکلف نیست در ہرچہ از دعا و از ثنا گفتم
تو دانی حالِ ما یا ''عالماً بالجہر والاخفا''

2 قصیدہ در تہنیت عید الفطر بجناب نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم

صاحبا! روز و شب بہ کامِ تو باد
صبحِ نوروز و عید شامِ تو باد

عیدِ سالِ ہزار و سی صد و شش
بر تو فرخندہ و بہ کامِ تو باد

شاہ نامید آسماں جاہت
آسماں مفتخر ز نامِ تو باد

شاہ کت ملک را سپردہ عناں
نظمِ اُو قائم از قیامِ تو باد

شاہ از رائے تست فارغ بال
خلق خرسند از نظامِ تو باد

آرزوہا ست زندہ از کرمت
فتنہ ہا مردہ از حسامِ تو باد

گنج معمور و ملک آباداں
از بقاے شہ و دوامِ تو باد

قصرِ والا اساسِ ملکِ نظام
محکم از پشتیِ نظامِ تو باد

ہر کہ در چار سوے ملک نظام
خیرہ و سرکش است رامِ تو باد

شرمساری عقوبتے است عظیم
عفوت از خصم انتقامِ تو باد

در سیاست گرہ بر ابرویت
خوش نما ہمچو لطفِ عامِ تو باد

برقِ تیغ تو خشک و تر سوزست
یا رب آں برق در نیامِ تو باد

عدل زاں ساں کہ وجہِ ہمتِ تست
ہمہ در ضبطِ اہتمامِ تو باد

در قضایاے صعبِ ملت و دیں
شرعِ خیر الوریٰ امامِ تو باد

در امورِ عظامِ دولت و ملک
بخداوند اعتصامِ تو باد

مقصدِ خلق طوفِ درگہِ تست
پرسشِ حالِ شاں مرامِ تو باد

ساز و برگِ دعاے مظلوماں
مایۂ عیشِ مستدامِ تو باد

بر زباں خلق را ستایش تست
در دل خلق احترامِ تو باد

اے مدار المہامِ ملکِ دکن
فتحِ دلہا خود از مہامِ تو باد

تا بنوشند بادہ اندر جام
بادۂ خوش دلی بہ جامِ تو باد

تا فشانند دانہ در تہِ دام
دلِ عالم اسیرِ دامِ تو باد

ہر شمیمے کہ ناگوار آید
دور پیوستہ از مشامِ تو باد

ہر نسیمے کہ از جناں خیزد
طرب انگیز در خیامِ تو باد

در جہاں ہر کہ ہست چوں حالی
طالبِ کام و ناز و نامِ تو باد

3- قصیدہ در تہنیت عید اضحیٰ بجناب نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی نظام

عید اضحیٰ کہ قریں باد ورودش بہ ظفر
باد بر خواجہ ز عیدِ رمضاں فرخ تر

نائب السلطنۃ نواب بشیر الدولہ
عمدۃ الملک فلک جاہ امیرِ اکبر

آں کہ برپا زدہ از نظم و سیاست حصنے
کز پے ملک سپر بودہ ز ہر فتنہ و شر

آں کہ از لطف و کرم کردہ رواں شہر و دے
کہ خس و خارِ الم برد بروں از کشور

آں سپہر شرف و مجد کہ در جاہ و جلال
پایہ اش برتر ازاں است کہ گنجد بہ فکر

879

آں مہِ اوجِ کرامت کہ ز والا گہری
بے نیاز آمدہ از مدح چو ما از زیور

صاحبا! عادتِ قوم است کہ در مدح و ثنا
ہر یکے ساز کند نغمہ بہ آہنگِ دگر

آں یکے جز بہ مدیحت نہ کشاید لب باز
تا بدانند کہ جز مدح نہ دارد در سر

واں دگر پیش تر از مدح ستاید خود را
تا فریبد دلِ ممدوح بہ اظہار ہنر

جمعے از شکوۂ گردوں سخن آغاز کنند
کہ شکایت بود از شکرِ بہ دل گیرا تر

قومے از مدح گرایند بہ تشبیب و غزل
کز نمک چارہ نہ باشد چو بخوردند شکر

بعد ازیں طائفہ باشد کہ در وقتِ مدیح
دم بہ دم حسنِ طلب جلوہ دہند از ہر در

گر قصیدہ ست وگر تہنیت ایں است شعار
نکتہ سنجاں را در مدحِ عزیزاں یکسر

من کہ جز خواجہ کم آلودہ ام اندر ہمہ عمر
دہنِ خویش بہ مداحیِ ممدوحِ دگر

لا جرم خامہ دریں مرحلہ پُر نا بلد است
می نہ داند کہ چساں طے کند ایں راہ گزر

تہنیت خود سخنے بیش نہ باشد کہ درو
چوں بگویند مکرر نہ بود ہیچ اثر

ور بجز مدحتِ خواجہ نہ راند حرفے
بہ تملق کندش دہر بہ ہر شہر سمر

ور بہ عرضِ ہنرِ خویش دکاں بکشاید
ایں خرافت نہ بود طبع زماں را درخور

ور بہ تشبیب و غزل روے سخن آراید
نیست ایں زمزمہ ہا جز بہ جوانی اجدر

ور نہد بر طلبِ جائزہ بنیادِ کلام
کردہ باشد مگر از شرم و حیا قطعِ نظر

آں کہ از مائدۂ فیضِ تو ادرار خورد
واں کہ از نعمتِ تو بہرہ برد شام و سحر

دل رضا چوں دہدش کز تو عوض دارد چشم
بر سپاسے کہ ازاں ہیچ گہش نیست مفر

خامہ زیں جاست کہ از غایت حیرت زدگی
اندریں مرحلہ نہ شناختہ پا را از سر

پس ہماں بہہ کہ کند ختم سخن را بہ دعا
کہ دمِ عجز پناہم بہ دعا مدحت گر

تا کنند اہل سخن مدحِ ملوک و وزرا
تا ملوک و وزرا مرجعِ فضل اند و ہنر

باد اوصافِ تو از مدح و ثنا مستغنی
گرچہ باشند بہ مدحِ تو عزیزاں مضطر

باد در سایۂ محبوب علی خاں ایمن
دولتِ آصفی از ہر حدث و فتنہ و شر

3 قصیدہ درشان جناب مستطاب ہز مجسٹی حبیب اللہ خاں

والی دولت خدادادافغانستان خلد اللہ ملکہ

(وقتے کہ برائے ملاحظہ مدرستہ العلوم در علی گڑھ نزول اجلال فرمودہ بودند ایں قصیدہ

درمواجہہ ایشاں خواندہ شدہ)

(1907ء)

می رسد گر فرقِ عزت بگزرد از فرقداں
میزبانے را کہ شاہے چوں تو باشد میہماں

گر بہ رقص آید در و دیوارِ کالج دور نیست
زیں طرب کامد بہ دیدارش امیرِ کامراں

دولتِ بیدار مفتِ ما کہ شد مہمان ما
چوں تو مہمانِ عزیزِ قیصرِ ہندوستاں

زندہ ، کاش امروز بودے بانیٔ ایں درس گاہ
تا بدیدے پایہ اش بالاتر از وہم و گماں

تا ہمہ اُمید ہا کاندر دلِ خود بستہ بود
از قدومِ شہ بچشمِ خویشتن دیدے عیاں

اے سراجِ ملت و دیں اے امیر ابن امیر
اے چو بابِ نامدارِ خویش شاہے کارداں

سنگ ہا کاندر رہِ تعلیمِ قوم آمد بہ پیش
داستانِ عبرت انگیزش نہ گنجد در بیاں

قصہ کوتہ جہل و دانش سالہا در جنگ بود
جہل می کوشید تا نگزارد از دانش نشاں

دولتِ ہند ار نہ بودے حامیِ ایں درسگاہ
کوششِ بانی ہمہ برباد رفتے بے گماں

شکر للہ کز میاں برخاست آں جنگ و خلاف
جملہ بربستند بر امدادِ ایں کالج میاں

عاقبت مقبولیِ کالج بدیں غایت رسید
تربیت گاہ غریباں شد گزرگاہِ شہاں

شکرِ ایں کہتر نوازی کز قدومِ خویشتن
اہلِ کالج را فزودی آبرو و عز و شاں

گر نویسد پارۂ زاں نیست یارائے قلم
ور بگوید اندکے زاں نیست نیروے زباں

پس ہماں بہتر کہ گردد بر دعا ختمِ سخن
زانکہ ناید جز دعاے خواجہ از ما بندگاں

تا زتعلیم است و تلقیں دین و دنیا را فروغ
تا بود وابستہ با علم و عمل نظمِ جہاں

ملتِ افغاں ز تدبیرِ تو اندر علم و فن
گوے سبقت بردہ باد از جملہ ابناے زماں

آں چناں کز نوع خود در زور و طاقت برترست
ہم چناں در علم و حکمت باد ممتاز از جہاں

تا بود خیر و صلاحِ خلق در صلح و وفاق
تا نہالِ دوستی بار آورد امن و اماں

اتحادِ دولتِ ہند و خدادادِ امیر
باد مستحکم بسانِ اتحادِ جسم و جاں

(د) مراثی

1 مرثیہ نواب مختار الملک سر سالار جنگ میر تراب علی خاں مرحوم

مدار المہام سرکار عالی نظام

(1883ء)

داشت ہر کس بہ زباں مدحتِ مختار الملک
کامد از در خبرِ رحلتِ مختار الملک
تا چہ اُفتاد پس از نہضتِ مختار الملک
بر سرِ حشمت و جمعیت مختار الملک
اے اجل گر تنِ بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکونامیش از یاد بری

لشکر اَز ماتم اوچاک گریباں شدہ است
کشور اَز مردن او یک سرہ پژماں شدہ است
اے بسا چشم کزیں حادثہ گریاں شدہ است
حیدر آباد تو گوئی ہمہ بے جاں شدہ است
اے اجل گر تن بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکو نامیش ازیاد بری

منتے ہست ازو برسرِ سرکار نظام
کہ بہ شکرش نتواں کرد مہ و سال قیام
ہم ازو یافتہ عدلیہ و مالیہ قوام
ہم بدو لشکر و ضبطیہ پذیرفت نظام
اے اجل گر تنِ بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکونامیش از یاد بری

879

آہ کایں درد نہ دردیست کہ درماں دارد
ملک ازیں داہیہ صد لرزہ در ارکاں دارد
قوم ازیں واقعہ انگشت بہ دنداں دارد
تا فلک در پس ایں پردہ چہ پنہاں دارد

اے اجل گر تنِ بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکونامیش از یاد بری

چشمِ اسلام ازیں غصہ بخوں تر گردید
ملت از حالتِ پیشینہ زبوں تر گردید
علمِ دیں کہ نگوں بود نگوں تر گردید
قیمتِ خواجہ پس از مرگ فزوں تر گردید

اے اجل گر تنِ بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکونامیش از یاد بری

دوست تا دشمن اُو زو طمعِ یاری داشت
ملک از نیروے تدبیرش استواری داشت
دولتِ عہد ازو چشمِ وفاداری داشت
گردنِ قوم ز احسانش گراں باری داشت

اے اجل گر تنِ بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکونامیش از یاد بری

آہ ازاں بذل و سماحت کہ نیابیش ہمال
آہ ازاں عقل و کفایت کہ نہ بینیش مثال
سپس از ہند چنیں مرد نہ خیزد صد سال
خاصہ از قوم کہ افتاد دراں قحطِ رجال

اے اجل گر تنِ بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکونامیش از یاد بری

در علی گڑھ کہ نہادند عزیزاں بنیاد
درسگاہے کہ ز طوبیٰ ثمرش باد زیاد
تا بہ گیتی بود ایں قصرِ ہمایوں آباد
خلق را یاد جواں مردیِ اُو خواہد داد

اے اجل گرتنِ بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکونامیش از یاد بری

کیست در ہند کزیں غم لبِ حسرت نہ گزید
کیست از قوم کزیں غصہ گریباں نہ درید
تا بہ جاے کہ چو ایں نالہ جاں کاہ شنید
حالیِ گوشہ نشیں ہم ز جگر آہ کشید

اے اجل گرتنِ بے جاں تہِ خاکش سپری
نہ توانی کہ نکونامیش از یاد بری

2 مرثیہ سرسید احمد خاں

(1898ء)

(1)

آہ ازیں تیرِ گزا را کز کماں انداختند
آہ کز یک زخم قومے نیم جاں انداختند

اے عجب کز رحلتِ فردے ز افرادِ بشر
عالمے را از قیامت در گماں انداختند

اے عجب کز مردنِ یک پیر مردِ سال خورد
تاب و تب در کودک و پیر و جواں انداختند

اے عجب کز سوزِ اندوہِ وفاتِ مسلمے
مردمِ ہر کیش را آتش بجاں انداختند

879

سید اندر قوم نقدے بود اندر کیسہ
کیسہ خالی ماندہ و نقد از میاں انداختند

قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت
بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند

نو بہار آید دگر در باغِ قوم ، اُمید نیست
بعد ازو طرحِ خزانِ جاوداں انداختند

تا قیامت گوئی از تاراجِ ما فارغ شدند
کایں مصیبت بر سرِ اسلامیاں انداختند

اہل دیں بے یاورو دیں بے کس و بے یار ماند
ہر کہ ایں آوازہ در ہندوستاں انداختند

رفت و با خود رونقِ بزمِ مسلمانی ببرد
ملت از مرگش پس مرد و مسلمانی بمرد

(2)

آہ آہ از مرگِ دہر آشوبِ سید آہ آہ!
آنکہ در ہر نالمائم قوم را بودے پناہ

عہدِ یاری کو بہ ملک و دین و دولت بستہ بود
تا ز تن جاں برنیاید داشتے دائم نگاہ

مشکلِ یاراں اگر بودے ہمہ طوفانِ نوح
بر مثالِ کشتیِ نوح اندرو کر دے شناہ

عمرہا کوشید تا شوید غبارِ سوے ظن
گر نشیند از رعیت بر دلِ ارکانِ شاہ

چارہ ہا انگیخت تا طرحِ صداقت افگند
درمیانِ حاکم و محکوم و سالار و سپاہ

کاروانِ قوم دور افتادہ بود از راہِ راست
رفت و از بے راہ بر گرداند و آوردش براہ

در مصافِ دہر بودن دین و ملت را سپر
حجِ او ایں بود ، اینش صوم و ایں بودش صلوٰۃ

سید القوم ست ہر کس قوم را خدمت کند
خدمتِ اُو بر سیادت بس بود او را گواہ

گرچہ از ما می تواند صد چو سید آورد
آں کہ لعل آرد ز سنگ و لالہ از خاکِ سیاہ

لیک قومے کز فراز اندر نشیب افتادہ اند
باز ہرگز درنیا بند انچہ از کف دادہ اند

(3)

می تواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن
در فصاحت ہمچو سحباں ، درِ خرد لقماں شدن

می تواں در جاہ و ثروت گوے از قاروں ببرد
می تواں در زہد و طاعت غیرتِ صنعاں شدن

می تواں در ملک و دولت خسرو پرویز گشت
می تواں در زور و طاقت رستمِ دستاں شدن

می تواں قطبِ زماں شد، می تواں شد غوثِ وقت
ہرچہ خواہی می توانی شد بجز انساں شدن

چیست انسانی ؟ تپیدن از تپِ ہمسایگاں
از سمومِ نجد در باغ عدن پژماں شدن

خوار دیدن خویش را از خواریِ ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنتِ زنداں شدن

آتشِ قحطے کہ در کنعاں بسوزد باغ و کشت
بر فرازِ تختِ مصر از تابِ آں بریاں شدن

زیستن در فکرِ قوم و مردن اندر بندِ قوم
گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

می تواں مقبولِ عالم گشت اما ہمچو شیخ
بہر سودِ خلق مردودِ جہاں نتواں شدن

جورِ اخواں دیدن و در عشقِ اخواں زیستن
زخمِ پیکاں خوردن و مشتاقِ پیکاں زیستن

(4)

در رہش جمعے بہ تقلید اسپ ہمت تاختند
لیک چوں رفتند گامے چند ، دل درباختند

زود دانستند کایں سودا نہ ہر سر را سزد
اہلِ دعویٰ کاندریں میداں علم افراختند

کار کارِ شیر مردان است کز سوزِ دروں
بزم را افروختند و شمع سا بگداختند

سید از رہ تا دمِ آخر عناں را برنتافت
گرچہ در راہش بسے خار و خسک انداختند

بود یاراں را سپر تا بود در ہر شور و شر
لیک یاراں بر سرش تیغِ جفا می آختند

خواجہ در فکرِ صلاحِ دین و ملت درگزشت
لیک اہلِ دین و ملت قدرِ اُو نشناختند

جز ملامت ہیچ نوشتند مزدِ خدمتش
چوں بنامش قرعہ در روزِ نخست انداختند

آرے از عالم ندیدستند جز جور و جفا
آں جواں مرداں کہ کارِ اہلِ عالم ساختند

آدمی وانگہ ز قومِ مردہ خیزد ، اے شگفت
کایں جہانِ مردمی زیں آب وگل چوں ساختند

حیف کاندر جمعِ مستاں ہوشیارے بود ، رفت
در زمینِ شور نخلے بار دارے بود ، رفت

(5)

گوے از گردش فرو ماندہ ست، چوگاں را چہ شد
کشتی از جا می نہ جنبد ، موجِ عماں را چہ شد
دہ بہ ویرانی کشد وقتست ، دہقانش کجاست
گلہ سرگرداں شود زودست ، چوپاں را چہ شد
چیرہ شد سہرابِ دوراں ، رستمِ دستاں کجاست
یافت فرصت اہرمن ، مہرِ سلیماں را چہ شد
تارکِ ہر کس نہ دارد تابِ گرزِ روزگار
برنمی تابد سرے ایں پتک ، سنداں را چہ شد
قوم را بیمِ عتاب و چشمِ رحم از کس نہ ماند
آں لبِ نفریں سرا ، آں چشمِ گریاں را چہ شد
پندِ ایں شیریں بیاناں در نمی گیرد بہ دل
آں زبانِ تلخ گو ، آں تیغِ عریاں را چہ شد
شد خزان و از بہاراں نیست یاراں را خبر
آں بہارِ بے خزانِ بزمِ یاراں را چہ شد
دل گرفت از خندہ گل تا بہ ست از خندہ لب
آں کلیدِ قفلِ دل ، آں لعلِ خنداں را چہ شد
آں کہ می بخشید جاں آں بادِ نوروزی کجاست
آں کہ می بارید دُر آں ابرِ نیساں را چہ شد
اے علی گڑھ آں کہ کردت شہرہ در امصار، کو؟
آں کہ از خاکت بہ گردوں برد آں معمار کو؟
آہ ازاں در بیشہ صدق و صفا شیرِ ژیاں
آں کہ در سرّ و علن بودش یکے دل با زباں
آں کہ چوں دریا نہ بودے تیرہ از بارانِ سنگ
آں کہ از عزمش نہ گشتے صورتِ کوہِ گراں

بود در امت بہ بدعت متہم از راستی
آرے ایں باشد دریں عالم سزاے راستاں

یار جز علمش نہ بود و علم دانی نا درست
ایں چنیں بے کس سزد کز جہل پر دازد جہاں

بعدِ سید کز جفاے قوم نہ گزشت از وفا
کیست تا باشد بر ایں نا مہرباناں مہرباں

خانہ اش دانی یکے مہماں سراے قوم بود
کیست مر ایں میہماناں را ازیں پس میزباں

بعد ازو کایں دشت را گلزار کرد و رفت، کیست
ایں بناہا را ضماں ، ایں باغ ہا را باغباں

سعیِ ما مشکل کہ بعد از خواجہ ماند برقرار
جنبش از لعبت مجو، لعاب چوں رفت از میاں

جیش را فقدانِ سر عسکر ، خطر دارد خطر
گلہ را بگسستن از چوپاں ، زیاں دارد زیاں

رہرواں را بعد ازیں یا رب دلیلِ راہ کیست؟
دیگر ایں بے دولتاں را یارِ دولت خواہ کیست؟

دوستاں ! از مرگ نہ بود چارہ وز فرقت مفر
چوں زناں تاچند بودن بہرِ سید نوحہ گر

جاے استقلال و وقتِ ہمت و مردانگی ست
کایں بلاے ناگہاں را نیست جز ہمت سپر

در غمِ سید اگر از فرضِ خود غافل شدید
ایں مصیبت راست صد چندیں مصیبت بر اثر

خواجہ دارالعلمے از بہرِ شما بگزاشت است
تا بود نسلِ شما از علم و دولت بہرہ ور

کوہ ہا کندہ است تا ایں جوے شیر آوردہ است
گو کہ آبِ رفتہ در جوے شما آید ز سر

تر سم ایں سر چشمہ گردد تیرہ از سنگِ خلاف
ہان و ہاں وقت است ، وقتِ اتفاق ہم دگر

عزمِ جزم آرید و برخیزید و ہم دستاں شوید
دست بکشائید و بربندید دامن بر کمر

شصت ملیَن ہست در ہندوستاں توحید گوے
دہ کہ چندیں خلق درماند ز کارِ یک نفر

یادگارِ خواجہ بعد از خواجہ برپا داشتن
شکرِ او را خوب تر زیں نیست اسلوبے دگر

مزدِ او ایں بس کہ در اصلاحِ خود کوشید زود
کز شما غیر از شما مطلوب اُو چیزے نبود

3 قطعہ بروفات

آنریبل نواب محمد علی خان مرحوم متخلص بہ رشکی خلف اکبر حضرت نواب محمد مصطفی خاںk
رئیس جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر

دریغ از رحلتِ نواب رشکی
کہ بود امید گاہِ حالیِ زار

بہ صورت گرچہ بود از دید گاں دور
نہ بود از دل نہاں یک لحظہ زنہار

بہ یادِ صحبتِ دیرینہ او
بدے روشن تر از روزم شبِ تار

زمرگِ خواجہ گم کردیم صد حیف
متاعِ کاسدِ خود را خریدار

دریغ آں شاد باش و شادماں زی
دریغ آں کس مرنجاں کس میازار

دریغ آں عیدِ وصل گاہ گاہے
کہ می آمد پس از یک سال یک بار

دریغ آں یادِ صحبت ہاے پیشیں
کہ می شد تازہ از انشا و اشعار

دریغ آں یادگارِ عہدِ اسلاف
کہ یاد از وضعِ شاں دادے بہ کردار

قدیماں را نہ راندے از درِ خویش
وگر بودند مجرم یا خطاکار

بہ عمرِ خویشتن نہ گرفت گاہے
بہ جرمے ، خشم بر خیل پرستار

مقرر داشت چوں رزقِ مقدر
بہ ہر کس ہرچہ می بخشید داوار

چناں کایزد درِ روزی نہ بندد
بہ جرمے یا خطاے بر گنہگار

ز حالی گرچہ کہتر بود در عمر
ولے بربست زیں جا پیش ازو بار

مگر از ما صبوری چشم می داشت
کہ لختے پیش از ما راند رہوار

بلے چوں جنگ نتواں با قضا کرد
بہ مرگش صبر باید کرد ناچار

ولے از دل نہ گردد یادِ او محو
بود تا جانِ محزوں در تنِ زار

879

4 قطعہ تاریخ وفاتِ قبل از وقت سید محمود علی مرحوم

خلف سید ببر علی نبیسہ مہین برادر جناب سر سید احمد خاں بہادر k

کہ از طلبہ رشید و کامیاب محمدن کالج علی گڑھ بود

زبدۂ اتراب و شمعِ جمع ، محمودِ علی
آں کہ در باغِ شبابش بود آغازِ بہار

آنکہ انوارِ نجابت می درخشید از رُخش
آں کہ آثارِ رشادش از جبیں بود آشکار

آں کہ در کسپ علوم آخر بہ پایاں بردہ راہ
گرچہ آمد سنگ ہا در راہش از لیل و نہار

در ہزار و سی صد و نہ کرد دنیا را وداع
پیش ازاں کز باغِ دنیا ہیچ چیند برگ و بار

پیش ازاں کز نخلِ سعیِ خویش افشاند رطب
پیش ازاں کز پاے رہ پیا برآرد نوکِ خار

پیش ازاں کز ثمرہ تعلیم گشتہ بہرہ ور
گل وماند سر پرستاں را براہِ انتظار

پیش ازاں کز عمر و از دولت نصیبے یافتہ
ہم نیا را یار گردد ہم پدر را غم گسار

آں کہ بودے چشمِ یاراں را فروغ از دیدنش
آں کہ گشتے از فراقش خاطرِ یاراں فگار

حیف کز یاراں فراقِ جاودانی برگزید
نا گرفتہ در جہاں چوں قطرۂ شبنم قرار

یا رب او را کز جہاں شد با دلِ پر آرزو
جاے صدیقاں بدہ از لطف در دارالقرار!

5 قطعہ بروفات وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم

وزیر ریاست پٹیالہ

آہ از مرگِ مفاجاتِ وزیر الدولہ
کہ فرو ریخت بہ حیرت خبرش ہر کہ شنید

برنتابد جگر ایں داہیہ دہیا را
کامد از پردۂ تقدیر بناگاہ پدید

فارغ از ماتمِ فرزندِ جواں ناگشتہ
رخت زی منزلِ فرزندِ جواں باز کشید

خلق را بہہ نشدہ زخمِ دو تیرِ منکر
کز فلک بر اثرِ ایں ناوک دل دوز رسید

شہر پٹیالہ نہ تنہا بہ غمش نوحہ سراست
کہ بہ ہر ناحیہ زیں نالہ بلند است نشید

اے بسا چشم کزیں واقعہ خوناب فشاند
اے بسا دست کزیں غصہ گریباں بدرید

صبر بر مرگِ عزیزے نہ تواں کرد آرے
کہ بود فرد در اقران و در امثال وحید

آں کہ تردستیِ اُو در کرم و بذل و سخا
رسمِ اجداد ز سر کردہ بہ عالم تجدید

آں کہ ہر گاہ لب از لطف کشادے بہ سخن
گفتی از خلد نسیمِ سحری باز وزید

مہرش شاملِ ہر فرقہ چہ بیگانہ چہ خویش
لطفِ اُو عام بہ ہر کس چہ قریب و چہ بعید

زخم مشکل کہ بہ تدبیر شود چارہ پذیر
کہ ازیں واقعہ بر دولتِ پٹیالہ رسید

ہمہ عمرش بہ نکو خواہیِ دولت بگزشت
تا توانست در اصلاحِ مفاسد کوشید

گر بکاوند ہمہ مملکتِ خالصہ را
ایں چنیں صاحبِ تدبیر و خرد نتواں دید

مگر از دودۂ اُو کس بہ تلافی خیزد
کش بود رائے پئے قفلِ درِ بستہ کلید

در علی گڑھ کہ بنا یافتہ دارالعلمے
از مددگاری و یاریش بسے داشت اُمید

یاورے گم شدہ از دستِ عزیزاں ہیہات
کہ ز دوراں بدلش می نہ تواں باز خرید

ذکرِ اُو ماندہ جاوید دریں دارِ علوم
کش نکو خواستہ تا بود و نکو اندیشید

مردنش گرچہ بہ ہنگام نہ بودست اما
عاقبت روزے ایں جرعہ ببایست چشید

مرد و با خویشتن از خلق بجز خیر نہ برد
ایں چنیں مرگ نکو تر ز حیاتِ جاوید

6 قطعہ در نوحۂ وفات جناب مشیر الدولہ

خلیفہ سید محمد حسین خاں مرحوم برادر خورد وزیر الدولہ مغفور

آہ از مرگِ مشیر الدولہ آہ!
آں عمادِ قوم و رکنِ خانداں

درس گاہِ قوم را پشت و پناہ
دود مانِ پھول را حرزِ اماں

آں بہ صورت انس و در سیرت ملک
آں بہ دانش پیر و در ہمت جواں

آں بہ تدبیر و خرد بوزر جمہر
آں بہ حزم و رائے سولونِ زماں

آں بہ شوریٰ یک مشیرِ پختہ کار
آں بہ دیواں یک دبیرِ کارداں

در سیاست از مفاسد بر کنار
در دیانت از تعصب بر کراں

آنچہ ملت دیدہ است از رحلتش
باغ خرم می نہ بیند از خزاں

آنچہ دولت را رسید از نہضتش
کم رسد گلزار را از مہرگاں

عمرہا باید کہ خیزد مثلِ او
بخردے از سر زمینِ پھلکیاں

در کراچی چوں فراقش دست داد
بود گوئی آں فراقِ جاوداں

ناگرفتہ دم ز سیر سند آہ
کوسِ رحلت کوفت زی باغِ جناں

منتظر بودیم ازو پیغام را
کامدہ پیغامِ مرگش ناگہاں

جز نکوئی در خصالِ اُو نہ دید
ہیچ کس ہم در عیاں ہم در نہاں

در صفا آئینہ سرّش چوں علن
از ریا پاکش نہاں ہمچوں عیاں

آہ ازاں مخدومِ خادم پرورے
مہرباں تر از پدر بر خادماں

آہ آہ آں خواجہ مہماں نواز
از کرم منت پذیر از میہماں

آہ ازاں در شادی و غم پائیدار
آہ ازاں در ناخوش و خوش شادماں

قصہ کوتہ بود یک فردِ فرید
کامدہ از وصفِ اُو قاصر زباں

از خرد پرسیدمش سالِ رحیل
گفت سالِ رحلتش ''مغفور داں''

۱۳۲۶ھ

7 قطعہ بروفات مولوی چراغ علی مرحوم

(1895ء)

آہ آہ از رحلتِ بیگاہِ اعظم یار جنگ
کز میانِ رہ زہمرہاں عناں پیچید و رفت
حیف دنیا را بہ پنجہ سالگی کردہ وداع
بزمِ ما را بزمِ ماتم باز گردانید و رفت
مستفیداں پر نہ کردہ دامنِ معنی ہنوز
مشتے از گنجینہ لعل و گہر پاشید و رفت
از سحابِ فیضِ کلکش ناشدہ سیراب خلق
ساعتے برقِ یمانی از افق تابید و رفت
عقدہ ہا نکشودہ ماند و نکتہ ہا نخوشتہ ماند
بہرِ جوے شیر کوہِ بے ستوں کندید و رفت
کرد بے آزارِ خلق اعمالِ سلطانی ادا
نے زکس رنجید و نے کس را برنجانید و رفت
یاورانِ قوم را تا زیست یاور بود و یار
ہرچہ بتوانست در تائید شاں کوشید و رفت
از دلِ پُر دردِ او گاہے صدائے برنخواست
مدتے چوں بحر کاہل در نہاں جوشید و رفت
طبعِ آزادش بہ ہر ملت کہ بینی صلح داشت
در دلِ خویش و دلِ بیگانہ در گنجید و رفت
گر زید صد سال کس انجامِ اُو مرگ ست و بس
چوں شرر بر وضعِ دوراں می تواں خندید و رفت

(ھ) قطعاتِ فارسی

1 قطعہ (بنام غالب) [۱]

تو اے کہ رونقِ پیشینیاں بہم بشکست
ز نظم و نثرِ تو کاندر زمانِ ما گفتی

چہ نغمہ ہا کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی
چہ بذلہ ہا کہ بہ اندازِ دلربا گفتی

۱۔ جس موقع پر یہ قطعہ لکھا گیا تھا اس کے متعلق مفصل بحث ''یادگارِ غالب'' میں درج کر دی گئی ہے۔ اس قطعہ میں مرزا غالب مرحوم کی طرف خطاب کیا گیا ہے اور جو مضامین اس قطعہ میں درج کیے گئے ہیں، اُن کا ماحصل بغیر ''یادگارِ غالب'' کے دیکھے اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔ (حالی)

متعلقہ بحث کا ماحصل، حالی ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''ایک روز مجھ سے ایک ایسی غلطی ہو گئی جس کے تصور سے مجھ کو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے...... مرزا کی بزرگی، استادی اور کبرسنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھ کر، خشک مغز واعظوں کی طرح اُن کو نصیحت کرنی شروع کی۔ چونکہ اُن کا ثقل، سماعت انتہا کے درجے کو پہنچ گیا تھا اور اُن سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعے سے کی جاتی تھی، نماز پنج گانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر اُن کے سامنے پیش کیا...... مرزا کو یہ تحریر سخت ناگوار گزری...... خصوصاً اس وجہ سے کہ انہی دنوں میں لوگ گمنام خطوں میں اُن کے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے...... اس کے بعد میں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھ کر میرے پاس بھیجی جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی لیکن اس کے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اس میں جو طعن و تعریض ہے، وہ میری ہی نسبت ہے...... اس غزل کو دیکھ کر مجھ کو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمالِ شاعری کی نسبت جو خیالات مکنونِ خاطر ہیں اور کبھی اُن کے اظہار کی نوبت نہیں آئی، ان کو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعہ میں بیان کیا جائے۔ چنانچہ قطعہ ذیل (تو اے کہ رونقِ پیشینیاں و ہم بشکست) ترتیب دے کر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔

...

رسید نشۂ عرفاں چو ذکرِ مے راندی
شگفت خاطرِ یاراں گر از صبا گفتی

دوید ریشہ بہ دلہا چو حرفِ مہر زدی
دمید نخلِ تمنا چو از وفا گفتی

گہر بہ بزم فشاندی اگر ثنا خواندی
اثر ز لفظ دماندی اگر دعا گفتی

ہزار عقدۂ سربستہ باز بکشودی
ہزار نکتۂ پوشیدہ برملا گفتی

ز سرِّ تفرقہ و جمع قصہ ہا راندی
ز سیرِ انفس و آفاق راز ہا گفتی

بر آمد از دلِ بیگانگاں ترانۂ ذوق
بہ محفلے کہ سخن ہائے آشنا گفتی

''' جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا، اُس زمانے میں مجھ کو نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم متخلص بہ شیفتہ وحسرتی، رئیس جہاں گیرآباد کے ہاں تعلق تھا اور ان دنوں میں وہ دلی آئے ہوئے تھے اور میں انہی کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گزرا تو انہوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھ کر بھیجا، جو ذیل میں درج ہے:

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری
ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از منِ آشفتہ بے سبب رنجید
تو گر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال
براں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عباداتِ عمرِ پیشینہ
دگر بہ پیش گہ حالی اعتذار کنم

...... مرزا صاحب کے اس قطعہ پر میں نے ایک اور قطعہ لکھ کر اُن کی خدمت میں بھیجا (قطعہ دیگر: ''تو اے کہ عذر فرستادہ ای بہ سوے رہی'') ...... جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہنچا، اس پر یہ لکھ کر کہ ''بس اب بیت بحثی موقوف'' میرے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔'' (یادگارِ غالب)

لطیفہ ہا کہ بہ لفظ و بیاں نمی گنجید
تو چوں فرشتہ ز غیب آمدی و وا گفتی

بحقِ لطفِ کلامت کہ ہست بر دلِ ما
کہ پایہ سخن افراشتند تا گفتی

تو اے کہ ہر سخنِ نغزِ تو بہ دل جا کرد
جز آں کہ در حقِ حالی بہ رمز وا گفتی

ہر آنچہ گفتہ ای اندر جواب عرضِ نیاز
خطا بود کہ بگیرم اگر خطا گفتی

ولے بہ عربدہ از حرفِ چند با خویشم
کہ گر نہ گفتہ ام آخر تو از کجا گفتی

عجب کہ قاعدہ دانِ نیاز مندی را
سفیہ و معجب و خودبین و خود نما گفتی

عجب کہ چاشنی اندوزِ خاکساری را
رہینِ ذوقِ نوآئینِ انا گفتی

عجب کہ منفعلے را ز نقدِ ناسرہ اش
بہ زرق در گروِ عرضِ کیمیا گفتی

نہ راہِ حرف بہ سویت نہ جاے من بدلت
جواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی

اگر نہ روے سخن با تو بودے گفتم
چگونہ گفتی و چوں گفتی و چرا گفتی

ولیک شرطِ ادب نیست بر تو خردہ گرفت
ہر آنچہ در حقِ من گفتہ ای بجا گفتی

2 قطعہ دیگر (بنام غالب)

تو اے کہ عذر فرستادہ ای بہ سوے رہی
سزد کہ جان گرامی براں نثار کنم

شکایتے کہ تواں گفت عین اخلاصش
گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم

نماندہ قاعدۂ شکرِ بے ریا بہ جہاں
اساسِ دوستی از شکوہ استوار کنم

چو شکوہ جز بہ تقاضاے دوستی نہ بود
ز غیر شکر و شکایت ز دوستدار کنم

سرشتِ پاک و دلِ صاف دادہ اند مرا
بہ حرفِ تلخ ولے خالی از غبار کنم

خوش آنکہ ساز کنم از تو شکوۂ بے جا
تو اعتذار کنی و من افتخار کنم

خوش آنکہ عذرِ تو چوں در کند مرا بزمیں
دگر بہ پیشِ تو تمہید اعتذار کنم

براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد زیں پس
زکار ہاے جہاں خاصہ ایں سہ کار کنم

ز کردہ توبہ نمایم ز گفتہ استغفار
دگر سپاسِ تو پنہاں و آشکار کنم

3 قطعہ در سپاس لطف و کرم جناب کرنل ہالرائڈ وقتے کہ عنان ادارۂ تعلیم پنجاب در دست ایشاں بود

اولاً شکرِ آں کہ فرمودی
حاجتِ بندہ بے دریغ روا

ثانیاً عذرِ آں کہ چندیں بار
آمدم از پئے صداع شما

آں شنیدی کہ گفت افلاطوں
رنج برد آں کہ در نکوییہا

رنجِ او عاقبت بہ پایاں رفت
لیک نیکی ہمیشہ ماند بجا

راست گویم گزاردن نہ تواں
حق لطفے کہ کردہای برما

می کنم ختم بر دعا گفتار
کہ نیاید ز بندہ غیرِ دعا

4 شکریہ مسٹر وٹن افسر محکمہ پرمٹ

(از طرف عزیزی ان شاء اللہ خاں مرحوم دہلوی)

فرزانہ امیرِ دادگر وٹن
کز داد و کرم زمانہ بنواخت
دستش بگرفت و زود برداشت
آں را کہ فلک زپا برانداخت

بنواخت بہ قدرِ پایہ اُو
آں را کہ زمانہ قدر نہ شناخت
اصلاحِ ادارۂ نمک کرد
زاں ساں کہ ز ہر خلل پر داخت

آوازہ فگند دار و گیرش
زاں گونہ کہ دزد زہرہ درباخت
ناخواستہ کامِ ما روا کرد
ناساختہ کار ہائے ما ساخت

از فیضِ نیاز مندیِ اوست
انشا کہ ز ناز سر بر افراخت

5 در شکر یاد آوری عالی جناب ہز ہائینس امیر الامرا
آنر یبل نواب سر حامد علی خاں بہادر مستعد جنگ والی ریاست رام پور دام اقبالہم

کیست یا رب کز دلِ آزادگاں
مدحِ او جوشد چو از فوارہ آب
کیست کز ذکرِ جمیلش در جہاں
ہر کسے نادیدہ می خواند کتاب
کیست کز ذوقِ ثنایش در دوات
خامہ می رقصد چو برق اندر سحاب
کیست کز صیت نوالش چار سو
قانعاں را در دہن گردیدہ آب
کیست کز رویش برافتد گر نقاب
گوئی از مشرق برآمد آفتاب
کیست کز خویش اگر حرفے رود
دفترِ اخلاق شوئی باب باب
کیست کز وصفش اگر جوئیش نام
در زماں بر دل فرود آید جواب
شہ نشاں حامد علی خاں آں کہ نیست
جز نمودارے ز رویش ماہتاب
روے اُو نورِ ضمیرش را گواہ
راے اُو روے منیرش را جواب
خوے اُو آمد دلیلِ خوے اُو
گر دلیلے بایدت زو رو متاب

کیست کز اکسیر اگر پرسی نشاں
بشنوی خاکِ درش از دل جواب

چوں ز خلوت پا نہد در جلوہ گاہ
یا کند در بزم جمع را خطاب

چشمہا از گوشہا سبقت برد
گوشہا بر چشمہا آرد شتاب

بردہ رہ گوئی بہ آبِ زندگی
ہر کہ از لطفِ کلامش کامیاب

جاوداں ماندہ ز راحت بے نصیب
ہر کہ از اعراضِ اُو در پیچ و تاب

بر دلم نادیدہ بندِ مہرِ اوست
اے خوشا روزے کہ برخیزد حجاب

مہرباں بر خود گمانش کردہ ام [1]
تا چہ تعبیر آرد ایں فرخندہ خواب

اے سلف را میوۂ نخلِ اُمید
وے نیاگاں را دعائے مستجاب

در جہاں باشی سلف را جانشیں
تا خلف ذی شاں بود نائب مناب

نامِ آبا زندہ از نسبت
تا پسر جوید بہ آبا انتساب

تا حساب از عمرو از دولت کنند
دولت و عمرِ تو بادا بے حساب

---

[1] مسند نشینی کے چند سال بعد نواب ممدوح نے خاکسار کو رام پور میں یاد فرمایا تھا۔ اُس وقت اوّل یہ قطعہ بھیجا گیا تھا، اُس کے بعد راقم خود گیا تھا۔ (حالی)

6 قطعہ در شکر صحت یابی شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی [1]

للہ الحمد پس از ناخوشی و رنجِ دراز
شبلیِ ما بہ مراد از سرِ بالیں برخاست
آں کہ نامش بہ کمالات سمر در گیتی ست
آں کہ مشہور در آفاق بہ شمس العلما ست
آں کہ گر سر کند افسانہ فضل و ہنرش
خاصہ مشکل کہ بہ پایاں بردش بے کم وکاست
آں کہ خوانندش اگر فخرِ زمانِ خود و بس
کردہ باشند عدول اہلِ سخن از رہِ راست
بود در علت او علتِ قومے مضمر
لا جرم صحتِ اُو بہرِ ہمہ قوم شفا ست
بسکہ او روح دمیدہ است بہ تاریخِ سلف
ہر قدر فخر بہ ذاتش بکند قوم رواست
زندہ تا دیر بماناد کہ بر قدِّ کسے
بعد ازو خلعتِ تحقیق نمی آید راست

---

[1] ماہ ستمبر 1899ء میں علامہ شبلی نے ایک طویل علالت سے صحت یاب ہونے کے بعد اپنے احباب کے پاس ''قصیدہ کشمیریہ'' کی نقلیں بھیجی تھیں جس کا مطلع یہ ہے:

دوستاں اے کہ رہ و رسم وفا کیش شماست؟
ہیچ دانید کہ شبلی بچہ حال ست و کجا ست

حالی نے 18 ستمبر 1899ء کو ''قصیدہ کشمیریہ'' کی رسید اور شکریے کا خط لکھا جس میں یہ قطعہ بھی درج تھا۔
(بحوالہ مکاتیب حالی صفحہ:35)

(و) متفرقاتِ فارسی

1 ترتیب ماہ ہائے جلالی در نظم

آذر و دے، بہمن، اسفندار، فروردیں، بہشت
باز خورد داد ست و تیر است و مرداد اے جواں
باز شہریور، سپس مہر ست و آباں بعد ازو
بر یک از ماہِ جلالی پیشِ تو کردم بیاں

2 عیدی شبِ برات

تعالی اللہ شبے کایزد دریں شب
کساں را مقبل و مدبر نماید
اگر اقبال خواہی بندگی کن
کہ حلوہ خوردنی را روے باید

3 تمہید رقعۂ شادی عروسی

(منقول از دیوان حالی)

شکر کہ از فضلِ خداے جہاں
وقتِ خوش از پردہ بر آمد عیاں
شادیِ دل را سبب آمد بہ دست
فرصتِ بزمِ طرب آمد بہ دست
تا شود از مقدم اہلِ کرم
کلبۂ ما غیرتِ باغِ ارم

4 تمہیدِ رقعۂ شادی عروسی

رفت آسیبِ زمستاں بادِ نوروزی وزید
دوستداراں را بشارت باد و یاراں را نوید
طرحِ بزمِ خرمی باہم دگر باید نہاد
نغمہ شکرِ الٰہی دم بہ دم باید کشید

5 تمہیدِ رقعۂ شادی عروسی

ہزار دیدہ و دل فرشِ راہِ یارانے
کہ از مسرتِ یاراں مسرت اندوزند
بہ شادی و طرب ہمدگر شوند انباز
ہزار رخ ز فروغ دلے بر افروزند

6 تمہیدِ رقعۂ شادی عروسی

کارِ احباب ساختن بتواں
دوستاں را نواختن بتواں
تا بہ دہر ابر و باد خواہد ماند
از شما لطف یاد خواہد ماند

7 فرد

چیدند خوانِ نعمتے چوں سیر شد دل از جہاں
دادند آب زندگی اما پس از نزعِ رواں

(ز) قطعاتِ تاریخ و مختلف مادہ ہائے تاریخ

1 قطعہ تاریخ طبع دیوان میر مہدی مجروح دہلوی

مجروح آں کہ نامِ سلف زندہ است ازو
ذاتش بود غنیمتِ کبریٰ دریں زماں

دہلی کہ بود کانِ ہنر ، معدنِ کمال
امروز از کمال نیابی در و نشاں

جمعے کہ داشت سر بفلک از وجودِ شاں
راندند سوے جنتِ ماویٰ یگاں یگاں

وانانکہ ماندہاند ازاں جمع یادگار
لبیک می زنند اجل را زماں زماں

غالب برفت و نیرؔ و آزردہ رفت و ذوق
مومن برفت و حسرتی و عارف از میاں

رفتند و جاے خود ہمہ خالی گزاشتند
کس برنخاست تا بنشیند بجاے شاں

مجروح ماندہ است ازاں جمع یادگار
یا رب بدار از بد دورانش در اماں

کایں عندلیب قصہ ہمی خواند از بہار
ویں گل خبر ہمی دہد از عہدِ گلستاں

دیوانِ اُو کہ ریختہ را دورِ آخر است
خوش می زند صدا بہ حریفانِ نکتہ داں

کایں مے کہ وا گزاشتہ میر و میرزا ست
می بخشمش بہ ہر جگرِ تشنہ رائگاں

القصہ چاپ گشتہ و ارزاں شد آں متاع
کانرا بہ نقدِ عمر خریدن ہمی تواں

پرسد اگر کسے ز تو تاریخ حالیا
گو ، "نظم دلفریب" بود سالِ طبعِ آں

1316ھ

2 قطعہ تاریخ طبعِ دیوانِ منشی اقبال حسین صاحب متخلص بہ عاشق

جواں مرد آزادہ عاشق کہ نیست
در اقرانِ خود کس مر او را قریں
نہ صیّاد و ہموارہ از حسنِ خلق
پئے صید آزادگاں در کمیں
نہ سحار و پیوستہ ز افسونِ نطق
کشد ز آشیاں باز و شیر از عریں
ہمی بارد از جبہاش انبساط
اگر مہربان است و گر خشمگیں
نہ پینیش گہہ سر کہ بر ابرواں
نہ یا بیش افتادہ چیں بر جبیں
دو سال است کا فسونِ مہر و وفاش
ربودست صبرم ز جانِ حزیں
ولے دیر پیوند ، نا آشنا
کہ بودست فارغ ز مہر و ز کیں
ندانم کہ عاشق چہ افسوں دمید
کہ در باخت خود را بہ مہرش چنیں

سرِ رشتہ ہیہات دادم ز دست
سخن ز آسماں بود و رفت از زمیں

کنوں رانم از طبعِ دیواں سخن
کہ شد جلوہ فرما بنوعِ گزیں

دریں روزہا کز صروفِ زماں
سخن شد مہان و سخن ور مہیں

عروسِ سخن می نیرزد بہ جو
بہ حسن ار بود غیرتِ حورِ عین

صد آباد بر عاشق و عزمِ اُو
کہ در دورِ ناسازگارے چنیں

ز معنی ، بہ بیگانہ و آشنا
فشاندست گنجینہ از آستیں

چو دیوان اُردوے عاشق کہ ہست
صنم خانہ طرفہ گفتی ز چیں

بہ پیرایہ طبع آراستند
شنیدند از ہر طرف آفریں

سخن کش نہ بود ار ز شے در جہاں
ز شادی نہ گنجید در پوستیں

چو حالی ہمی جست تاریخ طبع
"صنم خانہ، عشق" آمد سنیں

1307ھ

3 تاریخ بنائے مکان سید عوض علی مرحوم رئیس جارچہ ضلع بلند شہر کہ

حسب فرمائش برادر عزیز الوجود سید فیاض حسین مرحوم نوشتہ شد

کرد سید عوض علی تعمیر
ایں شبستاں برائے نزہت دل

چوں بہ پایاں رسید ہاتف گفت
سال ہجریش داں ''ظفر منزل''
1307ھ

پس بکن لفظِ ''بے مثال'' فزوں
1890=1307+583ء
تا شود سالِ عیسوی حاصل

4 قطعہ تاریخ تعمیر مسجد واقع سونی پت کہ بہ اہتمام خواجہ محمد علی مرحوم

خطیب پانی پت و واصل باقی نویس تحصیل سونی پت تعمیر یافتہ

محمد علی آں مددگارِ حق
کہ از مال و جان است بر دیں فدا

کمر بستہ بر یاریِ اہلِ دیں
بہ تعمیرِ ایں جامعِ دلکشا

پئے آنکہ زیں عہدہ آید بروں
کشیدہ بسے ماہ رنج و عنا

دگر جمعے از حق پرستانِ شہر
دریں کار با او شدہ ہم نوا

چو سالِ بنائش بجستم ز دل
بگفتا ''چہ خوش کرد مسجد بنا''
1293ھ

5 تاریخ وفات جناب خواجہ کرامت علی صاحب مرحوم

جو حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی کی فرمائش سے لکھا گیا تھا

شد کرامت علی ز دارِ فنا
ماند خلقے بہ گریہ و زاری

مغفرت وقفِ روحِ خواجہ کہ اُو
یافت رحلت بہ سالِ غفّاری
1291ھ

6 تاریخ وفات محمد ابراہیم جواں مرگ طالب علم بی۔اے کلاس دہلی کالج

محمد ابراہیم چوں ترکِ جاں گفت
ز نخلِ جوانی ثمر برنخوردہ

بگفتم ز روے ''الم'' سالِ فوتش
1
''بجاں آفریں جانِ شیریں سپردہ''
1293=1+1292ھ

7 قطعہ تاریخ بر پایاں رسیدن بنائے سید مہربان علی مرحوم رئیس گلاوٹھی در بلند شہر

علی آں سیّدِ والا کہ باشد
بنامش مہرباں جزوے ز اجزا

بود با ذاتِ او توام سیادت
چناں کز نامِ او مہرست پیدا

چو ایں کاشانہ را بنیاد بنہاد
بہ عہدِ حاکمِ بیدار و دانا
گروس آں فیض گستر کز وجودش
شد ایں معمورہ چوں گلشن سراپا
چنیں گفتمش حالی سال تعمیر
''مکان بے نظیر آباد بادا''
1299ھ

8 قطعہ تاریخ اورنگ نشینی آصف جاہ نظام الملک سادس میر محبوب علی خاں

بہادر فرماں روائے ملک دکن

بہ سالِ فرخ و ماہِ سعید و روزِ فرخندہ
نظام الملک محبوبِ علی خاں آصفِ ثانی
بہ تختِ سلطنت بنشست و حالی گفت تاریخش
''برائے وے مبارک تاج واورنگ جہاں بانی''
1301ھ

9 تاریخ رحلت جناب نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب مرحوم دہلوی رئیس لوہارو

دردا کہ ضیاء دین احمد بربست
929ھ
رختِ سفر از جہاں کہ جائے الم است
از طاق و ز ایوان و ز بزم و جلسا
94 + 49 + 68 + 110
بگسستہ بہ رحمتِ الٰہی پیوست اے
694

0 تاریخ بنائے مہماں سرائے در موضع مون واقع پنجاب، بحساب سال عیسوی

بحرِ کرم آں وزیر چند کہ باقی ست
نام بزرگان موں ز بذل و نوالش

ا۔ یہ تاریخ اس طرح نکلتی ہے کہ 929 میں سے جو کہ ضیاء دین احمد کے اعداد ہیں، 321 جو کہ طاق، ایوان، بزم اور جلسا کے اعداد کا مجموعہ ہے، تخرجہ کر کے باقی 608 کو 694 میں جو کہ رحمت الٰہی کے اعداد ہیں، ملانے سے 1302 حاصل ہوتے ہیں اور یہی نواب مرحوم کا سال وفات ہے۔ (حالی)

ساختہ منزل گہے چو مہر غریباں
''تکیہ گہہ ہر غریب'' آمدہ سالش
1877ء

! تاریخ بنائے باغ در موضع تسہ ضلع مظفر نگر ترتیب دادہ

سید فیاض علی خاں رئیس تسہ

رئیس نامور فیاض علی خاں
کہ نتواں کرد وصفِ او ز صد یک

بہ تسہ طرفہ باغے طرح انداخت
کہ در خوبی زند بر خلد چشمک

چو حالی سال ترتیبش ہمی جست
خرد فرمود ''باغ نو مبارک''
1322ھ

@ قطعہ تاریخ تعمیر چاہ بنا کردہ سید محمد ذکی رئیس سونی پت

بکند چاہ چو سید ذکی بہ سونی پت
زخاک جوش بزد آبِ صافی و شیریں

ندا رسید ز ہاتف بہ گوش حالی زار
کہ ہست سال بنا ''چشمہ بہشتِ بریں''
1317ھ

(ح) قطعاتِ تاریخ

1 قطعہ تاریخ وفات خواجہ فرید الدین احمد [1] حسب فرمائش سرسید احمد خاں

رخت سفر چو از جہاں خواجہ فرید دیں بست
از پے سال رحلتش سوے بہ سو شتافتم
روے نمود ناگہاں خواجہ شبے بہ خواب در
دید و بخندہ باز گفت ''جا بہ بہشت یافتم''
1244ھ

2 قطعہ تاریخ وفات مولوی چراغ علی [2]

زخمے از مرگِ چراغ علی آمد بر دل	کہ از و خاطرِ افکار بصد غم شدہ جفت
از خرد سالِ وفاتش چو بجستم محمود	''شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا'' گفت

1895ء

3 قطعہ تاریخ وفات نواب محسن الملک [3]

محسن الملک آہ ز دنیا برفت	خلق شد از رحلتش اندوہ گیں
سالِ وفاتش شدہ ملہم ز غیب	''انجمن آرائے بہشت بریں''

1325ھ

---

[1] سرسید احمد کے نانا، خواجہ فرید الدین احمد کا انتقال 14 محرم 1244ھ (مطابق 1828ء) کو ہوا تھا۔ ''سیرت فریدیہ'' میں سرسید لکھتے ہیں:
اُن کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں نے مادۂ تاریخ وفات ''جا بہ بہشت یافتم'' نکالا اور اس کو بطور قطعہ کے موزوں بھی کیا تھا جو راقم کو یاد نہیں رہا۔ زمانۂ تحریر اس رسالہ میں یعنی 25 اگست 1893ء کو میں نے اس کا ذکر مولانا خواجہ الطاف حسین حالی سے کیا۔ انہوں نے اس مادۂ تاریخ کو اس طرح پر موزوں کر دیا۔ (بحوالہ سیرت فریدیہ، مشمولہ مقالات سرسید حصہ شانزدہم، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی صفحہ:766)

[2] نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی کی وفات (15 جون 1895ء) پر سید محمود (خلف سرسید احمد خاں) نے

''حیف چراغ علی از دنیا نہاں شد'' سے مادہ تاریخ نکالا۔ مولانا حالی نے اس مادہ تاریخ کو قطعے کی صورت میں نظم فرمادیا۔

۳۔ یہ قطعہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (مورخہ 6 نومبر 1905ء) میں شائع ہوا تھا۔

باب ہیجدہم

کلامِ عربی

(عربی)

کلام عربی

1 نظم عربی جو مخدومی منشی محمد کرم اللہ خاں دام بقاؤہم کی شادی کتخدائی کے موقع پر بہ طور مبارک باد کے بیماری کی حالت میں لاہور سے دہلی بھیجی گئی تھی۔ (حالی)

بنفسی ما بہ جاء البشیر،
و ما افدی بہ شی یسیر
فبشّرنی وقد القیت سمعی
بسور لا یکافئہ سرور،
فقمت اذًا و کیف یقوم مثلی
نحیفًا لیس یبعثہ النشور،
شکیًا لا یصاحبہ انیس
غریباً لا یزار ولا یزور،
نسیت ولم أکُ انسیٰ بمومی
فما بذا النشاط وذالسرور،
اری الارجاء قد ملئت بهائً
وفی القمرین فوق النور نور،
فیا للّربع من ربعٍ بہیجٍ
بہ صحب و اخوان حضور،

879

کانّ الناس حول العرس کانوا
نجوماً بینہا قمر منیر،

و ارجو حضرۃ الاصحاب فیہ
بشوق لا الٰی بوس یصیر،

فان یک فاتنی ما کنت ارجو
اذًا قد فاتنی خیر کثیر،

أحبّ ولست اکذب عرس قوم
لہم و لعرسہم شان کبیر،

ابوہ فجدّہ و ہلم جراً
سریّ او غنیّ او امیر،

لہ فی ذاتہٖ کرم عمہم
کما فی اسمہٖ کرم شہیر،

فقرّت اعین الزوجین قراً
الٰی ما کان للّدنیا قدور،

وکان مبارکاً لہما ازدواج
بوُدِّ لا یداخلہ نفور،

فباطنہٗ کظاہرہ صلاح
و آخرہ کاوّلہ حبور،

2 ذیل کی ابیات دہلی کے احباب کو لاہور سے اُس وقت لکھ کر بھیجی گئی تھیں جبکہ راقم دلی سے بدل کر لاہور کے سررشتۂ ترجمہ میں چلا گیا تھا اور دوستوں کی جدائی میں مغموم تھا۔ (حالی)

ہل مَن یبلّغ عن محصور لاہورِ

عن مبتلی فیہ بعد الکور بالجور

الیٰ دیار بہا سلمیٰ و اہلیہا
ان لم یکن فی زمان البین من
خیرٖ

بل فیکم من یواسی حائذًا اسفًا
بما مضی من دوام القرب و
الزورٖ

ولم یزل حدثنا الدھر یزعجنی
یومًا بنجدٍ و یومًا کنت فی غورٖ

لٰکننی راسخ فی حبّکم قدمی
فلن أحوّل عن طور الٰی طورٖ

انی أحبّ و اہوی ان اُلاقیکم
ان لم یکن نحو کم مسعای او
سیری

انی ارانی وقد أنضبت من نصب
بحیث لم ابق ان امتاز عن غیری

واذ رایت قضاء اللہ محتکمًا
رایت نفعی طوی فیہا بری
ضیری

ارجو من اللہ بعد العسر میسرۃً
اِما علیٰ مہلۃ ما او علیٰ فورٖ

3 ذیل کی نظم کارڈری صاحب [1] کی شان میں اُس وقت لکھی گئی تھی جب کہ وہ لاہور میں قائم مقام ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم تھے اور راقم سررشتہ ترجمہ میں کام کرتا تھا اور صاحب ممدوح سے

ایک معاملے میں سفارش کا خواستگار تھا۔ (حالی)

لنا آسیائین عند خصاصۃٍ
تکون بنا ان نلتجی بالقصائدِ
فنثنی علیٰ من کان یکفی امورنا
ولا سیما من کان اشعر ناقدِ

ا؎ یہ وہی کاردی صاحب ہیں جو آخر کو ریزیڈنٹ مقرر ہو کر حیدرآباد گئے اور کئی سال وہاں ریزیڈنٹ رہے۔ (حالی)

وانت الذی تحوی الفضائل جمّۃً
کما تحتوی الداماء جمّ الفوائدِ
ففتشناک تفتیش اللحاۃ عن العدی
فلم نر شیئًا فیک غیر المحامدِ
لقد قلما ولیت امر جماعۃٍ
تمیزت منہم واحدًا بعد واحدِ
ومن ذا الذی یغرک ذرب لسانہٖ
فانک لا تشری رضاک بکاسدِ
ولم ینسک الغیّاب عنک مغیبہم
فعندک حق الغائبین کشاہدِ
اتیت ببدع لم یجد قبل واحد
الیہ سبیلاً من ذکی و خامدِ
کشفت غطاء عن خبیّات بومرا؎
کما یکشف الصبح الدجی عن
مراقدِ

وہل بعد ہذا الفضل للمرء حاجۃ
الٰی غیرہ من بیّنات الشواہدٖ
مدحتک حقًّا غیر مطر مبالغ
و شانک عندی فوق تلک
المجامدٖ

4 مبارک بادشادی کتخدائی جناب مرزا ثریا جاہ صاحب گورگانی خلف اوسط جناب مرزا ہدایت افزا المعروف بہ مرزا الٰہی بخش مرحوم جو میرے عزیز دوست مولوی مرزا اشرف بیگ مرحوم کی فرمائش سے لکھی گئی۔ (حالی)

ا؎ کارڈری صاحب نے یونان کے مشہور شاعر ہومر کی کتاب نظم یعنی "الیڈ" کا ترجمہ یونانی سے انگریزی نظم میں کر کے انگلستان میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ اُسی ترجمے کی طرف اشارہ ہے۔ (حالی)

ابیت اللعن نخبۃ آل قومٍ
الیہم ینتہی کلّ المعالی
لہم بین الوریٰ ذکر رفیع
و شان فی ملوک الدہر عال
وانک انت یا من طاب نفسًا
لہم خیر الجدود لخیر آل
خطبت کریمۃً من طیباتٍ
اولات الفضل خیّرۃ الفعال
فیا للمنتدی خیر التوادی
بہ حقت موالات الموالی
ویا للعرس من فحل کریم
اثیل المجد محمود الخصال

یجود بما یضنّ ولا یبابی
ویفعل ما یشاء ولا یبالی
یجیب السائلین بغیر مکث
ویعطی العائلین بلا سوال
وان یک اصغر الاقران سنًا
فاکبرہم بلوغًا فی الکمال
فبورک فیہ ما دام الثریا
وما السلخ النہار من اللیالی

5 قصیدہ بائیہ

در شان حضرت شاہ عبدالغنی قدس سرّہ کہ ہنگام اقامت آنجناب در مدینہ منورہ از ہند بخدمت بابرکت ایشاں فرستادہ شدہ بود واز آنجا اطلاع رسیدن آں ابیات حضرت ایشاں بہ دستخط خاص درعبارت مندرجہ ذیل دادہ بودند:

بسم اللہ الرحمن الرحیم! من عبدالغنی ابن ابی سعید الی الفاضل النبیل والادیب الجلیل المولوی الطاف حسین۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ! وصل مکتوبکم الشریف مع القصیدۃ

الی العبد الضعیف مع فصاحتہ و بلاغتہ لا یخلو عن الشّین من جہۃ الممدوح۔

لا عیب فیہم غیر ان سیوفہم
فیہا فلول من قراع الکتائب

واستحسنہا بعض أدباء المدینۃ المنورۃ لما فیہ من البراعۃ والفصاحۃ۔ اللہ یتجاوز من زللی وینفعکم باعلیٰ منایا و مأرب بجاہ صاحب الشفاعۃ الکبریٰ سیدنا محمد و آلہ و اصحابہ فلک السعادۃ و نجوم الہدایۃ بلا ریب و خلل۔ والسلام! (حالی)

ہوی الحور بلویٰ کل حبرٍ و نادب
و فتنۃ قسیّسٍ و زلّۃ راہب
و ہزم لمنصورٍ و فتح لخازلٍ
و عزّ لمغلوبٍ و ذلّ لغالب
وما من نساء الحیّ للعز مخلص
بلمحٍ قد ستأسرن اہل التجارب
و لیس بداءٍ کاد یشفی سقیمہ
صبابۃ قلبی بالعذاری الکواعب
قد اختطفت لبّی و روعی ملیحۃ
بلطف مدارٍ لا بعبس معاتب
معطلۃ الآراء من غیر رقیۃٍ
مقّتلۃ الاحشاء لا بالمضارب
و صاحبۃ العشاق لا فی مکارۃٍ
و کاذبۃ المیثاق لا بالمراقب
لفی نظرۃٍ منہا و غمزٍ و لمحۃٍ

879

بلاء الذی ورعٍ الی اللہ تائب

و کم من حیاءٍ دونہا و تصحّبِ

و حصنٍ من التقویٰ و خوف

العواقب

عجبنا لما قد خرّ موسیٰ و صعقہٖ

ولکن راینا عند کشف الجلابب

ذہبنا لنلہیہا بنا عن مشاغلٍ

فجاء ت والہتنی عن الاشتغال

بی

اشدّ بلائً وصلہا من فراقہا

اذا کان عند الوصل خوف

المراقب

أراقب وقت الوصل من غیر

موعدٍ

اصدق فی اقدمہا قول کاذب

الیلای ما اغناک عن شان مولعٍ

لہ انت فی دنیاہ قصوی المأرب

تناسیت فی ذکراک علمًا و

حکمۃً

لانضیت ایامًا الیہا رکائب

ذہبت بصبری یوم اقدمت فی

الحمیٰ

نزلت وما انزلت حمل المراکب

شغلت بلحظٍ قلبنا عن مشاغلٍ

صرفت برمزٍ قصدنا عن رغائب

یغشّی علی ابصارنا منک جلوۃً
کانک فی الاستار من غیر حاجب

عتابک حلو فی المذاق فعاتبی
و ضربک حق للرقاب فضاربی

و دونک قلب العاذلین بنظرۃٍ
لک الدّین عند العاشقین فطالبی

احبّۃ لا تشکوا حزینًا فرّبما
تہیّج للاصحاب رنۃٌ صاحب

ذرونی و قلبی بالرزایا فانّہ
مصائب اُخریٰ ذکر تلک المصائب

لقد قلّ عونی فی اُخوٍّ کثیرۃٍ
کانّی غریب بین خلّ و قارب

ولی من موالٍ انّما انا بینہم
بمنزلۃ الکرار بین النواصب

و فیہا الیٰ سلمیٰ وصولی فانّنی
ضللت سبیلی فی ضیاء الکواکب

لاصبح یوم البین کاللیل مظلمًا
کانّ صباحی قطعۃ من غیاہب

کما اظلم الدہلی بتغریب کوکبٍ
مضیٍٔ علی عربٍ عن الہند

عازب

عروفٍ غذیر العلم بادٍ و مرشدٍ
جلیل المساعی مستفیض المناقب

صبورٍ علی البلویٰ شکورٍ علی
اللہیٰ
نفور من الدنیا الی الحق راغب

مدار کمالٍ مقتدی کل کاملٍ
قحط رجالٍ منتہیٰ کل طالب

اذا ما قضیٰ عدلٍ صدوقٍ اذا
رویٰ
مصیبٍ اذا افتی اذا قال صائب

وحید الوریٰ عبدالغنی الذی لہ
اوائل مرأۃ لکشف العواقب

یقوم غبّی جالس الشیخ ساعۃً
بقلبٍ ذکّی مطمئنٍ مراقب

و ترجع رجعًا قہقری دون بابہ
ضلالۃ ضلیلٍ و خیبۃ خائب

لیعلم علم الناس بالشمس فی
الضحیٰ
باسرار موجودٍ و احوال غائب

بدایتہٗ اقصیٰ نہایات منتہ
نہایتہٗ قصویٰ عنایات واہب

مہابتہٗ فی نفس الفٍ و وامقٍ
ارادتہٗ فی قلب عاد و جانب

ہو السابق الغایات من صاعدی
العلی
الیٰ رجلہم لا ینتہی سیر راکب
کراماتہم مشہورۃٌ فی مشارقٍ
مقاماتہم مذکورۃٌ فی مغاربٍ
لا وضح برہانٍ علیٰ اختصاصہم
بموہبۃ الرحمن خیر المواہب
صیانتہم من کل طاغٍ و عاند
اذا غلبوا فی الہند کل اغالب
و ممن یصدّون السبیل اَمامہم
و کم خلفہم اذا ہاجروا من
معاقب
فلمّا احیطوا انّما کان حولہم
نصال العوالی او ذباب القواضب
ولمّا اتیٰ نصر من اللہ بغتۃً
لقد سابقوہم معجزی کل ناہب
ماثرہ شرع غریباً و قاطنًا
فیا عجبا من رانجات الجلائب
ولم یرو حتّیٰ اجتاز آبار قومہ
فقد ورد الینبوع اصل
المشارب[1]
مدحنا بما اختصّ الوریٰ من
مراتبٍ
وفی الشیخ شان فوق تلک

سینفد دون الابتداء بوصفہٖ
اقاویل وصّافٍ و اوصاف کاتب

ا؎ اشارۃ الیٰ ما نقل عن بعض الثقات ان الشیخ الممدوح رأی لیلۃ سید الطائفۃ خواجہ بہاء الدین النقشبندی فی المنام فبایعہ بلا واسطۃ بعد ما بایع شیوخ عہدہ مع اقرانہ۔ واللہ اعلم! (حالی)

6 مبارک بادِ خطابِ شمس العلما بہ جنابِ مولانا شبلی نعمانی کہ در علی گڑھ نوشتہ شد (حالی)

یا وحیدًا من الکرام فریدًا
و عزیزًا کمثل علق نفیس
انت اولیٰ بان تلقب شمسًا
بل بان یجعلوک شمس الشموس
انت شمس الہدیٰ ولست بشمسٍ
یعتریہا الخنوس بعد الخنوس
انت طہّرت ذیل دینٍ مبینٍ
لوّثتہ اللئام بالتدلیس
ثم دافعت عن امامٍ نقیٍ
کان بعد النبی e خیر رئیس
و عن الحق قد کشفت غطایٔ
بعد ما اغلفوہ بالتلبیس
سرت فی الارض انت برًّا

وبحرًا
للمعالی ولا لامر خسیس
فلَذوک التزام مدرس قومٍ
فیہ یرجی لہم کمال النفوس
نقمدث والتزمت لزومًا
خدمۃ المسلمین بالتدریس
قمت بالدرس والدراسۃ فیہم
فارغاً عن ریاسۃ و رئیس
و جعلت الکمال غایۃ ہم
واختذت الکتاب خیر جلیس
فعلی القوم لازماً لک حق
کلہم من وجوہہم و رؤس
ضانک اللہ عن مکارہ حتّٰی
ضرت کالقلب آمنًا فی الخمیس

7 تمہید رقعہ شادی

سلام من محب مستکین
یلیہ الخیر والبرکات تترٰی
سلام ردفہ روح و راح
وبین یدیہ للاحباب بشرٰی
و دعوۃ شاہدین و غائبینا
من الاخوان والخلان طراً

8 خاتمہ رقعہ شادی

فطیب العیش فی الدنیا و رغدہ
رہین بزیارات الاحباء

9 اشعار منقول از مکتوب حالی بہ نام مرزا اشرف بیگ دہلوی

(ضمیمہ اُردو کلیات حالی: صفحہ 132)

ارى الصبر محمودا و عنہ
مذہب
فكيف اذا ما لم يكن عنہ مذہب
ہو المہرب المنجیٰ لمن احدقت
بہ
نوائب دھر یس منہن مہرب

io

کتابیات

۱	دیوان حالیؔ	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	مطبع انصاری دہلی ۱۸۹۳ء
۲	کلیات نظم حالیؔ (اوّل ودوم)	مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	لاہور ۱۹۶۷ء
۳	مجموعہ نظم حالیؔ	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ 1918ء
۴	مسدس حالیؔ	مرتبہ ڈاکٹر عابد حسین	حالی پبلشنگ ہاؤس ۱۹۳۵ء
۵	جواہرات حالیؔ	مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	حالی بک ڈپو پانی پت ۱۹۲۲ء
۶	مسدس حالیؔ	مرتبہ انوار الحسن	تیج کمار نول کشور ۱۹۶۰ء
۷	مقالات حالیؔ	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	انجمن ترقی اُردو ۱۹۵۷ء
۸	مکتوبات حالی حصہ اوّل دوم	مرتبہ خواجہ سجاد حسین	حالی پریس پانی پت ۱۹۲۵ء
۹	یادگار غالب	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	شانتی پریس الٰہ آباد
۱۰	مقدمہ شعر وشاعری	مرتبہ رفیق حسین	رام دیال اگروال الٰہ آباد
۱۱	حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	ترقی اُردو بیورو دہلی ۱۹۹۰ء
۱۲	یادگار حالیؔ	صالحہ عابد حسین	انجمن ترقی اُردو ۱۹۹۵ء
۱۳	حالیؔ کا سیاسی شعور	معین احسن جذبی	قومی کونسل برائے فروغ اُردو دہلی
۱۴	حالیؔ مقدمہ اور ہم	وارث علوی	اُردو رائیٹرس گلڈ الٰہ آباد ۱۹۸۳ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱۵	تذکرۂ حالیؔ	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	حالی بک ڈپو ۱۹۳۵ء
۱۶	چند ہم عصر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	کراچی ۱۹۵۰ء
۱۷	Halis Musaddas	Syeda Saiyidain Hameed	Harper Collins Publisher Delhi 2003
۱۸	دیوان حالی مع شرح	اصغر حسین لدھیانوی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۵ء
۱۹	اُردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	۱۹۵۶ء لکھنو
۲۰	ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۹۷۲ء، دہلی
۲۱	حالیؔ	مالک رام	۱۹۸۰ء دہلی
۲۲	الطاف حسین حالیؔ	خلیق انجم	۱۹۸۸ء دہلی
۲۳	حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	۱۹۷۰ء دہلی
۲۴	خواجہ الطاف حسین حالیؔ	شہزاد انجم	اُردو اکادمی ۲۰۰۷ء
۲۵	عکس اور آئینے	سید احتشام حسین	سرفراز پریس لکھنو ۱۹۶۲ء
۲۶	فن سوانح نگاری کا ارتقا	الطاف فاطمہ	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۴ء
۲۷	تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۵۲ء
۲۸	حرف ادب	شجاعت علی سندیلوی	نامی پریس لکھنو ۱۹۷۸ء
۲۹	حالی کے شعری نظریات	ممتاز حسین	سعد پبلیکیشنز کراچی ۱۹۷۸ء
۳۰	اُردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھ پوری	رام نرائین لال الہ آباد ۱۹۴۵ء
۳۱	اُردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	سرفراز قومی پریس لکھنو ۱۹۶۹ء
۳۲	تنقیدی مضامین	مرتبہ مظفر اقبال	رام نرائین لال الہ آباد ۱۹۶۳ء
۳۳	تنقید و تجزیہ	ابو محمد سحر	کتابستان الہ آباد ۱۹۶۱ء
۳۴	Famous Urdu poest & Writers	Abdul Qadir	New Book Society Lahore 1947
۳۵	تجربے اور روایت	ابواللیث صدیقی	اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

۳۶	تنقیدیں اور خاکے	جلیل قدوائی	اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی
۳۷	تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبدالقیوم	مشتاق بک ڈپو، کراچی
۳۸	ادب و آگہی	مجتبیٰ حسین	مکتبہ افکار، کراچی
۳۹	اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر سید محمد الحسن رضوی	سرفراز قومی پریس، لکھنو
۴۰	قدیم دہلی کالج کا کردار	شمس الہدیٰ دریا آبادی	شاہد پبلی کیشنز
۴۱	اُردو میں تنقید	محمد احسن فاروقی	سرفراز قومی پریس، لکھنو
۴۲	انسان اور آدمی	محمد حسن عسکری	مکتبہ جدید لاہور
۴۳	اُردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	انجمن ترقی اردو، پاکستان
۴۴	غیر مدون کلام	گلدستہ انجمن	مطبوعہ مطبع اکبری، دہلی ۱۲۸۴ھ
۴۵	غیر مدون کلام	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	نومبر ۱۹۰۷ء
۴۶	غیر مدون کلام	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	دسمبر ۱۹۰۷ء
۴۷	غیر مدون کلام	بچوں کا اخبار	لاہور، جولائی ۱۹۰۵ء
۴۸	غیر مدون کلام	ماہنامہ مخزن	لاہور، جنوری ۱۹۴۹ء
۴۹	غیر مدون کلام	نقوش شمارہ نمبر ۹۶	جنوری ۱۹۶۳ء
۵۰	حیاتِ شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین اعظم گڑھ
۵۱	حالی کا ذہنی ارتقا	غلام مصطفیٰ خان	مکتبہ کارواں لاہور ۱۹۶۶ء

یہ بھی اُردو شعر و ادب کی ناقدری ہے کہ اس کے مشاہیر شاعروں، ادب کے عظیم ترین محسنوں اور معماروں کی قدردانی جیسے ہونی تھی ویسے ہو نہ سکی۔ الطاف حسین حالؔی اگرچہ ترقی پسند شاعر، تنقید کے بنیاد گزار اور جدید نظم کے پیشوا تھے جنھوں نے تنقید اُردو شعر و ادب میں مقدمۂ شعر و شاعری، نثری کارناموں میں حیات جاوید، یادگار غالبؔ اور حیات سعدیؔ کے علاوہ اُردو، فارسی اور عربی میں تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار چھوڑے ہیں جو ان کے ہم عصروں کے مقابل سب سے زیادہ وسیع اور تقریباً ہر صنف سخن پر محیط ہیں لیکن ان کا اصلی کارنامہ شعر و ادب میں جدت، مقصدیت اور زندگی کی قدروں کو شامل کرنا ہے۔ اس لیے اگر حالؔی کو اُردو شعر و ادب کا مجدد کہا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔ حالؔی کا کلام قومی، ادبی اور ملی سرمایہ ہے چناں چہ جب تک قوم اور ادب باقی ہے اس کی اہمیت بھی باقی رہے گی۔ حالی کا کلام جتنا مقبول اور موثر کل تھا آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ حالی شناسی پر راقم کی درجن بھر کتابیں اسی جذبے کے تحت ان کی سو سالہ برسی کے موقع پر پیش کی جا رہی ہیں جس کا ڈول ہم نے کئی سال قبل اُردو کے اندھے کنویں میں ڈال کر چلو چلو پانی جمع کر کے جام سخن میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے لیے ہم کسی تحسین اور صلے کے منتظر اس لیے بھی نہیں ہیں کہ ع

ہر بڑے کام کی تکمیل خود اس کا صلہ

KULYAT-E-HALI

Compiled by : Dr. Syed Taqi Abedi

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA